جستجو کیا ہے؟

(سوانح حیات)

انتظار حسین

جستجو کیا ہے؟

(سوانح حیات)

انتظار حسین

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

JUSTAJO KIYA HAI?
(Autobiography)

by

Intizar Hussain

Year of Edition 2012
ISBN 978-81-8223-970-8
Price: ₹ 500/-

نام کتاب	:	جستجو کیا ہے؟ (سوانح حیات)
مصنف	:	انتظار حسین
سنِ اشاعت	:	۲۰۱۲ء
قیمت	:	۵۰۰ روپے
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

غالبؔ

ترتیب

Scanned with CamScanner

کتنے خوابوں کے بعد

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب۔ اسی ایک توقع پر تو میں پہلے یہاں آیا تھا اور کتنے ذوق وشوق سے آیا تھا۔ لمبی مفارقت کے بعد ادھر آنے کی سبیل پیدا ہوئی تھی۔ اسی باعث تو شوق سوا تھا کہ کسی طرح اڑ کر پہنچ جاؤں۔ سوادھر شوق کا یہ عالم اور ادھر یہ حال کہ اپنی بستی اندر جانے کے رستے سمیت کرگم سم ہوگئی۔ میں باہر سے ٹکریں مار کر چلا آیا۔ اندر جانے کا ایک رستہ پا بھی لیا تھا مگر وہاں میرا کب کا ایک آوارہ خواب رستہ روکے کھڑا تھا۔ میں وہیں سے الٹے پاؤں واپس ہولیا۔ اب کتنے برسوں بعد پھر اسی ایک توقع پر اور اسی ذوق و شوق کے ساتھ یہاں پہنچا ہوں اور روٹھی ہوئی بستی کے در پر دستک دے رہا ہوں۔

خیراب کے یوں واپس جانے والا نہیں۔ ایک قافلہ میرے ساتھ ہے اور ایک روح خواجہ خضر بن کر میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ ادھر بستی کے بھی تیوراب وہ نہیں۔ داخل ہونے کا رستہ کتنی جلدی مل گیا اور حافظہ میں یہاں کی کتنی نشانیاں جگمگ جگمگ کر رہی ہیں۔ مگر یہ کیا۔ تھوڑا آگے چلا ہوں تو حافظہ جواب دے گیا۔ کیا وہ سب نشانیاں جو حافظہ میں محفوظ چلی آتی تھیں، مٹ چکی ہیں۔ "اے بھائی پریم کمار ہم کہاں ہیں۔ کونسا رستہ کدھر جا رہا ہے۔ مجھے تو کچھ پتہ نہیں چل رہا۔"

"انتظار صاحب، ہم ڈبائی میں داخل ہو چکے ہیں۔ کوئی نشانی بتایئے۔ پھر ہم آپ کے محلّے کی طرف چلیں۔"

"وہی تو مجھے نظر نہیں آ رہی۔" کیا زمانے نے ایک ایک کر کے ساری نشانیاں مٹا ڈالیں۔ میں اردگرد نظر دوڑاتا ہوں۔ بازار میں یہاں سے وہاں تک بھیڑ ہی بھیڑ ہے۔ سب اجنبی صورتیں اور در و دیوار، وہ بھی سب اجنبی۔ وہ پچھلے در و دیوار کہاں گئے۔ ذہن پر زور ڈال رہا ہوں۔ کوئی نشانی ایسی یاد آ جائے جس کا زمانے نے کچھ نہ بگاڑا ہو۔ لو حافظہ نے آخر کے تئیں ایک اشارہ کیا۔ "پریم کمار جی، یہیں کہیں اسی بازار میں ایک دوکان ہونی چاہیے۔ یقیناً ابھی تک سلامت ہوگی۔ مکھن لال حلوائی کی دوکان۔ مکھن لال حلوائی جس کی کھجیاں دور دور مشہور تھیں۔ اب بھی مشہور چلی آتی ہیں۔ ذرا اس کا پتہ کسی سے معلوم کیجیے۔"

"ہاں ہاں، میں نے بھی یہ نام سن رکھا ہے۔ معلوم کرتا ہوں۔"

مگر یہ رام کمار کون ہیں۔ بس سمجھ لو کہ غیب کی طرف سے ایک رستہ بتانے والا جیسے خواجہ خضر تھے' علی گڑھ سے ساتھ ہو لیے ہیں۔ وہاں کسی کالج میں ہندی کے پروفیسر ہیں۔ مجھے پریشان دیکھ کر کہا کہ ڈبائی میری دیکھی بھالی جگہ ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ تو لیجیے انہوں نے مکھن لال کی دوکان کا پتہ چلا لیا۔ ڈرائیور کو ہدایت کی کہ اس گلی میں موڑ لو۔ اے لو یہ تو بیچ بیچ وہی مکھن لال والی دوکان ہے۔ بالکل ویسی کی ویسی ہی۔ وہی پچھلا والا نقشہ۔ زمانے نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ پھر ڈبائی کیسے بدل گئی۔ غلط، ڈبائی نہیں بدلی ہے۔ شاید میں بدل گیا ہوں۔ اس لیے ڈبائی مجھے پہچان نہیں پا رہی ہے۔ اور کوئی ٹھکانے کی بستی کسی اجنبی کو آسانی سے اپنا آپا نہیں دکھاتی۔ مگر مکھن لال حلوائی...... وہ کہاں ہے۔ جو شخص دوکان پر بیٹھا ہے، وہ تو کوئی اور ہے۔ چھریرا بدن، سفید دھوتی کرتا، گندمی رنگت، عینک لگی ہوئی۔

میں آگے بڑھ کر اپنے اطمینان کے لیے پوچھتا ہوں "یہ مکھن لال جی کی دوکان ہے نا۔"

"جی ہاں۔" وہ شخص مجھے تجسس سے دیکھتا ہے۔

"مگر وہ کہاں ہیں؟"

"وہ تو بہت دن ہوئے سورگباشی ہو گئے۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔"

"مگر یہ دوکان تو کھجلوں کے لیے مشہور ہے۔ وہ تو یہاں نظر نہیں آ رہیں۔"

"تیار ہو رہی ہیں۔ تھوڑی دیر میں آ جائیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ واپسی میں آپ کی طرف آئیں گے۔ ذرا یہ بتائیے کہ......" میں اپنے مطلب کی بات پر آیا "یہ جو آگے رستہ پتلا سا جا رہا ہے، اس سے ویگن گزر جائے گی۔"

"ہاں جی، گزر جائے گی۔"

"آگے جا کر پھنس تو نہیں جائے گی۔"

"نہیں جی۔"

میں نے رستہ پہچان لیا تھا۔ بہت اعتماد سے اصغر وجاہت سے کہا "بس یہاں سے سیدھے چلے چلیں۔ ہمارا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

تو میرے ساتھ اصغر وجاہت بھی ہیں۔ وہ کس تقریب سے تو سنیے۔ میں تو اصل میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بلاوے پر دلی آیا تھا۔ ساہتیہ اکیڈمی نے جو سجاد ظہیر سیمینار کا ڈول ڈالا تھا اس میں شرکت مقصود تھی۔ وہاں عبید صدیقی سے ملاقات ہوئی۔ عبید آگے بی بی سی میں تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات وہیں ہوئی تھی جب میں لندن گیا تھا۔ اب جامعہ ملیہ کے ماس کمیونی کیشن سنٹر سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے ذکر کیا کہ "میں نے آپ کی دستاویزی فلم بنانے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ اچھا ہوا کہ آپ آ گئے۔ تو پروگرام یہ ہے کہ ہم اپنی ٹیم کو لے کر آپ کے ساتھ ڈبائی چلیں گے۔ وہاں کچھ شاٹ لیں گے۔ پھر وہاں سے سیدھے میرٹھ۔ وہاں میرٹھ

کالج میں جا کر کچھ شاٹ لیں گے۔ ہاں آپ عاصم سبزواری کو جانتے ہوں گے۔''

''ارے انہیں کیسے نہیں جانوں گا۔ میں نے میرٹھ کالج میں اپنی تعلیم کے چھ سال ان کی سنگت میں گذارے ہیں۔''

''تو میں نے انہیں اطلاع بھجوا دی ہے۔ وہ میرٹھ میں آپ کے ساتھ ساتھ رہیں گے۔''

دلی سے جو ٹیم ڈاکومنٹری کے ساز و سامان کے ساتھ چلی وہ سب میرے لیے شروع میں اجنبی تھے مگر اس قافلہ کے ساتھ اصغر وجاہت بھی ہو لیے۔ وہ ہندی کے جانے مانے ادیب۔ وہ تو میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ اچھی خاصی یاد اللہ چلی آ رہی تھی۔

تو ہم دلی سے نکلے اور چلے علی گڑھ کی طرف۔ پروگرام یہ تھا کہ رات یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں بسر کریں گے۔ صبح منہ اندھیرے ڈبائی کا رخ کریں گے۔ وہاں چند گھنٹے گزار کر میرٹھ کی طرف ہو لیں گے۔

آدمی کچھ سوچتا ہے مگر قدرت کچھ اور کر دکھاتی ہے۔ رات کو اچانک بادل گھر کر آئے اور موسلا دھار برسنے لگے۔ جب صبح اٹھے تو بادل اسی طرح امنڈے ہوئے تھے اور رم جھم برس رہے تھے۔ عبید صدیقی پریشان تھے کہ بارش میں تو شوٹنگ نہیں ہو سکتی۔ مگر میں تو ڈبائی جانے پہ تلا بیٹھا تھا۔ میں نے کہا کہ برادر تمہاری شوٹنگ ہو یا نہ ہو ہمارا رستہ تو کھوٹا نہیں ہونا چاہیے۔ سو طے یہ ہوا کہ اصغر وجاہت اور پریم کمار مجھے ساتھ لے کر نکل چلیں۔ بارش اگر وہاں پہنچتے پہنچتے رک جائے تو فون پر عبید کو بتا دیا جائے۔ پھر وہ اپنے تام جھام کے ساتھ وہاں آن پہنچیں گے اور شوٹنگ کریں گے۔

تو ہم رم جھم بارش میں چل پڑے۔ کیسی دستاویزی فلم، کہاں کی ڈاکومنٹری۔ میں تو اپنی بستی کے درشن کے شوق میں بوندوں میں بھیگتا دوڑا چلا جا رہا ہوں۔ اور لیجیے بستی نے درشن دے دیے۔ مکھن لال کی دوکان نے عجب جادو جگایا۔ بس وہاں کھڑے ہو کر ارد گرد نظر ڈالی تو پوری بستی کا جغرافیہ منور ہو گیا۔ اب مجھ پر روشن تھا کہ کونسا راستہ کدھر جا رہا ہے اور کونسی گلی کس گلی میں جا کر نکلے گی۔ ہم اپنی وین میں بیٹھ گئے ہیں۔ گزرتے گزرتے ایک چبوترے کو دیکھ کر ٹھٹھکا۔ ارے یہ تو وہی چبوترہ ہے جہاں رنگریز ناندوں میں نیلے پیلے کپڑے رنگتے نظر آتے تھے مگر وہ رنگریز کہاں چلے گئے اور ہاں یہ تو اس تیلی کا دروازہ ہے جس کی دو باری میں مستقل کولہو چلتا رہتا تھا۔ کڑوا تیل اور کھل۔ یہ اس کا کاروبار تھا۔ اے لو وہ نکڑ آ گیا جہاں مردان کبابی نے اپنی ٹھیک بنا رکھی تھی۔ کتنے لذیذ کباب بناتا تھا۔

''دیکھیں گاڑی سیدھے ہاتھ پہ موڑ لیں۔''

سیدھے ہاتھ پر مڑتے ہی سامنے کیا دیکھتا ہوں۔ فقیرا حلوائی کی دوکان۔ ارے بالکل ویسی کی ویسی ہی ہے۔ تو بس اب ہمارا گھر آ گیا۔ چند قدم کے فاصلے ہی پر تو تھا۔ مگر چند قدم کا فاصلہ طے کیا تو سارا

نقشہ ہی بدلا ہوا نظر آیا۔ میں حیران کہ یہاں جو گھر تھے وہ کہاں گئے۔ یہاں تو نقشہ ہی اور ہے۔ نہ وہ دیوار کی صورت نہ وہ در کی صورت۔

"پریم کمار جی، جگہ تو وہی ہے۔ یہیں ہمارا گھر تھا۔ اب تو نہیں ہے۔ پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔"

"کچھ نشانی بتایئے۔"

"ذرا یہ معلوم کیجیے کہ فقیر چند حلوائی کا گھر کونسا ہے۔ یہیں کہیں تھا۔ عین اس کے سامنے ہمارا گھر تھا۔"

"فقیر چند کی دوکان تو آپ پیچھے چھوڑ آئے۔"

"وہ تو دوکان تھی۔ اس کا گھر یہیں کہیں تھا۔"

پریم کمار نے پوچھ گچھ شروع کی۔ دم کے دم میں ارد گرد کے کتنے لوگ جمع ہو گئے۔ جیسے ان سب کے کان میں کسی نے پرو دیا ہو کہ پاکستان سے ایک اجنبی آیا ہے اور اپنا گھر ڈھونڈ رہا ہے۔

"انتظار صاحب، آپ جس گھر کے سامنے کھڑے ہیں۔ یہی فقیر چند کا گھر ہے۔" اور پریم کمار نے فوراً آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک نوجوان باہر نکل کر آیا اور حیران ہوا کہ اس کے گھر کے سامنے یہ کیسا مجمع ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا "فقیر چند جی کا مکان یہی ہے۔"

"ہاں یہی ہے۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

"ان کی تو بہت دن ہوئے مرتیو ہوگئی۔ میں ان کا پوتا ہوں۔"

"اچھا؟" اور پھر میں فوراً ہی پلٹ کر سامنے والے مکان کی طرف دیکھنے لگا۔ کتنی دیر تک تکتا رہا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ گھر کونسا ہے۔ ہمارا تو ہے نہیں۔ پھر صدر دروازے کی دہلیز پر دائیں بائیں دو پتھر کی چوکیاں دیکھ کر تھوڑا تجسس ہوا۔ ہمارے صدر دروازے کے دائیں بائیں بھی چوکیاں تو تھیں مگر یہ وہ دروازہ تو نہیں ہے۔ پھر برابر میں کمرے کے تین دروازے دیکھ کر تھوڑا ٹھٹھکا۔ ہمارے گھر میں وہ جو ہال کمرہ تھا، اس کے بھی تین دروازے باہر سڑک پر کھلتے تھے مگر یہ وہ دروازے نہیں ہیں۔ پریشان ہو کر میں آگے چل پڑا۔ چند قدم چلا تھا کہ ایک مسجد کے مینار نظر آنے لگے۔ ارے یہ تو وہی ہماری مسجد ہے۔ میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔ کتنی نمازیں میں نے یہاں پڑھی تھیں اور اس زمانے میں میں کتنا پکا نمازی تھا اور میں نے پلٹ کر پھر اس مکان پر نظر ڈالی جس کے در و دیوار دیکھ کر میں چکنم میں پڑ گیا تھا۔ مگر جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں آگے بڑھ گیا۔

"پریم کمار جی، شاید وہی ہمارا گھر ہے۔"

"تو پھر چل کر دیکھ لیں۔"

"دیکھ کے کیا کریں گے۔ سارا نقشہ ہی بدل گیا۔"

''نہیں پھر بھی دیکھ لیں۔''

پریم کمار مجھے چھوڑ کر اس مکان کی طرف لپکے۔ اصغر وجاہت ابھی تک وہیں کھڑے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ پریم کمار نے جا کر دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا دی۔ اندر سے ایک صاحب برآمد ہوئے۔ حیران کہ ان کے گھر کے آگے یہ کون اجنبی منڈلا رہے ہیں۔ پریم کمار اور اصغر وجاہت نے میرا تعارف کرایا۔ اس گھر پہ دستک دینے کی وجہ بتائی۔

ان کا نام تھا ارجن کمار صراف۔ معلوم ہوا کہ گھر کے معززین میں شمار ہوتے ہیں۔ اس نگر کی میونسپلٹی کے چیئرمین رہ چکے ہیں۔ ایک دفعہ نہیں دو دفعہ۔ انہوں نے مکان کے سلسلہ میں وضاحت کی کہ ''دیکھیے ہم نے یہ مکان 1948ء میں خریدا تھا۔ جن سے خریدا تھا، ان کا نام تھا شہنشاہ حسین۔''

''لیجیے تصدیق ہو گئی۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''ارجن کمار جی، یہ شہنشاہ حسین میرے ماموں زاد بھائی تھے۔ اس گھر کے آخری وارث وہی تھے۔ یہ ہمارا جدی گھر تھا۔ میں یہاں پیدا ہوا۔ بچپن اور لڑکپن اسی گھر میں گزرا۔ سو اس وقت سے تصور میں بسا ہوا ہے۔ بس ایک نظر دیکھنے کی آرزو تھی، سو وہ دیکھ لیا۔''

''نہیں نہیں آپ اندر آئیں۔ آئے ہیں تو اندر باہر سے دیکھیں۔''

لیجیے اب ہم اندر اس کمرے میں بیٹھے تھے جو صراف صاحب کی بیٹھک تھا اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کے ایک ایک گوشے کو دیکھ رہا تھا۔ کمرہ تو وہی ہے، میں سوچ رہا تھا مگر یہ اتنا چھوٹا کیوں ہو گیا۔ اس کمرے پہ موقوف نہیں، وہ پورا گھر ہی مجھے سکڑا سمٹا نظر آ رہا تھا۔ پہلے کتنا وسیع و عریض نظر آتا تھا مگر اب جیسے سکڑ کر چھوٹا ہو گیا ہے۔ اس بستی کی سڑکوں، گلیوں کے ساتھ بھی یہی صورت نظر آئی۔ میرے تصور میں وہ کتنی کشادہ چلی آ رہی تھیں۔ اب جو سڑکوں، گلیوں سے گزرا تو حیران کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ ہماری بستی کی ہر سڑک کتنی تنگ اور ہر گلی کتنی پتلی ہو گئی ہے۔ اور مکان پہلے کتنے بلند و بالا تھے۔ اب وہی مکان یعنی ان میں سے جتنے جہاں تہاں ویران و خستہ کھڑے نظر آ رہے تھے، کتنے پست اور رقبہ میں کتنے مختصر دکھائی دے رہے تھے۔ ہمارے گھر کا صحن کتنا بڑا تھا اور سامنے والے دالان کے در کتنے اونچے اونچے تھے۔ اب وہی صحن کتنا چھوٹا رہ گیا تھا اور در پچک کر کتنے پست اور چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ مگر صراف صاحب کہتے تھے کہ ہم نے سنر گھر میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ بس ضرورت کے حساب سے تھوڑی ترمیم اور تھوڑی لیپا پوتی کر لی ہے۔

صراف صاحب تو خیر ہوئے، مگر ان کی چھوٹی بٹیا کو دیکھو۔ وہ کتنی خوش ہے اور دوڑ دوڑ کے میرے لیے پوری کچوری لا رہی ہے۔ اس کے لیے تو واقعی یہ بات انوکھی ہونی چاہیے کہ دور دیس پاکستان سے ایک مسافر آیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں اس گھر میں پیدا ہوا تھا۔

تو لیجیے وہ بے چینی تو جاتی رہی کہ ہمارا گھر کہاں گیا۔ کتنی آسودگی کے ساتھ میں اس گھر سے نکلا۔ چار قدم چل کر اپنی مسجد آ گئی۔ سب کچھ اسی طرح تھا۔ بس وہ جو بڑا سا اور اونچا سا حوض یہاں تھا، وہ غائب

تھا۔ بھلا وہ کونسا موسم تھا جب اس حوض کے سبز رنگ پانی پر بھنبھیریاں منڈلاتی نظر آتی تھیں۔ کوئی بھی موسم ہو بہرحال بھنبھیری سے میرا تعارف اسی حوض پر ہوا تھا۔ حوض آنکھوں سے اوجھل ہوا تو بھنبھیری بھی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ حوض کہاں گیا۔ اس کا نشان اب کہاں ڈھونڈیں۔ یہ تو نصف صدی پہلے کا قصہ ہے۔ تو اس مسجد پر آدھی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ دن بیت چکے ہیں۔ اس دوران کتنا کچھ بدل گیا اور کیا کیا کچھ اس کے اردگرد سے غائب ہوگیا۔ اس کے سامنے جو بڑی حویلی اپنے لمبے چبوترے کے ساتھ کھڑی تھی، وہ کہاں گئی۔ مسجد کے بغل میں جو کھڑکی والا گھر تھا، وہ کدھر گیا۔ میں نے سوچا کہ گلیوں میں گھوم کر دیکھوں، کچھ تو بچا ہوگا۔ ہاں خانصاحبنی کا وہ دومنزلہ گھر بچا کھڑا تھا جہاں محرم میں کم اور چہلم کے دنوں میں زیادہ گہما گہمی ہوتی تھی۔ اس کی برجیاں، اس کی منڈیریں کتنی بلند و بالا تھیں، جب ہی تو بلندی میں اڑنے والے کبوتر جب تھک جاتے تو سانس لینے کے لیے ان منڈیروں پر اترتے تھے۔ لگتا تھا کہ اب جو یہ کبوتر اس منڈیر سے پھڑ پھڑا کر اڑے گا تو پھر آسمان ہی کے کسی کنگرے پر جا کر دم لے گا۔ لیکن اب یہ منڈیریں کھسک کر کتنی نیچے آ گئی تھیں۔ پورا مکان ہی جیسے کھسک کر نیچے آ گیا ہے۔ خیر بچا تو کھڑا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس میں تالا پڑا ہوا تھا۔

''کب سے یہ تالا پڑا ہے۔ یہاں کوئی رہتا نہیں ہے۔'' میرا خطاب اس بی ہمسائی سے تھا جو ایک پوری ٹولی کو اس تنگ گلی میں داخل ہوتے دیکھ کر اپنے گھر سے نکل آئی تھی۔

بولی ''بس محرم کے محرم کچھ لوگ یاں پہ آتے ہیں۔ محرم کے بعد پھر تالا پڑ جاوے ہے۔''

یہی داستان اس خستہ حال مکان کی تھی جو قیوما کی دوکان سے دو قدم کے فاصلہ پر کھڑا تھا۔ کتنی دیر کھڑا میں اس ویران مکان کی گرد آلود نیچے کھسکی ہوئی بالکنی کو دیکھتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ مجھے یاد آیا کہ ارے یہ تو انوار حسین، اصغر حسین کا مکان ہے۔ میں نے پلٹ کر اس دوکان کی طرف دیکھا جہاں سے ہمارے ساتھی سگریٹ خرید رہے تھے۔ دوکان سے متصل اور تھوڑا الگ ایک بڑے میاں کھڑے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ''اس گھر کے تو سارے مکین پاکستان جا چکے ہیں۔ یہاں اب کون رہتا ہے؟''

''کوئی نہیں۔'' وہ بولا۔ ''سال کے سال محرم کے دنوں میں ایک بڑے میاں یہاں آتے ہیں۔ محرم کر کے چلے جاتے ہیں۔''

جب ہم آگے بڑھے تو اصغر وجاہت نے بتایا کہ دوکان والے نے تو ہم سے سگریٹ کے پیسے ہی نہیں لیے۔ کہا کہ ابا جی نے منع کر دیا ہے کہ ان سے پیسے مت لینا۔ وہ ابا جی آگے کھڑے تھے۔ وہی جن سے آپ سوال جواب کر رہے تھے۔ نتھو خاں تھے وہ۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ہم سے پیسے کیوں نہیں لیے۔ بولے ''یہ ہمارے محلے کا لڑکا ہے۔ زمانے بعد یہاں آیا ہے۔ اس سے پیسے لینا اچھا نہیں لگ رہا۔''

نتھو خاں کا میں نے دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا اور پھر ہم آگے چل پڑے۔ اب ہمارا رخ چھوئیے کی طرف تھا۔ چھوئیا کیا۔ بس یہ ایک چھوٹا سا نالا تھا جو برسات میں امنڈ کر اچھی بھلی ندی بن جاتا تھا۔ گرمی

برسات میں ہمارے محلّے کے لڑکے بالے یہاں کس طرح امنڈ کر آتے تھے اور غوطے لگاتے تھے۔ میں بھی لپک کر یہاں آتا تو تھا، غوطہ کبھی نہیں لگایا۔ لیجیے وہاں تو اب ایک شاندار پل بن گیا ہے۔ صراف صاحب بھی اپنے سکوٹر پر اچھلتے کودتے یہاں آن پہنچے ہیں۔ بولے "یہ جو سامنے آپ کو آموں کا باغ نظر آ رہا ہے، سمجھ لیجیے کہ آپ ہی کا ہے۔ اسے بھی جھانکتے چلیے۔"

"آموں کا باغ اور اتنا گھنا۔" میں کھل اٹھا۔ "ہماری ڈبائی کی امریاں۔" میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

"پریم کمار جی، ہم جس راستے سے آئے ہیں اس راستے میں ایک اجاڑ مندر ہوا کرتا تھا جو چامنڈا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ واپسی میں مجھے اس مندر میں تھوڑا اچھا لگنا ہے۔"

پریم کمار نے فوراً حامی بھر لی۔ مگر جب واپسی میں انہوں نے لوگوں سے پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ وہاں تو اب اردگرد آبادی ہے، بازار ہے، دکانیں ہیں۔ وہیں کسی گلی میں وہ مندر ہے۔ میں حیران ہوا کہ اچھا وہ تو بہت اجاڑ جگہ تھی۔ جب ایک گلی میں مڑ کر اس مندر میں قدم رکھا تو حیرانی کے ساتھ ذہن کو ایک اور جھٹکا لگا۔ ارے وہ جو جادو بھری اجاڑ جگہ تھی، وہ کہاں گئی۔ یہ تو آباد مندر ہے۔ کس شدت کے ساتھ مجھے اپنے لڑکپن کے زمانے کی چامنڈا یاد آئی۔ اردگرد اجڑا اجڑا سا بیچ میں مندر کے نام پر بس ایک چہار دیواری۔ چھوٹی سی ایک چھت تلے ایک مورتی ایسی بدحال جیسے پجاری اسے یہاں رکھ کر بھول گئے ہیں۔ یہاں نہ کبھی سنکھ بجتا دیکھا گیا، نہ کبھی کوئی پجاری نظر آیا۔ کوئی زندہ مخلوق یہاں نظر آتی تھی تو وہ بندر تھے جو یہاں کھڑے اس گھنے پیپل پر کودتے رہتے تھے جس نے پوری چھت پر سایہ کر رکھا تھا۔ جب ہی تو ہم کھڑی دوپہریوں میں دور دور تک مارکر کے تھکے ہارے اس چھت پر آ کر دم لیتے تھے۔ گھنی چھاؤں، ٹھنڈی ہوا۔۔۔۔ جی خوش ہو جاتا تھا۔ ہاں بندروں سے ناراضگی مول لینی پڑتی تھی۔ مگر جب ان کی خوخو سے ہم خوفزدہ نہیں ہوتے تھے بلکہ اینٹیں لے کر مقابلہ کے لیے تیار ہو جاتے تو پھر وہ بھی ہار کر چپ ہو جاتے۔ کتنا جادو تھا اس اجاڑ مندر میں۔ کبھی کبھی لگتا تھا کہ جس چڑیل کو دیکھ کر ہم بھاگ کھڑے ہوئے تھے، وہ ہمارے پیچھے یہاں آ پہنچی ہے اور یہیں کہیں چھپی ہوئی ہے۔ وہ سارا جادو کہاں گیا۔ اجاڑ پن کا بھی تو اپنا ایک جادو ہوتا ہے۔ اس جادو کو چامنڈا نے کہاں گم کر دیا۔ اب تو یہاں گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ سنکھ پھونکا جا رہا ہے۔ پجاری اشلوک پڑھ رہے ہیں، کھڑتالیں بجا رہے ہیں۔ بڑے پجاری جی کو پتہ چل گیا کہ پاکستان سے ایک یاتری آیا ہے اور یہاں گھوم پھر رہا ہے۔ وہ کچھ دیر شک بھری نظروں سے میری نقل و حرکت دیکھتے رہے۔ پھر قریب آئے اور بولے "آپ کو اس مندر سے کیا دلچسپی ہے۔ کیوں آئے ہیں یہاں؟"

میں نے کہا "پنڈت جی، یہ بات میں آپ کو سمجھا نہیں سکوں گا۔ میں اپنی طرف سے کوشش بھی کروں تو آپ سمجھ نہیں پائیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے انہیں ڈنڈوت کی اور باہر نکل آیا۔

اوراب چلتے ہیں ذرا کربلا کی طرف۔ میں نے اپنے خوابوں میں کتنی مرتبہ سوچا کہ یہاں آئے ہیں تو کربلا کا بھی ایک پھیرا لگا لیا جائے مگر ہر مرتبہ یہی ہوا کہ رستہ ختم ہونے میں نہیں آیا اور آنکھ کھل گئی۔ ایک مرتبہ تو اتنی قریب پہنچ گیا تھا کہ آہنی گیٹ کی کاہی آلود برجیاں نظر آنے لگی تھیں۔ پھر وہی ہوا کہ پٹ سے آنکھ کھل گئی۔ مگر اس وقت میں کھلی آنکھوں کے ساتھ کربلا کی طرف جا رہا تھا۔ ہماری ڈبائی کی کربلا۔ ایک وسیع وعریض اجڑا اجڑا میدان۔ اس کے گرداگرد سرخ اینٹوں کی فصیل کھنچی ہوئی۔ اونچا آہنی گیٹ۔ دائیں بائیں بلند وبالا کاہی آلود برجیاں۔ محرم کے دنوں کے سوا خاموشی کا مستقل پہرہ، گیٹ مقفل، اندر باہر آدمی نہ آدم زاد۔ باغوں میں گھومتے پھرتے، کھیتوں کو کھوندتے ہم خاموش دوپہروں میں جب یہاں پہنچتے تو اچانک ایک رعب ہم پر طاری ہو جاتا۔ لگتا کہ اپنی بستی سے دور کہیں صحرائے کربلا کے آس پاس نکل آئے ہیں۔ ڈرتے ڈرتے آہنی دروازے کی سلاخوں کے بیچ سے دیکھنے کی کوشش کرتے کہ اندر کیا ہے۔ دھوپ میں تپتا وہ اجڑا اجڑا میدان سچ مچ کربلا نظر آنے لگتا اور اب میں اسی آہنی دروازے سے جڑا کھڑا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ وہ دوپہروں کا سناٹا، وہ خاموشی کا پہرہ یہاں سے کیسے رخصت ہو گیا۔ یہ اردگرد جھونپڑیاں، کچے مکان کب بنے۔ وہ کربلا کے متصل جوالی کے پیڑ ایک دوسرے میں گتھے کھڑے تھے، وہ کہاں گئے۔ ان پر اترتی طوطوں کی ڈاریں یہاں سے اڑ کر کس طرف نکل گئیں اور یہ کس بدمذاق منتظم نے اس سرخ فصیل پر اور ان کاہی سے لبسی برجیوں پر سفیدی پھروادی ہے۔

ꕤ........ꕤ........ꕤ

جڑوں کے سراغ میں

آخر کے تئیں میں نے اپنی گمشدہ بستی کو پالیا۔ زمانے کی گردش نے اس کی تو شکل وصورت ہی بدل ڈالی تھی۔ نہ وہ دیوار کی صورت نہ وہ در کی صورت۔ مگر پھر بھی کوئی در، کوئی کوئی دیوار اسی طرح کھڑی تھی اور میں جیسے صدی بعد نہیں صدیوں بعد زمانے کے تھپیڑے کھاتا گرتا پڑتا وہاں کسی نہ کسی طور آن پہنچا ہوں۔ زمانے کی گرد بہت پڑ گئی تھی۔ پھر بھی میں نے پہچان لیا ہے۔ یہ جو کوئی کوئی در کھڑا رہ گیا ہے اور کوئی کوئی ٹھیا جیسا چھوڑ کر گیا تھا ویسا ہی قائم ہے اس کے طفیل اب میرے لیے کتنا آسان ہو گیا ہے کہ یہاں سے زقند لگاؤں اور ان گلیوں، بازاروں میں پہنچ جاؤں جہاں میں نے کتنی خاک اڑائی تھی اور پھر جلدی سے آگے بڑھ کر اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاؤں۔

بس بیچ میں ایک ہی رکاوٹ ہے۔ میری بیتی دہائیوں کے خواب۔ چھوڑی ہوئی بستی کا خوابوں میں آکر درشن دینا۔ کبھی ڈرانا کبھی رجھانا۔ جیسے بہت خوش ہوں کہ لو میں تو اتنے دنوں بعد لوٹ کے آیا ہوں۔ ارے سب کچھ ویسا ہی ہے۔ چھوٹی بزریا میں کتنی بھیڑ ہے۔ اتنی ہی جتنی ہوا کرتی تھی اور یہاں سے اپنا گھر زیادہ دور تو نہیں ہے۔ دو قلانچیں بھروں گا اور وہاں پہنچ جاؤں گا۔ یہ بین کی آواز کدھر سے آرہی ہے۔ آگے بڑھتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ لوگوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ جیسے کوئی تماشا ہو رہا ہو۔ تو یہ سب تماشبین ہیں۔ میں بھی اس بھیڑ میں جا گھستا ہوں۔ ارے یہ تو سپیرا اپنی پٹاری لیے بیچ میں بیٹھا ہے اور بین بجا رہا ہے۔ دھیرے سے پٹاری کھولتا ہے۔ ایک دم سے دو ناگ پھن پھیلا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُف اللہ کتنے کالے ہیں۔ بالکل کالے بھجنگ اور کیسی پھنکاریں مار رہے ہیں۔ کچھ ڈر، کچھ کشش، میں جما کھڑا ہوں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مجمع میں ایک گھگنا لڑکا بڑی بڑی آنکھیں، مجھے گھور کے دیکھ رہا ہے۔ میں سٹپٹا کر اس کی طرف سے نظریں پھیر لیتا ہوں۔ لہراتے سانپوں کو دیکھ رہا ہوں مگر پھر کنکھیوں سے اس طرف دیکھتا ہوں۔ وہ تو مجھے بدستور گھورے چلا جا رہا ہے۔ اس نے مجھے پہچان تو نہیں لیا۔ اچانک نظر سامنے والی عمارت کی طرف جاتی ہے۔ ارے یہ تو تھانہ ہے۔ یہ تو تھانے والا چوک ہے۔ اب مجھے کچھ اور احساس ہوتا ہے۔ اور وہ لڑکا مجھے اب بھی تک رہا ہے۔ اگر اس نے جا کے کہہ دیا تو...... یہ کمبخت سپاہی اور میرے پاس تو پاسپورٹ بھی نہیں ہے۔ میں جلدی سے مجمع کے

بیچ سے سٹک جاتا ہوں۔ مجھے جلدی سے یہاں سے نکل لینا چاہیے۔ کوئی مجھے بھانپ نہ لے۔ مڑ مڑ کر دیکھ رہا ہوں۔ وہ میرے پیچھے تو نہیں آ رہا۔ یہ رستہ اتنا لمبا کیوں ہو گیا۔ بستی سے جلدی نکل جاؤں۔ اور تیز چلتا ہوں۔ بس اسی میں آنکھ کھل جاتی ہے۔ کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔ یہ کیسا خواب تھا۔

جیسے رات کا سناٹا۔ نال والی گلی سے گزر رہا ہوں۔ اندھیرا...... مگر کچھ مکانوں کے دریچوں سے نیلی روشنی چھن چھن کر آ رہی ہے۔ اس دریچے سے کوئی جھانک رہا ہے۔ کس کا گھر ہے یہ۔ کون ہے یہ۔ میں جلدی سے اگلی گلی میں مڑ جاتا ہوں۔ یہ تو پھر نال آ گئی۔ اس وقت کون لکڑیاں چیر رہا ہے، بس پٹ سے آنکھ کھل جاتی ہے۔

اور جیسے میں سوچ رہا ہوں کہ جلدی سے بزریا سے نکلوں اور کربلا والے رستے پہ ہولوں مگر کربلا آ کیوں نہیں رہی۔ کتنی دور ہے۔ جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں اور ڈر رہا ہوں کہ کربلا آنے سے پہلے کہیں آنکھ نہ کھل جائے۔ جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوں۔ کتنی دور ہے کربلا۔ اچانک مینار نظر آتے ہیں۔ حیران، کربلا کے مینار اتنے اونچے تو نہیں تھے۔ اس کا آہنی دروازہ، وہ کدھر ہے۔ قدم بڑھاتا ہوں۔ اے لو، پھر آنکھ کھل گئی۔

ہاں، اور وہ کیا خواب تھا۔ سیڑھیاں ہی سیڑھیاں کتنے لوگ نیچے اتر رہے تھے۔ میں اوپر چڑھتا چلا جا رہا ہوں۔ موڑ آتا ہے، چھت دکھائی دیتی ہے مگر پھر سیڑھیاں۔ میں پھر چڑھنے لگتا ہوں۔ بس پھر اچانک جیسے میں چھت پہ کھڑا ہوں۔ سیڑھیاں غائب۔ نیچے دیکھتا ہوں۔ ایک اجنبی مکان کا صحن نظر آ رہا ہے۔ مگر اترنے کے لیے سیڑھیاں نہیں ہیں۔ ہاں تھوڑا نیچے ایک منڈیر۔ سایہ پہنے ہوئے ایک لڑکی میرے برابر سے گزر کر اس منڈیر پر اتر گئی۔ میں بھی اتر گیا۔ پھر جیسے میں گلی میں کھڑا ہوں۔ گلی سنسان۔ یا اللہ، یہ کونسی گلی ہے۔ یہاں سے ہمارا گھر کدھر ہے۔ ارے یہاں سے تو نکلوں۔ جلدی جلدی چل رہا ہوں۔ چاروں طرف سناٹا۔ نہ آدمی نہ آدم زاد۔ میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ دور سبزہ زار میں بینڈ بج رہا ہے۔ بہت سے لوگ اردگرد کھڑے ہیں۔ میں بھی ان میں گھس کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اب جو دیکھتا ہوں تو برابر میں پولیس والی وردی میں ایک شخص کھڑا ہے اور اب مجھے یاد آتا ہے کہ میرے پاس تو پاسپورٹ بھی نہیں ہے۔ اس کے برابر سے چپکے سے گزر کر باہر آ جاتا ہوں۔ دل دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔ تیز تیز دھڑک رہا ہے۔ کہیں وہ پیچھے تو نہیں آ رہا۔ ایک گلی سے دوسری گلی میں۔ دوسری گلی سے تیسری گلی میں۔ یہ کونسی گلیاں ہیں۔ ہماری گلی کدھر ہے۔ ارے وہ رہی ہماری گلی اور وہ رہا ہمارا گھر۔ میں لپک کر چلتا ہوں۔ برابر میں ایک کتا اس زور سے بھونکا کہ بس میری آنکھ کھل گئی۔

ڈبائی آ گئی۔ کسی نے کہا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ ہوں۔ ہوں۔ روکو اور لاری رک جاتی ہے۔ میں ہبڑ دبڑ اترتا ہوں۔ مگر یہ کونسی جگہ ہے۔ آگے اجاڑ میدان۔ پھر دور ایک بوسیدہ عمارت نظر آتی ہے اور اچانک میں چونکتا ہوں۔ ارے یہ تو پرانا قلعہ ہے۔ یہاں سے بہت دور تک پیدل چلنا پڑے گا۔ کمبخت لاری والے نے کہاں اتار دیا۔ پھر جیسے آندھی آ رہی ہو۔ اڑتی ہوئی گرد۔ ساری فضا زرد زرد۔ آگے جیسے شفیقا چاچا جا رہے ہوں۔ ہاں وہی ہیں۔ وہی اپنی لاٹھی کے ساتھ کتنے تیز تیز جا رہے ہیں۔ میں لپک کر چلتا ہوں۔ بتا

دوں کہ میں آ گیا ہوں کہ پھر جیسے آندھی کا جھکڑ۔ کچھ نظر نہیں آ رہا۔ کہاں گئے شفیقا چاچا۔ اور پرانا قلعہ کہاں گیا۔ میں حیران ہو رہا ہوں۔ ارے یہ تو شفا خانہ آ گیا۔ یہ تو میں الٹا چل پڑا۔ یہ سڑک تو سٹیشن کی طرف جا رہی ہے۔ میں پلٹ کر چلنا شروع کرتا ہوں۔ اچھا یہ تو تالاب ہے۔ اس سے آگے گھیٹھروں والی گلی آئے گی۔ بس پھر وہاں سے نکلوں گا تو گھر آ جائے گا۔ تیز تیز چلتا ہوں۔ برابر میں ایک گھر کا دروازہ کھلتا ہے۔ ایک ڈری ہوئی آواز "بندر" اور دروازہ دھاڑ سے بند ہو جاتا ہے۔ ارے واقعی یہاں گلی میں تو بندر ہی بندر نظر آ رہے ہیں۔ مارے گئے۔ پلٹنے لگتا ہوں کہ آنکھ کھل جاتی ہے۔

عجب خواب تھے۔ تھے نہیں بلکہ تھا۔ وہ ایک ہی خواب تھا کہ بھیس بدل بدل کر میرے خوابوں میں آ رہا تھا۔ سمجھنا چاہو تو یوں سمجھو کہ ان خوابوں نے یا اس خواب نے ان دنوں میں جا کر رنگ پکڑا جب میں لاہور شہر میں رچ بس چکا تھا اور چھوڑی ہوئی بستی خواب و خیال بن چکی تھی۔ ناصر کاظمی کے ساتھ جو شب و روز بسر ہوئے یہ ان کا فیض تھا۔ ان دنوں ناصر کے ساتھ نہیں یاروں کی پوری منڈلی کے ساتھ اس شہر میں اتنا گھوما پھرا۔ گلی گلی کوچہ کوچہ سڑک سڑک، سمجھ بیٹھا کہ ناصر کے ساتھ میں بھی اس شہر کا روڑا بن چکا ہوں۔ سو اب اپنی چھوڑی ہوئی بستی کی گلیاں کوچے بھی کم کم ہی یاد آتے تھے مگر خوابوں میں تو وہ اب زیادہ ہی آنے لگے تھے۔ شاید انہوں نے مجھے لاہور کے گلی کوچوں میں رچتا بستا دیکھ کر میرے بیدار شعور سے پسپا ہو کر میرے خوابوں میں پناہ لے لی تھی۔ شاید میرے اندر وہ چھپ کر بیٹھ گئے تھے اور مجھے نیند میں غافل پا کر مجھے یاد دلانے آتے تھے کہ نیا یار، نئے کوچے برحق مگر ہم بھی یہیں کہیں تمہاری یادوں میں شاد آباد ہیں۔

وہ راتیں بھی خوب تھیں۔ گھومتے پھرتے رات زیادہ ہو جاتی تو کوئی کوئی یہ سوچ کر کہ گھر دور ہے، ہمارا رات کے کسی ہمسفر کے ہمراہ اس کے گھر جا پسارتا۔ کسی ایسی ہی ایک شبھ گھڑی میں غالب احمد میرے ٹھکانے پر آ گیا۔ تنہائی میں دل کی باتیں کہنے کا موقع ملا تو میں نے یہ سوچ کر کہ غالب کا مضمون نفسیات ہے، اسے اپنے خوابوں کی نوعیت بتائی۔ سوچا کہ وہ اس کی معنویت پر کچھ روشنی ڈالے گا مگر اس نے کچھ اور ہی بات کی۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے ایک سوال کر ڈالا۔ "تم نے کافکا کا ناول Castle پڑھا ہے۔"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس میں نے اس کا ایک ہی ناول پڑھا ہے Trial اور کچھ کہانیاں۔"

"اس ناول کو بھی پڑھ لو۔"

میں نے اس مشورے کی وضاحت چاہی۔ جواب دیا۔ "بس تم یہ ناول پڑھ لو۔"

رات گئی بات گئی۔ کتنی باتیں ہم ان راتوں میں کتنی سنجیدگی سے کرتے تھے اور صبح ہوتے ہوتے بھول جاتے تھے۔ سو یہ بات بھی آئی گئی ہو گئی۔ پھر اور اور باتیں اور اور قصے۔ دور دور تک جانا، دور دور کے چائے خانوں میں جا کر بیٹھنا اور نئے گرد و پیش میں چائے کو ایک نئے لطف کے ساتھ پینا۔ پھر پھر کر پھر ٹی ہاؤس آ جانا۔ ہم میں سے کچھ یاروں کا ایک طور یہ بھی تھا کہ ٹی ہاؤس کے سامنے برٹش کونسل میں جا کر اس کی

لائبریری سے فیض یاب ہونا۔ بالکل سامنے ہی تو برٹش کونسل لائبریری تھی۔ پھر کسی نے بتایا کہ ارے یہاں نیلا گنبد میں جرمن سنٹر کھلا ہے۔ ایک دن یوں ہی ٹی ہاؤس سے اٹھ کر میں اس طرف ہولیا۔ کتنا ٹھنڈا اور پرسکون گوشہ تھا۔ اردگرد جرمن ادب کی جلدیں آراستہ۔ انہیں میں معروف ناول نگاروں کے مجموعے بھی دکھائی دیئے۔ انہیں کریدتے کریدتے ایک ناول نظر آیا Castle۔ ارے یہ تو وہی ناول ہے جو مجھے اب تک پڑھ لینا چاہیے تھا۔ سو ایک ڈیڑھ دوپہر میں نے وہاں بیٹھ کر یہ ناول پڑھ ڈالا مگر حیران کہ یہ میں ناول پڑھ رہا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں۔ ارے، یہ تو میں خود اپنے خوابوں کے بیچ بھٹک رہا ہوں۔

بس میرے خوابوں میں ایک اور عجیب سے خواب کا اضافہ ہوگیا اور پھر یہ بھی عجب ہوا کہ اس کے بعد بہت دنوں تک مجھے کوئی خواب ہی دکھائی نہیں دیا۔ اے میرے خوابو، میری نیندوں کو آباد رکھنے والو، میری نیندوں میں آ کر مجھے ڈرانے اور رجھانے والو، تم کہاں جا چھپے۔

اب یاد نہیں کہ آگے چل کر کبھی ان خوابوں نے یا اس خواب نے پھر جھلک دکھائی تھی۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ 70ء میں جب مشرقی پاکستان سے پریشان کن خبریں آنی شروع ہوئی تھیں تو میری نیندیں خالی نیندیں نہیں رہی تھیں۔ میرے خواب واپس آ گئے تھے۔ اب کے ذرا چولا بدل کر واپس آئے تھے۔

وہ رمضان کے دن تھے۔ جوں جوں روزے گذر رہے تھے، مشرقی پاکستان سے آنے والی خبریں زیادہ تشویشناک ہوتی جا رہی تھیں۔ افطار پارٹیوں میں ایسی پارٹیاں بھی تو ہوتی تھیں جہاں میں بحیثیت کالم نگار مدعو ہوتا تھا۔ ایسی ہی کسی پارٹی میں جا پہنچا۔ افطار میں ابھی دیر تھی، مہمان خصوصی کا انتظار تھا۔ یہ مہمان خصوصی کوئی وزیر تھے۔ تو جب تک وہ آئیں اور ساتھ میں افطار کا مبارک لمحہ آئے، ہم آپس میں باتیں کرکے وقت گزار رہے تھے۔ میرے برابر نثار عثمانی بیٹھے تھے۔ وہی نثار عثمانی جن کی اخباری رپورٹنگ سے تنگ آ کر جنرل ضیاء الحق نے کہا تھا کہ "عثمانی صاحب، آپ اپنا قبلہ درست کر لیجیے۔" اور انہوں نے بے ساختہ جواب دیا "میرا قبلہ تو درست ہے، آپ اپنے قبلہ کی سمت دیکھ لیجیے۔" تو ہاں عثمانی صاحب میرے برابر بیٹھے تھے۔ باتیں کرتے کرتے اچانک بولے "انتظار صاحب، ان دنوں آپ نے کوئی خواب دیکھا ہے؟"

میں چکرایا کہ یہ کیسا سوال ہے۔ اور آخر عثمانی صاحب صحافی ہی ہیں، کوئی صوفی بزرگ تو نہیں ہیں کہ میرے دل کا حال اور میرے خوابوں کا احوال ان پر روشن ہو۔ میں نے تامل کیا۔ پھر کہا "ہاں دیکھا ہے۔" پھر رک کر میں نے پوچھا "کیا آپ نے کوئی خواب دیکھا ہے؟"

"ہاں میں نے بھی ایک خواب دیکھا ہے۔"

"کیا؟"

"پہلے آپ اپنا خواب سنائیں۔"

پہلے تو میں چکنم میں پڑ گیا کہ سناؤں یا نہ سناؤں۔ یہ افطار پارٹی ہے۔ میں روزہ دار ہوں یا نہیں

بہر حال روزے کا احترام کرنے والوں کے بیچ بیٹھا ہوں۔ یہاں خواب سنانا شروع کر دوں۔ بھلا اس بات کی کوئی تک ہے مگر میں اقرار کرکے پھنس گیا تھا۔ تھوڑے تامل کے بعد شروع ہو گیا۔ "ویسے تو میں پہلے ایسے خواب دیکھتا رہا ہوں کہ جیسے میں اپنی بستی میں گیا ہوں اور اپنا گھر تلاش کر رہا ہوں۔ پھر جیسے اچانک کسی خوف نے آ لیا ہو کہ میرے پاس پاسپورٹ نہیں ہے۔ پکڑا تو نہیں جاؤں گا اور پلٹ پڑتا ہوں۔"

"ہاں میں سمجھ گیا۔ اب جو آپ نے خواب دیکھا ہے، وہ ذرا بیان کیجیے۔"

"اب بالکل الٹ نقشہ تھا۔ جیسے میں اطمینان سے اپنے گھر گیا ہوں۔ ہمارے گھر میں جو ایک بڑا کمرہ تھا اور جس میں ہمارے والد کا بستر بچھا رہتا تھا اور برابر میں بڑا سا تخت، وہاں میں اسی جگہ بچھے پلنگ پر اپنا بستر کھول رہا ہوں اور دل میں کہہ رہا ہوں کہ یہ کمرہ ٹھیک ہے۔ یہاں رہوں گا۔"

خواب کو مختصر سنا کر میں چپ ہو گیا۔ عثمانی صاحب تھوڑی دیر چپ رہے۔ پھر بولے "میں نے یہ خواب دیکھا کہ میں دلی واپس گیا ہوں۔ اپنے گھر میں ہوں۔ وہاں عزیز رشتہ دار جمع ہیں۔ ان سے مل کر رو رہا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ میں آ گیا ہوں۔"

میں یہ خواب سن کر تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر کہا کہ "یہ تو میرے خواب سے ملتا جلتا خواب ہے۔" رک کر بولا "ان خوابوں کی تعبیر آپ کی سمجھ میں آتی ہے۔"

بولے "تعبیر کوئی اچھی نہیں ہے۔ دیکھ نہیں رہے مشرقی پاکستان سے کیسی خبریں آ رہی ہیں۔ انتظار صاحب، پاکستان ٹوٹ رہا ہے۔ بری گھڑی آنے والی ہے۔"

اس کے بعد وہ بھی چپ، میں بھی چپ۔ خیر یہ چپ لمبی نہیں کھنچی۔ مہمانِ خصوصی آن پہنچے تھے اور افطار کا وقت بھی ہو چلا تھا۔

اور ہاں میرے خوابوں ہی کی تجدید نہیں ہوئی، میرا حافظہ بھی پھر سے جاگ اٹھا تھا۔ ارے میں نے تو جب اپنا ناولٹ "دن" لکھ لیا تو جانا کہ گمشدہ بستی کے نام میری یادوں پر آخری خط کھنچ گیا۔ پھر ادر اور طرف دھیان گیا۔ اور اور رنگ کی کہانی لکھی۔ "آخری آدمی"، "زرد کتا"، "کایا کلپ"، "پرچھائیں"، "ہمسفر"......

بھلا ان کہانیوں کا اس راگ سے جسے یاروں نے روگ بتایا تھا اور نوسٹلجیا سے تعبیر کیا تھا، کیا تعلق تھا۔ مگر پتہ چلا کہ مرض دب گیا تھا، گیا نہیں تھا۔

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

یادوں کا ناسور پھر ابل پڑا۔ بھلا یہ کونسا وقت تھا بیتے لمحوں کو یاد کرنے کا۔ مگر یادیں کسی منطق کو نہیں مانتیں یا شاید یادوں کی اپنی منطق ہوتی ہے اور حافظہ اپنے حساب سے کام کرتا ہے۔ سو مشرقی پاکستان کی قیامت کے بیچ یہ نرالا گل کھلا کہ میری یادوں کا دفتر کھل گیا اور یہ سوچ کر کہ چڑھا دریا کہیں جلدی اتر ہی نہ

جائے، میں نے قلم کاغذ سنبھالا اور جو یاد آتا گیا قلمبند کرتا گیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ قلم چلتے چلتے ناول کی روش پہ جا نکلے گا۔ تو اس طرح ''بستی'' نام والے ناول کا ڈول پڑا۔

ارے لو میں کدھر نکل گیا۔ میں تو اصل میں اپنے خوابوں سے نبٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انہوں نے رستہ جو روک رکھا تھا۔ اے مرے خوابو! اب میں اپنی بستی تک پہنچنے کے لیے تمہارا مرہون منت نہیں ہوں اور اب مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تم نے جو میری بستی کا روپ دکھایا تھا، اس میں حقیقت کم اور خواب کا رنگ زیادہ تھا۔

اصل میں اب میرے سامنے اپنی بستی کے تین روپ تھے۔ ایک روپ وہ جو خوابوں کے راستے مجھ تک پہنچا۔ ایک وہ روپ جو اب حقیقت میں ہے اور ایک وہ روپ جسے میں نے برتا تھا، اصل میں تو اسی روپ کی تلاش میں علی گڑھ سے پریم کمار کو ساتھ لے کر ڈبائی پہنچا تھا۔ میں نے دو پھیرے لگا کر آج کی ڈبائی میں سے گزری ہوئی ڈبائی کا رستہ ڈھونڈ نکالا ہے اور اب جو تیسرا پھیرا کر رہا ہوں اس سے یہ رستہ اور روشن ہو جائے گا۔

آ گیا۔ علی گڑھ آ گیا۔ اور علی گڑھ آنے کا مطلب یہ ہے کہ اب میں ڈبائی سے گز بھر کے فاصلہ پر کھڑا ہوں۔ ایک چھلانگ لگاؤں گا اور وہاں پہنچ جاؤں گا اور اس مرتبہ پھر وہی ہوا جو علی گڑھ کے ہر پھیرے میں ہوتا آیا تھا۔ جب صبح ہی صبح یونیورسٹی کے مہمان خانے سے نکل کر باہر کی فضا کو سونگھا تو وہی بو باس اپنی بستی والی اور وہی آوازیں، وہی چہکار جو دل و دماغ میں گونجتی رہتی ہے۔ سارے وہ پرندے کیمپس کے درختوں پر پھدک رہے تھے اور سبزہ زاروں میں اترے ہوئے تھے جو ہماری کربلا کے آس پاس درختوں کے جھنڈ میں اور باغوں اور کھیتوں میں اڑتے پھرتے تھے۔ ارے وہ سب ہی اڑ کر ادھر آ گئے ہیں۔ یہ ان کا روز کا معمول ہے یا آج بس میری ٹوہ لینے آئے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ علی گڑھ میں آ کر کیوں پسر گئے، ڈبائی نہیں چلو گے۔ چلوں گا۔ یہاں دوستوں اور بزرگوں سے تو مل لوں اور سرسید کے دیار کی رونق بھی تھوڑی دیکھ لوں۔ ابوالکلام قاسمی ہیں۔ قاضی افضال ہیں۔ اور ہاں طارق چھتاری شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں اور کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان کے نام کو جو چھتاری سے نسبت ہے اس سے مجھے مرحوم نواب چھتاری کی مونچھیں یاد آ جاتی ہیں۔ وہ جو کبھی کبھی ان کی تصویر اخبار میں آ جاتی تھی، اس سے لگتا تھا کہ اس شخصیت کے نام مونچھیں ہی مونچھیں ہیں۔ ادھر پاکستان میں نواب کالا باغ کی جو مونچھیں تھیں، ان سے بڑھ کر وہ مونچھیں تھیں۔ ہاں اور شہریار۔ میں انہیں کے تو ہاتھوں میں ہوں۔ انہوں نے خوب تجویز پیش کی کہ یہاں علی گڑھ میں خلیب الرحمٰن صاحب کے بھانجے علیم صاحب ہیں۔ ان کی ہمراہی میں جاؤ تو یہ سفر زیادہ بامعنی بن جائے گا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اور سچ مچ علیم صاحب میرے لیے دو آنکھیں بن گئے۔ ہمارے محلّے کے اس گوشے میں لے گئے جہاں ان کا اپنا گھر تھا۔ سمجھ لیجیے کہ جہاں کرامت منزل تھی۔ ارے کرامت منزل اور اس کا گرد و پیش تو جوں کا توں ہے۔ وہ بتاتے

جاتے تھے، میں پہچانتا جاتا تھا۔ یہ ممن صاحب کی کوٹھی ہے۔ ہاں پہچان گیا۔ یہ تو وہی ممن صاحب کی کوٹھی ہے جہاں محرم میں روز کی ایک مجلس بندھی ہوئی تھی۔ اور وہ رہا لالا گڑھیا کا امام باڑہ۔ سمجھ گیا۔ یہاں محرم میں رات کو مجلس ہوا کرتی تھی۔ اور یہ سامنے عابد حسین کا مکان، بک گیا ہے۔ کسی ہندو نے خریدا ہے۔ اسے بھی پہچان لیا۔ ارے یہ تو اسی طریقہ سے کھڑا ہے اور کرامت منزل' وہ بھی اسی طرح ہے۔ اسی خاندان کے جو دو ڈھائی دوسرے گھر ہیں یعنی کرامت حسین والوں کے۔ وہ بھی ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ اپنے گھر لے گئے۔ ایک بوڑھی بی بی بیٹھی نظر آئیں۔ میں دور بیٹھا انہیں دیکھا کیا۔ شاید پہچان لوں۔ ارے کیسے پہچانتا۔ اتنا زمانہ گزر گیا اور پھر میں نے اس گھرانے کی بیبیوں کو کہاں دیکھا تھا۔ اب کا زمانہ تھوڑا ہی تھا کہ ہمارے آپ کے خاندانوں کی بیبیاں کھلی ڈلی پھرتی ہیں۔ نہ برقع نہ حجاب نہ نقاب، نہ گھونگھٹ۔ پھر میں قریب گیا۔ سلام کیا اور عرض کیا کہ آپ میرے نام سے تو مجھے نہیں پہچانیں گی لیکن اگر اپنے والد صاحب کا نام بتاؤں تو شاید پہچان لیں۔ میں نے نام لیا اور فوراً چونک کر بولیں "اچھا اچھا وہ دو بھائی منظر علی اور نذر حسین۔ ہم انہیں منظر ماما اور نذر ماما کہا کرتے تھے۔ یہی بتایا گیا تھا ہمیں کہ یہ تمہارے دور کے رشتے سے ماموں ہیں۔" پھر شاید انہیں خیال آیا ہو کہ وہ تو شیعہ تھے اور ہم اہل سنت ہیں۔ فوراً ٹکڑا لگایا۔ "ارے کمبختوں نے اب یہ سنی شیعہ کا فضیتا کھڑا کر دیا ہے۔ پہلے ایسا کب تھا۔ ہمارے خاندان اکٹھے تھے۔ کوئی سنی کوئی شیعہ، کوئی تفریق ہی نہیں تھی۔"

اور پھر مجھے اچانک یاد آیا کہ ارے یہ تو وہی بی بی ہیں۔ ان سے تو میں مل چکا ہوں۔ بھلا کہاں ملا تھا۔ منیب الرحمٰن کی نظم میں۔ مگر یہ میں زقند لگا کر کہاں آن پہنچا۔ یہ سب تو مجھے آگے چل کر بیان کرنا ہے اے لو کب کی ایک اور بات دھیان میں آ گئی۔

ابھی چند برس پہلے اسی گھرانے کے ایک بزرگ کہ اب کراچی میں رہتے ہیں، میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ تشریف آوری کا مقصد یہ کھلا کہ خاندان کے شجرۂ نسب کی تکمیل کے سلسلہ میں انہیں میرے مرحوم والد منظر علی کے خاندان کی تفصیلات مطلوب ہیں۔

میں نے بتایا کہ پانچ بہنیں اور ایک بھائی۔ یہ کل خاندان ہے۔ چار بہنیں کہ مجھ سے بڑی تھیں، اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ایک بہن کہ مجھ سے چھوٹی ہے اور ابھی تک بقید حیات ہے۔

باتوں باتوں میں کہا کہ ہم لوگ سید ہیں۔ اس پر میں چونکا۔ عرض کیا کہ میرے والد نے اپنے نام کے ساتھ کبھی سید نہیں لکھا۔ میں بھی نہیں لکھتا۔ بولے کہ اس وقت ہمارا شجرۂ نسب ہماری دسترس میں نہیں تھا۔ اب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم سید ہیں۔ میں اس وقت تو چپ رہا لیکن جب انہوں نے چند سال بعد خاندان کے سلسلہ میں مزید وضاحت کی غرض سے خاندان کے دو نو جوانوں کو بھیجا اور انہوں نے سادات ہونے کا دعویٰ کیا تو میں نے جھرجھری لی اور لینی ہی تھی۔ اگر میرے والد نے سید ہونے کے دعوے سے احتراز کیا تو میرے لیے یہ دعویٰ کرنے کی گنجائش پیدا ہو گئی کہ میں اسی برصغیر کی مٹی ہوں یعنی کہ ہندآریائی ہوں۔ ارے جب ہم

سادات نہیں ہیں تو کسی دوسرے عرب قبیلہ سے بھی رشتہ کیوں جوڑیں اور خاندان رسالت کو بیچ میں سے نکال دیں تو پھر عربوں میں کون سے لعل ٹنکے ہوئے ہیں کہ ہم اڑے ترچھے راستوں سے ان سے رشتہ جوڑنے کا جتن کریں مگر ان نوجوانوں کو اصرار تھا کہ ہمارا شجرۂ نسب یہ کہتا ہے تو پھر ہم کیوں یہ دعویٰ نہ کریں۔ میں نے پوچھا، اچھا یہ بات ہے تو یہ بتایئے کہ شجرۂ نسب ہمیں کس امام کی اولاد بتاتا ہے۔ بولے "ہم سیدنا حضرت امام حسین کی اولاد ہیں۔" تب میں ٹھٹھکا۔ ارے یہ تو خاک مدینہ و نجف میں کربلا کی خاک بھی آن ملی۔ اب میں کیسے انکار کروں اور یہ میرے سنّی عزیز حسینی ہونے پر مُصر ہیں تو میں کس خوشی میں پہلو بچا رہا ہوں۔

سوا ے دوستو، میں نے عالی نسبی کا کوئی دعویٰ نہیں کیا مگر میرے اہل خاندان شجرہ لیے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ کربلا کی خاک سے بہنے والے خون سے جو چھینٹے اڑے، انہیں میں سے ایک چھینٹا ہم بھی ہیں۔

اصل میں ہمارا خاندان چتکبرا ہے۔ چتکبرا بھی ایسا کہ ایک رنگ کچھ زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ شیعہ تو بس آٹے میں نمک کی نسبت سے بلکہ نمک اس سے بھی کم۔ باقی سب اہل سنت۔ یہ میں والد کی طرف سے جو ہمارا خاندان ہے، اس کا ذکر کر رہا ہوں۔ والدہ کی طرف سے سب یک رنگ تھے یعنی خالص مولائی۔ مگر میں ذکر کر رہا ہوں اپنے پدری خاندان کا جس نے اب خیر سے اپنا شجرۂ نسب بھی برآمد کر لیا تھا اور اس کے طفیل امام حسین سے اپنی نسبت بھی دریافت کر لی تھی مگر اس سے آٹے اور نمک کے تناسب میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

سچ پوچھو تو خاندان کے اس نقشہ نے جن کے لیے مسائل پیدا کیے تھے، وہ غریب شیعہ نوجوان تھے کہ شادی تو ہر پھر کر خاندان ہی میں ہوتی تھی۔ تو اکثر و بیشتر یہی ہوتا تھا اور ہوتا ہے کہ میاں شیعہ بی بی سنّی۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ خاندان تو ایک ہی ہے۔ عیسیٰ بدین خود موسیٰ بدین خود مگر جب بچے پیدا ہو جاتے تو غریب باپ مشکل میں پڑ جاتا کہ اولاد کو ماں کے عقیدے کی دستبرد سے کیسے بچائے۔ بیٹی کو تو صبر کر لیا کوئی بھی بیٹی ماں کے اثر سے کیسے بچ سکتی ہے۔ ہاں اگر شیعہ بدل جائے تو الگ بات ہے۔ ایسے دور تنگے عقیدے والے گھر کی بیٹی کے متعلق اک ان لکھا سمجھوتہ تھا کہ شیعہ بدل گیا تو شیعہ۔ سنّی بدل گیا تو سنّی۔ مسئلہ بیٹوں کا تھا۔ ہمارے ایک چچا فصاحت حسین اس صورت حال میں پھنسے ہوئے تھے۔ علی گڑھ میں اپنے جدی گھر میں بڑے بھائی کے ساتھ رہتے تھے۔ بڑے بھائی ان کی آل اولاد سب سنّی۔ ان کی اپنی گھر والی سنّی۔ اس شاد آباد خاندان کے بیچ وہ اکیلے شیعہ۔ انہوں نے اس صورت حال کا توڑ اس طرح کیا کہ برس کے برس اپنے دو ننھے بیٹوں کو ساتھ لے کر یکم محرم کو ڈبائی آن پہنچتے۔ حسنِ اتفاق سے ان کی ایک بہن شیعوں میں بیاہی گئی تھی۔ سو شیعوں میں شمار ہوئی۔ ڈبائی میں اس کا بڑا سا گھر تھا جو محرم کے دنوں میں بہت آباد نظر آتا تھا کہ وہ ساری آل اولاد کے ساتھ اس موقع پر پردیس سے یہاں آن پہنچتی تھیں۔ چچا جان خوش کہ بچے گھر میں رہیں گے تو نذر نیاز کے

حلوے کھائیں گے۔ باہر نکلیں گے تو مجلس میں جائیں گے۔ سوز و سلام سنیں گے۔ دوسرے بچوں کو ماتم کرتے دیکھیں گے تو خود بھی ماتم کریں گے۔ آٹھ کی شب کو امام باڑے میں جا کر کاندھے پہ مشک لاد کر اور سرخ فتد کمر میں لپیٹ کر چھوٹے مولا کا سقہ بنیں گے اور مشک سے دودھ کٹورے میں بھر بھر کر بچوں کو پلائیں گے۔ مولائیت کی اتنی لمبی اور گاڑھی خوراک اندر اتر جائے گی کہ سال بھر تک اچھے برے اثرات سے محفوظ رہیں گے۔

خیر یہ تو ویسے ہی درمیان میں ذکر آ گیا۔ اصل میں تو میں اپنے ان دو بزرگوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنہیں ہم اپنا دادا جانتے تھے۔ اصلی اور سگے دادا تو میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ دادی کو تھوڑا دیکھا تھا۔ میرے ہوش سنبھالتے سنبھالتے انہوں نے بھی آنکھیں موند لیں۔ ہاں ان کے دو بھائی صادق علی اور دل شاد علی کو جی بھر کے دیکھا اور انہیں اپنا دادا جانا۔ خاندان میں کوئی نہ کوئی تو ایسا بزرگ ہونا چاہیے جو دادا یا نانا کے مرتبہ پر فائز نظر آئے۔ اب تو وہ زمانہ ہے کہ لوگ دادا اور نانا بن جاتے ہیں مگر دادا اور نانا سے جو بزرگی منسوب چلی آتی ہے، اس سے محروم رہتے ہیں۔ آج کل دادیوں، نانیوں کا حال ان سے بڑھ کر ابتر ہے۔ ان کی بیٹیاں قد نکالنے کے ساتھ ہی اپنی مرضی کا بر تلاش کر کے بیاہ رچا لیتی ہیں اور ترت کے ترت ماں بھی بن جاتی ہیں۔ ادھر ان بیٹیوں کی مائیں یہ تک پتہ نہیں چلنے دیتیں کہ وہ صاحب اولاد ہیں۔ یہ کہ وہ نواسے نواسیوں، پوتے پوتیوں والیاں ہیں۔ اور انہیں دیکھ کر ایسا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔

مگر ہمارے یہ دونوں دادا سچے اور کھرے دادا تھے۔ ساری بزرگی جو داداؤں سے منسوب چلی آتی ہے، ان کی ذات میں کتنی نظر آتی تھی۔ ایک دادا دل شاد علی تو ڈبائی سے چار قدم کے فاصلہ پر دانپور میں رہتے تھے۔ شاید ہمارے خاندان کی جڑیں اس چھوٹی سی بستی ہی میں ہیں۔ ہماری دادی اور ان داداؤں کے والد بزرگوار بھی تو اسی بستی میں براجمان تھے اور کہتے ہیں کہ اس شان کے بزرگ تھے کہ اس پورے علاقے میں ان کی کرامات کی دھوم تھی۔ کوئی بیل گاڑی کہیں دلدل میں پھنس جاتی یا کسی گڑھے میں دھنس جاتی تو گاڑی بان ان کے نام کا واسطہ دے کر زور لگاتا اور گاڑی کو نکال لے جاتا۔ جب آخری وقت آیا تو کمبخت جان سینے میں آ کر پھنس گئی۔ نزع کی گھڑیاں لمبی ہوتی چلی گئیں۔ جان ہے کہ پھڑ پھڑاتی ہے نکل نہیں پاتی۔ اسی عالم میں کئی دن گزرے کہ اچانک ایک ننگ دھڑنگ ملنگ گھر میں داخل ہوا۔ گھر والوں نے شور مچایا کہ یہ کون وحشی گھر میں گھس آیا۔ انہوں نے اشارہ کیا کہ آنے دو۔ وہ سیدھا جا کر ان سے لپٹ گیا۔ ادھر وہ ان سے لپٹا، اُدھر ان کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ ملنگ فوراً ہی واپس ہو لیا۔ پھر اس کے پیچھے آدمی دوڑائے گئے مگر پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں چھو ہو گیا۔ ادھر بس پچھتاوا رہ گیا کہ کون اجنبی ان کے بزرگ کا سارا علم لے کر چمپت ہو گیا۔ اولاد کو ورثے میں کچھ نہ ملا۔ ہمارے دادا دل شاد علی کو ترکہ میں بس رتی بھر علم ملا تھا مگر اسی رتی بھر جدی علم کے زور پر انہوں نے بڑے بڑے جنات کو قابو میں کیا۔ علاقہ بھر میں ان کے عمل کی دھوم تھی۔ جس کے سر بلا آ جاتی اسے اتارنے کے لیے انہیں بلایا جاتا۔ کیا عمل پڑھتے تھے اور کیسی ڈانٹ بتاتے تھے کہ کیسا ہی موذی جن ہو

اسے بھاگتے ہی بن پڑتی تھی۔ ایسی ہی کسی مہم پر ہوتے کہ جنات کو دفع کرنے کے بعد وانپور جاتے جاتے ذبائی کی طرف مڑتے اور ہمارے گھر آ نکلتے۔ میری تو بچ بچ عید ہو جاتی۔ وجہ یہ کہ خالی ہاتھ تو نہیں آتے تھے اور جب جانے لگتے تو پیسے دھیلے سے بچوں کو ضرور نوازتے۔

مگر ان کی شخصیت میرے لیے ایک اور حساب سے بھی پرکشش تھی اور کسی قدر حیرت ناک بھی۔ انہیں برسوں کی بات ہے کہ ہماری ایک ماموں زاد بہن تھیں جن کے نام دلی کا رسالہ ''عصمت'' بڑی باقاعدگی سے آتا تھا۔ اس رسالہ میں تھوڑی تاک جھانک میں بھی کرتا تھا۔ مصورِ غم کی آنسوؤں میں ڈوبی تحریریں شغف سے پڑھتا اور ان کی تصویر کو بڑے احترام کے ساتھ دیکھتا اور سوچتا کہ ارے یہ تو بالکل ہمارے دادا کی طرح ہیں اور دادا آتے تو انہیں دیکھ کر حیران ہوتا کہ ارے یہ تو بنے بنائے مصورِ غم علامہ راشد الخیری ہیں۔ ویسے ان کی طبیعت میں بھی تھوڑی غم کی چاشنی تو تھی۔ رسول اللہ ﷺ کا اسمِ مبارک زبان پر آتا تو لہجہ میں رقت آ جاتی اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ پھر حضرت علیؓ کا ذکر شروع کر دیتے اور جیسے اپنے عزیز بھانجے کو سمجھا رہے ہوں کہ

اے کہ نشناسی خفی را از جلی
اے گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ

مولا علی کو روحانی فضیلت میسر تھی۔ باقی خلافت کا اپنا مقام و مرتبہ ہے۔ والد صاحب دھیان سے مودبانہ ان کے ارشادات سنتے اور خاموش رہتے۔ پھر بعد میں گھر والوں کو بتاتے کہ ماموں صاحب اہل سنت میں سے نہیں۔ پھر کیا ہیں؟ سمجھاتے کہ اصل میں وہ تفضیلیہ ہیں۔ تفضیلیہ؟ اس کا کیا مطلب۔ یہی کہ تفضیل علی کے قائل ہیں یعنی ان کا عقیدہ شیعیت کے آس پاس منڈلا رہا ہے۔

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیل علی ہم نے سنی اس کی زبانی

مگر ہمارے دوسرے دادا یعنی صادق علی۔ مگر اب وہ خالی صادق علی کہاں رہے تھے۔ ترقی کے کتنے منازل طے کر کے خان بہادر صادق علی بن گئے تھے یعنی دادا دل شاد علی کے بالکل الٹ تھے۔ مذہب کا ان کی زندگی میں عمل دخل برائے نام ہی تھا۔ ان کا حنفی سنی ہونا برحق مگر محرم میں بھی ایک اہتمام تو کرتے تھے۔ اپنے گھر میں دو مجلسیں کرتے تھے۔ ویسے ان مجلسوں کا رنگ اہل تشیع کی مجلسوں سے بالکل مختلف ہوتا تھا۔ نہ نوحہ و ماتم نہ گریہ۔ ہاں سوز خوانی ہوتی تھی اور اس کے لیے سوز خواں مع بازو کے باہر کے کسی شہر سے بلایا جاتا تھا۔ مجلس اسی کے سوز سے شروع ہوتی تھی۔ اسی کے سوز پر ختم ہوتی تھی۔ پھر تبرک تقسیم ہوتا۔ مٹی کی طشتریوں میں لبالب بھرا زردہ۔

ایک تو یہ خاندان خود لمبا چوڑا تھا۔ پھر قریب و دور کے عزیز رشتہ دار۔ مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ مردانہ حصہ مہمان خانہ بنا ہوا تھا۔ پلنگ قطار اندر قطار۔ جو نیا مہمان آتا۔ اس کے لیے فوراً پلنگ مہیا ہوتا۔ پلنگ

حاضر ہے۔ بستر اپنا لائیے، بچھائیے اور پسر جائیے۔ اور آنے والے یہی کرتے تھے۔ نہ آنے کا دن مقرر تھا نہ جانے کے متعلق طے تھا کہ کب جائیں گے۔ انتظار کرتے تھے کہ کب ان کا مسئلہ حل ہوگا۔ پھر اس حساب سے قیاس کرتے کہ کب انہیں واپس جانا چاہیے۔

ان دادا جان کو سب میاں جان کہتے تھے۔ میاں جان کے تین بیٹے ہوئے۔ تینوں نے بڑے عہدے پائے مگر کسی کی عمر نے وفا نہیں کی۔ باری باری کر کے بھری جوانی میں گئے۔ ان سب کی عمریں میاں جان کو لگ گئیں۔ دو بیٹوں کے متعلق مجھے زیادہ معلوم نہیں مگر تیسرا بیٹا مر کر خاندان کے لیے ایک لیجنڈ بن گیا۔ اس کے ذکر اذکار میں نے بہت سے لیکن ان دادا جان اور ان کی آل اولاد کا ذکر مجھے باپوز کے ذیل میں کرنا ہے، ابھی نہیں۔

ارے میں تو خاندان کے تذکرہ میں آ کر پھنس گیا۔ پھنسنا ہی تھا۔ شجرۂ نسب کا ذکر کیوں چھیڑا تھا۔ اب قریب و دور جہاں جہاں اس شجرے کی شاخیں پیچ کھاتی ہوئی جاتی ہیں وہاں تک جاؤ۔ تا بابا یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔ میں تو شجرۂ نسب کی نقل کہیں رکھ کر بھول گیا ہوں جو میرے بزرگ مجھے عنایت کر گئے تھے مگر یار کہیں گے کہ خاندان کے دور پرے کے عزیزوں، رشتہ داروں کا اتنا ذکر کیا، کچھ خاص اپنے گھرانے کے متعلق تو بتاؤ۔ ارے وہاں بتانے کے لیے کیا ہے۔ ایک ماموں، ایک چچا، ایک خالہ۔ پھوپھی ندارد۔ پانچ بہنیں۔ بھائی کے نام صفر۔ بھانجے بھانجیاں قطار اندر قطار۔ بیٹا بیٹی غائب۔ لو اب لکھتے ہوئے احساس ہو رہا ہے۔ پہلے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ کتنے اہم رشتے تو میری زندگی سے خارج ہیں۔ آخر آدمی کی زندگی میں ان کی کوئی معنویت تو ہوگی۔ خیر ذاتی حوالے سے تو اب میں یہ بات سوچ رہا ہوں۔ باقی انسانی زندگی میں خاندان کی کیا معنویت ہے اور رنگا رنگ خاندانی رشتوں کی کیا اہمیت ہے، اس کا احساس زیادہ شدت کے ساتھ اس موقع پر ہوا جب میں واقعۂ کربلا کے بارے میں ایک مضمون لکھ رہا تھا اور مرثیوں پر لکھتے ہوئے ذہن میں سوال ابھرا کہ یہ اتنا بھرا پرا خاندان اپنے رنگا رنگ رشتوں ناطوں کے ساتھ اس ریگ زار میں جہاں حق و باطل نبرد آزما ہیں، کیا کر رہا ہے۔ اس خون ریز جنگ میں اس کے یہاں ہونے سے کھنڈت پڑ رہی ہے یا اسے کوئی نئی معنویت مل رہی ہے۔ یہاں سے میرا دھیان مہا بھارت اور رامائن کی طرف گیا۔ کچھ جلیل القدر خاندان تو وہاں بھی نظر آ رہے ہیں مگر یہ کیا بھید ہے کہ اُدھر خاص طور پر مہا بھارت میں بیٹے ہی بیٹے، سب بھائی برادر، بہن کوئی نہیں، بیٹی کوئی نہیں۔ اس کے کیا معنی ہیں۔ لو میں بھٹک کر کدھر نکل گیا۔ کہہ یہ رہا تھا کہ ذاتی حوالے سے اب سوچ رہا ہوں۔ میں نے ابھی کہا کہ میری زندگی سے کچھ اہم خاندانی رشتے یا کہیے کہ انسانی رشتے غائب ہیں۔ کچھ رشتے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ابھی بتا رہا تھا کہ بھانجے بھانجیاں قطار اندر قطار ہیں۔ ان کی گہما گہمی میں کم رشتوں کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ وہاں بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔ جہاں سو بھائی ہوں وہاں ایک بہن کے نہ ہونے کی کمی کا کسی کو کیوں احساس ہوگا مگر کیا کسی ایک رشتے کی افراط سے کسی کم رشتے کی تلافی ہو جاتی ہے۔

اور یہ شجرۂ نسب کا کیا چکر ہے۔ خاندان وقت کے ساتھ بڑھتے پھیلتے جاتے ہیں۔ اس عمل میں قریبی رشتے رفتہ رفتہ پیچھے کھسکتے کھسکتے دور پار کے رشتے بن جاتے ہیں۔ جب وقت اور گزرتا ہے تو ایسے کتنے رشتے حافظہ سے دسر جاتے ہیں۔ شجرۂ نسب خاندانی حافظہ کا امین ہے۔ وہ اس پر بضد نظر آتا ہے کہ نسل در نسل چلتے خاندان کی کسی پیڑھی کو وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دے گا اور کسی دور پار کے رشتے کو گم نہیں ہونے دے گا مگر بابا کب تک۔ ویسے تو سارے بنی آدم ایک ہی کنبہ ہیں۔ بادا آدم اماں حوا کی اولاد۔ مگر دیکھو تو اب ایک دوسرے کو پہچاننے کے روادار نہیں۔ ایک دوسرے کا خون بہانے کے لیے ہر وقت تیار۔ بادا آدم اور اماں حوا آج آ کر دیکھیں تو اپنی اولاد کو دیکھ کے سر پیٹ لیں مگر خیر سر پیٹنے کی نوبت تو ان کے جیتے جی آ گئی تھی۔ قابیل نے اپنے بھائی کے ساتھ کیا کیا۔ وہ تو یہ کہیے کہ ایک کوے نے اس کی بدھی میں یہ بات ڈالی کہ بھائی کو مار کے اس کی لاش کو کاندھے پر لادے لادے پھرنا کوئی خوبی کی بات نہیں۔ گڑھا کھود کے اسے اس میں داب دو۔ کچھ تو جرم پہ پردہ پڑ جائے مگر اب جو ہم جنسوں، ہم وطنوں، ہم مذہبوں کو ہلاک کرنے کے نئے نئے طریقے برتے جا رہے ہیں۔ یہ کس نے انہیں سکھائے۔ کوا تو بہرحال اس کا ذمہ دار نہیں۔ ہماری ایا اماں کہا کرتی تھیں کہ ارے، اپنا مارے گا تو لاش کو چھاؤں میں تو ڈالے گا۔ غلط، ایا اماں غلط۔ ذرا آپ یہاں آ کر دیکھیں۔ اپنے لوگ اپنوں کو کیسے مار رہے ہیں اور قتل گاہوں میں یہاں سے وہاں تک کہیں چھاؤں نہیں ہے۔

۞........۞........۞

جس محلّہ میں تھا ہمارا گھر

یہ تب کی بات ہے جب ہماری بستی ہماری بستی تھی اور ہمارا گھر ہمارا گھر تھا۔ ہم سب اکٹھے رہتے تھے۔ خوب بستی تھی مگر پہلے گھر۔ بستی خود بخود نمودار ہو جائے گی۔ تو اس گھر میں ہم سب اکٹھے رہتے تھے۔ کون ہم سب۔ اصل میں ہمارے نانا نے کسی بھلے وقت میں یہ مکان بنوایا تھا۔ ان کے بعد ان کی اولاد ہی کو اس گھر میں شاد آباد ہونا تھا۔ اولاد کونسی لمبی چوڑی تھی۔ ایک بیٹا یعنی ایک ہمارے ماموں زمرد حسین۔ ایک ہماری خالہ۔ ایک ہماری والدہ۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ہمارے ماموں تو فارسٹ افسر بن کر اللہ میاں کے پچھواڑے سی پی کے جنگلوں کی طرف نکل گئے تھے۔ ملازمت کا سارا زمانہ وہیں گزرا۔ آئے دن تبادلہ ہوتا۔ اس دیار کے قصبوں شہروں میں کہ آج چھندواڑے میں ہیں تو کل سیونی میں۔ پرسوں دموہ میں۔ ہماری ممانی سال چھ مہینے میں لد پھند کر بیٹے بیٹیوں کے ساتھ آتیں تو اس گھر کی اوپر کی منزل میں چہل پہل ہو جاتی۔ چلی جاتیں تو پھر سناٹا ہو جاتا۔ بڑی خالہ تو ادھر جا کر کم و بیش وہیں رچ بس گئی تھی۔ رہ گئیں ہماری والدہ اور ہاں نانا کی ایک بہن، سوکھی چمرخ سر سفید، کمر جھکی ہوئی۔ انہیں ہم سب ایاّاماں کہتے تھے۔ تو نیچے کی منزل ان دموں سے آباد تھی مگر ان کے علاوہ بھی کچھ مکین تھے۔ ایک تو جنگلی کبوتروں کا جوڑا جو یہاں بڑے کمرے کی کنگنی میں آباد چلا آتا تھا۔ رات کنگنی پر بسر کرتا۔ صبح منہ اندھیرے جب ہمارے والد کمرے کا دروازہ کھول کر نماز کے لیے باہر نکلتے تو کبوتر اور کبوتری دونوں پھڑ پھڑا کر باہر نکلتے۔ اڑ کر جانے کدھر نکل جاتے۔ پھر تھکے ہارے شام کو پلٹتے۔ منڈیر پر اترتے۔ منڈیر سے سیدھے بڑے کمرے میں گھس کر کنگنی پر جا براجتے اور غٹرغوں غٹرغوں کرنے لگتے۔

ایاّاماں کے چھوٹے کمرے کے اندر ہی ایک بخاری تھی جس میں کب کب کا کباڑ جمع تھا، بند پڑی رہتی تھی۔ ہم چھوٹوں کو تجسس تو تھا کہ کیوں بند ہے اور اس کے اندر کیا ہے۔ ایاّاماں کہتیں کہ اس کے اندر بیچا رہتی ہے۔ بیچا کے ڈر سے ہم نے خود کبھی اس کے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ اور وہ جو دالان کے اندر ایک کوٹھری تھی۔ اس میں تو دن میں بھی اندھیرا ہی رہتا تھا۔ ساز و سامان کے نام پر وہاں بڑے بڑے اونچے صندوق رکھے تھے۔ زمین والا جو اس گھر کا پرانا باسی تھا، اسی کوٹھری میں رہتا تھا۔ ہم میں سے کسی کو کبھی نظر تو آیا نہیں۔ ہاں کسی کسی دن اس کے گرد آلود فرش پر ایک بل کھاتی لکیر دکھائی دیتی تھی۔ ہاں ایک دفعہ کینچلی بھی پڑی

نظر آئی تھی۔ کبھی کبھی رات کو کوٹھڑی کی طرف سے سرسراہٹ یا ہلکی سی پھنکار سنائی دیتی تو ہماری والدہ کہتیں "ارے یہ زمین والا کیا چاہتا ہے۔" اور اپا اماں کہتیں "کٹوری میں نمک ملا دودھ بھر کے رکھ دو، اسے چین آ جائے گا۔"

دودھ میں نمک کیوں؟ اپا اماں کی منطق یہ تھی کہ زمین والا نمک کا بہت پاس کرتا ہے مگر وہ تو ویسے بھی کسی کو نہیں ستاتا تھا۔ اپا اماں بتاتی تھیں کہ بہت پرانا ہے۔ گھر میں سب کو پہچانتا ہے۔ کبھی اس نے کسی کو پریشان نہیں کیا۔

یہ ہمیں اپا اماں ہی نے بتایا تھا کہ پاتال میں سانپوں کا بادشاہ راجہ باسٹھ راج کرتا ہے۔ ایک دفعہ ایک برہمن بچے کو کسی سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اس نے پھڑک کر فوراً ہی جان دے دی۔ اس کی استری بہت روئی پیٹی۔ پھر اسے عجب سوجھی کہ پتی کی لاش کو کمر پہ لاد کر پاتال میں اتر گئی۔ سانپوں سے بچتی بچاتی چلی اور ناگ محل کی ڈیوڑھی پہ دھرنا دے کر بیٹھ گئی اور دہائی دی کہ اے ناگ راجہ تیرے ایک زہری سنپولیے نے میرے پتی کو ڈس لیا ہے۔ راجہ باسٹھ نے فوراً اس سانپ کو طلب کیا اور حکم دیا کہ تو نے برہمن بچے کو ڈسا ہے۔ اب اس کا زہر چوس۔ اے لو اس نے دم کے دم میں وہ سارا زہر جو اس کے اندر سرایت کر گیا تھا، چوس لیا اور وہ بھلا چنگا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ تو مجھے بڑے ہو کر پتہ چلا کہ یہ ناگ راجہ کون تھا۔ اپا اماں زندہ ہوتیں تو میں انہیں بتاتا کہ اپا اماں، وہ راجہ باسٹھ نہیں تھا۔ اس کا نام راجہ باسک تھا۔ وہ شیش ناگ کا بھائی تھا۔ پرجاپتی کی بیٹی کدرو نے جو ایک ہزار سنپولیے جنے تھے، ان میں شرافت کے پتلے تو یہی دو بھائی تھے۔ شیش ناگ اور باسک ناگ۔ باقی تو سب موذی سانپ سنپولیے تھے۔ کوٹھڑی میں جو زمین والا رہتا تھا، وہ شاید انہیں دو میں سے کسی کی اولاد ہوگا۔ جب ہی تو وہ اس گھر میں اس شرافت سے رہتا تھا کہ کبھی کسی کو نہیں ستایا۔ ہاں میں جو اسے زمین والا کہہ رہا ہوں تو وہ اس وجہ سے کہ اپا اماں نے تاکید کی تھی کہ اس کا نام کبھی مت لینا۔ اس کے کان ہمیشہ کھڑے رہتے ہیں۔ اس کا نام کتنی ہی آہستہ لو، وہ سن لیتا ہے اور فوراً باہر نکل آتا ہے۔ تو خیر وہ سانپ تو بہت شریف النفس تھا۔ باقی جو اس گھر میں آئے دن سانپ سنپولیے نکلتے تھے وہ تو سب کدرو کی زہری اولاد تھے مگر جو بھی بل سے باہر نکلا میرے والد صاحب کے عصا سے اس کا سر کچلا گیا۔

ہاں پاس پڑوس میں ہندوؤں کے گھروں میں جو سانپ نکلتے تھے، انہیں کبھی وہ مارنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ اس بستی میں ایسے ماہر بھی تو تھے جو دُم سے پکڑ کر اسے ایسا جھٹکا دیتے تھے کہ اس کی کمر جواب دے جاتی تھی۔ بس پھر وہ دُم کو چٹکی میں پکڑے الٹا لٹکائے اسے پاس کے سوکھے کنویں میں پھینک آتے۔

ہاں اس اندھی کوٹھڑی سے کبھی کبھی ایک چھناکے کی آواز بھی تو سنائی دیتی تھی اور کسی نے سنی ہو یا نہ سنی ہو اپا اماں نے تو سنی تھی۔ "بی بی کیا پوچھو ہو۔ بس ایسی جیسے اشرفیوں کی دیگ چھن چھن کر رہی ہو اور ساتھ

میں ایک آواز کہ بیٹا دے دے مایا لے لے۔ میں نے کہا کہ تیرے منہ میں خاک بھوبھل۔ کیوں بیٹا دے دوں۔ بس وہ زمین کے اندر ہی چھن چھن کرتی دور چلی گئی۔''

سب گھر والوں نے حیرت سے سنا مگر ابا اماں کے یہاں کوئی حیرت نہیں تھی۔ انہیں اس دولت کی حقیقت معلوم تھی۔ ''بی بی یہ غدر کے دنوں کے دبے ہوئے خزانے ہیں۔ ان دنوں تو قیامت مچی ہوئی تھی جاٹ، گوجر اور جانے کون کون دندناتے پھرتے تھے۔ آج اس بستی پر دھاوا بولا کل اس بستی پہ جا پڑے۔ لوٹ مچار کھی تھی۔ شریف لوگ اپنی جانیں لے لے کر بستیوں سے بھاگ رہے تھے۔ جو جمع پونجی ہوتی اسے دیگ دیگچوں میں انڈیلتے۔ ان کا منہ بند کر کے زمین میں داب دیتے اور خود جدھر سینگ سمائے نکل گئے مگر دولت زمین کے اندر جا کر ایک جگہ ٹکتی تھوڑا ہی ہے۔ ارے اسے تو پیے لگ جاتے ہیں اور کمبخت کی کالی زبان۔ اس کی بات سن لو تو بیٹا بچ بچ جان سے جاتا ہے۔ بی بی مجھے تو جب بھی زمین کی تہہ سے چھنا کا سنائی دیا کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ اس کے منہ میں خاک بھوبھل ڈالی اور قل شریف پڑھنی شروع کر دی۔ پھر میں نے صبح اٹھ کر نماز کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ اپنے زمرد پر سے پانچ سکوں کا صدقہ اتارا اور فقیر کو دے دیا۔''

ہاں یاد آیا تقسیم کے بعد جب ہمارے ماموں کا سارا گھرانا پاکستان آ گیا تو ہم نے اپنی ممانی سے سنا کہ ''شہنشاہ تو وہ گھر بیچ کر ادھر چلا آیا۔ وہاں مکان خریدنے والے لالہ نے جب اسے نئی شکل دینے کی غرض سے توڑ پھوڑ کی تو وہاں سے خزانہ نکلا۔ سونے کی اینٹیں جانے کب کی دبی پڑی تھیں اب جو کھدائی ہوئی تو نکل پڑیں۔'' پھر انہوں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''جس کی قسمت کی تھیں، اسے مل گئیں۔''

اور جب میں اپنے دور کے عزیز اور حبیب الرحمٰن کے بھانجے علیم صاحب کے ہمراہ علی گڑھ سے ڈبائی گیا تھا تو میں انہیں اپنے گھر کا اتا پتا سمجھانے لگا۔ وہ بولے ''اچھا وہ گھر۔ اسے تو کسی لالہ نے خرید لیا تھا اور ہم نے سنا کہ جب اس گھر کی توڑ پھوڑ ہوئی تو کھدائی میں خزانہ برآمد ہوا۔'' رکے، پھر بولے ''پھر سنا کہ اس گھر میں کوئی جوان موت ہوئی ہے۔''

ابا اماں کو اللہ میاں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اس گھڑی وہ مجھے بہت یاد آ رہی ہیں۔

ارے میں یہ کدھر نکل گیا۔ میں اس گھڑی ڈبائی پہنچا ہوا ہوں۔ وہ ڈبائی جو کبھی ہوا کرتی تھی۔ مجھے سب کچھ بھول کر تھوڑا وقت یہیں بتانا چاہیے۔ ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا کہ اس گھر میں کون کون رہتا تھا۔ ویسے تو بس ہم ہی رہتے تھے مگر پتہ نہیں اور کون کون سی روح، کون کون سی مخلوق آ کر اس گھر میں آباد ہو گئی تھی۔ گھر بالکل دیومالائی گھر بن گیا تھا۔ مجھے تو اور مجھے کیا گھر والوں میں سے اور کسی کو بھی اس کا پتہ نہیں چل پایا تھا۔ وہ تو ابا اماں نے سب کو خبردار کیا۔ انہیں نظر بھی بہت کچھ آتا تھا اور سنائی بھی بہت کچھ دیتا تھا۔ انہیں کے بیانات سن کر والد صاحب اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس گھر میں شیاطین کا غلبہ ہو گیا ہے مگر اس کا توڑ ان کے پاس موجود تھا۔ ہر ایسے موقع پر وہ کلام پاک سے رجوع کرتے تھے۔ سو اس انکشاف پر بھی کہ گھر میں شیاطین گھس آئے ہیں،

انہوں نے کلام پاک سے رجوع کیا۔ انہوں نے وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر اپنا قلمدان نکالا۔ ایک سفید کاغذ پہ کلام پاک سے ایک آیت نقل کی۔ پھر اس کاغذ کو کوٹھڑی کے دروازے پر چپکا دیا اور سمجھ لیا کہ شیاطین اب دفع ہو جائیں گے اور واقعی اس کے بعد ابا اماں کو نہ کوئی سایہ دکھائی دیا نہ کوئی آواز سنائی دی اور نہ کوئی پریشان خواب نظر آیا۔ گھر سے سب شیاطین دفع ہو چکے تھے۔

مگر ایک شیطان جسے بندر کہتے ہیں، وہ تو پھر بھی اس گھر کی منڈیروں پہ منڈلاتا رہا۔ ابا اماں کو سب سے زیادہ تنگ اسی نے کیا۔ بیچاری اصغری خالہ دوپہر کا کھانا کبھی چین سے نہ کھا سکیں۔ اصغری خالہ کا ابا اماں سے کیا رشتہ تھا۔ ہماری وہ کس رشتے سے خالہ تھیں، یہ کبھی واضح نہ ہو سکا۔ وہ بیچاری صحن کے ایک گوشے میں اپنے پلنگ پہ بیٹھی مستقل اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی تھیں۔ آنکھوں سے کم نظر آتا تھا۔ ابا اماں کس محبت سے کھانا ان کے ساتھ رکھ کے جاتی تھیں۔ "اصغری، کھانا کھا لے۔" وہ تو یہ کہہ کے پھر باورچی خانے میں چلی جاتیں۔ ادھر منڈیر پہ بیٹھا بندر آہستگی سے اتر کر آتا اور سامنے رکھی روٹیاں لے کر یہ جا وہ جا۔ اصغری خالہ کو اس وقت پتہ چلتا جب وہ روٹیاں اٹھا کر بھاگتا اور آڑے ترچھے رستوں سے ہوتا ہوا منڈیر پہ جا پہنچتا۔ پھر دہائی دینے سے کیا ہوتا تھا۔

ہماری منڈیر پہ منڈلاتے بندروں کو اس گھر کی تین چیزوں سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اصغری خالہ کے سامنے رکھی روٹیوں سے، الگنی پر پڑے دوپٹے سے اور گھڑونچی پہ رکھے گھڑے پر ڈھکے ہوئے کٹورے سے۔ ان میں سے جس چیز پر بھی جس بندر کا داؤ چل جاتا وہ سمجھتا کہ معرکہ مار لیا۔ پھر منڈیر پر بیٹھ کر وہ اطمینان سے اپنے اچکے ہوئے مال سے انصاف کرتا۔ مثلاً کس شوق سے وہ دوپٹے کو الٹتا پلٹتا، اسے سر پہ اوڑھتا اور پھر لیر لیر کر دیتا۔

ایک اسی گھر کی منڈیروں اور چھت پر موقوف نہیں تھا۔ محلے کی ساری چھتوں اور منڈیروں پہ بندر کودتے پھاندتے پھرتے تھے۔ بستی میں کوئی طاقت ایسی نہیں تھی کہ ان پر روک ٹوک کرتی۔ بس جب اس بستی کی خوبی قسمت سے کوئی بھولا بھٹکا لنگور یہاں آ نکلتا۔ پھر بندروں کو پتہ چلتا کہ ان سے بھی بڑی کوئی طاقت ہے۔ ایسے غائب ہوتے کہ پھر کسی منڈیر، کسی درخت پر ان کا نام و نشان نظر نہ آتا۔ ایک لنگور سو بندروں پہ بھاری۔ اور کیا مخلوق تھی۔ منہ کی طرف دیکھو تو کالا بھتنا، باقی سارا بدن سفید بالوں سے ڈھکا ہوا۔ سب سے بڑھ کر اس کی دم جس کا کوئی انت ہی نہیں تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہنومان جی خالص بندر نہیں تھے۔ ان کی ذات میں تھوڑا سا لنگور بھی شامل تھا۔ کم از کم دم تو لنگوروں والی ہی تھی۔ بندر کی دم اتنی لمبی کہاں ہوتی ہے۔

خیر جب بندر رخصت ہو جاتے تو محلے کی چھتوں پر لڑکے کودتے تھے۔ انہیں پتنگیں جو لوٹنی ہوتی تھیں۔ اپنی چھت پر میں اکیلا کودتا پھرتا تھا اور یہ چھت ویسے تو خود بھی خاصی لمبی چوڑی تھی۔ دائیں بائیں کے گھروں کی چھتوں نے اس سے رشتہ جوڑ کر اسے اور وسعت بخش دی تھی اور یہ سب چھتیں ہندو چھتیں تھیں۔

ہمارا گھر بھی خوب تھا۔ کہنے کو مسلمان محلہ میں تھا لیکن دائیں بائیں آگے پیچھے سب گھر ہندوؤں کے تھے۔ اصل میں یہ اس محلّے کے بالکل آخر میں تھا جو شیخان محلّہ کہلاتا تھا۔ آگے بازار شروع ہو جاتا تھا اور ساتھ میں ہندوؤں کے گھر۔ تو اس گھر کی آب و ہوا اسلامی تھی مگر ارد گرد کی فضا ہندووانی تھی۔ کیا خوب گھر تھا۔ چار قدم آگے چلو تو مندر کھڑا نظر آتا۔ چھ قدم پیچھے جاؤ تو اپنی مسجد میں پہنچ جاتے تھے۔ تو میں مندر اور مسجد کے بیچ اپنی چھت پر اس آزادی سے کٹی ہوئی پتنگوں کے پیچھے دوڑتا تھا کہ برابر میں پھیلی ہندو چھتوں کو بھی اپنی ہی چھت میں شمار کر لیتا تھا۔ کٹی ہوئی پتنگ پھر بھی ہاتھ نہیں آتی تھی۔ کمبخت ڈولتی ہوئی آگے نکل جاتی تھی۔

گھر کے اس محل وقوع سے ایک فائدہ مجھے یہ پہنچا کہ ہولی اور دیوالی کے تیوہار اپنے تیوہار لگتے تھے۔ خاص طور پر دیوالی کہ دائیں بائیں کے گھروں کی منڈیروں پر جو دیئے جلائے جاتے تھے، لگتا تھا کہ وہ سب ہماری منڈیروں پر جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ ان دیوں کے بارے میں میری نیت کبھی نیک نہیں رہی۔ ان میں سے کتنوں کو میں پھونک مار کر بجھاتا اور سمیٹ کر سٹاک سے منڈیر سے کود نیچے اتر آتا۔ رام لیلا کا معاملہ البتہ تھوڑا ٹیڑھا تھا کیونکہ وہ ہمارے گھر سے دور رچائی جاتی تھی اور میرے والد خاص طور پر نگاہ رکھتے تھے کہ میں شام کے بعد گھر سے نہ نکلوں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آخر کے تئیں رام لیلا بھی چل کر ہمارے گھر تک آ گئی۔ میں نے کہا نا کہ ہمارے گھر سے ذرا آگے بڑھو تو بازار شروع ہو جاتا تھا۔ اس بازار میں ایسے ٹھکانے بھی تو تھے جہاں ہارمونیم بجتا رہتا تھا۔ شاید انہیں میں سے کوئی ایسی ٹولی تیار ہو کر نکل آئی کہ یہاں سمجھو کہ ہمارے گھر کے بالکل برابر رام لیلا کرنی شروع کر دی۔ تو گھر سے باہر قدم نکالنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اپنے گھر کی منڈیر پر بیٹھ کر کتنی رام لیلائیں دیکھ لیں۔

مگر کفر کی اس رنگا رنگی کے بیچ ہمارے گھر میں بھی تو کسی کسی تقریب سے تھوڑا رنگ چھلکتا نظر آتا۔ اسی رُت میں کہ بسنت گزر چکی ہوتی اور ہولی اپنا رنگ دکھا چکی ہوتی۔ ایک دن ہمارے گھر میں بھی رنگ گھلتا نظر آتا۔ ارے رنگ ایک دوسرے پر چھڑکنے کی رسم تو ہندووانی ہے اور ہولی پر اپنا رنگ خوب جماتی ہے۔ ہمارے یہاں کس تقریب سے۔ نوروز کی تقریب سے۔ ایرانیوں نے کتنا اچھا کام کیا تھا کہ اپنے قدیم تیوہار میں اسلام کا ہلکا سا چھینٹا دے کر ایک مذہبی تقریب کا رنگ پیدا کر لیا تھا اور ہمارے یہاں جو جنتری سال کے سال آتی تھی، اس میں لکھا ہوتا تھا کہ جس روز حضرت علیؓ کی پیدائش ہوئی تھی، وہ نوروز کا دن تھا۔ جس روز تختِ خلافت پہ جلوہ افروز ہوئے وہ بھی نوروز کا دن تھا۔ اور 21 مارچ کو والد صاحب صبح ہی سے نہا دھو کر نوروز کی تیاری شروع کر دیتے۔ جنتری دیکھ کر بتاتے تھے اس برس نوروز کا رنگ کیا ہے۔ کس سواری پر آیا ہے اور وہ برس جب جنتری نے بتایا کہ اب کے نوروز کا رنگ سرخ ہے۔ شیر پر سوار ہاتھ میں تلوار لیے نمودار ہوا چاہتا ہے۔ یہ اس کے جلالی شان کی نشاندہی تھی۔ پھر وہ اپنے قلمدان سے سرخی مائل نرسل کا قلم نکال کر اسے دھوتے۔ چینی کی پیالی میں زعفران گھولتے اور تعویذ لکھنے کے لیے سفید کاغذ کی چھوٹی چھوٹی دھجیاں برابر میں

رکھ لیتے۔ ایک تسلا پانی سے بھرا سامنے رکھا ہے۔ اس میں گلاب کا بڑا سا پھول الٹا پڑا آہستہ آہستہ تیر رہا ہے۔ کتنے انتظار کی گھڑیوں کے بعد تحویل کی گھڑی آئی۔ گلاب کے پھول نے پانی پر تیرتے تیرتے تیزی سے چکر کھایا اور والد صاحب نے قلم زعفرانی روشنائی میں ڈبو کر ان دفتیوں پر عربی کلمات لکھنے شروع کیے۔ مطلب یہ تھا کہ اس گھڑی جو تعویذ لکھا جائے گا وہ بہت پر تاثیر ہوگا۔

مگر نوروز کے سوا بھی تو مواقع تھے جن کی خاطر والد صاحب کو ستاروں اور سیاروں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنی پڑتی تھی۔ کچھ حوالے میرے حافظہ میں محفوظ ہیں۔ کچھ حوالے شاید اتنے پراسرار تھے کہ نہ اس وقت میری سمجھ میں آئے نہ اب یاد ہیں۔ وہ کونسا ستارہ تھا جو رات کے کسی پہر میں سب ستاروں سے بڑھ کر چمکتا دمکتا نمودار ہوتا تھا اور صبح صادق کے نمودار ہونے سے پہلے ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ والد صاحب نے اس کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش تو کی تھی مگر وہ اپنا بھید بتائے بغیر ہی کہیں آگے نکل گیا۔ پھر ہماری بستی کے آسمان پر وہ نظر ہی نہیں آیا۔ ہاں جب اچانک ستاروں کے بیچ کوئی دمدار ستارہ نمود کرتا تھا تو والد صاحب کو کچھ زیادہ ہی تشویش ہو جاتی تھی۔ ویسے ستاروں کے ٹوٹنے کی وجہ تو انہوں نے احادیث و روایات کے مطالعہ کی مدد سے معلوم کر لی تھیں اور شاید ابا اماں نے انہیں سے سن کر ہمیں بتایا تھا کہ یہ کمبخت شیطان چوری چھپے عرش کی سمت جاتا ہے اور کنسوئیاں لیتا ہے کہ وہاں فرشتوں کو کیا ہدایات دی جا رہی ہیں۔ پہرہ دینے والے فرشتوں کو پتہ چلتا ہے تو وہ گرز لے کر اس کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ جو ستارہ ٹوٹتا ہے تو سمجھو کہ فرشتوں نے شیطان کے سر پہ گرز مارا ہے۔

مگر سب سے بڑھ کر تو چاند کی نقل و حرکت اور عروج و زوال پر والد صاحب کو نظر رکھنی پڑتی تھی۔ انہیں یہ حساب رکھنا پڑتا تھا کہ مہینے کے آخر میں کونسی شب وہ نظروں سے اوجھل ہوا۔ اس سے وہ یہ حساب لگاتے تھے کہ اب وہ 29 کی شام کو نمودار ہوگا یا 30 کی شام کو۔ کس اہتمام سے وہ ہر مہینے کی 29 کی شام کو سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچتے تھے۔ ایک ہاتھ میں تحفۃ العوام، دوسرے ہاتھ میں آئینہ یا کوئی سبز شاخ یا پانی سے لبریز کٹورا۔ بات یہ تھی کہ نئے چاند کی دید تو ہر بار نیا تقاضا کرتی تھی۔ چاند دیکھ کر جو دعا پڑھی جاتی تھی، وہ تو ایک ہی تھی اور وہ تحفۃ العوام میں لکھی ہوئی تھی لیکن چاند آسمان پر دیکھنے کے بعد زمین پر کونسی شے پہلے دیکھی جائے، ہر مہینے کا چاند ایک نیا تقاضا لے کر آتا تھا۔ کبھی آئینہ دیکھنے کا تقاضا، کبھی سبز شے کوئی درخت، کوئی پودا، کوئی سبز شاخ دیکھنے کا تقاضا۔ کبھی پانی دیکھنے کا تقاضا۔ کبھی تقاضا کہ چاندی کی انگوٹھی دیکھو۔ کبھی یہ تقاضا کہ چاند دیکھنے کے بعد کوئی معصوم صورت دیکھ لو۔ اس آخری تقاضے کی تکمیل کی خاطر مجھے بھی ان کے ہمراہ چھت پہ جانا پڑتا تھا۔

یہ سب قمری مہینوں کا چکر تھا اور والد صاحب کو تو قمری مہینوں سے غرض تھی۔ بکرمی مہینوں کے چکر کو ابا اماں جانیں۔ اور ابا اماں اس ذمہ داری کو خوب نباہتی تھیں۔ جیٹھ، اساڑھ، ساون، بھادوں سب مہینوں کی خبر

رکھتی تھیں اور ہر مہینے کے رنگ ڈھنگ کو جانتی تھیں۔ بس سمجھ لو کہ اپنی ذات میں ایک اچھا خاصا بارہ ماسہ تھیں۔
مگر ذکر چاند کا ہو رہا تھا۔ والد صاحب چاند کے ہر دکھ سکھ میں شریک تھے۔ جب وہ کسی مشکل برج میں داخل ہوتا اور مشکل میں پھنس جاتا تو والد صاحب کس خضوع و خشوع سے اس کی مشکل کے حل کے لیے دعا کرتے۔ چاند کو گہن لگنے کے ساتھ ہی جا نماز پہ بیٹھ جاتے۔ ایسے موقع پر جو نماز پڑھنی چاہیے وہ نماز پڑھتے اور وہ ساری دعائیں جو اس مشکل گھڑی میں پڑھنی چاہئیں وہ پڑھتے۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے کہ اے خالق ارض و سما اے شمس و قمر کے رکھوالے۔ قمر اس گھڑی مشکل میں ہے، اسے اس مشکل سے نکال۔
ہاں ایک برس سورج گرہن بھی تو ایسا پڑا تھا کہ گھڑی دو پہری میں گہری ہوتی شام کا سماں پیدا ہو گیا۔ ہمارے گھر کے آس پاس جو اتنی ہندو دکانیں تھیں وہ کتنی پھرتی سے بند ہوئیں کہ ایک دم سے بازار میں سناٹا چھا گیا۔ ہمارے آس پاس جو گھر تھے، ان میں بھی دیکھتے دیکھتے کنڈیاں چڑھ گئیں۔ پھر بھکاریوں کا ایک غول نمودار ہوا اور کتنی تیزی سے پوری سڑک کا چکر لگایا۔ پتہ نہیں کیا الاپ رہے تھے مگر جس گھر پہ رکتے اور شور کرتے، اس کا دروازہ کھلتا۔ اندر سے للائن اناج لیے برآمد ہوتیں۔ اناج جھولیوں میں ڈال پھر سناک سے اندر اور دروازہ دھاڑ سے بند اور میں اپنے گھر کے دروازے پہ کھڑا حیران کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اندر سے چلانے کی آوازیں۔ میری والدہ کی آواز "ارے اس کمبخت کو اس وقت بھی گھر میں چین نہیں آیا۔ کدھر نکل گیا۔" بس میں نے فوراً دروازہ بند کیا اور اندر آ گیا۔ والد صاحب جا نماز پہ بیٹھے تھے۔ مجھے غصے سے دیکھا مگر بولتے کیسے۔ اس وقت وہ تحفۃ العوام کھولے بیٹھے تھے اور دعائیں پڑھ رہے تھے۔ مضمون وہی کہ "اے پاک پروردگار، اے ارض و سما کے مالک، شمس مشکل میں ہے، اس کی مشکل آسان کر۔"
تو یہ تھا ہمارے گھر کا کمال۔ باہر نکلنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ صدر دروازہ سڑک پہ کھلتا تھا۔ دائیں بائیں پتھر کی بنی دو چوکیاں۔ کبھی دہلیز میں کھڑے ہو کر کبھی چوکی پر بیٹھ کر میں نے کتنے تماشے دیکھے۔ آخر یہ بازار کا ٹکڑا تھا۔ ہر طرح کا تماشا ہوتا تھا۔ ہر رنگ کا بھیڑ بھڑکا۔ کبھی رام لیلا کے جلوس کا۔ کبھی کانگریس کے جلوس کا۔ کبھی ہولی کے ہولیاروں کا۔ لو ہولی سے یاد آیا۔ ہولی کے ہلیاروں کو گال اڑاتے، رنگ پھینکتے میں بس صدر دروازے کی ڈیوڑھی سے جھانک کر دیکھتا تھا مگر خود ہولی کو جلتے دیکھنا بھی تو اپنی جگہ ایک نظارہ تھا۔ وہ گلی کے دروازے سے نظر آتا تھا یعنی ہمارے گھر کا ایک چھوٹا دروازہ بھی تو تھا جو پچھواڑے گلی میں کھلتا تھا۔
ارے یہ گلی بھی تو ہندوؤں والی ہی تھی۔ ہمارے دروازے سے آگے سب انہیں کے گھروں کے دروازے کھلتے بند ہوتے تھے۔ گلی کے سارے ہنگامے، ساری چہل پہل بھی انہیں کے دم سے تھی۔ وہ ڈگڈگی بجاتا، بھالو والا آیا۔ سب بچے بڑے گھروں سے باہر نکل آئے۔ بھالو کا ناچ دیکھا۔ پیسوں کی بارش۔ پھر ڈگڈگی بجی۔ یہ۔ یہ۔ بندر کے مداری کی ڈگڈگی ہے۔ بندر بندریا کا تماشہ دیکھو۔ بندری کو بندر کے ہاتھوں ڈنڈے سے پٹتے دیکھو۔ بندریا روٹھ کر میکے چلی جاتی ہے۔ بندر اسے منا کر لاتا ہے۔ جیسے بندر بندریا ملے ویسے وہ سب میاں بیوی جو

آپس میں لڑتے رہتے ہیں، لڑیں اور پھر ملیں۔ بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔ اور اے لو، یہ بین کی آواز کدھر سے آ رہی ہے۔ وہ آ رہا ہے سپیرا۔ کانوں میں بڑے بڑے بالے، منہ میں بین جسے دونوں ہاتھوں سے تھامے ہے۔ گردن کے پیچھے کندھوں پر ایک ڈنڈا ٹکا ہوا ہے۔ ان پر دو پٹاریاں لٹکی ہوئیں۔ ایک دائیں ایک بائیں۔ اے لو اس نے آ کر بیچ گلی میں کندھے سے پٹاریاں اتاریں۔ ان کے ساتھ ہی خود بھی پسر گیا۔ بین اب زیادہ گرمجوشی سے بجا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک پٹاری کھولتا ہے۔ پٹاری کے کھلتے ہی دو بھنیر سانپ کالے بھجنگ ناگ اور ناگن پھن پھیلا کر اونچا اٹھ کر لہرانے لگتے ہیں۔ بار بار پھنکارتے ہیں۔ انہیں پچکار کر پٹاری میں بند کرتا ہے۔ اب دوسری پٹاری کھلتی ہے۔ اس سے ایک زہری سانپن نکلتی ہے۔ اسے وہ دھامن کہتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ گھوڑے سے زیادہ تیز دوڑتی ہے۔

دھوں، دھوں، دھوں۔ یہ دور سے آتی ہوئی ڈھول کی آواز ہے۔ اے لو چوپئی آ گئی۔ ہولی جلنے کے بعد دیہات سے جو گانے بجانے والوں والیوں کی ٹولیاں مہینہ پندھرواڑے تک لگاتار آتی رہتی تھیں، ہم انہیں چوپئی کہتے تھے۔ مردانہ اچھل کود اور ڈھول ڈھمکا تو اب ٹھیک طرح یاد نہیں مگر وہ زنگی ٹھمک ٹھمک کرتی جس طرح مجمع کے بیچ لمبا چکر لیتی، پھر تھرکتی پھرکی کی طرح گھومتی۔ ساتھ میں گھنگھرو باجتے۔ پھر کچھ ٹولی شور مچاتی، کچھ تماشائی ہو ہا کرتے۔ لیجیے چوپئی ہو گئی۔ پھر خرید و فروخت بھی تو اسی گلی والے دروازے پہ ہوتی۔ پھیری والوں میں کوئی چینی تیل والا، کوئی صدا لگا رہا ہے۔ ریشم کی لچھیاں لے لو۔ پھر موسم کے میوے کی صدا لگانے والے۔ کسی کے سر پہ شہتوت کا بڑا سا چھابڑا ہے۔ کوئی کرنج بیچتا ہے۔ کوئی فالسے کی صدا لگاتا ہے اور ہاں رات آندھی چلی تھی۔ آندھی میں جانے کتنی پکی امبیاں گری تھیں کہ ٹوکرے امبیوں سے بھرے سر پہ دھرے کنجڑے چلے آ رہے ہیں۔ ٹکے دھڑی لگا دی ہیں امبیاں۔ منہارن تو خیر بے تکلف اندر چلی آتی تھی۔ وہ آئی اور ہماری بہنوں کی عید ہو گئی۔ کلائیوں پر چڑھتے چڑھتے کتنی چوڑیاں چکنا چور ہو جاتی تھیں۔

اور ہاں سیر بین والی دلی کا لال قلعہ دیکھو۔ قطب صاب کی لاٹھ دیکھو۔ تاج بی بی کا روضہ دیکھو۔ مکہ دیکھو۔ مدینہ دیکھو۔ بارہ من کی دھوبن دیکھو۔ بمبئی کا بازار دیکھو۔ پھر کھڑی دوپہری میں ایک آواز سینگی بائی کی۔ اس آواز کو سن کر میرا تو دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا تھا۔ یہ سینگی والیاں بالکل جادوگرنیاں دکھائی دیتی تھیں۔

سڑک کی طرف سے آنے والی آوازوں کا رنگ اور تھا۔ انقلاب زندہ باد۔ روز صبح سویرے یہ آواز سنائی دیتی اور میں ڈیوڑھی کی طرف لپکتا۔ کوئی لمبا چوڑا جلوس نہیں۔ بس کھدر پوشوں کی ایک ٹولی۔ ایک کے ہاتھ میں ترنگا اور لب پہ ترانہ ؎

جھنڈا اونچا رہے ہمارا

پھر نعرے۔ انقلاب زندہ باد۔ موتی لال نہرو زندہ باد۔ سردار پٹیل زندہ بد۔ ڈاکٹر کچلو زندہ باد اور پھر سب مل کر مہاتما گاندھی کی جے۔ اور ٹولی ہمارے گھر سے پرے پرے ربڑی والے کے سامنے والی گلی میں مڑ

جاتی۔ مگر سب سے بڑھ کر جے تو راجہ رامچند رجی کی بولی جاتی تھی اور ان کی برأت کس دھوم سے نکلتی تھی۔ برأت ابھی بہت پیچھے ہے مگر ایک نرالی مخلوق۔ کہنے کو آدمی مگر پیچھے ایک لمبی دُم لگا رکھی ہے۔ سارے بدن پہ روئی کے پھوئے چپکے ہوئے، منہ پہ کالک ملی ہوئی۔ آدمی ہے یا بھتنا، سارے بازار میں کودتا پھاندتا پھر رہا ہے اور لوگ تالیاں بجا رہے ہیں۔ اے لو وہ برأت آ گئی۔ پہلے پٹا بازوں کی ٹولی نمودار ہوئی۔ پھر کوئی سنکھ پھونک رہا ہے۔ کوئی جھانجھر بجا رہا ہے۔ کوئی ڈھول پیٹ رہا ہے۔ اے لو دولہا دلہن کی سواری آن پہنچی۔ کیا لحیم شحیم ہاتھی ہے۔ مستک پہ گیرو سے اوم لکھا ہے۔ ہودے میں تین سجے بنے چہرے، راجہ رامچند رجی، سیتا جی، سری لکشمن جی اور لمبی زوردار جے۔ سری رامچند رجی کی جے۔ جے ہو، جے ہو۔ اے لو یہ برأت بھی ربڑی والے کے سامنے والی گلی میں مڑ گئی۔

ہمارے گھر کے سامنے سے تو بس ارتھیاں گزرتی تھیں۔ رام نام ستیہ ہے۔ رام نام ستیہ ہے اور ارتھی اٹھانے والے کتنی تیزی سے گزر جاتے تھے۔ مسلمانوں والے جنازوں کی طرح تھوڑا ہی کہ کلمہ پڑھ رہے ہیں اور چیونٹی کی چال چل رہے ہیں اور ہاں ارتھی تو تیزی سے گزر گئی۔ بس اس کے تھوڑی دیر بعد ہی بین کرتی ہندنیوں کی ٹولی گزرتی ہے۔ ہاتھوں میں تھوڑا ایندھن، تھوڑے گیندے کے پھول، ایک گڑوی پانی کی۔ وہ بھی اسی راہ جاتیں جس راہ سے ارتھی گئی۔ اصل میں مرگھٹ کو راستہ ہمارے محلے کے بیچ سے جاتا تھا۔ چامنڈا کے کہیں پرے ہوگا۔

اور وہ جلوس بھی تو تھے کہ ہمارے محلے کے کہیں بیچ سے نمودار ہوتے تھے اور ہمارے گھر کے سامنے سے گذرتے ہوئے بازار میں اور بازار سے نکل کر کربلا کی طرف جاتے تھے۔ دلدل کا جلوس، تعزیوں کا جلوس۔ ارے جلوس تو میں اپنی رو میں لکھ گیا ہوں۔ بس یوں کہتے تھے کہ دلدل نکل رہا ہے۔ تعزیے اٹھ رہے ہیں۔ لو یہ تو ڈبائی کے محرموں کی یاد تازہ ہوگئی۔ شام ہونے لگی ہے۔ محلے کے لڑکے بالے گھروں سے نکل پڑے ہیں۔ کسی نے کالا کرتا پہن رکھا ہے۔ کسی نے سبز۔ گلے میں تاشے، ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی قمچیاں۔ تاشا بجنے لگا ہے۔ یہ تاشا بج رہا ہے یا غم کی ہوا چل پڑی ہے۔ بس اس آواز کے ساتھ گھر گھر خبر پہنچ گئی کہ محرم کا چاند ہو گیا۔ چاند رات لگ گئی۔ بزرگوں کی سوگوار ٹولی نمودار ہوتی ہے۔ عزاخانوں کی طرف اس کا رخ ہے۔ عزاخانوں میں علم سج چکے ہیں۔ سبز سرخ پٹکوں میں لپٹی چھڑوں پر طلائی نقرئی پنجے جگمگا رہے ہیں۔ لوبان سلگ رہا ہے۔ موم بتیاں جھلمل جھلمل کر رہی ہیں۔ سوگوار ٹولی داخل ہوتی ہے۔ کھڑے کھڑے مرثیے کا کوئی ایک یا دو بند۔

جب کوچ کی شب قبر نبی پر گئے شبیر
قندیلیں جو روشن ہوئیں غش کر گئے شبیر

پھر امام مظلوم کی خدمت میں سلام۔ پھر گریہ مگر جلد ہی آنسو پونچھے اور اگلے عزاخانے کی طرف۔ آخر ہر عزاخانے میں جا کر حاضری دینی ہے۔ یہ دوسرا عزاخانہ ہے۔

سبطِ نبی سے منزلِ مقصد قریب ہے
آرام گاہ جانِ محمد قریب ہے
مولد تو دور رہ گیا مشہد قریب ہے
جس جا لحد بنے گی وہ سرحد قریب ہے
جاتے ہیں آپ خلق کی مشکل کشائی کو
آئی ہے کربلا سے اجل پیشوائی کو

گلی میں مڑکر اگلے عزاخانے میں۔ مرثیہ شروع ہوگیا۔

جب کربلا میں داخلۂ شاہِ دیں ہوا

وہی چند گنے چنے مرثیے آج کی تاریخ کے حساب سے۔ اس کے ساتھ گریہ۔ پھر رقت بھری آواز میں ایک بزرگ کا اعلان۔ عزادارو! امام مظلوم اس وقت کربلا میں نہیں ہیں۔ محرم جب آتے ہیں تو آپ ہمارے اس دیار میں تشریف لے آتے ہیں۔ گریہ...... اسی گریہ کے عالم میں امام مظلوم کی خدمت میں انگشت شہادت اٹھا کر سلام۔ پھر پلکوں سے آنکھوں کو ملا۔ علموں کی زیارت کی۔ پھر اگلے امام باڑے میں۔

تو لیجیے چاندرات لگ گئی۔ موسمِ عزا شروع ہوگیا۔ ہر موسم، ہر رُت کی اپنی بہار اپنا رنگ ہوتا ہے۔ موسمِ عزا کی بہار آنسوؤں سے ہے۔

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں

ارے ہم کیا بوئیں گے۔ زمینِ شعر میں اشک کے دانے تو انیس و دبیر بو گئے۔ موسمِ عزا آنسوؤں میں رچا بسا آتا تھا۔ آنسو شاعری میں رچ بس کر اپنی بہار دکھاتے تھے۔ میں نے شاعری کا پہلا سبق اسی مکتب میں پڑھا۔ مجلس ایک سے بڑھ کر ایک بارونق۔ ہر مجلس میں سوز و سلام، نوحہ ماتم، مرثیہ خواں، سوز خواں، نوحہ خواں۔ شاعری کی کتنی اصناف تو خالی موسمِ عزا ہی سے پھوٹی ہیں اور پھر رباعی سے بھی انہیں مجلسوں میں تعارف ہوا اور ہاں سلام۔ حضرات مومنین مرزا دبیر کی رباعی عرض ہے۔

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہ کیا
(دوسرا مصرعہ بھول گیا)

ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر
لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا

واہ واہ سبحان اللہ کا شور۔ مومنو درود بھیجو اور صلوٰۃ۔ اللھم صل علی محمد و آل محمد۔ وقفہ۔ دوسری رباعی حضور دلورام کوثری کی رباعی عرض ہے۔

کیا پہنچا مسیحا جو فلک پر پہنچا

مقصود کو اپنے نہ سکندر پہنچا
اللہ غنی کوثری کتنا چالاک
گنگا سے جو پھسلا لب کوثر پہنچا

پہلے سے بڑھ کر واہ واہ سبحان اللہ کا شور۔ نعرہ صلوٰۃ۔ اللھم صل علی محمد و آل محمد۔
مگر واہ واہ سبحان اللہ کا شور تو سب سے بڑھ کر اصغر صاحب کی مجلس میں ہوتا تھا۔ مجلس کیا پڑھتے تھے، آدھا مشاعرہ آدھی بزم گریہ۔ برس کے برس لکھنؤ سے تشریف لاتے تھے۔ سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے۔ کھلتی ہوئی رنگت، چھریرا بدن، بر میں سفید براق چکن کا انگرکھا۔ اسی چکن کی دو پلو ٹوپی سر پر۔ چوڑے پائنچوں والا لکھنوی کٹ پائجامہ۔ منبر پر بیٹھ کر پہلے استاد کی مدح۔ دولہا صاحب کو اپنا استاد بتاتے تھے۔ انہیں کا مرثیہ پڑھتے تھے اور اس کمال ادائیگی سے کہ جو منظر شعر میں بیان ہوا اس کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ دولہا صاحب کا بیان۔ اصغر صاحب کی ادائیگی۔ یزیدی لشکر کے دل کے دل بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ عون اور محمد تعاقب کر رہے ہیں ۔

چاند دو پیچھے ہیں گھنگھور گھٹا آگے ہے

مگر کب تک۔ فوج پلٹتی ہے۔ دونوں نرغے میں آ جاتے ہیں۔ کبھی ان کے چاند سے چہرے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی سپاہیوں کے ہجوم میں نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں ۔

کبھی جلتے ہیں چراغ اور کبھی بجھ جاتے ہیں

افسوس کہ مجھے کوئی پورا بند یاد نہیں ہے اور پھر کبھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ دولہا صاحب کے مرثیے حاصل کر کے پڑھے جائیں۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ بس میں نے تو یہ سمجھ لیا تھا کہ انیس کو پڑھ لیا تو اس پورے خاندان کو جان لیا کہ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔ اور رہی مرثیہ خوانی کا معاملہ تو اصغر صاحب کے کمال مرثیہ خوانی کو دیکھ کر دولہا صاحب کی مرثیہ خوانی پر قیاس کیا۔ پھر اس سے اشارہ لے کر تصور کیا کہ یہ ایسا پڑھتے ہیں تو میر انیس پڑھتے ہوئے کیا جادو جگاتے ہوں گے۔ اور کسی کا نہیں مرزا دبیر کے شاگرد صفیر بلگرامی کا بیان ہے کہ میر انیس کی ایک مجلس میں شرکت ہوئی۔ جب بیان میں یہ مقام آیا ۔

ساتوں جہنم آتش فرقت میں جلتے ہیں
شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں

تو مجھے لگا کہ میرے گرد شعلے بھڑک رہے ہیں۔ پھر میں سننے میں ایسا محو ہوا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔
میں نے اپنے تئیں اصغر صاحب کی خواندگی سے سند لی اور جانا کہ صفیر بلگرامی نے صحیح محسوس کیا اور صحیح بیان کیا۔
پھر ایسا مرثیہ خواں کہاں سے لاتا۔ سو اصغر صاحب کو اپنے لڑکپن میں جتنا سن لیا، اسے کافی جانا۔ پھر کوئی مرثیہ خواں جچے بھی سنا نظروں میں جچا ہی نہیں۔ ارے یہ تو فن ہی لکھنؤ تک تھا۔ میرے بڑے ہوتے ہوتے وہاں

سے بھی اس کا دفتر مٹ گیا۔

اصغر صاحب محرم کی جس مجلس پہ اپنا اختتام کرتے تھے، وہ بڑے علم والی مجلس تھی جو 9 محرم کی صبح نور کے تڑکے برپا ہوتی تھی۔ اس مجلس میں وہ انیس کا مرثیہ پڑھتے تھے۔ حضرت عباس کا علمدار بننا، علم لے کر ان میں جانے کے تیار ہوتا اور جب یہ مقام آتا کہ

ناگاہ علم سبز چمکتا ہوا نکلا

تو ایک دم سے حاضرین کی نظریں عزا خانے کے اس دروازے کی طرف اٹھ جاتیں۔ جہاں سے علم برآمد ہوتا تھا۔ لگتا کہ واقعی علم نمودار ہو گیا ہے اور چپ پڑ جاتی۔ اسی چپ میں بیچ بیچ وہ دروازہ کھلتا اور چاندی کا چمکتا پنجہ نمودار ہوتا اور مجمع بیٹھے سے کھڑا ہو جاتا اور سر کا ماتم ہونے لگتا۔

یہ مجلس ہماری ڈبائی کے محرم کا نقطۂ عروج تھی۔ بڑا علم نکل لیا۔ اب کیا رہ گیا۔ اب حضرت عباسؑ کے نام کی جہاں جہاں حاضری ہوتی ہے، وہاں وہاں حاضری کھاؤ۔ حلیم کھاؤ۔ پشاوری پراٹھا اور کباب کھاؤ اور جب شب عاشورہ لگے تو امام باڑوں میں جا کے سوگواروں کی صورت بیٹھو اور رقت بھری آوازوں میں پڑھے جانے والے سوز سنو۔

جب رات عبادت میں بسر کی شہ دیں نے
سجدوں میں نمازوں میں گذر کی شہ دیں نے
دیکھا جو سپیدی کو سحر کی شہ دیں نے
مڑ کر رخ اکبر پہ نظر کی شہ دیں نے
فرمایا سحر قتل کی ظاہر ہوئی بیٹا
لو اٹھ کے اذاں دو کہ شب آخر ہوئی بیٹا

میرے والد سوز سے اجتناب کرتے۔ ان سے انہیں موسیقی کی بو آتی تھی۔ رات بھر جا نماز پہ بیٹھے دعائیں پڑھتے رہتے۔ صبح کے ہونے میں جا نماز سے اٹھ کر بلا کا رخ کرتے۔ وہاں جا کر وہ دعائیں پڑھتے تھے جنہیں اعمال کہا جاتا ہے اور کتنے عزادار وہاں اس عمل میں معروف نظر آتے۔ کیسا غسل، کیسا وضو۔ پانی صبح عاشور کربلا میں کہاں تھا جو یہاں عزادار اس کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتے۔ ننگے پاؤں، ننگے سر، ملے دلے کپڑوں میں ملبوس سر جھاڑ منہ پھاڑ کربلا پہنچے ہوئے ہیں۔ اعمال پڑھ رہے ہیں۔ وہاں سے واپس آئیں گے تو تاشہ بجنے لگے گا۔ تعزیے عزا خانوں سے باہر آنے لگیں گے۔

تعزیے قطار اندر قطار، ماتمی صف بہ صف، رستے میں سبیلیں جا بجا۔ بچے بڑے شربت پی رہے ہیں۔

پیاسو یہ ہے سبیل شہیدوں کے نام کی

مگر ماتی کیسے لب تر کریں۔ ادھر کربلا کی تپتی دھرتی پر امام پیاسے کھڑے ہیں اور خیموں میں بچے گھونٹ پانی کے لیے ترس رہے ہیں۔

بولے شاہ ہدیٰ العطش العطش

اور نوحے کے ساتھ دھڑا دھڑ ماتم ہونے لگتا ہے۔ تعزیوں کو کربلا میں جا کے دفن کر آئیں۔ واپس آ کر فاقہ توڑیں گے۔

عشرہ ہوا تمام شہ مشرقین کا
دو فاطمہ کی روح کو پرسا حسین کا

عشرہ تو تمام ہو گیا مگر آگے ابھی تو دسواں، بیسواں ہے۔ پھر اربعین کی مجلسیں، پھر چہلم۔ غم کا موسم ختم ہونے میں وقت لیتا ہے۔ گریہ ہے۔ یہ کچھ ہنسی نہیں ہے۔ اس کے اپنے آداب ہیں۔ عصمت چغتائی بتاتی ہیں کہ جب وہ بچپن میں پہلی مرتبہ مجلس میں گئیں تو کیا ہوا: ''جب علی اصغر کے حلق میں تیر پیوست ہونے کا ذکر آیا تو خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔ میں نے بری طرح ڈاڑھیں مار کر رونا شروع کیا۔ ماتم کرنے والی بیبیاں ایک دم چپ ہو گئیں اور بڑی حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔'' بعد میں کیا ہوا۔ ''گھر میں جب کوئی مہمان آتا تو بھائی مجھے ذلیل کرنے کے لیے کہتے، یہ مجلس میں بھوں بھوں روئی تھی۔ نکالی گئی۔'' صحیح کہتے تھے۔ عزاداروں نے کتنی صدیوں تک اشک بہانے کے بعد، کتنی محرم کی شبوں اور کتنے عاشور کے بیچ بین کر کر کے رونے کے بے ہنگم عمل میں ایک سلیقہ پیدا کیا ہے۔ محرم کا گریہ اب ایک پوری تہذیب ہے۔ اس میں آپ بھوں بھوں کر کے نہیں رو سکتے۔ شام غریباں اور یوم عاشور کی مجالس کی اور بات ہے ورنہ کوئی مجلس عزا بھی گریہ سے شروع نہیں ہوئی۔ ذاکر کتنے مراحل سے عزاداروں کو گذارتا ہے۔ پھر گریہ کے مقام پر لاتا ہے اور اس مقام سے پہلے کتنے ڈھکے چھپے اشارے کرتا ہے کہ یہ جنگ خندق اور جنگ خیبر کا بیان نہیں کہ آپ خوش ہو کر نعرۂ صلوٰۃ بلند کریں۔ اب جو جنگ کا بیان شروع ہوا چاہتا ہے اس کے تقاضے اور ہیں۔ تو اے عزادارو! اپنے اپنے رومال نکال لو۔ ان کے تر بتر ہونے کی گھڑی آ گئی اور یہ نہیں کہ ایک دم سے سب گریہ شروع کر دیں۔ ہماری ڈبائی کی مجلسوں میں ہمیں پتہ ہوتا تھا کہ گریہ کا آغاز کس بزرگ کو کرنا ہے۔ جس امام باڑے میں اصغر صاحب مرثیہ پڑھتے تھے وہاں طے تھا کہ پہلے کنور جی ایک رقت بھری چیخ کے ساتھ روئیں گے۔ لو گریہ کا حرف آغاز ہو گیا۔ پھر جس کا جتنا حوصلہ ہے اتنا گریہ کرے۔

پتہ نہیں اور کتنے دن تک گریہ کا موسم چلتا مگر ربیع الاول کا مہینہ آ جاتا اور بارہ وفات کی سواری آن پہنچتی۔ مجالس کا موسم ختم، اب مولود شریف کا موسم شروع ہوتا ہے۔ ارے میلاد النبی ﷺ تو اب کہنے لگے ہیں اور اس کے ساتھ میلاد شریف۔ ڈبائی میں ہم اس موسم کو بارہ وفات کے مبارک نام سے جانتے تھے اور محفل میلاد کا نام کسی کسی ثقہ بزرگ کی زبان سے سننے میں آتا تھا۔ ہم سب مولود شریف کے نام سے ان مبارک

محفلوں کو یاد کرتے تھے اور مجلس عزا اور مولود شریف میں کم از کم ایک چیز تو مشترک تھی۔ وہ تھا تبرک۔ اور ہم ایسے بچوں بالوں کو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے تھا۔ آج مولود شریف میں علی گڑھ والے بسکٹ بٹتے ہیں، کل نان خطائیاں بٹیں گی۔ پرسوں بالوشاہیاں۔ اترسوں بدایوں کے پیڑے۔

یا نبی سلام علیک
یا رسول سلام علیک

ارے لو سلام شروع ہو گیا۔ دوڑو، تبرک بٹنے والا ہے۔ ہاں تبرک سے یہ یاد آیا۔ برادری کنبہ والوں میں سے جو لوگ پردیس میں جا بسے تھے، ان میں سے کچھ عزیز رشتہ دار محرم کی آمد کے ساتھ یہاں پہنچتے تھے اور کچھ بارہ وفات کے بیچ آتے تھے۔ حکیم شمیم حافظ صدیق حسن فاضلی بارہ وفات کے موقع پر بدایوں سے آتے تھے اور بدایوں کے پیڑوں سے لدے پھندے آتے تھے۔ تو ان کی طرف سے جو مولود شریف ہوتا تھا، اس میں بدایوں کے پیڑے بٹتے تھے۔ وہیں سے تو میں نے جانا تھا کہ بدایوں کی سوغات وہاں کے پیڑے ہیں۔

اور ہاں پھر پردیس والوں کی واپسی کی بھی تو ایک ریت تھی۔ کم از کم محرم کے پردیسی تو اس ریت کو پابندی سے نباہتے تھے۔ جب عاشور کی شب گزر جاتی اور گیارہ کی صبح چڑھتی تو بیبیوں کی لڑائی شروع ہو جاتی۔ گالی کوسنے، طعنے مہنے، پھبتیں، الزام تراشیاں۔ کب کب کے بھولے بسرے عیب ثواب یاد دلائے جاتے۔ فلاں کا معاشقہ اور فلاں کا چھنالا، سب ہی کچھ اگلا جاتا۔ یہ بھی شاید ضروری تھا۔ آخر دس دنوں میں جو ایک دوسرے سے شکایتیں پیدا ہوتی تھیں، وہ محرم کے بیچ تو نہیں بکھانی جا سکتی تھیں۔ مولا کو رونے کے بعد ہی یہ رسم ادا ہونی تھی اور گیارہ محرم ہی کو ادا سکتی تھی۔ بارہ کی صبح کو تو سواریاں سٹیشن کی طرف ڈھلنی شروع ہو جاتی تھیں۔ 12 کی صبح کو کتنے لدے پھندے اکے کس کس گلی سے نکل کر سٹیشن کی طرف جاتے نظر آتے تھے۔

پردیسیوں کی گہما گہمی بس محرم اور بارہ وفات کے موقعوں پر ہوتی۔ باقی عید بقر عید شب برأت کی اپنی رونقیں تھیں مگر یہ رونقیں پردیسیوں کی شرکت کے بغیر ہی اپنی بہار دکھاتی تھیں۔ عید بقر عید کی اپنی اپنی رونق تھی مگر سب سے بڑھ کر رونق تو شب برأت پر ہوتی تھی۔ ہائے کیسا جگمگاتا تیوہار تھا۔ پھلجھڑیوں، قندیلوں کی رنگا رنگ روشنیوں میں نہایا ہوا۔ مولوی ملاؤں کو مصلحین کو، پولیس کو خدا سمجھے۔ انہوں نے اس کی ساری رونق اس سے چھین لی۔ ارے نیک بختو، جس آتش بازی سے جان کے زیاں کا اندیشہ رہتا تھا، وہ تو مرسل پٹاس والے پٹاخے تھے جو اناڑیوں کے ہاتھوں میں آ کر خرابی پیدا کرتے تھے۔ وہ جو رنگا رنگ پٹاخے تھے، پھلجھڑی، مہتابی گل دوپہری، سری، تتیا، چھچھوندر، تونتا، نش پلیا، ان میں کونسا ضرر چھپا ہوا تھا۔ ہاں یہ جو میں نے نش پلیا کہا، اس کی سن لو۔ جسے ہم اب انار کہتے ہیں، اسے پرانی اردو میں ناشپال کہتے تھے۔ کم از کم ہماری ڈبائی میں تو یہی نام رائج تھا۔ اہل لغت نے اسے ناسپال لکھا ہے مگر ناشپال سے جو پھول ایسی چنگاریوں کا فوارہ چھوٹتا تھا، وہ تو بہت اونچا جاتا تھا۔ تو ناشپال تو ہمارے یہاں شادی بیاہ میں جو آتش بازی چھوٹتی تھی، اس میں بہار

دکھاتے نظر آتے تھے۔شب برأت کے موقع پر منی سائز کے ناشپال اپنی بہار دکھاتے تھے۔انہیں ہم نش پلیاں کہتے تھے۔اس بے ضرر آتش بازی سے بچوں کی عید ہو جاتی تھی اور شب برأت رنگ و نور کا تیوہار بن جاتا تھا۔ بھلا پوچھیے یہ رنگ و نور کی بہار کس طرف سے غیر اسلامی تھی اور کس حساب سے لہو ولعب میں شمار ہوئی۔

اور ہاں شب برأت کا حلوہ۔حلوے اور روٹی پر مردوں کی فاتحہ مگر تخصیص کے ساتھ حلوہ کیوں۔ ہماری اماں ابا نے بتایا کہ جنگ احد میں حضور پاک ﷺ کا مبارک دانت شہید ہو گیا تھا تو بی بی فاطمہؓ نے ان کے لیے حلوہ پکایا تھا۔سو یوں تھا کہ شب برأت کا حلوہ تو سنت ہے۔سو اب تک کس ذوق وشوق سے حسب مقدور اس مبارک دن حلوے تیار کیے جاتے ہیں۔نیاز دلاتے ہیں۔بانٹتے ہیں اور خود کھاتے ہیں۔

ہاں یاد نہیں، یہ ہم نے اماں ابا سے سنا تھا یا کسی اور بڑی بی سے کہ اس شب فرشتے سال بھر کے مرنے جینے کا حساب تیار کرتے ہیں۔سو ہم اس شب کتنی توجہ سے اور کتنا ڈرتے ڈرتے اپنی پرچھائیں دیکھتے تھے۔اگر خدانخواستہ کسی کی پرچھائیں غائب ہوتی تو مطلب یہ ہوتا کہ برس کے اندر اندر اسے کوچ کر جانا ہے۔

ارے ہاں، ہمارے امام زماں بھی تو اسی شب پیدا ہوئے تھے۔لو خوشی میں ایک اور خوشی شامل ہو گئی۔عریضوں کی رسم اسی تقریب سے تو ہے۔پھر ہمارے والد صاحب کا قلمدان اسی پچھلے اہتمام سے چوکی پر جا نماز کے برابر رکھا جاتا اور چینی کی ننھی سی پیالی میں زعفران گھولا جاتا۔امام زماں کی خدمت میں جو عریضہ بھیجا جائے گا، وہ کالی پیلی روشنائی سے تھوڑا ہی لکھا جائے گا۔زعفرانی روشنائی سے لکھا جائے گا۔سو والد صاحب خاندان کے کس کس فرد کی طرف سے عریضے پر کرتے۔آدھے صفحہ پر عربی عبارت چھپی ہوئی تھی۔ آدھے صفحہ پر جو بھی آرزو جو بھی خواہش ہے، اولاد کی یا رزق کی یا اور کوئی بھی اسے نرسل کے قلم سے زعفرانی روشنائی میں ڈبونے کے بعد رقم کیا جاتا۔پھر ان مہکتے عریضوں کو گوندھے آٹے میں لپیٹ کر گولیاں بنائی جاتیں۔پھر پچھلے پہر ان گولیوں کو لے کر نکلتے اور وہ جو چامنڈا سے پرے چھوئیا بہہ رہا تھا، اس کی لہروں کے سپرد کر دیتے۔چھوئیے میں اگر مچھلیاں نہ بھی ہوں تو اس شب کو ضرور آتی ہوں گی۔یہ ڈیوٹی تو انہیں کی چلی آتی تھی کہ ان عریضوں کو امام زماں کی خدمت میں پیش کر دیں۔اس پہ لپٹا ہوا آٹا بے شک خود کھالیں۔یہ تو اس نیک کام کی اجرت تھی۔

مگر شب برأت سے پہلے ایک تیوہار اور بھی تو آتا تھا۔بھلا کونسا تیوہار۔مسلمانوں کے تو گنے چنے تین تیوہار ہیں۔عید، بقر عید، شب برأت۔شب برأت سے پہلے بیچ ماہ رجب میں یہ کونڈوں کا شور کیسا ہے اور یہ کس خوشی میں کونڈوں کی نیاز ہو رہی ہے اور کس اہتمام سے۔ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ پہلے سے ہمارے گھر میں اس کی تیاری شروع ہو جاتی تھی۔وہ بڑا دالان جس میں برابر برابر دو چوکیاں جوڑ کر ان پر سفید چادر بچھائی جاتی تھی۔ اس کے فرش کی پہلے لپائی ہوتی تھی۔پھر در و دیوار کو پوتا جاتا تھا۔پھر 21 رجب کو صبح سے لے کر شام تک برتنوں

کی دھلائی منجھائی ہوتی رہتی تھی۔ صرف برتنوں کی نہیں چمٹا، پھونکنی، کڑھائی، توا سب کو دھونے کے بعد تین تین دفعہ تریڑے دے کر پاک کیا جاتا تھا اور ایا اماں بتاتی تھیں کہ پہلے تو وہ لکڑیاں بھی جو اس شب ایندھن کے طور پر استعمال ہوتی تھیں، دھو کر پاک کی جاتی تھیں۔ مٹی کے کونڈے دھوئے جاتے اور اسی طرح پاک کیے جاتے۔ کئی دن تک دھوپ میں سوکھنے کے بعد وہ لکڑیاں اس قابل ہوتی تھیں کہ چولہے میں جلائی جائیں۔ ہاں چولہا بھی تو الگ ہی تیار ہوتا تھا۔ وہیں دالان میں جہاں نیاز ہوتی تھی۔ شام سے کڑھائی چڑھائی جاتی۔ رات بھر چڑھی رہتی۔ میدے سوجی کی میٹھی پوریاں مستقل تلی جا رہی ہیں۔ ادھر صبح کی اذان کان میں پڑی۔ ادھر نیاز شروع ہوگئی۔ حضرت امام جعفر صادق کے نام کی نیاز۔ مگر کس خوشی میں، کچھ پتہ نہیں۔ کوئی کہانی تھی کہ کسی بوڑھیا نے امام سے اپنی مفلسی کا رونا رویا۔ انہوں نے فرمایا کہ پوریاں پکا کر فلاں لکڑہاڑے کی کہانی سنو اور سناؤ اور پھر نیاز دلاؤ، مراد پوری ہوگی۔

اب جن جن کی مرادیں ہیں، وہ پوریاں پکا رہے ہیں اور امام کی نیاز دلا رہے ہیں مگر پاکیزگی پر کتنا زور ہے اور کتنی پابندیاں ہیں۔ نیاز کی پوریاں شام تک ختم ہو جانی چاہئیں۔ انہیں نیاز کی چوکی سے اٹھانا نہیں ہے۔ اٹھانا پڑ جائے تو انہیں لے کر نالی نہیں ناکھنی چاہیے۔ سو شام پڑے میری والدہ محلّے کے بچوں کو سمیٹتی پھرتیں کہ آؤ بچو اور پوریاں کھاؤ۔ اس طرح کہ کسی کونڈے میں پوری کا کوئی ٹکڑا، کوئی ریزہ باقی نہ بچے۔

خیر اس کے بعد جو 26 رجب کو کونڈے ہوتے تھے ان کے متعلق تو طے تھا کہ یہ نیاز شب معراج کی خوشی میں ہے۔ مگر اس میں نہ پوریوں کی کوئی قید تھی نہ مٹی کے کونڈوں، پیالوں کی۔ جو لذیذ غذائیں مقدرت میں ہیں، تیار کرو اور کونڈوں میں، چینی کے طشت میں، ڈونگوں میں، جس میں جی چاہے سجا کر رکھو۔

بس بس انتظار حسین۔ حکایت کو اتنا بھی نہ بڑھاؤ کہ اسے ہضم کرنا دشوار ہو جائے۔ محرموں میں محرم لکھنؤ کے۔ تم نے تو اپنی ڈبائی کے محرم کو لکھنؤ کے محرم کے مقابل لا کھڑا کیا اور شب برأت کی ساری حکایت سنا دی۔ یہ بتایا ہی نہیں کہ تر تراتے حلوؤں کے بیچ مسور کی دال کی کیا تُک ہے اور عید کی سویاں۔ تم نے محققوں کی اس بات پہ کوئی کان نہیں دھرا کہ یہ تو تم لوگوں نے رکھشا بندھن منانے والوں سے مستعار لی ہیں۔ پھر مولوی مُلا کیا غلط کہتے ہیں کہ گمراہ مسلمانوں نے پاک صاف اسلامی تیوہاروں میں بلکہ ہر دینی تقریب میں کفر کی ملاوٹ کر دی ہے اور تمہیں سب تج تیوہار یاد رہے۔ شاہ مدار کی چھڑیوں کو کیوں بھول گئے اور ہاں مٹھی بھر مسلمانوں کے تج تیوہار نہیں بلکہ ان کے ہجری کیلنڈر کو بھی ایسے بیان کیا ہے کہ جیسے اس بستی میں بس اسی ایک کیلنڈر کا بول بالا تھا۔

سیدھی سچی بات تو یہ ہے کہ اپنا تو لکھنؤ یہی چھوٹی سی بستی ڈبائی تھی۔ ہاں مسور کی دال کو صحیح یاد دلایا۔ شب برأت کی شام کو حلوے تو اہتمام سے بنتے ہی تھے مگر ہماری والدہ نے حلوؤں کے بیچ یہ کبھی فراموش نہیں کیا کہ ہنڈیا آج مسور کی دال ہی کی پکے گی۔ مسور کی دال ہی آخر کیوں؟ یہ مت پوچھو، رسموں رواجوں کی کوئی

منطق نہیں ہوا کرتی۔ بس یہ کہاوت سن لیجیے ؎

سب دالوں میں دال بڑی ہے
سب سے بڑی مسور

اور سویاں رکھشا بندھن ہی سے لی ہوں گی۔ مگر یہ تو دیکھیے کہ سویاں عید پر آ کر کیا سے کیا بن گئیں۔ کیسے کیسے ذائقے اس سے نکلے ہیں کہ شیر خوب، سویوں کا زردہ مرغوب، کھاؤ اور ہونٹ چاٹتے رہ جاؤ۔

اور یہ جو ہجری کیلنڈر ہے، ویسے تو یہ اسلام کے طفیل عرب سے ہمارے یہاں آیا تھا مگر اس دیار کی بیبیوں نے عربی رنگ کاٹ کر ان مہینوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا یا شاید دلی کی بیبیوں نے یہ کمال دکھایا ہو۔ تو ربیع الاول کا مہینہ بارہ وفات کا مہینہ بن گیا۔ ربیع الثانی میراں جی کا مہینہ یا گیارہویں کا مہینہ۔ شعبان کا مہینہ شب رات کا مہینہ۔ شوال عید کا مہینہ۔ ذی قعد کے مہینے میں کوئی تیج تیوہار نہیں۔ سو یہ خالی کا مہینہ کہلایا۔

ارے ہم نے تو اکٹھے تین کیلنڈر اپنا رکھے ہیں اور کیا خوب تقسیم کار کی ہے کہ دنیا کے کاموں کے لیے عیسوی کیلنڈر، دینی معاملات ہجری کیلنڈر کے ذمے، جاڑے گرمی، برسات کا کاروبار بکرمی کیلنڈر کے سپرد۔ بس ذرا نوروز کے موقع پر ہمارے والد صاحب ہجری کیلنڈر سے انحراف کر کے عیسوی کیلنڈر سے رجوع کرتے تھے یا شاید جنتری سے قدیم ایرانی مہینے کا پتہ لگا لیتے ہوں، یاد نہیں۔ قدیم ایرانی مہینے جاننے ہوں تو فارسی شاعری سے رجوع کرو۔ جہاں تہاں ہماری پچھلی شاعری میں بھی ان کے حوالے مل جائیں گے۔ جیسے سودا کے کسی قصیدے میں اس رنگ سے ؎

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستان سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

مگر ہماری اردو شاعری کی روایت نے یوں فارسی سے بہت کچھ لیا اور ہضم کر لیا۔ فارسی سے بہار اور خزاں بھی لے لیے مگر فارسی مہینے اسے ہضم نہیں ہوئے۔ باقی رہا بکرمی کیلنڈر تو وہ تو ہماری زمینی مجبوری تھی۔ باقی مہینوں کو فراموش بھی کر دیتے مگر ساون بھادوں سے بچ کر کہاں جاتے۔ ان کے جادو نے تو ایسا پکڑ رکھا تھا کہ برسات کو برسات نہیں کہتے تھے۔ ساون بھادوں کہتے تھے۔ مہینوں کے نام کہاں رہ گئے تھے۔ اس موسم کا نام ہی اب ساون بھادوں تھا۔

اے لو یہ تو برسات کا ذکر نکل آیا مگر برسات کا ذکر مقصود ہے تو پہلے ان کٹھن دنوں کا ذکر کرنا پڑے گا جنہیں گرمی کا موسم کہتے ہیں۔ گرمی کا موسم الہٰی توبہ۔ ہماری بستی میں گرمی کے نام واقعی آگ برستی تھی لیکن گرمی کا ذکر کرنا ہے تو پھر ہماری بستی کے جاڑوں نے کیا خطا کی ہے۔ ایسا جاڑا پڑتا تھا کہ دانت سے دانت بجتا تھا اور ہونٹوں سے پھو پھو کی آواز نکلتی تھی۔ ارے تو کیا میں بارہ ماسہ لکھنے لگا ہوں مگر کاش میں لکھ سکتا۔ سوچتا ہوں کہ شاعر ہوتا تو میں بارہ ماسہ ضرور لکھتا۔ پتہ نہیں ہمارے شاعروں نے اس صنف کو کیوں درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ سمجھ

لیا کہ افضل جھنجھانوی نے جو بارہ ماسہ لکھ دیا ہے، وہ کافی ہے مگر اس بارہ ماسے کو بھی ہماری دنیائے ادب نے کب گانٹھا۔ ویسے یہ بارہ ماسہ بارہ ماسہ کم ہے، برہہ کا گیت زیادہ ہے۔ موسموں کا ذکر برائے نام، برہن کے دکھ درد کا ذکر بہت۔ پتہ چلا کہ موسم سخت ہو یا نرم ہو برہن پر بہر حال بھاری گزرتا ہے۔

جو آیا ماہ پھاگن کیا کروں ری
بجن پردیس، میں نت دکھ بھروں ری
سلونی، سانولی اور سبز گوری
سبھی کھیلیں پیا اپنی سیں ہوری
گلال اندر بھگیں ہیں لال ساری
بجاویں دف پیا کے تال ساری
ولے میں ہو رہی مرجھائی تم بن
ہزاراں برس بیتے مجھ اپر چھن
نمی دانم چہ شد ازمن خطائے
کہ اب تک تم پیا گھر کوں نہ آئے

پھاگن کے بعد چیت اور چیت کے بعد بیساکھ۔ رُت بدل گئی۔ اس حساب سے طبیعتوں کا رنگ بدل گیا۔ حالت نہ بدلی تو برہن کی نہ بدلی ؎

سنو سکھی کہ اب بیساکھ آیا
کوئل نے انبہ پر چڑھ شور لایا
سنی آواز کوئل اور پپیہا
رہے دن رین کیونکر میرا جیا
اری اس مانس سب عشرت کرت ہیں
ہمن کی پاپنی نت دکھ بھرت ہیں
بھیا آنند سکھ در جملہ عالم
پیا بن بر خدا معلوم حالم

بیساکھ کے بعد جیٹھ، جیٹھ کے بعد اساڑھ۔ مگر میں یہ مہینے کیوں گن رہا ہوں۔ ان مہینوں سے تو بس ہماری ایا اماں انصاف کرتی تھیں۔ وہی موسم کے بدلنے کے ساتھ بتایا کرتی تھیں کہ کونسا مہینہ ہے اور کونسی رُت ہے۔ ہمارے والد صاحب تو بس ہجری مہینوں سے غرض رکھتے تھے۔ 29 کی شام آئی اور وہ تحفۃ العوام لے چھت پہ چڑھ گئے۔ مغرب کی سمت میں آسمان پر نظر دوڑا رہے ہیں کہ چاند کدھر ہے۔ نمودار ہوا یا نہیں ہوا

مگر یہ جو ہمارے گھر میں ہجری کیلنڈر کا راج تھا، اس کا ذکر تو میں کر چکا ہوں۔ مطلب یہ کہ ہم نے ہمارے گھر نے چاند سے اپنا رشتہ جوڑ رکھا تھا۔ اسی کی شعاعوں سے جو بارہ مہینے عرب کی سرزمین پر پھوٹتے تھے۔ انہیں کی چکاچوند میں ہم اپنے تیج تیوہار مناتے تھے۔ کوئی مہینہ کسی مقدس ولادت کا مژدہ سناتا آتا تھا۔ کسی مہینے کا چاند شہادت کی خبر دیتا تھا مگر آخر ہم ایک جغرافیہ سے بھی تو بندھے ہوئے تھے اور جس دھرتی کی خاک دھول پھانکتے ہم نے ہوش سنبھالا تھا، اس کی کوکھ سے بھی تو ایک بارہ ماسے نے جنم لیا تھا اور وہ بارہ ماسے جن رُتوں کی برأت ساتھ لے کر آتا تھا ان کے اثر سے ہم بچ کر کہاں جا سکتے تھے۔ جاڑا غضب، گری قیامت اور ان گرمیوں کی دوپہریں بلکہ دوپہریاں اور ان کے بیچ چلتی لو۔ قیامت در قیامت۔ مگر انہیں دوپہریوں میں تو ہم زیادہ شغف کے ساتھ بستی کی خاک چھانتے تھے۔ گلیوں کی خاک کو روندتے ہوئے آبادی سے باہر نکل جاتے۔ آگے سماں اجاڑ سنسان جیسے نرجن بن میں چل رہے ہیں۔ نہ پرندوں کی چہکار نہ گل پھول کی مہکار۔ درختوں پہ مردنی چھائی ہوئی۔ کھیت پژمردہ۔ دور دور تک نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد اور اگر کسی بٹیا پر کوئی جنا سر پہ گٹھڑ رکھے جاتا نظر آتا تو اس پر سوسو طرح کے شک گزرتے۔ جانے کون ہے۔ آدمی ہے یا کوئی اور روح۔ لو زور پکڑ جاتی اور تیزی سے چکراتا ہوا کوئی بگولا اٹھتا تو سہم جاتے کہ پتہ نہیں یہ بگولا ہی ہے یا کوئی جن اپنا زور دکھا رہا ہے۔ کہیں ہمیں اڑا کر نہ لے جائے۔ خیر جن تو نہیں مگر چڑیل تو ہم میں سے کسی نہ کسی کو نظر آ ہی جاتی تھی۔ اس کمبخت کو بھی ایسی ہی گرم دوپہروں میں مٹرگشت کی سوجھتی تھی۔ دوپہریوں کے ہمارے ایک ساتھی منے نے قسمیں کھا کھا کے بتایا کہ ادھر کربلا کے پیچھے جو پیپل ہے، واں پہ چڑیل تھی۔

''جھوٹ، تجھے کیسے پتہ چلا کہ چڑیل ہے۔''

''میں سمجھا کہ کوئی ڈوکریا ہے۔ پیروں کو جو دیکھا تو کیا دیکھوں ہوں کہ ایڑی آگے پنجے پیچھے۔ ارے یہ تو چڑیل ہے۔ بس جی میں نے دوڑ لگا دی۔ خنخناتی ہوئی جانے کیا کہہ رہی تھی۔ میں نے تو بھیا مڑ کے دیکھا ہی نہیں۔''

پھر تو ہمیں اعتبار کرنا پڑا۔ پھر خود ہمیں ایک خوف نے آلیا۔ بھاگو۔ کسی نے کہا اور ہم بھاگ کھڑے ہوئے۔

پھر برسات شروع ہو گئی۔ تو پھر ہم ادھر گئے ہی نہیں۔ یہاں سے وہاں تک جل تھل تھا۔ کیسے جاتے۔

برسات کی مت پوچھو۔ ساون من موجی مہینہ ہے۔ اپنی مرضی سے برستا ہے۔ ضد پہ آ جائے تو ہفتوں نہ برسے۔ مچاتے رہو غل۔ لونڈے لپاڑے ننگے بدن پہ کالونس ملے ہوئے شور مچاتے پھر رہے ہیں:

کالے ڈنڈے پیلے ڈنڈے

برسو رام دھڑاکے سے

بوڑھیا مر گئی فاقے سے

مگر سب بے اثر۔ بادل آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں۔ پھر جب برسنے پہ آئے تو ایسا برسے کہ الٰہی توبہ۔ جمعرات کو اگر شروع ہو تو سمجھو کہ جھڑی لگ گئی۔ اب اگلی جمعرات ہی کو کھلے تو کھلے اور کیا خبر تب بھی نہ کھلے۔ موسلا دھار بارش سے گذرے تو لیجیے پھوار پڑنی شروع ہوگئی۔ دن گذرا، رات گذری اگلا دن آ گیا اور پھوار پڑے جا رہی ہے۔ ایسے میں کرنے کے لیے کیا رہ گیا ہے اور کرنے کا کوئی کام ہو بھی تو اس پر طبیعت کہاں مائل ہوتی ہے۔ ایسے میں تو اور ہی طرح کی باتیں سوجھتی ہیں۔ سو گھر میں چولہے پہ کڑھائی چڑھے گی۔ سو طرح کے پکوان پکیں گے۔ پھلکی، پکوڑے، پوڑے، پوریاں، چنے کی دال کے پراٹھے اور لڑکیاں بالیاں جھولا جھولیں گی۔ بس گھر میں کوئی درخت ہونا چاہیے آم کا، املی کا، نیم کا۔ لمبی لمبی پینگیں۔ ان کے ساتھ ساون کے گیت۔

جھولا پڑا املی کی ڈال
گھری گھٹا چاروں اور

کھلی چنبیلی، چمپا، جوہی
گجرا پہن پہن سکھیاں

دادر، مور، پپہرا بولے
موکا یاد آوے میکے کی

بدرا گرجے، بجلی چمکے
برنا مورے بیرن

جھولیں سب سکھیاں پیاری
دھرتی ہوئی ہریالی
جھولا پڑا املی کی ڈال
مہکے کیسر کیاری
پینگ لگاویں نیاری
جھولا پڑا املی کی ڈال
کوکیلا لگائے کوک نیاری
بہن پیاری پیاری
جھولا پڑا املی کی ڈال
میں کھڑی آنگن کے بیچ
دیکھوں راہ تمہاری
جھولا پڑا املی کی ڈال

جھولا جھولنے والیوں نے صحیح کہا۔ دادر، مور، پپیہا، کوئل سب مل کر برکھا بیچ کتنا شور مچاتے تھے۔ ادھر بارش تھمی اور ادھر مور نے جھنکارنا شروع کیا۔ جانے کون سے دور کے باغ میں بولتا تھا۔ آواز ہمارے گھر تک آتی تھی۔ پھر پپیہے کی پی کہاں، پی کہاں اور کوئل کی کوک، لگاتار کوکے جا رہی ہے۔ خیر یہ تو سریلی آوازیں ہوئیں۔ ان کے بیچ یہ دادر کہاں سے کود پڑا یعنی مینڈک۔ مگر ادھر بارش تھمی اور شام کا دھندلکا پھیلا اور انہوں نے مل کر ٹرٹرانا شروع کر دیا۔ ان کی ٹرٹر سے مور یقیناً بہت بے مزہ ہوتے ہوں گے مگر یہ تو قدرت کا انتظام ہوا۔ وہ بیچارے اپنی جھنکار سے مینڈکوں کا منہ بند تو نہیں کر سکتے تھے اور کوئل اس کی مت پوچھو۔ نظر نہیں

آتی جیسے پردے میں ہو۔ بس اس پردہ نشین کی لمبی کوک سنے جاؤ۔ بلبل فقط آواز ہے۔ نہیں بلبل نہیں کوئل۔ کوئل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ۔ مگر فقط رنگ نہیں۔ آواز کیا اس کی کم سُریلی ہے۔ مگر میں کوئل کی بات کر رہا تھا۔ وہ اور درختوں پر بھی بیٹھتی ہوگی میں یہی سمجھتا تھا کہ بس آم کے درخت پر پتوں میں چھپ کر بیٹھتی ہے اور آم کھا تو نہیں سکتی مگر آم پر بیٹھ کر پاد تو سکتی ہے۔ یہ جو کسی کسی آم پر کالا دھبا پڑا ہوتا ہے اسے ہم کوئل پدا آم کہتے تھے اور شوق سے کھاتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ اس پر کوئل نے پادا ہے۔ ضرور میٹھا ہوگا مگر خود آم کیوں نہیں کھا سکتی۔ روایت یوں ہے کہ جب تک آم پک کر تیار ہوتا ہے تب تک اس کی باچھیں پک جاتی ہیں۔ سو غریب جس نے کوکتے کوکتے یہ سارے دن گزارے تھے اور آموں کو پکنے کے عمل میں سہارا دیا تھا، انہیں کھانے سے محروم رہتی ہے۔ کھاتے ہم ہیں۔ وہی مضمون ہوا کہ دکھ بھریں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔

ارے میں پرندوں کا ذکر کیے جا رہا ہوں۔ برسات کی اس رنگا رنگ امت کو کیوں فراموش کیا جائے جو تر بتر دھرتی سے برآمد ہوتی ہے۔ اس امت میں خالی سانپ سنپولیے اور کنکھجورے تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ وہ تو زہری کیڑے ہوئے اور کیڑے مکوڑے بھی تو ہوتے ہیں۔ کینچوے، کنسلائیاں، آنکھ پھوڑے اور روشنی کے گرد منڈلاتے پروانے۔ آنکھ پھوڑے تو میں نے تکلفاً کہا ہے یا سمجھ لیجیے کہ از راہ لغت۔ ہم تو اسے آنکھ پھٹا کہتے تھے۔ ایک آنکھ پھٹا وہ ہوتا تھا کہ بالکل سبز کہ گھاس میں بیٹھا ہو تو بالکل گھاس۔ چھیڑو تو پھرر کر کے اڑا اور ہم سمجھتے تھے کہ سیدھا ہماری آنکھ پہ آئے گا اور ہمارے دیدے پھوڑ دے گا۔ ان میں سب سے بڑھ کر اور سب سے خوبصورت وہ ننھی مخلوق تھی جسے بیر بہٹی کہتے ہیں۔ رات کو بارش ہوئی اور صبح صبح ہم نکل پڑے۔ آبادی سے باہر کسی باغ میں کسی سبزہ زار میں جا پہنچے۔ بیر بہٹیاں ہی بیر بہٹیاں۔ جیسے کسی فنکار نے لال مخمل سے تراش تراش کر یہ گٹھیاں سبزے پر بکھیر دی ہیں اور وہ شاداب سبزے کے فیض سے متحرک ہوگئی ہیں مگر ذرا ہاتھ لگا کر دیکھو۔ فوراً جامد ہو جائیں گی۔ انہیں سمیٹا اور شیشی میں بھر لیا۔ تھوڑی سی پیلی مٹی ڈال دی۔ لو انہیں غذا میسر آ گئی۔ پھر رینگنے لگیں۔ قدرت خدا کی، ایک چھینٹا پڑا اور دھرتی کے اندر سے اچھا برا کتنا کچھ نکل پڑتا ہے۔ شاید دھرتی کے اندر بھی ایک دنیا آباد ہے۔ ہماری اپّا اماں کہا کرتی تھیں کہ دھرتی کے بھیتر پاتال ہیں۔ وہاں سانپوں کے راجہ کا جسے وہ راجہ باسُٹھ کہتی تھیں محل ہے جو اندھیرے میں جگر جگر چمکتا ہے۔ ہمارے ہمجولی کہتے تھے کہ زمین کے اندر بالشتے رہتے ہیں۔ اگر کانی انگلی سے ایک بالشت گہری زمین کھودی جائے تو بالشتے نکل پڑیں گے۔ ہم میں سے کسی کی کانی انگلی میں اتنا دم نہیں تھا کہ بالشت بھر گہری زمین کھودے، اس لیے بالشتیوں کو دیکھنے کی بس آرزو ہی رہ گئی۔ خیر ایسی اور کتنی آرزوئیں تھیں جو کبھی پوری نہ ہوئیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کبھی مجھے جن دکھائی تو دے۔ میرے ساتھ کے سب ہی آوارہ گردوں کو کسی نہ کسی موقع پر کوئی جن ضرور نظر آیا۔ بس مجھے ہی کبھی دکھائی نہیں دیا۔ ارے کچھ پتہ تو چلتا کہ وہ ہوتا کیسا ہے۔

اے لو ذکر تھا ساون بھادوں کا۔ بات کہاں سے کہاں نکل گئی اور یہ جن کہاں سے بیچ میں آن

کودے۔ ساون بھادوں جڑواں مہینے ضرور ہیں مگر یہ مت سمجھو کہ وہ یک رنگ ہیں۔ برکھا مشترک مگر ساون کی برکھا کا اپنا رنگ ہے۔ بھادوں کی برکھا کا اپنا رنگ ہے۔ ساون کی جھڑی، بھادوں کی بھد بھدی۔ ساون میں جھڑی ایک دفعہ لگ جائے۔ بس پھر چل سو چل۔ اذانیں دینے کی نوبت آجاتی تھی۔ مطلب یہ ہوتا کہ اللہ میاں بس کرو۔ باران رحمت کو رحمت ہی کی حد تک رہنے دو۔ ایسا نہ ہو کہ زحمت ایسی بن جائے کہ خلقت تراہ تراہ پکار اٹھے۔ رہا بھادوں کا مہینہ تو اس منزل تک آتے آتے برسات کے لشکر کا زور ویسے ہی ٹوٹ جاتا بلکہ نوبت یہ آجاتی کہ بدلی آئی، بھد بھد برسی اور آن کی آن میں یہ جا وہ جا۔ یہ بھی ہوتا کہ بل میں جتے بیل کا ایک سینگ بوندوں سے شرابور، دوسرا سینگ بالکل سوکھا۔

ویسے تیج تیوہار میلے ٹھیلے بھادوں ہی میں ہوتے تھے۔ سلونے بھی اسی مہینے میں اور جنم اشٹمی بھی اسی مہینے میں۔ اور ہندوؤں کا جو بھی تیوہار ہوتا میلے کا سماں ساتھ لے کر آتا۔ کھلونے تو خیر رنگا رنگ کے بکتے ہی تھے۔ ان کے بیچ ہمارے مطلب کی بھی کئی چیزیں ہوتیں۔ پھرکی، چکئی، لٹو۔ اے لو اس ذکر پر مجھے اپنی غلیل یاد آ گئی۔ میرے چچا تو بندوق سے شکار کرتے تھے اور کیسا کیسا شکار کرتے تھے۔ مرغابی سے لے کر ہرن بلکہ نیل گائے تک جو بھی زد میں آجائے مگر میں اپنی غلیل کے زور پر شکاری بنا ہوا تھا مگر ایسا شکاری جس کی غلیل پر کسی چڑیا کسی پدی کا خون نہیں ہے۔ ویسے تو میں پرندے کو تاک کر ہی غلیل چلاتا تھا اور سمجھتا تھا کہ غلہ پرندے کے پوٹے پر جا کر لگے گا مگر میری غلیل سے نکلا ہوا غلہ کبھی کسی چڑیا کے پوٹے پر جا کر نہیں لگا۔ اس وقت تو بہت محرومی کا احساس ہوتا تھا کہ کبھی ایک پدڑی بھی نہ ماری مگر تیر انداز بنے پھرتے ہیں مگر اب اپنی غلیل بازی کو دھیان میں لاتا ہوں تو ایک اطمینان ہوتا ہے کہ کسی جاندار کا خون میری گردن پر نہیں ہے۔ غلیل سے دھیان کس طرف چلا گیا۔ یہ پہاڑا ہے یا کچھ اور۔

ایک دو دس
تیتر کی توڑوں نس
نس میں لگا تالا
تو گن لے پورے بارہ
بارہ میں لگی رسی
تو گن لے پورے اسی
اسی میں لگا جو
تو گن لے پورے سو

⁂

شام پڑے رات گئے

دوپہری، دوپہری، دوپہری۔ ارے تم کب تک اپنی ڈہائی کی دوپہروں کا راگ الاپو گے۔ آخر اس بستی میں رات بھی تو آتی ہوگی۔ ہاں مقرر آتی تھی۔ ادھر شام پڑی ادھر رات آئی اور پھر سناٹا۔ بجلی تو ان دنوں تھی نہیں۔ اندھیرا بہت سارا۔ روشنی تنک سی۔ آخر لالٹینوں سے کتنی روشنی ہوسکتی تھی۔ سڑکوں پر جہاں تہاں میونسپلٹی والی لائٹیں نصب تھیں۔ شام پڑے میونسپلٹی کا آدمی کاندھے پر بانس والی سیڑھی لادے، ہاتھ میں لمبی سی لالٹین سنبھالے نمودار ہوتا۔ لپک جھپک آیا، سیڑھی کھڑی کی۔ سیڑھی پر چڑھ کر لالٹین کو روشن کیا اور آگے بڑھ گیا۔ لالٹینوں کو اسی انداز سے روشن کرتا چلا جاتا مگر ان لالٹینوں سے آخر کتنی روشنی ہوسکتی تھی اور گلیوں میں تو اتنی روشنی بھی نہیں تھی۔

اسی ہنگام ہماری مسجد سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہوتی۔ لیجیے اب مغرب کی اذان ہونے لگی ہے۔ ادھر ہمارے پڑوس کے مندر میں گھنٹیاں بجنی شروع ہو جاتیں۔ بیچ بیچ میں سنکھ کی آواز۔ لڑکے جو ابھی ابھی گلیوں میں اتنا شور مچا رہے تھے، جلدی جلدی کھسک کر چلے اپنے گھر کی طرف۔ اب اچھا خاصا اندھیرا ہو چلا تھا اور ہماری ڈیوڑھی میں کھڑا ایک فقیر اپنی عقیدت سے لبریز آواز میں معجزہ سنا رہا تھا۔ یہ جمعرات کی شام تھی۔ باقی شاموں میں تو وہ لپک جھپک آتا۔ اللہ رسول کا واسطہ دے کر مانگتا۔ میری والدہ فوراً ہی میرے ہاتھ روٹی پکڑا کر ہدایت کرتیں کہ جا فقیر کو دے آ اور وہ فقیر روٹی لے کر اس عجلت سے جاتا جیسے کسی بہت ضروری مشن پر جا رہا ہے۔ ہاں صرف جمعرات کی شام کو وہ اطمینان سے کھڑے ہو کر کوئی مناجات سناتا یا بی بی فاطمہ کا معجزہ کہ گھر میں دو دن سے فاقہ تھا۔ تیسرے دن جیسے تیسے کر کے مولا علی نے تھوڑا آٹا مہیا کیا اور بی بی فاطمہ نے روٹیاں پکا کر دونوں شہزادوں اور مولا علی کے سامنے ایک ایک روٹی رکھی۔ ایک روٹی اپنے لیے۔ نوالہ توڑا ہی تھا کہ دروازے پر کسی سائل نے دستک دی۔ مولا علی نے فوراً ہی اپنے حصے کی روٹی سائل کو جا کر دے دی۔ یہ دیکھ کر دونوں شہزادوں نے بھی اپنے اپنے حصے کی روٹی سائل کی نذر کر دی۔ بی بی فاطمہ نے بھی اپنے حصے کی روٹی سائل کے لیے بھجوا دی۔ چاروں کی تقدیر میں پھر فاقہ مگر عین اس عالم میں رحمت الٰہی جوش میں آئی اور فاقہ کشوں کے لیے آسمان سے خوان اترا۔ معجزہ ختم۔ میں نے ایک کی بجائے دو روٹیاں جا کر فقیر کو دیں اور وہ

دعائیں دیتا آگے روانہ ہو گیا۔ بس اپنی بستی کے اسی ایک فقیر کی یاد آ رہی ہے۔ ایسا کوئی بھکاری یاد نہیں آ رہا کہ نہ حمد و نعت، نہ مناجات و منقبت۔ بس بھیک کے لیے ہاتھ پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے گھر کے عین سامنے فقیر چند حلوائی کا گھر تھا۔ وہاں مانگنے والا جوگیا دھوتی باندھے ہاتھ میں سارنگی لیے آتا۔ تھوڑی دیر سارنگی بجاتا اور جو ملتا اسے لے کر جے بھگوان کی بولتا اور کہیں آگے نکل جاتا۔

ہماری مسجد میں مغرب عشاء کی نماز اکٹھی ہوتی۔ سو خالی ایک اذان پر گزارہ تھا۔ دس بارہ قدم آگے کی مسجد میں عشاء کی اذان بھی باقاعدگی سے ہوتی۔ اس اذان کے بعد پھر نہ کوئی آواز نہ قدموں کی آہٹ۔ پھر جتنی چہل پہل ہوئی وہ گھر کے اندر۔ دکانیں بھی جلد ہی بند ہو جاتیں۔ بس کوئی کوئی دودھ دہی والے کی دکان کھلی پائی جاتی۔ پھر وہ بھی بند ہو جاتی۔ ہاں مٹھن لال حلوائی کی دکان بارہ بجے رات تک کھلی رہتی مگر آخر بارہ بجے تک کیوں۔ اس سے تک تو ساری بستی سو جاتی تھی۔ وہ اس وجہ سے کہ مٹھن لال کی بجیوں کی شہرت جنات تک پہنچی ہوئی تھی۔ روز رات کے بارہ بجے ایک لمبا تڑنگا آدمی آتا۔ بڑا سا پگڑ۔ منہ پہ لمبی لمبی مونچھیں۔ نہ بولتا بات کرتا۔ بس دو اشرفیاں اپنا بڑا سا ہاتھ بڑھا کر مٹھن لال کی مٹھی میں تھماتا اور ٹوکری میں بجیاں بھر کر لے جاتا۔ مٹھن لال شک میں کہ یہ کون شخص ہے۔ ایک روز چوک ہوگئی "مہاشے جی، تمہارا نام کیا ہے۔" ادھر سے جواب میں تڑاخ سے ایک تھپڑ اور آدمی غائب۔ مٹھن لال تین دن بخار میں پھنکتا رہا۔ مرتے مرتے بچا۔

میں نے تو ایسے ہی سنا تھا۔ ویسے ہماری بستی میں بارہ بجے رات کا وقت ہی ایسا تھا۔ بازار، سڑکیں، گلیاں، محلے بھائیں بھائیں کرتے تھے۔ ہماری اپا اماں سنایا کرتی تھیں "ارے میاں مجھے کیا پتہ تھا کہ مجلس اتنی دیر سے ختم ہوگی۔ لوٹتے لوٹتے بخت مارے بارہ بج گئے اور میں اکیلی۔ اے میاں، میں اپنی گلی میں مڑنے لگی تھی کہ کسی نے مجھے پکارا۔ میں اس کی خنخناتی آواز سے سمجھ گئی کہ یہ کمبخت کوئی بھتنا ہے۔ کئی مرتبہ مجھے پکارا۔ نہ مڑ کے دیکھا نہ جواب دیا۔ بس چپکے چپکے آیت الکرسی پڑھ پڑھ کے دائیں بائیں پھونکتی رہی۔ بس آیت الکرسی ختم ہوئی ہے اور وہ غائب۔"

"اپا اماں آپ کو ڈر نہیں لگا؟"

"اے بیٹا میں تو ڈر سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ بس اچانک آیت الکرسی کا خیال آ گیا۔ بس اس کی برکت سے بچ گئی۔"

محرم اور بارہ وفات کی شبوں کی اور بات ہے ورنہ رات گئے کون گھر سے نکلتا تھا۔ بس ایک دفعہ کی یاد ہے۔ شاید اربعین کی کوئی شب تھی۔ بیبیوں کی ایک ٹولی کربلا میں جانے کی نیت سے نکلی۔ رات کا وقت، یہاں سے وہاں تک اندھیرا۔ آبادی سے نکل کر کربلا والے رستہ پر آئے تو بالکل گھپ اندھیرا۔ وہ تو یہ کہو کہ محلّہ کے دو تین مرد لالٹینیں لے کر ساتھ ہو لیے تھے۔ چونکہ میری والدہ بھی اس ٹولی کے ہمراہ تھیں، اس بہانے میں بھی ساتھ ہو لیا تھا مگر دل رستے بھر دھکڑ پکڑ کرتا رہا۔ بس میں نے دل ہی دل میں نادعلی پڑھنی شروع کر دی۔

کربلا میں پہنچ کر بیبیوں نے مجلس شروع کردی۔ مرثیہ، پھر ماتم، اس کے بعد نوحہ۔ پھر ماتم اور پھر نوحہ۔ اس کے ساتھ گریہ۔ بی بی زینب کو بھائی کا پرسہ۔ اس کے ساتھ زور کا ماتم اور گریہ۔

جب پلٹ رہے تھے تو اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا اور غضب کا سناٹا۔ درخت ایسے لگتے تھے جیسے بھوت کھڑے ہیں۔ دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں۔ بس ایسا لگ رہا تھا کہ دور ہمارے گرد دائرہ بنا کر بھونک رہے ہیں اور رفتہ رفتہ جیسے دائرہ تنگ ہوتا جا رہا ہو اور وہ چپکے چپکے آگے بڑھ رہے ہوں۔ میں نے اور جلدی جلدی نادعلی پڑھنی شروع کردی۔

ہاں رات گئے جب میری آنکھ کھل جاتی تو اور قسم کی آوازیں کان میں پڑتی تھیں۔ گیدڑوں کی آوازیں۔ وہ جو آبادی سے نکلتے ہی چامنڈا تھی اور جس کے آس پاس گیدڑوں کے بھٹ ہم نے دوپہریوں کی آوارہ گردی میں دریافت کیے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ سب اپنے بھٹوں سے نکل آئے ہیں اور چامنڈا کے آس پاس منڈلاتے ہوئے ہمارے گھر کے رخ چیخ چلا رہے ہیں۔ جیسے وہاں سے لپک کر ہمارے گھر کی طرف اب آئے اور اب آئے اور میں ڈر کے مارے لحاف میں اور زیادہ دبک جاتا۔ پھر اردگرد سوتے ہوؤں کی خراٹوں کی آوازیں ڈرانا شروع کر دیتیں۔ ارے سب ہی گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔ آپا اماں بھی ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو وہ جاگ رہی تھیں۔ کہانی ختم کرنے کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک کھانس کھانس کر اپنے جاگنے کا اعلان کرتی رہتی تھیں۔ ارے وہ تو ہماری نیند کے خیال سے کہانی سنانا بند کرتی تھیں۔ ''اچھا بہت رات ہوگئی، سو جاؤ۔ مجھے بھی تو صبح اٹھ کے اپنا وظیفہ پڑھنا ہے۔ تو کہنے والے کا بھلا سننے والوں کا بھلا۔ باقی کل رات کو۔'' اور فوراً ہی منہ لپیٹ کر ایسے پڑ جاتیں کہ سو گئی ہیں مگر تھوڑی دیر بعد ہی ان کے خراٹوں کی بجائے ان کے کھانسنے کی آواز سے میری ڈھارس بندھ جاتی کہ ابھی سب نہیں سوئے ہیں۔ اور کوئی نہیں تو آپا اماں ضرور جاگ رہی ہیں۔ اس سے رات کا خوف خود بخود کم ہو جاتا۔

ارے ہاں کسی کسی رات یہ بھی تو ہوتا کہ رات گئے تک ہارمونیم کی آواز آتی رہتی۔ ہارمونیم بج رہا ہے اور کوئی ترنگ میں گا رہا ہے ؎

لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بن میں
لیلیٰ پیاری بسی مرے من میں

یا پھر کوئی دوسری ہی قسم کی ٹولی اپنی سبھا جماتی اور اپنے رنگ میں شروع ہو جاتی۔ یہ کیا ہے ؎

ایک تو بنی ہے رابے کی دوسرے روپ دیا کرتار
تیسرے چوندا ہے جوبن کا، چوتھے سولہ کیے سنگھار
جیسی دلہن ہے آلھا کی ایسی کسی دیش میں نائے

ارے یہ تو آلھا اودل گائی جا رہی ہے

مارا جھونٹا جب سکھیوں نے جھونٹا لگا سرگ میں جائے
پروا ہوا چلے ساون کی، ساری ہنا پتی لہرائے
جھونکا لگا گیا جب پروا کا چوڑی مچلا کی اڑ جائے
گھونگھٹ اڑ گیا رانی کا، چہرہ دمک دمک رہ جائے

اور بھیا دوہا سنو ۔

ایک تو دھکا اس کو لگ جا جس کا گھر ساون میں گر جائے
دوسرا دھکا اس کو لگ جا جس کی لین بھینس مر جائے
تیسرا دھکا اس کو لگ جا جس کی بھری چلم گر جائے
چوتھا دھکا اس کو لگ جا جس کا جوان پوت مر جائے

پتہ نہیں کتنی رات تک الھا گائی جاتی ۔ میری آنکھوں میں جلدی نیند اترنے لگتی اور میں سو جاتا ۔ بیچ میں آنکھ کھل جاتی تو نہ آلھا نہ ہارمونیم کی آواز ۔ یا اللہ سب کہاں گم ہو گئے ۔ سناٹا، اتھا سناٹا ۔ ہاں کہیں دور سے کسی اکیلے کتے کے بھونکنے کی آواز ۔ جیسے سناٹا یلغار کر رہا ہے اور کوئی اکیلا کتا اس عزم کے ساتھ بھونکے چلا جا رہا ہے کہ وہ اس سناٹے کو آگے نہیں بڑھنے دے گا، مگر کب تک ۔ اتنی دیر ہو گئی کب تک بھونکے گا ۔ سناٹا تو امنڈا ہی چلا آ رہا ہے اور رات گہری ہوتی چلی جا رہی ہے ۔ یا مولا رات کب ڈھلے گی ۔ اس کا کوئی انت ہے کہ نہیں ہے ۔ رات جس کا انت نہیں ہے وہ تو قیامت کی رات ہوگی ۔ اتنی لمبی کھنچے گی کہ گائیں بھینسیں کھونٹوں سے بندھے بندھے تنگ آ کر ڈکرانا شروع کر دیں گی اور رسہ تڑا کر بھاگنے کی کوشش کریں گی ۔ لو وہ جو ایک اکیلا کتا بساط بھر بھونکے چلا جا رہا تھا، اس نے بالآخر بھونکنا بند کر دیا ۔ مکمل خاموشی ۔ یہاں سے وہاں تک سناٹا ہی سناٹا ۔ پھر اچانک کسی دور کے ڈربے سے آتی ہوئی مرغے کی بانگ ۔ ارے یہ تو صبح ہونے لگی ہے ۔ اس سے شہ پکڑ کر کسی دوسرے مرغے نے بانگ دینی شروع کر دی ۔ پھر ہمارے صحن میں جو ڈربہ ہے اس میں مرغے نے بازو پھڑ پھڑائے اور بہت زور کے ساتھ ککڑوں کوں کی آواز بلند کی ۔ جیسے رات سے پیچھا چھڑا کر ایک دم سے صبح ہو گئی ہو ۔ بس اس کے بعد ہی ہمارے پاس کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی ۔ اللہ اکبر اور وہ جو ہمارے پڑوس میں مندر تھا، اس میں گھنٹیاں بجنے لگتیں ۔ پھر بیچ بیچ میں سنکھ کی آواز اور بہت دور سے جیسے اللہ میاں کے پچھواڑے سے روئی کے بیچ کی آواز آنی شروع ہو گئی ۔ پھر کسی دوسرے بیچ نے اس سے زیادہ تیز آواز میں بولنا شروع کر دیا اور اسے لوگوں نے بھی شور مچانا شروع کر دیا ۔ رات کی اپنی آوازیں تھیں، صبح کا اپنا شور ہے ۔ ایک ایک کر کے ساری مخلوق جاگ رہی ہے ۔ اکے کے گزرنے کی آواز ۔ مطلب یہ کہ صبح کی گاڑی آ کر گذر گئی ۔ اب سٹیشن سے سواریاں ڈھل رہی ہیں ۔ سواریوں سے لدے پھندے اکے آنے شروع ہو گئے ہیں ۔ اکا دکا سواری ہمارے محلے کی بھی تو ہو گی ۔ اکے کے گزرنے کی آواز سے تو یہی معلوم ہوتا ہے ۔

لوائے کو تو میں بھولا ہی جا رہا تھا۔ ارے اسے کوکوئی ڈبائی والا کیسے بھول سکتا ہے۔ اسے ہی تو سب سے بڑھ کر ڈبائی کی شناخت ہے۔ "ہے" میں نے غلط کہا۔ اب تو وہاں اسے نظر ہی نہیں آتا مگر وہ جو میرے بچپن لڑکپن کی ڈبائی تھی اس ڈبائی کی بڑی شناخت اسے تھا۔ ڈبائی کی لے دے کے یہی ڈھائی تین چیزیں تو مشہور تھیں۔ اسے، چلم، گجیا۔ بھائی ڈبائی جا رہے ہو تو وہاں سے ہمارے لیے ایک چلم لیتے آنا۔ کوئی تو صفت تھی ڈبائی کی چلم میں کہ دور دور سے اس کے لیے فرمائشیں آتی تھیں۔ گجیا کا معاملہ بھی یہی تھا مگر گجیا کے ساتھ ایک تخصیص اور بھی تھی۔ اس کے لیے خالی ڈبائی کا ہونا کافی نہیں تھا۔ گجیا ڈبائی کی ہو اور مٹھن لال حلوائی کی دوکان کی ہو۔ ارے مٹھن لال کی دوکان گجیوں کی شہرت تو جنات تک پہنچی ہوئی تھی۔ ڈبائی کے آس پاس کے جنات بسے ہوئے تھے وہ بطور خاص مٹھن لال کی دوکان سے گجیاں منگواتے تھے۔

جب میں بھولا بھٹکا پھر ڈبائی پر پہنچا تو ایک جگ بیت چکا تھا۔ مٹھن لال بیکنٹھ سدھار چکے تھے۔ مٹھن لال، سورگ میں تمہیں استھان ملے۔ میں نے تمہاری دوکان پہ کھڑے ہو کر تمہیں یاد کیا اور اپنی گمشدہ بستی کو پھر سے پایا اور ہاں یہیں سے میں نے اپنے گھر کا رستہ پایا۔

مٹھن لال کا ذکر نکلا ہے تو پھر بھگت جی کا ذکر بھی لازم آتا ہے۔ پوری چھوٹی بزریا میں وہی تو ایک دوکان تھی جس پہ میں لپک لپک کر جاتا تھا اور بقول ہمارے والد صاحب پورے بازار میں یہی ایک دوکاندار ایماندار ہے۔ جب ہی تو وہ سارا سودا، آٹا، دال چاول نمک مرچ دھنیا سب یہیں سے خریدتے تھے۔ ماسوا گھی اور کڑوے تیل کے کہ وہ تو گیلی چیزیں ہیں۔ ہندو کے ہاتھ کی لگی کیسے لیں۔ میرے والد صاحب چھوت چھات کے ہندوؤں سے بڑھ کر قائل تھے۔ ادھر بھگت جی پوجا پاٹ کے دھنی، ماتھے پہ لمبا تلک۔ مذہب کی سخت گیری دونوں ہی طرف تھی مگر مذہب کی سخت گیریاں اپنی جگہ اور انسانی رشتہ اپنی جگہ۔ میرے والد صاحب برادری کنبہ والوں پر نکتہ چین کہ یہ لوگ سود کھاتے ہیں۔ قارورہ کہاں جا کر ملا، بھگت جی سے جن کے متعلق ان کا گمان تھا کہ ایماندار آدمی ہے۔ سود بیاج نہیں کھاتا۔ کاروبار میں بے ایمانی نہیں کرتا۔ سودا کاندار اور گاہک کے رشتہ سے بڑھ کر دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا۔ مجھے ہدایت تھی کہ سودا اس دوکان سے خریدنا ہے مگر یہ ہدایت چنداں ضروری نہیں تھی۔ بھگت جی کے یہاں ہر جنس صاف ستھری، اونچا کبھی نہیں تولا۔ آخر میں رونگن کے طور پر گڑ کا یہ بڑا ڈلا ہاتھ پہ رکھ دیتے۔ گڑ کا ڈلا جیسے سونے کی ڈلی۔ ان کی دوکان کا گڑ کتنا اچھا ہوتا تھا۔

ڈبائی سے نکل جانے کے بعد بھی جب بھی ادھر کا پھیرا لگتا، بھگت جی کی دوکان پہ ایک دفعہ حاضری ضرور دیتا۔ آخری پھیرا وہ تھا جب پوچھنے پر میں نے انہیں بتایا کہ "ابی اے کا آخری سال ہے۔"

"اس کے بعد نوکری کرو گے۔"

"جی ہاں۔"

"میں نے حساب میں دیکھا تو مولبی صاب کی طرف کچھ رقم نکلتی ہے۔ نوکر ہو جاؤ۔ اب تمہیں ہی

ان کے سب حساب نبٹانے ہیں۔"

مگر اس کے بعد پھر ڈبائی جانے کا موقع ہی میسر نہیں آیا۔ اب آیا ہوں تو نہ بھگت جی ہیں، نہ ان کی دوکان ہے۔ جانے اس وقت جو یہاں دوکانیں تھیں، وہ کہاں چلی گئیں۔ تو اب میں بھگت جی کا قرض چھاتی پہ دھر کر دنیا سے جاؤں گا۔

یہ چھوٹی بزریا تھی۔ بازار اس سے آگے تھا اور چھوٹی بزریا میں تو مجھے بھگت جی کی دوکان ہی سب سے بڑھ کر نظر آتی تھی۔ مسلمانوں کی دوکانیں بھی تھیں مگر اکا دکا۔ ان اکا دکا میں ایک تو بنیاد علی عطار تھے۔ انہیں تو مسلمان ہونا ہی تھا۔ عطار جو تھے۔ جہاں حکیم ہوگا وہاں عطار بھی ہوگا۔ ہماری ڈبائی میں ایک حکیم صاحب تھے۔ ایک وید جی، ایک ڈاکٹر صاحب۔ مگر بنیاد علی عطار نے ہمیں حکیم صاحب سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ خود ہی گل قند جوارش مصطگی دے کر ہمارے پیٹ کے سارے امراض کا علاج کر دیتے تھے۔ پیٹ کا درد ہو تو اس کو دفع کرنے کے لیے تو خالی کالا نمک ہی کافی تھا۔ زیادہ تکلف کیا تو نوسادر لے لیا۔ کسی بچے کو کوئی تکلیف ہوئی تو کہا جاتا کہ لے جاؤ اسے وید جی کے پاس۔ وید جی نے تین پڑیاں دیں اور بچہ پھر چلنے کھیلنے لگا مگر سب سے بڑھ کر ہمارے ڈاکٹر صاحب تھے۔ ڈاکٹر جوشی، ہم سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں کوئی ڈاکٹر ہے تو ہمارے ڈاکٹر جوشی ہیں۔ کیسے کیسے موذی مرض کا انہوں نے علاج کیا تھا۔ ہمارے بہنوئی وجاہت حسین جب دق میں جتلا ہوئے تو نوکری چھوڑ چھاڑ ڈبائی میں آن بیٹھے کہ ڈاکٹر جوشی سے علاج کرانا ہے اور ڈاکٹر جوشی نے واقعی ایسا علاج کیا کہ یہ لاعلاج مرض، ان دنوں تو لاعلاج ہی تھا، ایسے گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ پتھر اپنی جگہ پہ بھاری ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب شفا خانے میں جمے بیٹھے تھے۔ بیمار خلقت کا ہجوم ہے۔ ڈاکٹر صاحب یکساں توجہ کے ساتھ سب کو دیکھ رہے ہیں اور دوا تجویز کر رہے ہیں۔ تشخیص مفت، دوا مفت۔ ہاں گھر بلاؤ گے تو ڈاکٹر صاحب مہنگے پڑیں گے۔ ایک روپیہ فیس لیں گے مگر گھر پہ تو اس وقت ہی بلائے جاتے تھے جب جان پہ آن بنی تھی۔ مردوں سے زیادہ عورتوں میں مقبول تھے۔ کوئی تکلیف ہو، چلو شفا خانے۔ ہسپتال کے نام سے یہ بستی نا آشنا تھی۔ بس شفا خانے کو جانتی تھی اور ہمارے محلے سے کسی بی بی کو شفا خانے جانا ہوتا تو اس کا مطلب تھا اکے کی سواری۔ ویسے محلے سے کون بی بی باہر نکلتی تھی۔ محلے کے اندر ہی گلی گلی گھوم لو۔ بوڑھی عورتوں کے لیے تو سر پہ چادر ڈالنا بھی ایسا ضروری نہیں تھا۔ اب اگر محلے میں کوئی اکا منگایا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی سواری کو سٹیشن جانا ہے یا پھر شفا خانے جانا ہے۔ اکہ ٹخ ٹخ کرتا آیا اور ڈیوڑھی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ چار مرد دو چادریں لے کر گھر سے نکلے۔ دو مرد چادر تان کر اکے کے دائیں، دو مرد اکے کے بائیں اور آواز لگائی کہ بھائی ادھر ہی رہو، بیبیاں سوار ہو رہی ہیں اور ہاں اکے کے ارد گرد بھی تو چادر منڈھی جاتی تھی۔ اس شان سے کہ اکہ ٹخ ٹخ کرتا شفا خانے کی سمت میں روانہ ہوتا۔ ڈولتا جھکولے کھاتا چلا جا رہا ہے اور اکے والا ادھر گھوڑے کو ہنٹر مار رہا ہے۔ ادھر راہگیروں کو خبردار کر رہا ہے۔ ہٹو، بچو۔ میں نے غلط کہا کہ اکہ ڈبائی کی سوغات ہے۔ ڈبائی سے

آگے علی گڑھ جاؤ تو اکہ، بلند شہر جاؤ تو اکہ۔ اس پورے علاقے میں اکے کا راج تھا۔ تانگہ کا کہیں نام و نشان نہیں۔ کم از کم ہماری دہائی میں تو تانگہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور اکہ نام کی سواری اس شان سے چلتی تھی کہ اچھے بھلے آدمی کی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی تھی مگر خدا کی شان بیمار بیبیاں اسی میں بیٹھ کر چادر میں لپٹی لپٹائی ہسپتال پہنچتی تھیں اور شفا کی کارنٹی لے کر واپس آتی تھیں۔

میرے لیے شفاخانے جانے کا مطلب تھا تتلیاں پکڑنا، بیلے نواڑے کے پھول چننا۔ وہاں شفاخانہ خالی شفاخانہ تھوڑا ہی تھا۔ ارد گرد باغیچہ پھولا ہوا۔ کسی گوشے میں رنگ برنگ تتلیاں پھرر پھرر اڑ رہی ہیں۔ کہیں بیلا پھولا ہوا ہے۔ چنبیلی پر بہار آئی ہوئی ہے اور نواڑے کو تو یار پھولوں میں گنتے ہی نہیں تھے۔ اس میں خوشبو جو نہیں ہوتی تھی۔

ꙮ .... ꙮ .... ꙮ

اکے گم، ٹم ٹم حاضر

ارے یہ تو در و دیوار ہی اور ہیں۔ نہ یہاں چامنڈا نظر آ رہی ہے نہ ہماری وہ کربلا جس کی بغل میں املی کے پیڑوں پہ بندر جھولتے رہتے تھے۔ نہ گنگا کی وہ پتلی دھار جو چھوئیے کے نام سے بہتی تھی، نہ سنبھل والوں کی چوپال نہ مالا گڑھیا کا امام باڑہ۔ اکے کہاں گم ہو گئے۔ یہ ٹم ٹم کس قماش کی سواری ہے اور یہ تانگے جن کے پہیوں پہ ربڑ کے ٹائر چڑھے ہوئے ہیں اور بالا قد گھوڑے جتے ہوئے ہیں، کس شان سے چل رہے ہیں۔ کھڑکی والے گھر کا عزا خانہ کہاں اوجھل ہو گیا اور یہ کھڑکی بازار کہاں سے نمودار ہو گیا۔ ارے یہ تو ہاپوڑ ہے مگر میری نال تو ڈبائی میں گڑی تھی۔ وہاں سے نکل کر بارہ پتھر دور ہاپوڑ میں کیسے نکل آیا مگر وہاں سے نکل کر ہی تو اچانک کتنا کچھ دیکھ لیا۔ ریل کی سیٹی کی آواز سنی۔ کالے بھجنگ انجن کو دھواں اگلتے دیکھا۔ ریل گاڑی کو چھک چھک چلتے دیکھا۔ کتنی خلقت اس میں بھری ہوئی ہے۔ یا اللہ، یہ اتنے لوگ کہاں سے آ رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں اور میں خود اکے سے اتر کر ریل میں سوار ہو کر کس سفر پہ نکل کھڑا ہوا ہوں۔ اکے کی سواری سے ریل گاڑی تک کا سفر۔ لگتا ہے کہ اپنی چھوٹی سی دنیا سے نکل کر کسی بڑی دنیا میں نکل آیا ہوں۔ اس وقت تو ایسا ہی لگا تھا۔

اس بڑی دنیا میں رہنے کے لیے ٹھکانا کہاں میسر آیا۔ ایک باغ کے بیچ ایک چھوٹی سی عمارت نچلی منزل میں میرے چچا اپنے خاندان کے ساتھ پہلے سے بسے ہوئے تھے۔ اب یہ دوسرا ابرا آیا اور بالائی منزل میں آن بسا۔ باغ اور اس کے ارد گرد حد نظر تک کھیت ہی کھیت۔ عقب میں ایک تکیا۔ اس میں سنگھاڑے کی بیل پھیلی ہوئی۔ خوب جگہ تھی۔ یہ سب ہمارے دادا جان کے دم کا ظہورہ تھا۔ دادا جان کون؟ تو سنیے۔

میں ابھی اپنے خاندان کے دو بزرگوں کو یاد کر رہا تھا کہ دونوں میرے والد کے ماموں تھے۔ اس حساب سے ہمارے دادا۔ دل شاد علی اور صادق علی۔ دادا دل شاد علی اپنی اور خاندان کی زمینوں کو سنبھالے دانپور میں بیٹھے تھے۔ بستی سے اس وقت نکلتے تھے جب قریب یا دور کی کسی بستی میں کوئی کمبخت جن کسی بھلے آدمی کو ستاتا تھا۔ یہ ہمارے دادا پہنچے ہوئے بزرگ بھی تو تھے۔ بزرگوں سے ورثے میں ولایت کی بچی کھچی جتنی دولت رہ گئی تھی، اسے بھی تو سنبھالے بیٹھے تھے۔ خیر دانپور ڈبائی سے ایسا کونسا دور تھا۔ اکے میں لد پھند کر ڈبائی سے

نکلے۔گردآلود سڑک پراکر تخ تخ کرتا جارہا ہے۔اے لووہ مقبرہ آ گیا۔اس سے آگے دانپور۔ہمارے خاندان کی جڑیں تو اصل میں اسی بستی میں تھیں۔

مگر دادا صادق علی بلند شہر ضلع سے آگے میرٹھ ضلع کے نگر ہاپوڑ میں آنریری مجسٹریٹ کی شان سے جمے بیٹھے تھے۔دوسرے تیسرے دن اپنے احاطے میں کچہری لگاتے اور مقدموں کی سماعت کرتے۔کچھ اپنے زور پر سرکاری خطاب اور مرتبہ حاصل کیا تھا۔کچھ اپنے مرحوم بیٹے کے مراتب سے تقویت حاصل کی تھی۔لو اس پر مجھے ''امروز'' کے زمانے کی ایک بات یاد آ گئی۔کوئی بات نہیں۔واپس ابھی مجھے اسی زمانے اور اسی نگر میں آنا ہے۔''امروز'' میں حمید ہاشمی مرحوم سے میری بہت گاڑھی چھننے لگی تھی۔روز نہیں تو دوسرے تیسرے دن ضرور دفتر سے نکل اس کے ساتھ اس کے گھر کی طرف ہولیتا۔وہاں چائے جو چنی ہوتی تھی۔حمید ہاشمی پارٹی ورکر۔اس کے گھر او بدا کر ایک بزرگ سے مڈھ بھیڑ ہوتی تھی۔یہ دادا منصور تھے۔پرانے کامریڈ۔تحریک کا گرم و سرد دیکھ چکے تھے۔دن ڈھلے اپنے مخصوص وقت پر وہاں پہنچتے۔بہت کم بولتے چائے پیتے اور چلے جاتے۔ایک شام چائے پیتے پیتے مجھ سے مخاطب ہوئے۔''تمہارا تعلق ہاپوڑ سے ہے۔''

''جی۔''

''تم نے کبھی وہاں خان بہادر تصدق حسین کا نام سنا تھا۔یہ صاحب وہیں کے تھے۔''

اس حوالے پر میں چکرایا۔''جی ہاں۔''میں نے کہا۔''وہ میرے تایا جان تھے۔''

''تمہارے تایا جان؟''اب ان کے چکرانے کی باری تھی۔

''اصل میں وہ میرے والد کے ماموں زاد بھائی تھے۔میرے تایا جان ہی ہوئے۔''

تامل کیا۔پھر بولے''تمہیں معلوم ہے ان کی ملازمت کس قسم کی تھی۔''

''جی معلوم ہے۔میرے چچا ان کے کارناموں کا بہت ذکر کیا کرتے تھے۔''اور کب کب کے چچا کے بیان میرے سامعہ میں گونجنے لگے۔''بھائی تصدق نے قبائلی علاقہ میں بھی بہت وقت گزارا تھا۔ان کے ساتھ بہت گھل مل گئے تھے مگر ایک دفعہ کیا ہوا۔''چچا جان رکے۔پھر رواں ہو گئے۔''جرگہ کے عین بیچ ایک قبائلی کھڑا ہو گیا۔بولا ہماری صف میں فرنگی کا ایک آدمی گھسا ہوا ہے۔''سب چونک پڑے''کون؟''اس نے بھائی تصدق کی طرف اشارہ کیا۔''یہ شخص۔''ایک دم سے بندوقوں کی نالوں کا رخ ان کی طرف ہو گیا۔بھائی تصدق بہت اطمینان سے کھڑے ہو گئے۔کہا کہ''اگر میں نے کوئی غداری کی ہے تو بے شک مجھے گولی مار دو۔میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔''اور پھر ایسی پر جوش تقریر کی کہ تنی بندوقیں جھک گئیں۔

دادا منصور خاموش چائے پیتے رہے۔پھر بولے''مگر دیوان سنگھ مفتون نے ان کی بہت تعریف کی ہے۔اس کی کتاب''ناقابل فراموش''ابھی آئی ہے۔تمہاری نظر سے گزری؟''

''نہیں۔''

"دیکھ لینا۔"

ان دنوں تو میں اس کتاب کو نہیں دیکھ پایا مگر جب حکیم اجمل خاں کے سلسلہ میں اس زمانے کی کتابوں پر نظر ڈال رہا تھا تو اس کتاب پر بھی نظر گئی۔ مصنف دیوان سنگھ مفتون جو ہفت روزہ "ریاست" کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے اور اپنے وقت کے بہت زوردار صحافی تھے انہوں نے واقعی ہمارے تایا جان کی بہت تعریف کر رکھی تھی مگر انہیں دنوں ایک دوسری کتاب نظر سے گزری۔ مولانا حسین احمد مدنی کی "نقشِ حیات" تحریک خلافت کے زمانے کی قید و بند کے ذکر میں کچھ تایا جان کا حوالہ آیا تھا۔ حاشیے میں ان کا یوں تعارف کرایا تھا۔ خان بہادر تصدق حسین کا تعلق ہاپوڑ کے ایک مسلمان خاندان سے تھا۔ یہ بہت جابر افسر تھا۔

دیوان سنگھ مفتون، مولانا حسین احمد مدنی، میرے چچا جان۔ ان تینوں کی رائیں میرے سامنے ہیں مگر آخر پانی نشیب ہی میں مرتا ہے۔ یہاں نشیب میرے چچا جان ہیں۔ ان کا بیان لڑکپن سے سنتا چلا آیا تھا وہی دماغ میں بسا ہوا ہے۔

مگر خیر ذکر تو میں ہاپوڑ والے دادا جان کا کر رہا تھا۔ جن کو پورا خاندان میاں جان کے نام سے پکارتا تھا۔ ڈبائی میں رہتے ہوئے ان کا ذکر ایسے سنا تھا جیسے وہ کوئی داستانی دادا ہیں۔ اب آ کر دیکھا تو سچ مچ کے دادا نکلے۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ ملازمت کے طلبگاروں کے لیے ملازمت کی سفارش، ملازمت والوں کے لیے ترقی کی سفارش، سرکاری عتاب میں آئے ہوؤں کے لیے بریت کی سفارش، حصہ بقدر جثہ اور بادہ بقدر ظرف۔ میری والدہ نے بھی شاید ایسے ہی کسی معاملہ میں ان سے رجوع کیا تھا۔ وہ اپنے ایک داماد کی بیروزگاری سے پریشان تھیں۔ اس کا تو فوری بندوبست بطرز احسن ہو گیا مگر اس ریلے میں ہمارا سارا گھر ہاپوڑ منتقل ہو گیا۔ خاندان کے کچھ افراد تو پہلے ہی ادھر منتقل ہو گئے تھے۔ سب سے بڑھ کر ہماری بڑی بہن جو اسی گھر میں بیاہی گئی تھیں، اب ہم بھی وہاں جا پہنچے اور باغ کے جس گوشے کا میں نے ابھی ذکر کیا، اس میں جا پسارے۔ والد کے سپرد یہ کام کہ زمینوں کی دیکھ بھال کرو۔ میں نے باغ کے پھل والے درختوں کی دیکھ بھال شروع کر دی اور یہ سوچے بغیر کہ پھل پکے ہیں یا کچے کھانا شروع کر دیئے۔ مگر کسی پھل کے کچے یا پکے ہونے سے فرق کیا پڑتا ہے۔ انار پکا ہو یا کچا بہرحال انار ہوتا ہے۔

خیر تو ابھی میں اس نئی فضا میں درختوں سے توڑ توڑ کر کچے پکے انار، امرود، انجیر کھا رہا تھا اور کھیتوں کے بیچ ڈنڈے بجاتا پھر رہا تھا کہ میری تعلیم کا سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے والد تعلیم کی جو قبا مجھے پہنانے کے درپے تھے اس کی وجہ سے یہ سوال اٹھنا ہی تھا۔ اصل میں میرے والد اپنے اسلامی مطالعہ کے زور پر مولویوں سے بڑھ کر مولوی تو بن ہی چکے تھے۔ سونے پہ سہاگہ یہ ہوا کہ کسی بھلے وقت میں وہ شیعہ کانفرنس کی شروع کی ہوئی ایک تحریک میں بھی سرگرم رہے تھے۔ یہ تحریک اس حوالے سے تھی کہ سلطان ابن سعود نے جنت البقیع کے مبارک مزاروں کو پیوند زمین کر ڈالا تھا۔ اس کے خلاف مہم کے طور پر ایک انجمن قائم ہوئی جس کا نام تھا انجمن

تحفظ ماثر حبر کہ۔ اس تحریک سے وابستہ ہو کر انہوں نے انجمن کی طرف سے شہر شہر کے دورے بھی کیے تھے اور کچھ وقت لکھنؤ میں بھی گزارا تھا۔ وہیں سے شاید یہ جذبہ لے کر واپس آئے کہ اپنے فرزند دلبند کو ابتدائی عربی پڑھا سکھا کر مدرسۃ الواعظین میں داخل کرایا جائے کہ وہاں سے عالم فاضل بن کر نکلے اور مجتہد بن جائے۔ تو ابھی میں تختی پہ اب ت لکھ رہا تھا اور بغدادی قاعدہ ختم کر چکا تھا کہ انہوں نے ایک کتاب "الصرف" نام کی مجھے پکڑا دی۔ مختلف سبق پڑھائے اور ضرب یضرب کی گردانیں حفظ کرانی شروع کر دیں۔ صرف کے بعد نحو کا نمبر آتا تھا مگر اس سے پہلے ہی انہوں نے قرآن معنوں کے ساتھ پڑھانا شروع کر دیا۔ اس اعتبار پر کہ ضرب یضرب کی گردانوں کے حفظ ہو جانے کے بعد اسے قرآنی آیات کے معنی سمجھ میں آ جانے چاہئیں۔

گھر میں کسی نے کہا کہ اسے کچھ اردو بھی تو پڑھاؤ۔ جواب دیا کہ اردو کونسی ایسی مشکل زبان ہے کہ اسے پڑھایا جائے۔ گھر کی زبان ہے۔ وہ اسے خود بخود آ جائے گی۔ اس باب میں وہ شاید سچے تھے۔ میری ایک ماموں زاد بہن تھیں جنہیں ہم چھوٹے بی بی آپا کہتے تھے، ان کے نام مہینے کے مہینے دلی سے رسالہ "عصمت" موصول ہوتا تھا۔ اس کے جلو میں علامہ راشد الخیری کے ناول بھی آنا شروع ہو گئے۔ صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی، نانی عشو کی کہانی، عصمتی دسترخوان، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اس نسوانی ادب میں تاک جھانک شروع کر دی۔ ان کی کتابوں میں ایک کتاب الف لیلہ بھی تھی۔ چکنے ورقوں والی باتصویر الف لیلہ۔ پہلے میں اس کی تصویروں سے متاثر ہوا۔ پھر ان کہانیوں کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تو اپنی اردو کی تعلیم کے لیے تو میں اپنی اس مرحوم بہن کا ممنون احسان ہوں۔ ان کے وسیلہ سے جب میں اردو میں رواں ہو گیا تو والد کی کتابوں سے بھری الماری کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ یوں مذہبیات کا مطالعہ شروع ہو گیا۔

خاندان میں کسی نے کہا کہ لڑکے کو اب سکول میں داخل کرا دو۔ والد نے اس سے صاف انکار کر دیا۔ انہیں نہ سکول کی تعلیم پر اعتبار تھا نہ سکول میں پڑھنے والے لڑکوں کی صحبت پر۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ تعلیم اور یہ صحبت لڑکے کو خراب کرے گی۔ ہاں گھر پہ انگریزی پڑھانی شروع کر دی اور ساتھ میں وہ سارے مضامین جو میٹرک تک کی تعلیم کے لیے ضروری تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ میٹرک کا امتحان پاس کرانے کے بعد مدرسۃ الواعظین بھیجنے کا بندوبست کیا جائے۔

مگر آدمی سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ ڈبائی میں تو گھر میں اور گھر سے باہر کے کسی عزیز رشتہ دار کو ان کی کسی تجویز سے اختلاف کی مجال نہیں تھی مگر ہاپوڑ میں آ کر یہ ہوا کہ یہ تعلیمی منصوبہ سن کر میری بڑی بہن پہلے حیران و پریشان ہوئیں۔ پھر انہوں نے جرأت پکڑی اور صاف صاف اعلان کر دیا کہ خاندان میں ایک مولوی بہت ہے۔ ہمیں دوسرے مولوی کی ضرورت نہیں ہے۔ والد صاحب بیٹی کو آمادۂ بغاوت دیکھ کر چپ ہو گئے۔ آخر وہ بڑی بیٹی تھی جس کو شاید وہ باقی بیٹیوں اور بیٹے سے زیادہ عزیز جانتے تھے اور اس کی بات سن بھی لیتے تھے۔ ہاں اتنا صاف صاف کہہ دیا کہ سکول میں داخل کرانا ہی ہے تو نویں کلاس میں داخل کرانا۔ میں نے

اسے اتنا پڑھا لکھا دیا ہے کہ وہ آج بھی میٹرک کے امتحان میں بیٹھ کر کامیاب ہو سکتا ہے۔

گورنمنٹ ہائی سکول نے تو نویں کلاس کے داخلہ کا نام سنتے ہی معذرت کر لی۔ نویں کلاس کیا اسے تو آٹھویں، ساتویں میں داخلہ بھی خلاف ضابطہ نظر آتا تھا مگر شہر میں ایک ہائی سکول اور بھی تھا۔ کمرشل اینڈ انڈسٹریل ہائی سکول۔ اس کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے دادا میاں کا لحاظ کر کے میری تعلیمی لیاقت کو جانچا پرکھا۔ پھر فیصلہ سنایا کہ نویں کلاس میں داخلہ تو خلاف ضابطہ ہوگا۔ ہاں آٹھویں کلاس میں دخلہ ہو سکتا ہے۔ سو میں آٹھویں کلاس میں داخل ہو گیا یعنی سکول کی زندگی کی میں نے صرف تین بہاریں دیکھیں۔ آٹھویں، نویں، دسویں۔

یہ سکول خوب تھا۔ میں نے جب اردگرد نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ پورے سکول میں مسلمان تو لے دے کے بس میں ہی ہوں۔ سب استاد ہندو۔ سب کلاس فیلو ہندو مگر اس خیال نے مجھے بالکل پریشان نہیں کیا اور سچی بات ہے کہ میرے کسی استاد نے یا کسی کلاس فیلو نے بھی اس حوالے سے میرے لیے کوئی پریشانی پیدا نہیں کی۔ میں کلاس فیلوز کے ساتھ جلد ہی گھل مل گیا اور اس فضا سے ایسا مانوس ہوا کہ چھٹیاں ہوتیں تو سوچتا کہ سکول جلدی کھلے اور میں دوڑ کر وہاں پہنچوں۔

کلاس فیلوز میں سے چند ایک سے دوستی بھی جلدی ہو گئی اور ایک دو استادوں کا منظور نظر بھی جلدی بن گیا۔ کم از کم دو استادوں کا۔ ایک تو اردو کے استاد تھے۔ بہت سیدھے سچے آدمی تھے مگر شاید انہیں اپنی اردو پر زیادہ اعتبار نہیں تھا۔ کلاس میں وہ اس باب میں ہر پھر کر مجھ ہی پر اعتبار کرتے تھے۔ کم از کم مرثیے کے سلسلہ میں تو میں نے ہی انہیں بہت سی تلمیحات سمجھائیں۔ مثلاً یہ کہ جبریل امین کون تھے۔ حضرت قاسم کس کے بیٹے تھے۔ شہر بانو کس ملک کی اور کس باپ کی بیٹی تھیں۔

دوسرے اپنے محبوب استاد کے بارے میں ابھی بتاتا ہوں۔ میں نے ابھی سکول میں داخل ہو کر سانس ہی لیا تھا کہ آگے پیچھے دو نئے استاد سکول میں نمودار ہوئے اور دونوں جوان العمر۔ ایک تو مہتہ جی تھے۔ گورے چٹے، سوٹ بوٹ میں ملبوس۔ الہ آباد یونیورسٹی سے نکل کر سیدھے اس سکول میں آ گئے تھے۔ تاریخ اور جغرافیہ پڑھانے پر مامور ہوئے مگر جلدی پتہ چلا کہ تاریخ اور جغرافیہ سے بڑھ کر انہیں اکبر الہ آبادی سے شغف ہے۔ تاریخ پر لیکچر دیتے دیتے کوئی بہانہ ڈھونڈ کر اکبر کا کوئی شعر سناتے۔ دیکھتے کہ لڑکے شعر سن کر کچھ محظوظ ہوئے ہیں۔ بس پھر تاریخ کا دفتر لپیٹتے اور اکبر الہ آبادی کی شاعری کا دفتر کھولتے اور رواں ہو جاتے۔ بتاتے کہ میرے استاد پروفیسر جھا اکبر کے بہت قائل تھے۔ اکبر کی شاعری سے میرا تعارف انہیں کا فیض ہے۔

سو اکبر سے آٹھویں کلاس میں ہوتے ہوئے جتنا مجھے تعارف حاصل ہوا، وہ مہتہ جی کا فیض تھا۔

جو دوسرے استاد انہیں دنوں وارد ہوئے، وہ دھیندر جی تھے۔ چھریرا بدن، سانولی رنگت، دھوتی ان کا مستقل پہناوا تھا۔ انہیں سوٹ بوٹ میں میں نے شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ ڈیبٹس کے انچارج وہی تھے۔

بہت اچھے مقرر تھے۔ خالص ہندی بولتے تھے مگر ان کے لہجہ میں ڈھل کر یہ زبان کتنی شیریں ہو جاتی تھی۔ یاد پڑتا ہے کہ وہ برج کے علاقہ سے تھے۔ شاید برج کے لہجہ نے ان کے لہجہ میں گھل مل کر ان کی تقریر میں روانی اور شیرینی پیدا کی تھی۔ میری مفرس اردو سے بہت محظوظ ہوتے تھے مگر انہیں کی حوصلہ افزائی پر میں نے ڈیبٹس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ جتنی دیر میں اپنی مفرس اردو بولتا رہتا، وہ مسکراتے رہتے۔ سیکنڈ فارم کی کلاس کے بعد ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ یہ جو ہندی تم پڑھ رہے ہو، یہ کچھ نہیں۔ مجھ سے پوری طرح ہندی پڑھ لو اور تھوڑی سی مجھے اپنی اردو سکھا دو۔ میں یہ سن کر بہت ٹپٹایا کہ بھلا شاگرد استاد کو کیسے پڑھا سکتا ہے اور یہ بھی سمجھ نہیں آئی کہ ایک زبان کو سیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ بہر حال میں اپنی مفرس اردو کے ساتھ اس شدھ ہندی والے استاد کا منظور نظر بن گیا کہ صوبائی تقریری مقابلہ کا موقع آیا تو ان کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی۔ مجھے لے کر وہ مرادآباد کی تقریری تقریب میں لے کر گئے مگر پھر وہ ہمارے میٹرک تک پہنچتے پہنچتے ہیڈ ماسٹر صاحب سے بگڑ کر سکول سے رخصت ہو گئے۔ آخر انہیں سکول ماسٹر بن کر ہی تو زندگی نہیں گزارنی تھی۔ شاستری بن کر دلی یونیورسٹی کے سنسکرت کے شعبہ کی سربراہی کرنی تھی۔

کتنے برسوں بعد جب دلی جانا ہوا تو ریوتی نے باتوں باتوں میں پوچھا "تجھے وحید رجی یاد ہیں۔"

"بالکل یاد ہیں۔"

"وہ دلی میں ہیں۔"

"ارے واقعی؟"

"ہاں اب وہ ہمارے سکول والے وحید رجی نہیں ہیں۔ شاستری بن چکے ہیں۔ دلی یونیورسٹی میں سنسکرت ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ میں ان سے ایک دفعہ مل چکا ہوں۔ تو ملے گا۔"

"ارے کیوں نہیں۔"

اور اگلی صبح ہم پروگرام بنا کر آنند نکیتن سے نکل کر پرانی دلی میں دلی یونیورسٹی سے بھی پرے اللہ میاں کے پچھواڑے ایک آبادی میں پہنچے اور ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر کا چاکر نکل کر آیا تو ہم نے اپنے نام بتائے۔ اس نے اندر جا کر اطلاع دی۔ پھر فوراً ہی آ کر ہمیں ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا۔ وہاں دو سادھو قسم کے آدمی پہلے سے بیٹھے تھے۔ میرے لہجہ سے انہوں نے تاڑ لیا کہ یہ کوئی غیر مخلوق ہے۔ کرید کرید کر مجھ سے پوچھنے لگے۔ تب میں نے انہیں بتایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں۔

حیران ہو کر پوچھا "شاستری جی سے تمہارا کیا سمبندھ ہے۔"

میں نے کہا "میں ان کا شش ہوں۔"

"شش؟" انہوں نے مجھے تعجب سے دیکھا۔ "مگر تم تو پاکستان میں رہتے ہو۔"

میں نے کہا کہ "میں سکول میں ان سے پڑھا ہوں۔" اور پھر ان کی حیرت دور کرنے کی غرض سے

کہا کہ "شش اور گورو کا ناتا ایسا ہوتا ہے کہ کتنا ہی سمے بیت جائے اور دنیا کتنی ہی بدل جائے، وہ ناتا نہیں ٹوٹتا۔"

اتنے میں وجیندر جی آ گئے اور وہ سادھو لوگ اپنے شاستری جی کو دیکھ کر چپ ہو گئے۔ اب میں کرشل انڈسٹریل ہائی سکول والا طالب علم تھا۔ اسی طرح ان سے سوال کر رہا تھا اور وہ استادانہ شان سے جواب دے رہے تھے۔ ایک ڈیڑھ سوال میں نے رامائن کے حوالے سے بھی کیا تھا۔ اس پر بات کرتے کرتے رکے۔ پھر بولے "اب یہ بابری مسجد اور رام مندر کا جھگڑا شروع ہو گیا ہے۔" رکے۔ پھر آہستہ سے بولے "رام مندر الگ رہا۔ پتہ نہیں رام جی پیدا بھی ہوئے تھے یا نہیں ہوئے تھے۔"

میں اس بیان پر چکرایا مگر میں نے اس پر کوئی سوال نہیں کیا۔ باہر آ کر ریوتی سے پوچھا "وجیندر جی یہ کیا کہہ رہے تھے کہ رام جی پیدا بھی ہوئے تھے یا نہیں۔"

وہ ہنسا اور بولا "وجیندر جی اصل میں کرشن بھگت ہیں۔ رام جی کو زیادہ نہیں مانتے۔"

ریوتی کے حوالے سے یاد آیا کہ سکول میں میری اچھی خاصی دوستیاں ہو گئی تھیں مگر سکول سے فارغ ہونے کے بعد سب چڑیاں اڑ گئیں۔ سب نے اپنی اپنی راہ لی۔ بس ایک طالب علم ریوتی سرن شرما سے کہ ہمارے محلّے کے قریب ہی اس کا محلّہ تھا، ملنا جلنا جاری رہا۔ پھر یہ رشتہ پختہ اور گہرا ہوتا چلا گیا۔ خیر یہ ذکر تو ابھی آگے چل کر آتا ہے۔

میری اس تین سالہ سکول کی زندگی کا کیا خوب اختتام ہوا کہ سان نہ گمان بس فرسٹ ڈویژن آ گئی۔ بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ میری والدہ حق دق۔ ادھر بڑی ہمشیرہ صاحبہ نے جھرجھری لی اور اعلان کر دیا کہ میرا بھیا بی اے کرے گا اور ڈپٹی کلکٹر بنے گا۔ اس زمانے میں اور اس فضا میں اس سے بڑھ کر اعلان اور کیا ہو سکتا تھا۔ ہماری ڈبائی میں تعلیم کا عمومی تصور یہ تھا کہ لڑکا انٹرنس پاس کر لے یعنی میٹرک پاس ہو جائے اور اعلیٰ عہدے کا تصور یہ تھا کہ داروغہ بن جائے یعنی سب انسپکٹر پولیس۔ تو جو لڑکا میٹرک کر لیتا تھا۔ اس کی ماں برادری کے بیچ بیٹھ کر دون کی لیتی تھی کہ ماشاء اللہ سے میرے پوت نے انٹرنس پاس کر لیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو داروغہ بنے گا اور ماں کو راج رجائے گا۔ میں اس کے لیے چاندی دلہن لے کر آؤں گی۔ داروغہ کی تنخواہ کیا ہوتی ہے، اس کے بارے میں کون سوچتا تھا۔ داروغائی میں اصل چیز تنخواہ نہیں بالائی آمدنی ہوتی تھی اور پھر داروغہ کا کروفر۔ جب کوئی لڑکا خوبیٔ قسمت سے میٹرک کی حد کو پار کر کے کالج میں پہنچ جاتا تو ماں بہنوں کا خواب بھی داروغائی کی حد پار کر کے ڈپٹی کلکٹری کا خواب بن جاتا تھا۔ اس زمانے میں ایک ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کی اڑان یہیں تک تھی۔ اس سے آگے کے مراتب و مقامات تو انگریزوں کے لیے تھے۔ ہندوستانیوں میں سے تو کوئی کوئی مائی کا لال ہی اس لکشمن ریکھا کو پار کر کے آگے کے مقامات تک رسائی حاصل کرتا تھا۔ اس زمانے کے ایک شاعر کے مرغِ تخیل نے بھی پرواز کی تو بس اسی مقام ڈپٹی کلکٹری پر آ کر رک گیا ؏

شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر بن گیا

تو میری ہمشیرہ نے ڈپٹی کلکٹری کا خالی خواب دیکھا۔ بہنوئی صاحب نے عملی قدم اٹھایا اور وظیفے اور فیس میں رعایت کے لیے کاغذی گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے اور لیجیے میں دم کے دم میں ہاپوڑ سے نکلا اور میرٹھ جا کر میرٹھ کالج میں داخل ہو گیا۔ شہر میں تو اب میں نے قدم رکھا تھا۔ میرٹھ شہر اور پھر چھاؤنی والا شہر۔ میں نے ایک رشتہ کے چچا (دوسرے رشتے سے بہنوئی) فضل الرحمٰن کے گھر میں جا کر ڈیرا کیا تھا۔ ان کا فرزند انیس الرحمٰن ایک رشتے سے چچازاد بھائی، دوسرے رشتے سے بھانجا۔ رہائش ان کی صدر میں تھی۔ جب ہم دونوں دن ڈھلے چہل قدمی کے لیے نکلتے تو بس قدم اٹھاتے ہی کنٹونمنٹ کی حدیں شروع ہو جاتیں۔ سڑکیں صاف شفاف۔ ہندوستانی کے نام نہ آدمی نہ آدم زاد۔ اکا دکا گورے گورے چہرے نظر آتے۔ کوئی میم کا کوئی گورے صاحب کا۔ گورے صاحب سفید نیکر قمیض میں ملبوس۔ پیروں میں سفید کریچ والا جوتا۔ ہاتھ میں ٹینس کا ریکٹ، فٹ پاتھ پہ فرنگیانہ شان سے چلے جا رہے ہیں۔ کمپنی باغ کی طرف رخ ہے۔ وہیں تو ٹینس کورٹ ہے مگر ہم بھی تو ادھر ہی جا رہے ہیں۔ سواری ان سڑکوں پر مشکل سے نظر آتی۔ نہ ٹم ٹم نہ تانگہ۔ کوئی کوئی کار ایک فراٹے کے ساتھ ہمارے برابر سے گذری چلی جاتی یا کوئی نوخیز گورا سائیکل پہ تیزی سے گذرتا نظر آ جاتا۔

کمپنی باغ میں قدم رکھا۔ واہ واہ کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا۔ گل پھول کی بہار دیکھو۔ ہری بھری رنگا رنگ کیاریوں کے بیچ سے گزرتی پگڈنڈیوں پر میموں کو دیکھو۔ گوری میمیں۔ ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی کالی آیائیں۔

یہ کنٹونمنٹ کا علاقہ ہے۔ یہاں تو یہی کچھ دیکھنے کو ملے گا۔ میرٹھ شہر دیکھنا مقصود ہو تو صدر بازار سے گزرو۔ آگے جاؤ۔ شہر میں قدم رکھو۔ چڑھائی چڑھ کے سیٹ بازار جاؤ۔ ریوڑی گزک والی گلی سے گزرو۔ رام چندر کی ریوڑی خوب۔ گزک خوب تر۔ ویلی بازار کی بہار دیکھو۔ بالا خانوں پر نظر ڈالتے چلو۔ یہیں کہیں تمیزن کا بالا خانہ تھا۔ قتل تمیزن کا خونیں ڈرامہ یہیں ہوا تھا۔ پھر اس خونیں ڈرامے پر ڈرامے لکھے گئے۔ بوم ہاپوڑی کہاں پیچھے رہنے والے تھے۔ انہوں نے بھی خوب خامہ فرسائی کی۔ بوم ہاپوڑی اچھے بھلے ہاپوڑ کی میونسپلٹی میں محرری کر رہے تھے۔ تحصیلدار کا چماری پر دل آ گیا تھا تو تھمبیں کیا۔ موصوف نے ''چماری نامہ'' لکھ ڈالا۔ بیک بنی و دو گوش نکالے گئے۔ اب میرٹھ کی گلی محلوں میں اپنے شعر سناتے بیچتے پھرتے تھے۔ میں جب ہاپوڑ جانے کے لیے لاری اڈے پر جاتا تو لاری میں بیٹھتے بیٹھتے ایک آواز کان میں پڑتی۔ کلام بوم دو آنے میں۔ چماری نامہ ایک آنے میں۔ مڑ کر نظر کی تو بوم ہاپوڑی نظر آئے۔ پھٹے حالوں، کتابچوں کی صورت اپنا کلام چھپوا کر خود بیچتے پھرتے ہیں۔ مشاعرے میں پہنچ جائیں تو بھرا مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔ یہاں لاری اڈے پر انہیں اپنے خریدار ڈھونڈنے پڑ رہے ہیں۔

آگے بڑھو تو گھنٹہ گھر نظر آئے گا۔ بھیڑ ہی بھیڑ۔ کندھے سے کندھا چھلتا ہے۔ یہ میرٹھ کا مرکزی

بازار ہے۔ گھنٹہ گھر میرٹھ کا مرکز و محور۔ اس بازار سے ایک سڑک مڑتی ہے۔ اس پر مڑو۔ وہ ہے خیر نگر بازار۔ خیر نگر کے سیخ کباب مشہور ہیں۔ یہاں ایک کبابی بیٹھتا تھا۔ ایسے کباب بناتا تھا کہ کھانے والے سی سی کرتے تھے اور ہونٹ چاٹتے تھے۔ یاد آیا، ایک شے ہاپوڑ کی بھی مشہور تھی۔ ایسی مشہور کہ اس سے ہاپوڑ کا نام بگڑ کر ہاپڑ بن گیا۔ یعنی ہاپڑ کے پاپڑ مگر شوکت تھانوی نے لکھا کہ ہاپوڑ کی دو چیزیں مشہور ہیں۔ پاپڑ اور مولوی عبدالحق۔ پاپڑ کی مقبولیت اور شہرت میں تو خیر کوئی کلام ہی نہیں مگر شاید مولوی عبدالحق کی شہرت ہاپوڑ سے باہر باہر بہت تھی۔ ہاپوڑ میں ان کا نام سننے میں کم ہی آتا تھا۔ زیادہ آتا بھی کیسے۔ وہ تو ہاپوڑ سے ایسے گئے کہ پھر مشکل ہی سے کبھی اس نگر میں آ کر جھانکا۔ ان کا ذکر کسی کسی سے سنا بھی تو اس رنگ سے جیسے کوئی راز افشا کیا جا رہا ہے۔ چپکے چپکے سنایا کہ رات کو ان کی شادی ہوئی اور صبح کو وہ ہاپوڑ سے ایسے غائب ہوئے کہ پھر برسوں تک پلٹ کر صورت ہی نہیں دکھائی۔

ہاپوڑ میں تو مولوی عبدالحق سے بڑھ کر ان کے بھائی کے کمالات کا چرچا تھا۔ اچھا ہاں میں نے جو ابھی باغ کے بیچ اپنی رہائش کا ذکر کیا، وہ بھی بس میاں جان کے جیتے جی تک تھی یا شاید ان کی آنکھ بند ہونے سے پہلے ہی ہمارے چچانے اور ہم نے وہ جگہ چھوڑ دی تھی اور آبادی کے اندر ایک محلہ قانون گویان میں کرائے پر الگ الگ ٹھکانے تلاش کیے تھے۔ وہاں ہمارے گھر کے عین سامنے ایک دروازہ تھا جو کھلتا کم تھا، بند زیادہ نظر آتا تھا۔ رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ ضیاء الحق کا مکان ہے۔ مجھے تجسس ہوا کہ ضیاء الحق کون بزرگ ہیں۔ پتہ چلا کہ مولوی عبدالحق کے بھائی تھے جو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں مگر ایک غیر معمولی شخصیت کے طور پر ان کا ذکر اکثر سننے میں آتا تھا۔ بس یہ سمجھ لو کہ اپنے ہنر میں یکتا تھے۔ ریاستوں کے درون خانہ رازوں کو مٹھی میں دبائے پھرتے تھے۔ جس نواب جس راجہ کی شان میں ایک پمفلٹ لکھ دیا اس کی تھڑی تھڑی ہوگئی۔

لو میں کدھر نکل گیا۔ میرٹھ کا ذکر کرتے کرتے پھر ہاپوڑ کی طرف پلٹ گیا مگر یہ صورت تو شاید آگے بھی پیش آئے۔ اصل میں اب میرا حال یہ تھا کہ ایک پاؤں میرٹھ میں دوسرا پاؤں ہاپوڑ میں۔ کوئی چھٹی آئی اور میں نے منہ اٹھایا اور ہاپوڑ کی طرف چل پڑا۔

❧........❧........❧

شہر میں پہلا قدم

میں نے اب پہلی مرتبہ گھر سے قدم نکالا تھا اور قصبہ سے نکل کر شہر کی فضا میں سانس لے رہا تھا اور ایک سطح پر نہیں دو سطحوں پر۔ سکول سے نکل کر کالج میں پہنچنے کا معاملہ بھی تو کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے کہ جیسے قصباتی فضا سے نکلے اور ایک بھرے پھرے شہر میں آن براجے۔ کم از کم میرے ساتھ تو یہی ہوا۔ وہاں سکول میں تو ایک چھوٹی سی برادری تھی۔ جو چہرے بھی تھے کتنی جلدی جانے پہچانے بن گئے تھے۔ کوئی گورا چٹا، کوئی گندمی، کوئی سانولا سلونا، کوئی شدھ کالا۔ کسی نے دھوتی پہن رکھی ہے۔ کوئی نیکر پہن کر اترا رہا ہے۔ پائجامہ تو پوری کلاس میں ایک ہی تھا یا شاید پورے سکول میں۔ مگر پتہ چلا کہ پائجامہ والا میرے سوا سکول میں کوئی دوسرا بھی ہے۔ چلو اچھا ہوا۔ سکول میں ایک اور پائجامہ والا نکل آیا۔ ایک سے دو بھلے۔

خیر میں کہہ یہ رہا تھا کہ سکول کی فضا میں آپ دیر تک ایک دوسرے سے اجنبیت نہیں برت سکتے۔ جلدی ہی آپس میں گھل مل جاتے ہیں اور باہمی تعلق کی گرمائی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ کالج کا معاملہ اس سے بہت مختلف ہوتا ہے اور میرٹھ کالج تو ویسے بھی اچھا خاصا بڑا کالج تھا۔ میرٹھ میں یہی تو ایک ڈگری کالج تھا۔ دوسرا کالج تھا تو سہی مگر انٹر کالج کی حد تک۔ فیض عام انٹر کالج، وہ خالص مسلم کالج تھا۔ ادھر طلبا دور تک، سمجھ لو کہ گنگا جمنی۔ مگر ٹولیوں میں بٹے ہوئے۔ کلاسوں میں آ جا رہے ہیں لیکن نہ میں انہیں پہچان پا رہا ہوں نہ انہیں اس سے غرض ہے کہ کون ان کے ساتھ کلاس روم میں داخل ہوا ہے اور برابر میں بیٹھ کر لیکچر سن رہا ہے۔ اور کلاس روم بھی کوئی ایک نہیں ہے۔ ہر مضمون کے ساتھ کلاس روم بھی بدل جاتا تھا۔ تو وہ جو سکول میں در و دیوار سے وابستگی ہو جاتی ہے، اس طرح کہ ایک ہی کمرے میں ایک ڈیسک کو مستقل طور پر اپنا کر ڈٹے بیٹھے ہیں۔ ویسا کالج میں نہیں ہو پاتا اور پھر ایک ایک کلاس میں طلبا بھی اتنے کہ انہیں گروپوں میں تقسیم کرنا پڑتا تھا اور ایک کلاس کئی ذیلی کلاسوں میں اس طرح بٹ جاتی تھی کہ ایک ذیلی کلاس دوسری ذیلی کلاس کے لیے اجنبی ٹھہرتی تھی۔ استادوں کا معاملہ بھی یہ تھا کہ ہر سال آپ کا گروپ بدل جاتا تھا اور اس کے ساتھ استاد بھی۔ قسمت سے اگر اگلے برس بھی وہی پچھلے برس والا استاد آپ کے حصے میں آ جائے تو اسے خوش قسمتی سمجھنا چاہیے۔

خیر جس طالب علم کو ایف اے، بی اے، ایم اے سب مراحل ایک ہی کالج میں طے کرنے ہوں تو

وہ کتنے دنوں تک اجنبی بنا رہ سکتا ہے۔ سو اجنبیت تو رفتہ رفتہ جاتی رہی مگر استادوں سے قرب۔ طلباء جب قطار اندر قطار ہوں اور کلاس روم طلباء سے لبریز نظر آئے تو پھر چند ایک ہی طالب علم اپنے ہنر کے زور پر استاد سے قرب حاصل کر پاتے ہیں مگر ان کا یہ ہنر کسی کلاس فیلو لڑکی سے قرب حاصل کرنے میں کبھی کام نہ آیا۔ ہماری انگلش لٹریچر والی کلاس میں فرسٹ ایئر سے فورتھ ایئر تک تین لڑکیاں تھیں۔ دو ہندو، ایک مسلمان لیکن وہ اتنی الگ تھلگ رہتی تھیں کہ لڑکوں کے قریب بیٹھنے سے بھی گریز کرتی تھیں۔ پروفیسر صاحب کے قریب انہوں نے اپنا ایک گوشہ بنا لیا تھا۔ لیکچر یکسوئی سے سننا۔ کیا مجال کہ لڑکوں کی صفوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھ لیں۔ ہمارے ایک سکھ کلاس فیلو نے جرأت دکھائی تھی اور کلاس روم سے نکلتے ہوئے ایک لڑکی سے کلام کرنے کی کوشش کی تھی مگر منہ کی کھائی۔

ہماری اردو اور فارسی کلاسوں میں بس ایک لڑکی تھی۔ مسلمان تھی مگر برقعہ پوش نہیں تھی۔ پھر بھی طور اس کا وہی رہا کہ کلاس روم میں استاد کے قریب اس طرح بیٹھنا کہ جیسے ان کی پناہ میں ہے اور ہمارے اردو والے پروفیسر مظہری تو اتنے چوکنے رہتے تھے کہ کبھی اس طالبہ کو نام لے کر مخاطب نہیں کیا۔ مبادا کسی نٹ کھٹ شاگرد کو نام کا پتہ چل جائے اور نام کی خوشبو ساری کلاس میں پھیل جائے۔

مگر ہمارے پروفیسر جیلانی آزاد منش قسم کے بزرگ تھے۔ فارسی اور اردو کے مشترکہ شعبہ کے صدر تھے۔ اگرچہ پروفیسر صرف فارسی کے تھے۔ فارسی شاعری ان کا مضمون تھا مگر طبیعت آزاد پائی تھی۔ کلاس میں بیٹھ کر ہمیں ان کا کتنا انتظار کرنا پڑتا۔ جس روز آ جاتے اس روز ہماری عید ہو جاتی۔ پڑھاتے کم تھے، باتیں زیادہ کرتے۔ ہر پھر کر علامہ اقبال کا ذکر کرتے۔ علامہ سے ان کا تعلق بھی رہا تھا کہ تعلق ان کا لاہور ہی سے تھا۔ اس تعلق کے حوالے سے علامہ کے طور اطوار پر کتنی دلچسپ گفتگو کرتے اور میں یہ سوچ کر کتنا حیران ہوتا کہ اچھا ہمارے جیلانی صاحب نے علامہ اقبال کو دیکھا تھا اور نہ صرف دیکھا بلکہ ان کی صحبت میں اٹھے بیٹھے بھی تھے۔ اس ایک وجہ سے میری نظروں میں ان کا رتبہ بہت بلند ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ تو انہوں نے اپنی گفتگو میں ایسا سماں باندھا کہ میں مجسم حیرت بن گیا۔ علامہ اقبال کا عالم اضطراب میں راوی کی طرف نکل جانا۔ وہاں ایک بزرگ سے ان کی ملاقات۔ علامہ کے سوال، بزرگ کی طرف سے جواب۔ آخر میں جیلانی صاحب نے انکشاف کیا کہ اصل میں وہ بزرگ خواجہ خضر تھے۔ اسی تجربے نے علامہ سے ''خضر راہ'' ایسی نظم لکھوائی تھی۔ اس انکشاف کے بعد تو ''خضر راہ'' نے میرے تصور میں کچھ اور ہی شکل اختیار کر لی اور پھر تو میں جیلانی صاحب کا پہلے سے بڑھ کر معتقد ہو گیا۔

ویسے جیلانی صاحب طلباء میں اور خالی اردو اور فارسی کے طلبا میں نہیں کالج کے سب سے مسلمان طلباء میں بہت مقبول تھے اور ایک طرح سے ان کے سرپرست اعلیٰ بنے ہوئے تھے۔

ہاں اسی قسم کی مقبولیت پروفیسر شریف کو بھی حاصل تھی۔ اتفاق سے ان کا تعلق بھی پنجاب ہی سے

تھا مگر وہ تو کالج کے مسلمان طلباء کے لیے عملی کام بھی کرتے تھے۔ ایک مسلم سوسائٹی تھی جس کے وہ کرتا دھرتا تھے۔ یہ سوسائٹی مستحق مسلمان طلباء کو وظیفے دیتی تھی۔ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کا ایک ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اس مقصد سے کہ جو طالب علم غیر نصابی کتابیں خریدنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اسے مطلوبہ کتابیں فراہم کی جائیں۔ ویسے اس ذخیرے سے تو میں نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ کمبخت فارسی کا مضمون بھی عجب تھا۔ کلاس میں ہمارے استاد نظم و نثر کا مطلب اردو میں سمجھاتے تھے مگر امتحان کا پرچہ انگریزی میں آتا تھا۔ اس توقع کے ساتھ کہ ہم حافظ و سعدی کے شعروں کی تشریح انگریزی میں کریں گے اور خالی تشریح نہیں بلکہ ترجمہ بھی۔ اب تصور کیجیے کہ خاقانی کے قصیدے کے اشعار ہمارے سامنے ہیں اور ہم سر پکڑے بیٹھے ہیں کہ انگریزی میں ان کا ترجمہ کیسے کریں۔ شریف صاحب کے ذخیرے سے میں نے ایسی کتاب ڈھونڈ نکالی جس میں کسی نیک دل پروفیسر نے طلباء کی سہولت کے لیے ایسے کتنے شاعروں کے منتخب کلام کا ترجمہ انگریزی میں کر رکھا تھا۔

شریف صاحب فزکس کے شعبہ سے وابستہ تھے تو ان سے میرا تعلق بس سوسائٹی ہی کے واسطے سے تھا۔ اب سنیے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد شریف صاحب مجھے کہاں نظر آئے اور مجھے ان سے کتنی ڈانٹ کھانی پڑی۔ یہ 48ء کا ذکر ہے۔ میں لاہور آ چکا تھا۔ تپتی جون کی گرمی میں ذرا اومنی بس کے سفر کا تصور کیجیے۔ میں بس میں کہیں پیچھے ٹھنسا کھڑا تھا۔ اب جو میں نے کھڑے کھڑے بس کے مجمع پر نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ مجھ سے دور دروازے کے قریب ایک معزز شخصیت ٹھسا ٹھس مجمع میں پھنسی کھڑی ہے۔ ارے یہ تو شریف صاحب ہیں۔ یہ یہاں کہاں۔ اتنا سوچ ہی پایا تھا کہ ادھر سے ایک ڈانٹ پڑی۔ ''انتظار حسین، تم کتنے نالائق شاگرد ہو۔ استاد کو دیکھ رہے ہو اور یہ توفیق نہیں کہ دو پورے اٹھا کر سلام کرلو۔''

یہ ڈانٹ اتنی بلند آواز میں پڑی کہ بیچ میں کھڑی سب سواریوں کی نظریں میری طرف مڑ گئیں۔ میرا حال دیکھ کر انہوں نے مجھے رستہ دیا اور میں نے شریف صاحب کے قریب جا کر مودبانہ اپنے قصور کی معافی مانگی اور معذرت کی کہ ''میں اتنی دور سے آپ کو کیسے اپنا سلام پہنچاتا۔ سوچ رہا تھا کہ بس رکے اور سواریاں اتریں تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔''

اصل میں شریف صاحب کو غصہ تو اپنے حال پر آ رہا ہوگا۔ کالج میں ان کا کیا رعب داب تھا۔ اب یہاں آ کر مہاجروں کی ریل پیل میں پسے جا رہے تھے اور بسوں میں دھکے کھا رہے تھے۔ ایک شاگرد نظر آ گیا تو سارا نزلہ اس پر گرا۔

ہاں وہ جو ہمارے استاد پروفیسر مظہری تھے، بہت ثقہ بزرگ تھے۔ انہیں مسکراتے ہوئے شاید ہی کبھی کسی نے دیکھا ہو۔ کس پر مہربان ہیں، اس کا پتہ مشکل ہی سے چلتا تھا۔ مجھے اس کا پتہ اس وقت چلا جب کالج میگزین (اردو) کی ادارت کے سلسلہ میں ان کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی۔

ارے ہمارے استادوں میں پروفیسر مکرجی بھی تو تھے۔ انگریزی ادب پڑھاتے تھے۔ لگتا تھا کہ

وہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے مگر لیکچر دیتے دیتے نصاب کی حدود سے نکلتے اور کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ ایک روز نئے رجحانات پر بات کرتے کرتے جوائس کے ناول "یولیسس" کا حوالہ دیا اور پھر پورا لیکچر اسی ناول کے لیے وقف کر دیا۔ پھر بھری کلاس پر ایک نظر ڈالی۔ سوال کیا "یہ ناول تم میں سے کسی نے پڑھا ہے؟"

ساری کلاس گم صم۔ کسی نے ہنکارا بھی نہیں بھرا۔ تب وہ جو کلاس میں تین لڑکیاں تھیں، ان میں سے وہ جو مسلمان تھی، سانولی رنگت، سرو قد، وہ کھڑی ہوئی۔ "میں نے پڑھا ہے۔"

مکر جی نے کچھ سوال کیے۔ اس نے فرفر جواب دیئے اور استاد سے داد پائی۔ پوری کلاس پہلے ہی اس کے سحر میں تھی، آج اس کے رعب میں آ گئی۔

ایسا ہی ایک واقعہ اور سن لیجیے۔ یہ اس برس کی بات ہے جب "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک چلی تھی۔ شہر شہر ہنگامے ہو رہے تھے۔ میرٹھ کیسے بچا رہتا۔ وہ بھی زد میں آ گیا۔ اردگرد ہندوستان چھوڑ دو کے نعرے لگ رہے تھے۔ لاٹھی چارج، آنسو گیس، گرفتاریاں مگر میرٹھ کالج میں امن وامان تھا۔ بس ایک صبح اچانک کالج کے کسی گوشے میں یہ نعرہ بلند ہوا۔ سمجھو کہ جیسے کسی نے بھس میں چنگاری پھینک دی۔ آگ فوراً ہی بھڑک اٹھی۔ کلاسوں سے لڑکے بھرا کھا کے نکلے۔ نعرہ بازی شروع ہو گئی۔ کسی نے گھما کر پتھر مارا اور ایک کمرے کے کسی دریچے کے شیشے چکنا چور ہو گئے۔ بس پھر دروازوں، دریچوں کے شیشے چکنا چور ہوتے چلے گئے۔ جب ہجوم کسی طور قابو میں نہ آیا تو پولیس طلب کی گئی۔ دم کے دم میں گھڑ سوار پولیس کالج میں آن داخل ہوئی۔

مگر پولیس کے آنے سے پہلے میرٹھ کے جانے مانے لیگی رہنما ڈاکٹر اشرف کالج آن پہنچے تھے اور مسلمان طلباء میں جو لیڈر قسم کی مخلوق تھی، اسے ہدایات دیں اور چلے گئے۔ سو ہوا یہ کہ پولیس کے داخل ہوتے ہی احتجاج کرنے والے طلبا اڑن چھو ہو گئے۔ میں نے اردگرد نظر ڈالی تو دیکھا کہ مسلمان طلباء بھاگنے کی بجائے لپک جھپک پرنسپل چنز جی کے گرد اکٹھا ہو رہے ہیں۔ میں بھی ان میں جا شامل ہوا۔ آگے آگے جو گھڑ سوار تھا، اس نے اپنے دستے کو ہدایت کی کہ کر لو انہیں گرفتا۔ مگر چنز جی بیچ میں آ گئے "نہیں انہیں نہیں۔ یہ میرے بچے ہیں۔" سور سیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔

بس پھر کالج بند ہو گیا۔ کالج پہ پولیس کا پہرہ بیٹھ گیا مگر پروفیسر مکر جی کلاس سے اپنی بے تعلقی کو زیادہ دن تک برداشت نہ کر سکے۔ انہیں یہ فکر بھی تو تھی کہ امتحانات قریب ہیں اور طلباء کو جتنا انہیں پڑھانا تھا، اتنا پڑھا نہیں سکے تھے۔ جلد ہی انہوں نے اس جمود کو توڑا اور ہماری کلاس لینی شروع کر دی۔ تصور شرط ہے۔ کالج میں طلباء، طالبات کے دم سے کتنی چہل پہل رہتی تھی۔ اب نہ آدمی نہ آدم زاد۔ یہاں سے وہاں تک سناٹا۔ بس مٹھی بھر پولیس والے ہیں کہ پہرہ دے رہے ہیں۔ پہرہ کیا دے رہے ہیں جہاں تہاں بیٹھے اونگھ رہے ہیں اور اس سناٹی فضا میں ایک کلاس روم ہے جہاں مٹھی بھر مسلمان طلباء بیٹھے ہیں اور مکر جی اپنی اونچی آواز میں یوں رواں ہیں جیسے کلاس بھری ہوئی ہے اور وہ ان کے دل و دماغ میں انگریزی ادب کے باب اتارنے میں منہمک

ہیں اس سے بے پروا کہ پوری کلاس ہے کہاں۔ یہ تو گنتی کے چند مسلمان طلباء ہیں جنہوں نے ہڑتال میں حصہ نہیں لیا ہے اور اب جبکہ امتحان قریب ہیں اپنے ایک استاد کے دم کو غنیمت جان رہے ہیں مگر استاد کی پرانی روش کہ کورس کی حدود سے باہر نکلے اور ادب کی روش پر دور نکل گئے۔ آج یوں ہوا کہ انگریزی شاعری کے نئے رجحانات پر بات کرتے کرتے کہیں ایزرا پاؤنڈ کا حوالہ آ گیا۔ لیجیے پھر پاؤنڈ ہی پر رواں ہو گئے۔ یہ دھیان ہی نہیں کہ پاؤنڈ تو کورس میں شامل ہی نہیں ہے۔ ذرا وقفہ آیا تو ایک طالب علم ڈرتے ڈرتے کھڑا ہوا اور جھجکتے جھجکتے کہا کہ "سر، پاؤنڈ ہمارے کورس میں نہیں ہے۔"

بس مکرجی کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ "کورس؟ میں کورس نہیں پڑھاتا، تمہیں انگریزی ادب پڑھاتا ہوں۔" یہ کہا، سامنے رکھی کتاب کہنے والے طالب علم کی طرف پھینک کے ماری اور بھنا کر باہر نکل گئے۔ کلاس ہکا بکا کہ یہ کیا ہو گیا۔

اگلے دن کلاس میں طلباء سب موجود، مکرجی غائب۔ بہت انتظار کیا مگر بے سود۔ تب طلباء کو احساس ہوا کہ مکرجی کچھ زیادہ ہی خفا ہو گئے ہیں۔ اگلے دن طلباء کی ایک ٹولی ان کے گھر پہنچی۔ منت سماجت کی۔ روٹھے ہوئے کو منایا اور کلاس میں لے کر آئے۔

یہ تھے ہمارے پروفیسر مکرجی۔

مگر مجھے اگر کسی استاد سے صحیح معنوں میں قرب حاصل ہو سکا تو وہ بس کرار صاحب تھے۔ ان سے تو قرب ہونا ہی تھا۔ خاندانی قرب جو چلا آتا تھا۔ بچپن سے دیکھ رہا تھا، اگرچہ دور دور سے۔ دیکھتا تھا اور حیران ہوتا تھا۔ سب سے الگ ہی ادا تھی۔ لیجیے کب کی بات یاد آئی۔ ڈبائی میں ہمارے گھر کے آس پاس ایک اور گھر بھی تھا۔ ویسے اس محلہ میں سب گھر ایک دوسرے کے آس پاس ہی تھے۔ ہاں تو وہ گھر کھڑکی والا گھر کہلاتا تھا۔ اس میں سال بھر تالا پڑا رہتا تھا۔ اس کے مکین کہیں پردیس میں رہتے تھے۔۔ شادی بیاہ کی تقریب سے کبھی آ جاتے تو یہ گھر آباد ہو جاتا ورنہ مقفل اور سنسان ہی نظر آتا۔ ہاں محرم کے ایام میں اس کا کھلنا بہت ضروری تھا۔ اس میں ایک عزا خانہ جو تھا۔ سمجھ لیجیے کہ یہ ہمارے خاندان کا مشترکہ عزا خانہ تھا۔ ایسا خاندان جس کے اکثر افراد ڈبائی سے باہر جا کر آباد ہو گئے تھے۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ چاندرات سے چند دن پہلے میری والدہ جا کر اس کا تالا کھولتیں، گھر کی صفائی ہوتی۔ جھاڑ و بہاڑ و، لپائی تپائی، خاص طور پر عزا خانے کی۔ علموں کے سنہری روپہلی پنجے دھو مانجھ کر پاک کیے جاتے۔ پٹکوں کو دھوپ دکھائی جاتی۔ چاندرات کے آتے آتے علم سج کر کھڑے ہو جاتے۔ لوبان سلگایا جاتا۔ موم بتیاں روشن کی جاتیں۔

بس اسی ہنگام پردیس سے سواریاں آنی شروع ہو جاتیں۔ سواریوں سے لدا ایک اکہ کھڑکی والے گھر کے سامنے بھی آ کر رکتا۔ نسوانی سواریوں کے ساتھ ایک نوجوان بھی اترتا نظر آتا۔ اس کے لمبے لمبے بال مجھے کتنا حیران کرتے۔ کان میں پڑی اس وقت کی کچھ آوازیں میرے حافظہ میں گونج رہی ہیں۔

''اے ہے مہربان علی کا پوت تو فلسفی ہے فلسفی۔ دنیا جہاں سے بے خبر۔''
دوسری آواز ''بال بڑھا لیے، فلسفی بن گیا۔ خبطی ہے خبطی۔''

یہ میرا اکرار صاحب سے پہلا تعارف تھا۔ دور دور سے دیکھتا تھا اور حیران ہوتا تھا۔ قریب سے دیکھنے کا اس وقت موقع ملا جب میرا میرٹھ کالج میں داخلہ ہوا۔ پہلے تو میں بس اپنے داخلہ کے فارم پر ان سے سفارشی دستخط کرانے کے لیے گیا تھا۔ بس پھر تو گھر دیکھ لیا۔ لڑکے نے نام خدا کالج میں نیا نیا قدم رکھا ہو تو اس اجنبی ماحول میں یہ جان کر اسے کتنی ڈھارس ہوتی ہے کہ یہاں ایک ایسا استاد بھی ہے جس سے وہ بوقت ضرورت بلاتکلف رجوع کر سکتا ہے، گھر جا کر اس سے پڑھنے پڑھانے کے معاملات میں اس سے ہدایات بھی لے سکتا ہے۔

جب بھی میں وہاں گیا کمرے کا عجب نقشہ دیکھا۔ کمرے میں بچھی دری پر کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ مجلد کتابیں، کتابچے، پمفلٹ، رسالے، اخبار۔ انہیں میں رلے ملے خاکسار تحریک کے پمفلٹ۔ علامہ مشرقی کے کتابچے، مولوی کا مذہبی نمبر 1۔ مولوی کا مذہب نمبر 2 کوئی خطبات کا مجموعہ اور علامہ صاحب کا ''تذکرہ''

ﷻ........ﷻ........ﷻ

میرٹھ اور پھر میرٹھ

ایک برس کے غوطے کے بعد پھر میرٹھ کالج میں آ گیا ہوں اور ایم اے اردو میں پڑھ رہا ہوں۔ بارے برس بھر رہا کہاں غائب۔ بندہ عاجز تھا گردش ایام۔ ہاپوڑ میں ڈنڈے بجاتا پھرتا تھا اور ملازمتوں کے لیے درخواستیں دیتا رہتا تھا مگر میں اکیلا کہاں یہ مشقت بھرتا تھا۔ ہمارے بہنوئی صاحب یعنی وہی بڑے بہنوئی شمشاد حسین اخبار میں پڑھ کر بتاتے کہ فلاں محکمہ میں آسامیاں نکلی ہیں۔ وہاں درخواست دو۔ پھر خود مضمون بنا کر ٹائپ کرتے۔ بی اے پاس ہونے کا حوالہ دیتے۔ سرٹیفکیٹ نتھی کرتے۔ مجھ سے درخواست پہ دستخط کراتے۔ آیت پڑھ کر اس پر پھونکتے اور روانہ کر دیتے ع

کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا

سمجھ رہے تھے کہ آخر اچھے نمبروں سے بی اے کیا ہے۔ کوئی اچھی ملازمت جلدی قدم چومے گی۔ کتنی عرضیاں دیں مگر ہر عرضی کالے کنوئیں میں جا کر غرق ہو جاتی اور متوقع ملازمت جُل دے جاتی۔ اور وہ جو مقابلہ کے امتحان میں بیٹھنے کے لیے اکساتے رہتے تھے، میں ہاں ہوں کر کے ٹالتا رہا۔ جانتا تھا کہ مقابلہ کے امتحان والا مطالعہ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ دل و دماغ پر تو اب ادب سوار تھا۔ اسی حساب سے مطالعہ ہو رہا تھا۔ اب اس میں نئے ادب کا بھی تڑکا لگ گیا تھا۔ اس کا ذمہ دار میرا ایک یار غار تھا۔ بھلا وہ کون تھا۔ کالج میں تو مغائرت کا شکار رہے۔ چند ایک کلاس والوں سے میل جول تھا تو بس اتنا کہ کلاس کے وقفوں میں ہنس بول لئے، پڑھائی کے سلسلہ میں تبادلۂ خیال کر لیا۔ پھر وہ اپنی راہ تم اپنی راہ۔ ہاں بس کالج کے ہمنشیوں کے ساتھ تو اتنی ہی رفاقت تھی مگر وہ جو سکول سے ایک دوستی دم کے ساتھ لگ گئی تھی گل اس نے کھلائے۔ وہ جو کلاس میں ایک مخنی سا لڑکا تھا ریوتی سرن شرما، اس نے میٹرک تک پہنچتے پہنچتے قد نکالا اور میرے ساتھ گھلتا ملتا چلا گیا۔ خیر کالج میں میرے ساتھ وہ داخلہ لے نہ سکا کہ اس کے باپ کو میٹرک سے آگے کی تعلیم کی افادیت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ سوچتا تھا کہ آخر میں تو اسے میرا کاروبار اور زمینوں کا انتظام ہی سنبھالنا ہے۔ اس کے لیے گریجویٹ بننا کیا ضرور ہے مگر اس برہمن بچہ پر گریجویٹ بننے کا بھوت سوار تھا۔ سو پرائیویٹ ایف اے کی تیاری کی۔ اس تیاری میں یہ پروگرام بھی شامل تھا کہ جب چھٹیوں میں میں ہاپوڑ آؤں تو مجھ سے ملنا اور کرید کرید کہ پوچھنا کہ

کلاس میں وہاں کیا پڑھا۔ کونسے نوٹس لیے، کونسی کتابیں پڑھیں۔ اے لو، یہی کرتے کرتے وہ امتحان میں بیٹھا اور کامیابی حاصل کر کے میرے ساتھ تھرڈ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ کالج کی اجنبی فضا میں میں نے اس دوست کو غنیمت جانا۔

مگر بی اے کا نتیجہ آنے کے بعد ہوا یہ کہ ریوتی نے باپ کے سائے سے چار قدم دور جا کر دلی میں نوکری کر لی۔ میں ہاپوڑ کی گلیوں میں اکیلا خاک پھانکتا پھرتا تھا۔ ملازمت کے لیے عرضیاں بھیجنا اور شعر و ادب میرا مشغلہ ٹھہرا اور اندر ہی اندر ہنڈیا پک رہی تھی کہ مجھے ایم اے کرنا ہے۔ ادھر دلی سے ریوتی کے ذریعہ کچھ اس قسم کی کتابیں موصول ہونے لگیں۔ ماورا، نقش فریادی، میرا جی کی نظمیں۔ ارے نئی شاعری تو یہ ہے۔ میں اقبال کی شاعری کو نئی شاعری سمجھ رہا تھا۔ اسے سنگھوا کر الگ رکھا اور نظم آزاد کو شاعری کی معراج جان کر پڑھنا شروع کر دیا۔ ادھر فسانہ آزاد کو طاق میں رکھا اور کرشن چندر کے نام کی مالا جپنے لگا۔

سال ختم ہونے لگا تو دل کی بات زبان پر آئی۔ اردو میں ایم اے کرنے کی بات اور اس عزم کا اظہار کہ اب کسی کو زحمت نہیں دوں گا۔ اپنی مدد آپ کروں گا۔ جنگ کا زمانہ ابھی جاری تھا۔ اس واسطے سے کتنے نئے محکمے وجود میں آ گئے تھے اور اکثروں کے دفتر میرٹھ میں قائم تھے۔ میں نے کتنے سینئر طلباء کو دیکھا تھا کہ ان دفتروں میں کام بھی کر رہے ہیں اور تعلیم کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ایم اے میں داخلہ لیا تو کئی ساتھیوں کا بھی یہی طور دیکھا کہ دن میں دفتر میں کام کرتے ہیں۔ شام پڑے کرار صاحب کے آشیانے کا رخ کرتے ہیں اور کلاس میں حاضری دیتے ہیں مگر کرار صاحب تو انگریزی کے استاد تھے۔ اردو کی کلاس کس تقریب سے۔ اصل میں آگرہ یونیورسٹی نے ایم اے کے لیے اردو کا مضمون نیا نیا اپنایا تھا۔ میرٹھ کالج نے فوراً ہی ایم اے اردو کا نفاذ کر دیا۔ خبر گرم تھی کہ اب فارسی سے الگ اردو کا شعبہ قائم ہوگا اور کرار صاحب صدر شعبہ ہوں گے۔ کرار صاحب نے اب اردو میں بھی تو ایم اے کر لیا تھا۔ یہ کہ کلاس شام کو ہو اور کرار صاحب کے گھر پہ ہو۔ اس میں طلبا کو بھی سہولت تھی اور کرار صاحب کو بھی۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے کتنے سینئر طلباء کو دیکھا کہ بی اے کے بعد طور یہ ہے کہ وہ جو عارضی جنگی دفتر کھلے ہوئے ہیں، ان میں سے کسی میں ملازمت کر رہے ہیں اور شام پڑے کرار صاحب کے ٹھکانے پر جا کر اردو ایم اے کی کلاس میں حاضری دے رہے ہیں۔ میں نے بھی یہی نسخہ آزمانے کی ٹھانی۔ ایک دو دفتروں میں تاکا جھانکا مگر فوراً ہی گردن باہر نکال لی۔ ارے یہ دفتر تو مجھے صبح سے شام تک پدائیں گے۔ دن بھر کی نوکری کے بعد مجھ میں اتنا دم رہے گا کہ کتابوں کے ساتھ مغز سوزی کروں۔ بالآخر پھرتا کٹ ٹوئیاں مارتے مارتے فلاح کا راستہ نکل ہی آیا۔ خود کہاں نکلا۔ ہمارے بہنوئی صاحب کے ذہن رسا اور میل ملاقات نے راہ دکھائی۔ وہ جنگ کے ایام تھے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی سخت قلت تھی۔ اس کی وجہ سے سرکار نے راشننگ کا نسخہ استعمال کیا اور راشننگ کا محکمہ قائم ہو گیا یعنی اب گیہوں اور چینی نپی تلی مقدار میں راشننگ کارڈ پر

ملے گی۔ ہر علاقہ میں ایک راشننگ دفتر۔ اس سے وابستہ راشننگ انکوائری انسپکٹر۔ ان پر تعینات ایک سینئر انسپکٹر جو اس علاقہ کے دفتر کا ہیڈ ہوگا جسے یہ انسپکٹری مل گئی اس کے وارے نیارے ہو گئے۔ دفتر میں چھوٹا موٹا افسر بن کر بیٹھے گا۔ علاقہ کے راشننگ مرکزوں پر چینی اور اجناس کے کاروباریوں پر حکم چلائے گا۔ تنخواہ معقول۔ بالائی آمدنی مستزاد۔ خیر بالائی آمدنی الگ ہنر کا تقاضا کرتی ہے۔ مجھے یہ ملازمت اس حساب سے راس آئی کہ خود کرنا دھرنا کچھ نہیں۔ باہر کی بھاگ دوڑ، انکوائری انسپکٹر کریں گے۔ دفتر کے اندر فائلوں پر لکھا پڑھی کلرک کریں گے۔ تمہاری معاونت ہیڈ کلرک کرے گا۔ دفتر میں ڈیڑھ دو گھنٹے گزارو۔ فائلوں پر دستخط کرو۔ کلرکوں انسپکٹروں سے تھوڑی پوچھ گچھ کرو اور گھر چلے آؤ۔ شام پڑے تم بھی دوسرے یاروں کے ساتھ استاد گرامی کرار صاحب کے ڈیرے پر حاضری دو اور سمجھو کہ ایم اے اردو کی کلاس میں بیٹھے ہو۔ آخر تم اب ایف اے، بی اے کی پڑھائی تو نہیں کر رہے کہ خالی نصاب کو اوڑھنا بچھونا سمجھو۔ تم ایم اے کے طالب علم ہو۔ تمہیں اپنے مضمون کے سوا بھی مضامین کا پتہ ہونا چاہیے۔ یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ دنیا کس طرف جا رہی ہے۔ خود تمہارے ملک میں کیا نئے نئے گل کھل رہے ہیں اور کونسی ہوائیں چل رہی ہیں۔ کانگریس کن ہواؤں میں ہے۔ مسلم لیگ کیا راگ الاپ رہی ہے۔ خاکسار تحریک جس سے تمہارے استاد گرامی وابستہ ہیں، ہندی مسلمانوں کے لیے کونسا نسخۂ کیمیا لے کر آئی ہے اور یہ کمیونسٹ کس کھیت کی مولی ہیں اور ہندو سبھا کیا بیچتی ہے۔ جس ڈیرے میں آکر بیٹھے ہو یہاں بیٹھ کر یہ سب کچھ پتہ چل جائے گا۔ خالی میر و غالب کی غزل ہی تو نہیں پڑھو گے۔ ہندوستانی سیاست کی گلستان بوستان کے سبق بھی دھیل میں ازبر ہو جائیں گے۔

استاد کا ڈیرا بھی خوب تھا۔ ہر قماش کی مخلوق، ہر رنگ کا پنچھی یہاں آکر گرتا تھا اور اپنے رنگ سے چہچہاتا تھا۔ کوئی لیگی، کوئی نیشنلسٹ مسلمان، کوئی سوشلزم کی بولی بول رہا ہے اور انقلاب کی خبر دے رہا ہے۔ کوئی اسلام کے احیاء کا مژدہ سنا رہا ہے۔ کوئی یہ سوچ کر متوحش ہے کہ پاکستان اگر واقعی بن گیا تو ہندوستان کے مسلمانوں کا کیا بنے گا۔ ادھر کوئی دوسرا اس تصور میں مگن ہے کہ بٹ کے رہے گا ہندوستان، لے کے رہیں گے پاکستان۔ اور کرار صاحب کتنے سکون سے کہنے والے کی بات سنتے۔ بس جیسے اس کے استدلال سے قائل ہو گئے ہیں مگر پھر اپنی بات شروع کرتے۔ اب وہ غریب حق دق کہ انہوں نے تو میرے سارے استدلال کو الٹ دیا۔

اردو ایم اے کی کلاس کے نام ہم بس تین تگ تھے۔ ایک چوتھا تگ بھی تھا مگر وہ کہیں دور کے کسی نگر میں شاید خیر پور میں بیٹھا تھا۔ وہ اس کلاس میں غائبانہ شریک تھا۔ ان میں لے دے کے ایک ہی نام یاد رہ گیا ہے۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ وہ تو فرسٹ ایئر سے میرا کلاس فیلو چلا آ رہا تھا۔ اس کا نام تھا عاصم سبزواری۔ اب وہ اردو ایم اے کے ساتھ خاکسار بھی بن چلا تھا، شاید بن چکا تھا۔ تو اپنی اردو کی کلاس کے لیے ہم یہاں استاد کے ڈیرے پہ آن حاضر ہوئے ہیں مگر اردو کی کلاس بعد میں پہلے ہندوستان کی سیاست کا سبق بھی تو تھوڑا پڑھ لو۔

ہندوستان کی الجھی ہوئی سیاست کا سبق جو سلجھنے کی تگ و دو میں اور الجھتی چلی جا رہی تھی۔ ہوتا یوں تھا کہ جب ہم وہاں پہنچتے تو پہلے ہی سے تشنگانِ سیاست میں سے کوئی آیا بیٹھا ہوتا اور اپنی ہانک رہا ہوتا۔ کوئی نیشنلسٹ مسلمان جس کے لیے پنڈت نہرو اور گاندھی جی کا کہا ہوا قولِ فیصل ہے یا کوئی لیگی جیالا جس کے لیے مستند ہے قائداعظم کا فرمایا ہوا یا کوئی کامریڈ کہ انچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم۔ یا کوئی خاکسار کبھی بیلچہ بردوش، کبھی اپنی ذات میں بیلچہ بنا ہوا۔ اسی رو میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دراز قامت شخصیت نمودار ہوئی۔ قد کڑوے نیم سے لکلتا ہوا، رنگت گوری چٹی، بر میں خاکساروں والا خاکی کرتا پاجامہ، کاندھے پر ایک تھیلا لٹکا ہوا۔ مجھے پہچاننے میں اس لیے دیر نہیں لگی کہ انہوں نے بیٹھتے فوراً ہی بے تکلفانہ اپنا تھیلا کھولا جس میں سے پرانے دھرانے کتنے ہی تالے نکل پڑے۔ انہوں نے آغاز کلام بعد میں کیا۔ پہلے زیرِ مشق تالے کی ٹھوک پیٹ شروع کی۔ اس ادا سے میں نے فوراً ہی پہچان لیا کہ ارے یہ تو اختر حمید خاں ہیں کہ کلکٹری کا بارگراں سر سے اتار پھینک کر اب کھٹ بگڑے تالوں کی مرمت کرتے ہیں۔ علامہ صاحب نے حکم جو جاری کر دیا تھا کہ جو خاکسار سرکاری ملازمت میں ہیں وہ اس ملازمت سے مستعفی ہو جائیں۔ علامہ صاحب نے تو حکم عام دیا تھا۔ یہ ان کے دھیان میں کہاں ہوگا کہ اس حکم کی زد میں وہ خاکسار جوان بھی آئے گا جسے انہوں نے اپنی فرزندی میں لے لیا ہے۔ اس کے لیے وہ حرفِ استثنیٰ لکھنے لگے تھے کہ اس نے کہا کہ شاید آپ مجھے اس لیے اس حکم سے مستثنیٰ قرار دینے لگے ہیں کہ میرے استعفے سے آپ کی بیٹی کے آرام میں خلل پڑے گا مگر جو حکم سب کے لیے ہے اس کا مجھ پر اطلاق کیوں نہ ہو۔ سو انڈین سول سروس کا وبال سر سے اتارا اور بنگال سے جہاں کلکٹر بنے بیٹھے تھے، چل کر واپس علی گڑھ آ گئے جہاں ان کے اہل خاندان شاد آباد بیٹھے تھے۔ یہاں کی دو ہی مصنوعات مشہور و مقبول چلی آتی تھیں۔ بی اے علیگ اور علی گڑھ کے تالے۔ انہوں نے بلا تکلف موخر الذکر کاروبار کو اپنا لیا۔ قفل سازی میں تو مہارت آتے آتے ہی آتی۔ تالوں کی مرمت میں مہارت جلدی پیدا کر لی۔

اختر حمید خاں کا روئے سخن تو کرار صاحب کی طرف ہے مگر یہ خاکسار نما دو نوجوان کون ہیں جو ان کے آس پاس منڈلا رہے ہیں۔ شاید یہ دونوں ابھی خاکساری کے اس مکتب میں زیرِ تربیت ہیں مگر یہ مکتب کب کھلا۔ اب سے پہلے تو ایک ہی مکتب تھا اور ایک ہی مدرس اعلیٰ علامہ مشرقی۔ انہوں نے ارشاد کیا اور اوپر سے نیچے تک، اعلیٰ سے ادنیٰ تک سب خاکساروں نے آمنا و صدقنا کہا مگر اب جا بجا آثار بغاوت کے تھے۔ درّوں کی سزا بھی ان آثار کو کچل نہیں سکی۔ کرار صاحب کا ڈیرہ علامہ صاحب سے بغاوت کرنے والوں کا مرجع بن گیا۔ اب یہ ڈیرہ ایک اخبار کا دفتر بھی تھا۔ ہفت روزہ ''الامین'' کا دفتر۔ ہفت روزہ ''الامین'' علامہ صاحب کی پالیسی سے اختلاف کرنے والوں کے موقف کا ترجمان۔

جن دو نوجوانوں کا ذکر کیا، ان کے نام تھے رؤف خان اور یونس منصور۔ رؤف خان کے متعلق مجھے پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں سے چل کر یہاں پہنچا۔ یونس منصور کی آمد کا قصہ اس طرح ہے کہ اختر حمید خاں جب

ایک دفعہ سسرال گئے تو علامہ صاحب کے کیمپ میں ایک نوجوان کو بہت بے چین پایا۔ کریدا تو پتہ چلا کہ علامہ صاحب سے بہت تنگ ہے۔ تب انہوں نے اس سے کہا کہ بھلے مانس اگر صورت احوال یہ ہے تو یہاں کس خوشی میں ڈیرا ڈالے پڑا ہے۔ یہاں سے اٹھ، لاہور سے نکل اور میرٹھ جا کر کرار حسین کے ڈیرے میں ڈیرا کر۔ اس نے یہی کیا۔ علامہ صاحب کے کیمپ سے نکلا۔ اپنے شہر لاہور سے کنارہ کیا اور میرٹھ میں کرار صاحب کے ڈیرے میں آ کر ڈیرا ڈال لیا۔

اب میری سنو۔ اب سے پہلے اپنے استاد کے توسط سے جس خلوص سے میں نے علامہ مشرقی کے خطبات اور ''تذکرہ'' کا مطالعہ کیا تھا، اب اسی خلوص سے میں ''الامین'' میں چھپنے والی تحریریں بالخصوص کرار صاحب کی لکھی ہوئی پڑھ رہا تھا۔ آخر مجھے پتہ تو چلنا چاہیے کہ کرار صاحب اپنے مرشد سے کیوں بدک گئے۔ پھر یونس منصور نے تھوڑا سا مجھے اکسایا تو میں نے سوچا کہ ادبی رسالہ میں چھپنے کا شرف جب حاصل ہوگا تب ہوگا فی الحال ''الامین'' ہی میں خامہ فرسائی کرتے ہیں تو میں نے چند چھوٹی موٹی تحریریں اس رسالہ کے لیے بھی لکھیں اور جب عسکری صاحب کے مضمون اس میں شائع ہونے لگے تو ہر چند کہ وہ مضمون ادب سے ہٹ کر تھے مگر میں نے یہی جانا کہ اب ''الامین'' کو ادبی اعتبار بھی حاصل ہو گیا ہے مگر یہ عسکری صاحب بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑے۔ وہ کہاں ''الامین'' کہاں۔ اور کرار صاحب سے ان کا قارورہ کیسے ملا۔ یہ ذکر مجھے کرنا چاہیے۔ آخر اس قرانِ السعدین میں تنک بھر فریضہ میں نے بھی تو ادا کیا تھا۔ ہمارے استاد تو نئے ادب کو خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے۔ حافظ، بیدل، رومی، میر۔ ان مقامات سے نیچے ہی نہیں اترتے تھے۔ میں نے بساط بھر محترم استاد کو بزعم خود Educate کرنے کی بہت کوشش کی مگر کوئی کوشش بارآور نہیں ہوئی۔ ہاں ایک مرتبہ میں نے ''ادب لطیف'' کا ایک سالانہ نمبر ان کی خدمت میں پیش کیا۔ وہی مشہور سالانہ نمبر جس میں کرشن چندر کا ''ان داتا'' شائع ہوا تھا مگر یہ افسانہ تو انہوں نے بعد میں پڑھا۔ ورق گردانی کرتے کرتے ٹھٹھکے۔ ''ارے، اس میں تو منوں کی نظم بھی چھپی ہوئی ہے۔'' کون منوں۔ اصل میں وہ خیب الرحمٰن کو ان کے گھریلو نام سے یاد کر رہے تھے۔ ان کی نظم ''ابوالہول'' اس اشاعت خاص میں چھپی ہوئی تھی اور تب مجھے پتہ چلا کہ خیب الرحمٰن تو ڈبائی کے اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو ''کرامت والے'' کہلاتے تھے اور جس سے آڑے ترچھے رشتوں سے ہمارے خاندان کے ڈانڈے بھی ملتے تھے۔ خیر ''ان داتا'' پڑھ کر تو کرار صاحب نے کرشن چندر کے لیے کلمۂ خیر کہا۔ مت پوچھو کہ میں دل ہی دل میں کتنا خوش ہوا مگر محمد حسن عسکری، ان کے سلسلہ میں ان کا ایک ردعمل مجھے یاد ہے۔ لیٹے لیٹے ''ساقی'' کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولے ''ارے میاں، یہ محمد حسن عسکری کون صاحب ہیں۔''

میں نے کہا کہ ''یہ نئے ادب کے بہت اچھے نقاد ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ بھلا مانس جوائس پہ کیوں لکھے چلا جا رہا ہے۔ جوائس کی تو کوئی بھی تحریر شاید

اردو میں ترجمہ نہیں ہوئی ہے۔ پھر اردو میں جوائس پر لکھنے کا فائدہ۔"

خیر بات آئی گئی ہوئی مگر تھوڑے ہی دنوں بعد عسکری صاحب کا اس شہر میں ورود ہوا۔ خیر وہ پہلے بھی آتے رہتے ہوں گے۔ آخر ان کا خاندان تو میرٹھ ہی میں شاد آباد چلا آتا تھا۔ اب کے ایسا ہوا کہ میرا ان سے رابطہ ہوا۔ کیسے ہوا، اس کی کہانی میں "چراغوں کا دھواں" میں سنا چکا ہوں۔ بس رابطہ ہونے کی دیر تھی۔ پھر تعلق بڑھتا ہی چلا گیا۔ اتنا کہ تعلق دیرینہ نظر آنے لگا۔ اتنا کہ روز دن ڈھلے وہ گھر سے نکل چلتے پھرتے اس کوچے میں آنکلتے جہاں میں نے اپنا ٹھکانہ بنا رکھا تھا اور مجھے ساتھ لے کر لمبی سیر پر نکل جاتے۔ کرار صاحب کا ذکر ان ملاقاتوں میں نکلنا ہی تھا۔ کچھ دنوں خاموش رہے۔ پھر ایک شام انکشاف کیا "کرار صاحب میرے بھی استاد رہے ہیں۔ میں نے انٹر میرٹھ کالج ہی سے کیا تھا مگر اب میں ملوں تو وہ مجھے پہچانیں گے نہیں۔"

"پہچانیں گے کیوں نہیں۔" میں نے فوراً کہا۔ "پہلے میں انہیں اطلاع دوں گا کہ آپ کا ایک شاگرد آپ سے ملنے آرہا ہے۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ ایک شام میں نے ادھر جا کر استاد کو مطلع کیا کہ "آپ کو جس نقاد پر اعتراض تھا کہ یہ جوائس کا وظیفہ کیوں پڑھے جا رہا ہے، وہ تو آپ کا شاگرد نکلا۔"

"میاں کس کا ذکر کر رہے ہو؟"

"محمد حسن عسکری کا۔ وہ بتا رہے تھے کہ انہوں نے انٹر میرٹھ کالج ہی سے کیا ہے اور وہ آپ کی کلاس میں تھے۔"

"اچھا؟"

"وہ آپ سے ملنے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔"

"ارے بھئی شوق سے آئیں۔"

تو لیجیے ایک شام یہ ملاقات ہوگئی اور ایسی ہوئی کہ پھر ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ اب سیر کی صورت یہ ٹھہری کہ عسکری صاحب گھر سے نکلے۔ مجھے میرے ٹھکانے سے اٹھایا اور چلے کرار صاحب کے ڈیرے کی طرف۔

خیر یہ ذکر تو ابھی آگے چلے گا۔ پہلے مجھے میرٹھ سے اپنے تعلق کا حساب چکا دینا چاہیے۔ ارے تعلیم کے پہلے تین چار سال تو ایسے گزر گئے کہ کالج سے گھر اور گھر سے کالج اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ جس گھر میں میں نے اپنا بستر جمایا تھا، وہ میرٹھ شہر میں کہاں تھا۔ سمجھو کہ میں نے کنٹونمنٹ کے علاقہ میں چھاؤنی چھائی تھی۔ اس علاقہ میں میرٹھ کا کتنا پتہ چلتا تھا۔ وہ تو اب پتہ چلا جب میں بیچ شہر میں اپنے ماموں زاد بھائی حسن عارف کے یہاں آ کر رہا۔ وہ اپنی ملازمت کے حوالے سے پور وہ فیاض علی میں ایک کرائے کے گھر میں مقیم تھے۔ ان کا تبادلہ ہوا اور وہ لکھنؤ چلے گئے۔ میں نے پھر اس کوچہ ہی کو اپنا کوچہ سمجھ لیا۔ خوب جگہ تھی۔ شہر کے

مرکز گھنٹہ گھر سے قریب۔ ایک سمت میں ٹاؤن ہال۔ دوسری طرف چلو تو فیض عام انٹر کالج۔ مسلمان نوجوانوں کا اڈا۔ یہیں سے وہ نگ برآمد ہوا تھا جس کا نام سلیم احمد تھا اور جس سے جلد ہی میری گاڑھی چھننے لگی تھی۔ قریب ہی خیر نگر بازار میں میرا وہ کلاس فیلو رہتا تھا جس کا نام شفیق احمد تھا جو چار سال تک میرا کلاس فیلو رہا اور اب وہ انگریزی کے ایم اے میں تھا۔ میں اردو کے ایم اے میں تھا مگر وہ تلا ہوا تھا کہ شہر میں جو ادبی ٹھکانے اور شخصیتیں ہیں، ان سے میرا تعارف کرادے۔

ہم مکتبوں کا ذکر نکل آیا ہے تو مجھے اپنا وہ کلاس فیلو یاد آ رہا ہے جس نے آگے چل کر تاریخ و تحقیق کے میدان میں بہت نام پیدا کیا اور مستند مانا گیا۔ میں ان دنوں اسے حیرت سے دیکھتا تھا۔ ذات میں اتنا منحنی اور بغل میں اتنی بھاری بھرکم کتابیں۔ دھوندل کاٹ کتابوں کو دبانے کے لیے بغلیں بھی تو دھوندل کاٹ ہونی چاہئیں۔ زمانے بعد جب علی گڑھ جانے کی تقریب پیدا ہوئی تو ابوالکلام قاسمی نے مجھ سے پوچھا "آپ خلیق احمد نظامی کو جانتے ہیں۔" میں چونکا۔ "خلیق احمد نظامی۔ ارے انہیں کیسے نہ جانوں گا۔ بی اے تک ان کا ساتھ رہا ہے۔ اس کے بعد شاید انہوں نے علی گڑھ کا رخ کیا تھا۔"

"انہوں نے آپ کی آمد کا سنا تو مجھ سے کہا تھا کہ انہیں مجھ سے ملوایئے۔"

وقت تھوڑا تھا۔ میں بھاگم بھاگ دلی سے علی گڑھ آیا تھا اور اب واپسی کا خیال سر پہ سوار تھا۔ قاسمی کے ساتھ بھاگتا دوڑتا نظامی صاحب کے آستانے پہ گیا۔ کہاں کے اور کب کے بچھڑے کہاں اور کب جا کر ملے ہیں مگر اطمینان سے ملنا اس وقت نصیب میں نہیں تھا۔ سوچا اور کہا کہ اگلا پھیرا جب بھی ادھر کا لگا، پھر تفصیل سے ملاقات ہوگی مگر اگلا پھیرا کب لگا، جب وہ عزیز اس دنیا سے گزر چکا تھا۔

ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا کہ اب میری آنکھیں کھل رہی تھیں اور میں میرٹھ کو دیکھ رہا تھا۔ محمد یحییٰ خاں تنہا، ندرت میرٹھی، ساغر نظامی، بخشش جار چوی۔ کسی کو دور سے دیکھا۔ کسی کو قریب جا کر سلام کیا اور ڈیڑھ بات کر لی۔ جنہیں قریب سے دیکھا، ان کی سنو۔ سر سے پیر تک کھدر میں ملبوس مگر اس کھدر کے لباس میں کیا خوش سلیقگی تھی۔ چال ڈھال دانشورانہ۔ عینک آنکھوں پر چڑھی ہوئی۔ زلفیں بڑھی ہوئی۔ آتے جاتے انہیں کتنی مرتبہ دیکھا اور حیران ہوا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ جانے کس تقریب سے تعارف ہوا۔ پتہ چلا کہ یہ قیصر زیدی ہیں۔ میرٹھ شہر کے دانشوروں سے بڑھ کر دانشور۔ شاعر مگر نئی شاعری کرتے ہیں۔ نظم آزاد کے میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ محفل میں بیٹھتے ہیں تو چائے کا دور ایسے چلتا ہے جیسے چائے کا نہیں شراب کا دور چل رہا ہے۔ وہ مجھ پہ مہربان ہوتے چلے گئے۔ میں ان سے مانوس ہوتا چلا گیا۔ ان دنوں میرے دو بھانجوں انصار حسین اور حسن ظہیر نے بھی میرٹھ کالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔ ان کے لیے ہمارے بھائی صاحب نے پوروا فیاض علی ہی میں ایک کمرے کا بندوبست کیا۔ میں بھی ان کے ساتھ سا گیا۔ وہ دونوں بھی قیصر صاحب کے گرویدہ ہو گئے۔ قیصر صاحب کی ذات ہی کچھ ایسی پرکشش تھی۔ وقتاً فوقتاً ہمارے اس گوشے میں آن براجتے۔ آتے ہی تقاضا کہ

چائے کی ایک بھری کیتلی میرے لیے الگ رکھ دو۔ چائے پیتے جاتے اور ہونٹوں سے گل پھول بکھیرتے جاتے۔ ایک افسانہ بھی لکھ رکھا تھا۔ منہ زبانی سناتے تھے۔ کہتے کہ بجلی گل کر دو۔ اندھیرے میں افسانہ شروع کرتے۔ آواز سے جادو جگاتے۔ جب افسانہ ختم ہوتا تو ایک منٹ کا وقفہ۔ پھر کہتے، جب میں نے وہاں افسانہ سنا کر ختم کیا تو پردے کے پیچھے سے سسکیاں سنائی دیں۔ یہ زبیدہ کی سسکیاں تھیں۔ ہم نے کبھی پوچھنے کی جرأت نہیں کی اور انہوں نے بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ یہ زبیدہ کون تھی۔

رات گئے تک خود بھی جاگتے اور ہمیں بھی جگاتے۔ جب کیتلی میں قطرہ بھی باقی نہیں رہتا تب رخصت ہوتے۔ ان کی شہرت سدا بہار کنوارے کی تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ اسی طرح کنوارے رہیں گے۔ اپنی طلاقت لسانی سے گل پھول کھلاتے رہیں گے۔ ملازمت جیسی مبتذل شے کو قریب نہیں پھٹکنے دیں گے۔ مگر چلتے پھرتے انہوں نے بھی اردو میں بھی ایم اے کر لیا اور اس کے بعد جامعہ ملیہ چلے گئے۔ میرٹھ کو ویران کر گئے۔

پھر یاروں نے خبر دی کہ قیصر صاحب نے تو شادی کر لی۔ اچھا؟ واقعی؟ ہم سب حیران رہ گئے۔ یاروں نے ایک شگوفہ اور چھوڑا۔ کہا کہ ارے یار وہ دوست کی شادی میں براتی بن کر گئے تھے۔ وہاں عین نکاح کے ہنگام میں جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے ثالث بن کر سمجھوتہ کرانے کی بہت کوشش کی۔ جب دولہا والے اپنی ہٹ پر اڑے رہے تو انہوں نے انہیں پیچھے دھکیلا اور متبادل دولہا کے طور پر اپنے آپ کو پیش کیا۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ لیجیے شادی ہو گئی۔

ہاں یاد آیا۔ انہوں نے ایک نامی گرامی ترقی پسند ادیب سے میرا تعارف کرایا تھا اور عجب انداز سے بولے ''ظ۔ سمجھے اس کا کیا مطلب ہے۔''

میں چکرایا ''ظ بس ظ ہے۔ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔''

سمجھاتے ہوئے بولے ''ارے بھائی، یہ پورا نام ہے۔ نام تو بھلا سا تھا ظل حسنین۔ لیکن جب ترقی پسند ہوئے تو یہ نام بہت روایتی نظر آیا۔ اسے مختصر کرتے کرتے خالی ظ پر قناعت کی۔ ساتھ میں انصاری ٹانک لیا۔ اس طرح ظ۔ انصاری بن گئے۔ میرٹھ ہی کے ہیں۔ چلو میں تمہیں ان سے ملاتا ہوں۔''

اصل میں ظ۔ انصاری یہاں ایک مشن پر آئے ہوئے تھے۔ میرٹھ میں ترقی پسند تحریک کے امکانات کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہاں جو اردو کے شاعر تھے، انہوں نے اب تک مشاعرے دیکھے تھے۔ تحریک کیا ہوتی ہے، یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ تو اردو والوں سے تو وہ جلد ہی مایوس ہو گئے۔ میرا دم انہیں غنیمت نظر آیا۔ ویسے بھی اس بھاگ دوڑ میں انہیں کسی ایک نوجوان کی ضرورت تھی جو ان کا معاون بن سکے۔ مجھ میں انہوں نے شاید کوئی ایسا جوہر دیکھا ہوگا کہ میرٹھ کے گشت میں انہوں نے مجھے اپنا معاون بنا لیا۔ شہر میں ہندی کے ننھے لکھک تھے، ان سب سے باری باری ملے۔ میں ان کا بازو بنا ہوا تھا۔ ہندی کے لکھنے والوں کو وہ اپنی تحریک کے مقاصد سمجھانے میں کامیاب ہو گئے۔ کم و بیش ایک مہینے کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک وکیل

صاحب کے گھر ایک جلسہ ہوا جس میں کسی نے کویتا پڑھی۔ کسی نے کہانی سنائی۔ لیجیے میرٹھ میں ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑ گئی۔ انجمن کے قیام کی بھی صورت پیدا ہو گئی۔

تو تحریک کی تھوڑی خدمت میں نے بھی کی ہے مگر ظ صاحب کے جانے کے بعد مجھے ان ادیبوں کا پتہ ہی نہ چلا جو ترقی پسندی پر ایمان لے آئے تھے اور جب تھوڑے مہینوں کے بعد ظ صاحب نے میرٹھ کا دوسرا پھیرا لگایا تو ایک بدشگنی ہو گئی۔ شومئی قسمت سے وہ ایسے وقت میں میری طرف آئے جب وہاں عسکری صاحب آئے بیٹھے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنی اپنی جگہ محتاط ہو گئے۔ اُدھر میں سٹپٹایا ہوا تھا کہ ان دونوں کا یہ ملن کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ ظ صاحب سے پھر دوسری ملاقات نہیں ہو سکی یعنی میرٹھ میں رہتے ہوئے۔

ظ صاحب بمبئی سے آئے تھے۔ واپس بمبئی چلے گئے۔ میرے ہوتے ہوئے پھر وہ میرٹھ نہیں آئے۔ ظ صاحب کا ایک امتیاز یہ بھی تو تھا کہ اب وہ بمبئی کے باسی تھے۔ بمبئی کا بھی ایک زمانے میں ایک عجب گلیمر تھا۔ پری چہرہ نسیم ہی نہیں سب پری چہرہ لوگ وہیں رہتے تھے۔ جو چہرے غروب ہو گئے جیسے سلوچنا، مادھوری اور جواب چمک دمک رہے تھے، ونمالا بی اے بی ٹی، لیلا چٹنس بی اے، بے شری۔

خیر وہ گلیمر تو اب بھی ہے مگر اس زمانے کے نوخیز عاشقوں کے رنگ ڈھنگ اور تھے۔ پہلے خط لکھ لکھ کر بھیجتے تھے۔ جب جواب نہ آتا اور جذبۂ عشق زیادہ زور کرتا تو گھر سے تھوڑی رقم چرا کر بمبئی کی راہ لیتے۔ بمبئی جانے والے ان دنوں دو قسم کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ ایک تو حج پر جانے والے جو بمبئی جا کر پانی کے جہاز پہ سوار ہوتے اور مکہ شریف روانہ ہو جاتے۔ دوسرے وہ نوخیز عاشق پیشہ جن کی منزل مقصود خود بمبئی شہر ہوتا۔ بمبئی یعنی ہندوستان کا کوہ قاف۔ خیر اب تو واں بال ٹھاکرے بھی رہتے ہیں۔ یاد آیا کہ ابھی جب میں بمبئی گیا تھا تو بمبئی یونیورسٹی کی پروفیسر کے ساتھ جن سے میرا نیا نیا تعارف ہوا تھا، ان کے گھر جا رہا تھا تو انہوں نے گزرتے گزرتے گاڑی کو آہستہ کیا اور ایک گھر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں بال ٹھاکرے رہتے ہیں، وہ ہمارے پڑوسی ہیں۔"

میں نے کہا "بہت خوب۔ ایسے پڑوسی تو قسمت والوں ہی کو میسر آتے ہیں مگر آپ کے مہمان کے لیے تو اس سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔"

"بالکل نہیں۔ آپ اپنے آپ کو بالکل محفوظ سمجھئے۔"

اصل میں میرا تعارف تو بمبئی سے بچپن ہی میں ہو چکا تھا۔ سیر بین کے ذریعہ۔ ایک موٹی سی عورت سیر بین کے ساتھ محلے میں نمودار ہوتی۔ گھر گھر جاتی اور سیر بین پر بچوں کو دنیا کی سیر کراتی۔ ہمارے گھر بھی آ کر براجمان ہوتی۔ ہمارا منہ سیر بین کے اندر گڑا ہوا ہے۔ منظر بدلتے چلے جا رہے ہیں۔ بدلتے ہوئے اعلان کے ساتھ مکہ دیکھو مدینہ شریف دیکھو، تاج بی بی کا روضہ دیکھو، بارہ من کی دھوبن دیکھو، بمبئی کا بازار دیکھو۔

تو میں نے پہلے بمبئی کا بازار دیکھا۔ پھر ظ انصاری کو دیکھا۔ بمبئی خالی فلمی ستاروں کا شہر نہیں تھا۔ ترقی پسند تحریک کے ستارے بھی اب ان کے دوش بدوش جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ ریوتی نے دلی سے

ایک اور ستارے کے ورود کی مجھے خبر بھیجی کہ آؤ اور اس سے ملو۔

مگر یہ ملاقات ایک تمہید کی طلبگار ہے۔ ریوتی نے پہلے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ اس نے ایک لڑکی کو اردو پڑھانا شروع کیا ہے۔ اچھا کیا۔ نیک کام ہے۔ پھر دھیرے دھیرے کھلا "اچھی لڑکی ہے۔"

"بہت خوبصورت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔ مگر بہت اچھی لڑکی ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے آنکھوں میں ایک چمک آئی۔

پھر خاصے تامل کے بعد کچھ کھلا۔ "پتہ ہے یہ کون لڑکی ہے؟"

"کون ہے بھلا۔"

"کرشن چندر کی بہن۔"

اب میرے چونکنے کی باری تھی اور حیران ہونے کی "واقعی؟"

"ہاں واقعی۔"

میرا تجسس بڑھتا ہی چلا گیا۔ آخر میں نے دلی جا کر اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا اور دل نے گواہی دی کہ اتنی اچھی، اتنی سادہ، اتنی شریف۔ ضرور یہ کرشن چندر کی بہن ہے۔

پھر اس کے گھر جا کر بھی اسے دیکھا۔ گھر جانے کی تقریب اس طرح پیدا ہوئی کہ اس کے بھائی مہندر ناتھ آئے ہوئے تھے۔ مہندر ناتھ اپنی جگہ ایک اچھے افسانہ نگار تھے۔ ان کی افسانہ نگاری کے ساتھ بس ایک ہی گڑبڑ تھی کہ وہ کرشن چندر کے چھوٹے بھائی تھے۔ چھوٹا بھائی ہونا ویسے بھی چھوٹے بھائیوں کے لیے کوئی خوشگوار تجربہ نہیں ہوتا۔ اگر دوڑنے پھرنے کا میدان بھی مشترک ہو تو پھر ناخوشگواری میں تھوڑا اضافہ اور ہو جاتا ہے۔ پھر ناموری کا تاج بڑے بھائی کے سر پر ہی سجتا ہے۔ تو کرشن چندر اردو کے نامی گرامی افسانہ نگار اور ان دنوں تو ان کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ مہندر ناتھ بھی افسانہ نگاری کے میدان میں چمکے لیکن بڑے بھائی کے نام کی چکا چوند میں کتنا چمک سکتے تھے۔

بہرحال میں دلی پہنچا۔ پھر ہم دونوں مل کر اس گھر پہنچے۔ مہندر ناتھ تو واقعی اپنی بہن کے بھائی نکلے۔ سادہ دل، کھلے ڈلے، جاذب نظر شخصیت، جاذب نظر اور دل موہ لینے والی۔ اوپر سے خوش گفتار۔ ادھر سرلا (اس کا نام تھا سرلا دیوی) سامنے ہی نہیں آئی۔ بس باورچی خانے سے پکوڑے پھلکی تل کر بھیجتی رہی۔ کیا وہ سچ مچ یہ سمجھ رہی تھی کہ ہم پیغام لے کر آئے ہیں۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کی ملاقات میں میں یہ سمجھنے لگا کہ پہلے سے ملاقات چلی آتی ہے۔ جیسے واقعی دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا ہو۔ انہیں دنوں ان کے افسانوں کا مجموعہ "چاندی کے تار" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اسے میں نے ان کی طرف سے "سوغات" جانا۔ گھر جا کر پڑھا۔ یوں بھی اچھے تھے۔ اس خوشگوار ملاقات کے ساتھ میل کھا کر اور بھی اچھے ہو گئے۔ میں تنقید لکھنے کے لیے ویسے ہی پر تول رہا تھا۔ سوچا کہ اسی کتاب سے بسم اللہ کی

جائے اور مضمون فوراً ہی چھپ بھی گیا۔ بمبئی کے ہفتہ وار پرچہ "نظام" میں۔

لو میں اپنا ذکر درمیان میں لے آیا۔ ذکر مجھے اور کرنا چاہیے۔ یہ خالی مہندر ناتھ سے ملاقات تھوڑا ہی تھی۔ ہم سرلا کے پورے خاندان سے مل کر آ رہے تھے۔ اس کے ماتا پتا سے۔ اس کے بھائی سے بلکہ بھائیوں سے۔ بس اس وقت یہاں کرشن چندر ہی نہیں تھے۔ خیر ان تک مہندر ناتھ کے ذریعہ پہنچنے والی خبر پہنچ جائے گی۔ اس وقت ریوتی کو حالات کتنے سازگار نظر آ رہے تھے مگر محبت کا راستہ کبھی ہموار نہیں ہوتا اور پتہ چلا کہ یہاں تو رستہ بہت ہی ناہموار ہے۔ میرا دوست ریوتی برہمن بچہ۔ سرلا کائستھ زادی۔ ملن ہو تو کیسے ہو۔ جس کا اندیشہ تھا وہی ہوا۔ ریوتی کے ماتا پتا کو بیٹے کی پریم کہانی کا پتہ چلا تو بس گھر میں قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے ماتا پتا دونوں کا اعتماد حاصل تھا۔ انہوں نے مجھے بیچ میں ڈالنا چاہا "اپنے دوست کو سمجھاؤ۔ ہم برہمن لوگ، وہ کائستھ۔ ہم تو برادری میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔ کیوں خاندان کی عزت خاک میں ملاتا ہے۔"

میں اسے کیا سمجھاتا۔ میں تو پہلے ہی اسے اس کا الٹ سمجھا چکا تھا۔

اے لو میں تو پھر باپوز میں آ کر پھنس گیا۔ تو اس سے پہلے کہ میں اپنے گھر کا ذکر شروع کر دوں۔ مجھے واپس میرٹھ چلنا چاہیے۔ میں ابھی تک کالج میں جو میرے ساتھ والے تھے، ان کا ذکر کر رہا تھا یا ان کا جو مجھ سے بڑے تھے۔ اب جو قد نکال رہے تھے، ان کی طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ فیض عام انٹر کالج کی ایک ادبی محفل میں ایک نوخیز کو دیکھا کہ اقبال کا رنگ اس پر غالب ہے۔ اسی رنگ میں اس نے قطعات لکھ رکھے تھے۔ اچھے لگے۔ پتہ چلا کہ یہ فیض عام کا ہونہار طالب علم ہے۔ سلیم احمد اس کا نام ہے۔ اب یاد نہیں کہ میری اس سے راہ و رسم کیسے پیدا ہوئی لیکن یہ راہ و رسم جلدی ہی اچھی خاصی دوستی میں بدل گئی۔

میرے دیکھتے دیکھتے سلیم نے پر پرزے نکال لیے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس کے ارد گرد یاروں کا ایک اچھا خاصا جمگھٹا اکٹھا ہو گیا ہے۔ کوئی شاعر، کوئی عاشق پیشہ، کوئی ہاکی کا کھلاڑی، کوئی قرآن کا قاری، کوئی شعر و شاعری کا اناڑی۔ انہیں میں ایک دن ایک گورا چٹا لڑکا نظر آیا۔ پتہ چلا کہ باہر سے آیا ہے۔ شاید سہارن پور سے۔ میرٹھ کالج میں پڑھ رہا ہے۔ نام ہے جمیل احمد۔ خیر سلیم کے پاؤں تو پالنے ہی میں نظر آ گئے تھے مگر اسے دیکھ کر مجھے آگے کا اندازہ نہیں ہوا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ آگے چل کر وہ اپنے دادا ابا کا نام ساتھ جوڑ کر جمیل احمد سے جمیل جالبی بن جائے گا۔ محقق بن کر ممتاز ٹھہرے گا اور دادا کا نام روشن کرے گا۔

جلد ہی سلیم نے بھی میرٹھ کالج کا رخ کیا اور چند دن گزرے تھے کہ اس شان سے چلا آتا ہے کہ بر میں خاکساروں والا کرتا پائجامہ ہے اور کاندھے پر بیلچہ۔ میں حیران کہ ارے میں نے اتنے سال کرار صاحب کے مشفقانہ سائے میں گزارے۔ اس عرصے میں خاکسار لٹریچر میں بھی تاک جھانک کی۔ علامہ صاحب کے خطبات پڑھے۔ "تذکرہ" کا مطالعہ کیا۔ خاکساروں کی گلیوں محلوں میں چپ و راست دیکھی مگر کبھی بیلچہ بردار بننے کا خیال نہ آیا۔ اس نووارد نے چار دن ہی میں یہ رنگ پکڑ لیا۔

مگر یہ رنگ لمبا نہیں کھنچا۔ کیسے کھنچتا۔ جس استاد کے اثر میں یہ رنگ پکڑا تھا، وہ علامہ صاحب سے بغاوت کرتے کرتے تحریک سے بالکل ہی الگ تھلگ ہو گئے۔ علامہ صاحب کے احکامات سے سرکشی کر کے تحریک میں شامل کتنے دن رہ سکتے تھے۔ اب ان کا اپنا ایک گروپ تھا، الامین گروپ۔ طور طریقے وہی خاکساروں والے لیکن درمیان سے بیلچہ نکل گیا تھا اور چپ وراست والے ڈسپلن سے آزاد ہو گئے تھے۔ اب سارا زور قلمی جہاد پر تھا اور پوری توجہ ہفتہ وار ''الامین'' پر تھی۔ ہاں ایک انگریزی کا ہفت روزہ ''ریڈینس'' (Radiance) بھی تو نکلتا تھا لیکن اس کی اشاعت ان کے علی گڑھ والے دفتر کے ذمے تھی جہاں اختر حمید خاں جمے بیٹھے تھے۔

یہ ''الامین'' کا دفتر بھی خوب جگہ تھی۔ خیر الامین کے دفتر کا نقشہ تو یہاں کم ہی نظر آتا تھا۔ بہرحال اردو ایم اے کی کلاس بھی یہیں بھگتائی جاتی تھی اور میل ملاقات والے جو اپنی اپنی سیاسی بصیرت لے کر اور مستقبل کے متعلق اپنے اپنے اندیشے اور وسوسے لے کر آتے تھے، ان سے بھی یہیں نبٹا جاتا تھا۔

تھوڑے دنوں سے یہاں ایک نیا ملاقاتی نظر آنے لگا تھا بلکہ رفتہ رفتہ وہ شام کو بلا ناغہ وقت مقررہ پر آتا اور اچھا خاصا وقت گزار کر یہاں سے رخصت ہوتا۔ یہ نیا ملاقاتی کون تھا۔ وہی اپنے عسکری صاحب۔ اب تو جیسے انہوں نے میرٹھ ہی میں ڈیرا ڈال لیا تھا۔ آگے تو یہ صورت تھی کہ دن ڈھلے وقت مقررہ پر وہ گھر سے نکلتے۔ مجھے میرے ٹھکانے سے اٹھاتے اور لمبی ٹہل پر نکل جاتے۔ کرار صاحب سے تعلق خاطر قائم ہونے کے بعد اس پروگرام میں ایک تبدیلی آئی۔ اب بھی وہ اسی طرح دن ڈھلے وقت مقررہ پر گھر سے نکلتے، مجھے میرے ٹھکانے سے اٹھاتے مگر اب اور سمتوں میں جانے کی بجائے سیدھے سونتے ہوئے بیگم باغ کی طرف جاتے اور کرار صاحب کے ڈیرے پر جا کر دم لیتے۔

میں شروع میں سوچتا تھا کہ عسکری صاحب مسلم لیگ کے حامی، قائداعظم کے پرستار۔ ادھر کرار صاحب خاکسار، مسلم لیگ سے بیزار۔ دونوں میں کتنے دن نبھے گی مگر میں نے دیکھا کہ یہاں ایک دوسرے کا پاس لحاظ بہت ہے۔ مسلم لیگ کے بارے میں بات کرتے ہوئے کرار صاحب کا لہجہ کسی قدر نرم ہو چلا تھا۔ ادھر عسکری صاحب نے خاکساریت سے دلچسپی لینی شروع کر دی تھی اور ''الامین'' کے باقاعدہ قاری بن گئے تھے۔ کرار صاحب نے ''الامین'' کے مندرجات میں ان کی دلچسپی دیکھ کر انہیں لکھنے کی دعوت دی اور عسکری صاحب کا قلم فی الفوران موضوعات پر چل پڑا جو ''الامین'' کے صفحات میں زیر بحث رہتے تھے۔ انہیں کے بیچ سے انہوں نے اپنے مزاج کے مطابق موضوعات نکالے۔ مثلاً ''جمہوری معاشی نظریئے اور اسلامی تحریکیں''، ''اسلامی انقلاب کا علمبردار کون، متوسط طبقہ یا محنت کش عوام''

تو یوں سمجھیے کہ عسکری صاحب کی ادبی زندگی میں ایک مختصر سا دور ایسا بھی آیا ہے جسے ہم عسکری صاحب کا الامینی دور کہہ سکتے ہیں۔ انہیں کی اسی سرگرمی سے ایک شگوفہ اور بھی پھوٹا تھا مگر جس تیزی سے پھوٹا

اسی تیزی سے مرجھا بھی گیا مگر جمیل جالبی نے بھی تو "عسکری نامہ" کے اپنے پیش لفظ میں عسکری صاحب کے میرٹھ کے ان ایام کا ذکر کیا ہے۔ ان کا ایک بیان ایسا ہے جس کی تصحیح مجھ پر لازم آتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"46-47ء میں عسکری صاحب نے پروفیسر احتشام حسین کے ایما پر اردو تحریک کی تیاری کی۔ رسیدیں چھپیں، چندہ جمع ہوا لیکن ابھی جلسے کا پروگرام بن رہا تھا کہ گڑھ مکتیشر میں ہندو مسلم فسادات ہو گئے۔ بہار، کلکتہ اور دہلی کے فسادات نے سارے برعظیم کی صورتحال کو بدل کر رکھ دیا۔"

یہ پروفیسر احتشام حسین یہاں بیچ میں کیسے آ گئے۔ ترقی پسند تحریک سے تو عسکری صاحب کی یاری کٹ ہو چکی تھی۔ کس جارحانہ انداز میں وہ اس پر تنقید کر رہے تھے۔ اگر احتشام صاحب کو اردو کے حق میں کسی تحریک چلانے کا خیال آیا بھی ہوگا تو ان کی نظر انتخاب اپنے سب ہم خیالوں کو چھوڑ کر عسکری صاحب ہی پر پڑنی تھی۔ جمیل جالبی محقق ہیں۔ انہیں یہ شگوفہ چھوڑنے سے پہلے تھوڑی تحقیق تو کر لینی تھی۔ تو سنیے کہ اس زمانے میں میرٹھ میں رہتے ہوئے عسکری صاحب کی احتشام صاحب سے کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی تھی۔ قصہ کچھ اور تھا۔ ساری کھچڑی تو میرے سامنے پکی تھی اور اسی کرار صاحب کے ڈیرے میں اور عین ان دنوں جب 3 جون کا اعلان ہو چکا تھا۔ گڑھ مکتیشر کا واقعہ اس سے بہت پہلے گزر چکا تھا۔

3 جون کا اعلان۔ دوسرے لفظوں میں تقسیم ہند کا اعلان۔ مسلمانوں کے حساب سے قیام پاکستان کا اعلان۔ اس شام جب آل انڈیا ریڈیو سے قائداعظم کی تقریر نشر ہوئی تو اس پر مسلمان محلوں، گلیوں میں بہت گولے پٹاخے چھوٹے۔ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگے۔ بس خوشی کا سیلاب امنڈا ہوا تھا مگر کتنی جلدی اس میں تشویش اور تذبذب کی ایک لہر شامل ہو گئی۔ ہوا یوں کہ بس اس اعلان کے فوراً بعد ہی مسلمان سرکاری ملازمین کو پروانہ ملا کہ جلدی فیصلہ کرو کہ تمہیں ہندوستان میں رہنا ہے یا پاکستان جانا ہے اور ان ملازمین نے فیصلہ جلدی کیا کہ ہمیں پاکستان جانا ہے۔ ایسے بھی سرکاری ملازمین ہوں گے تو سہی بلکہ تھے جنہوں نے یہ سوچ کر کہ جو ہو سو ہو، یہیں رہیں گے مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کی نسبت سے تھی یا شاید اس سے بھی کم۔ جانے والوں نے فوراً اپنے بستر باندھنے شروع کر دیئے۔ ادھر مسلم لیگ کے وابستگان بھی کوچ کی تیاری کرنے لگے اور کوچ کا نقارہ کتنی جلدی بجا۔ دیکھتے دیکھتے آس پاس کے کتنے گھر خالی ہو گئے۔

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

تب خلقت کی آنکھیں کھلیں۔ ارے یہ تو سب ہی جا رہے ہیں۔ ہمارا کیا بنے گا۔ اچانک کسی کے ذہن میں ایک سوال کلبلایا۔ اور قائداعظم؟ ارے یہ تو ابھی تک کسی نے سوچا ہی نہیں تھا۔ یعنی کہ قائداعظم بھی چلے جائیں گے مگر یاروں نے تاول کیا، سوچا اور فوراً ہی اپنے اطمینان کے لیے ایک راستہ نکال لیا۔ سوچا کہ وہ بمبئی میں اپنے ٹھکانے کو تھوڑا ہی چھوڑ دیں گے۔ چھ مہینے پاکستان میں جا کر رہیں گے۔ چھ مہینے یہاں رہیں گے مگر۔

ایسی باتوں سے کہیں درد جگر جاتا ہے

بے آسرارہ جانے کا احساس بڑھتا ہی چلا گیا۔

کرار صاحب کا ڈیرہ اسی طرح آباد تھا اور ہمارا روز کا ورد بھی اسی طرح جاری تھا۔ نمازی کی نماز قضا ہو جائے۔ عسکری صاحب کو اس ڈیرے پر مقررہ وقت پر جانا قضا نہیں ہو سکتا تھا لیکن اب وہاں بھی تو گفتگو میں ایک تشویش کی لہر شامل ہو گئی تھی۔

میں اور اندیشہائے دور دراز

کرار صاحب کی گفتگو میں اندیشہائے دور دراز کی کارفرمائی اب زیادہ ہی نظر آنے لگی تھی۔ "آپ پوچھتے ہیں کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کی سیاست کیا رخ اختیار کرے گی؟" رکے۔ پھر بولے "کیسی سیاست، کہاں کی سیاست۔ یہاں مسلمانوں کے لیے یہ دروازہ لمبے عرصے کے لیے بند ہو چکا ہے۔"

عسکری صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ پھر دیر بعد بولے "سیاست کے سوا بھی تو فعل و عمل کی صورتیں ہیں۔"

"مثلاً؟" کرار صاحب نے پوچھا۔

"مثلاً کلچر۔"

بس یہاں سے ایک نئی بحث کا دروازہ کھل گیا اور بات ہند اسلامی کلچر تک پہنچی۔ عسکری صاحب کو خوب سوجھی کہ "ایک ہند اسلامی کلچرل کانفرنس کا ڈول ڈالا جائے۔"

"یہ پھر اسلام کو آپ درمیان میں لے آئے۔" کرار صاحب بولے۔

"پھر؟"

کرار صاحب کی رائے تھی کہ "ایسی کسی کانفرنس کا انعقاد اگر اس وقت ممکن ہے تو وہ اردو کے نام پر شاید ممکن ہو۔ تو ایسی کانفرنس کا نام اردو کلچرل کانفرنس بھی ہو سکتا ہے۔"

عسکری صاحب شاید سرگرم ہونے کے لیے کوئی بہانہ چاہتے تھے۔ یہ بہانہ اچھا ہاتھ آیا۔ وہ سرگرم ہو گئے اور ایسے سرگرم ہوئے کہ انہوں نے ایک پھیرا دلی کا بھی کر ڈالا۔ میں ان کے ہمراہ تھا۔ اصل میں انہیں دنوں لوک سبھا کا اجلاس ہونے والا تھا۔ عسکری صاحب کو خوب سوجھی کہ اس وقت مولانا حسرت موہانی دلی میں آئے ہوں گے۔ اس کانفرنس کے سلسلہ میں ان کی آشیرواد لی جائے۔

تو ہم دلی جا پہنچے اور وہ جو لوک سبھا کے ممبروں کا سرکاری مہمان خانہ تھا جس کا کچھ بھلا سا نام تھا، وہاں جا پہنچے۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ مولانا تو یہاں کبھی ٹھہرا ہی نہیں کرتے۔ لوک سبھا کے قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد ہے، وہاں پڑاؤ کیا کرتے ہیں۔ خیر گیلری سے گزرتے گزرتے ایک کمرے کے آگے بیگم اعزاز رسول کی تختی نظر آئی۔ عسکری صاحب نے سوچا کہ چلو انہیں ٹٹولتے ہیں کہ وہ اس باب میں کیا کہتی ہیں۔ ان کے سامنے جب عسکری صاحب نے اپنے منصوبے کا دفتر کھولا تو انہوں نے تعجب سے انہیں دیکھا۔ بولیں "یہ وقت

کسی ایسی کانفرنس کا نہیں ہے۔ حالات بہت خراب ہیں۔ پتہ نہیں کیا رخ اختیار کریں۔''

ایک اور رکن اسمبلی سے بھی اسی ریلے میں مل لیے۔ ان کا ردعمل بھی کچھ اسی طرح کا تھا مگر عسکری صاحب کو یقین تھا کہ مولانا حسرت موہانی اس تجویز کا خیر مقدم کریں گے مگر مولانا تو ہاتھ ہی نہیں آئے۔ امام مسجد نے بتایا کہ ابھی آئے نہیں ہیں، بس آج کل میں آنے والے ہیں۔

تو بس یوں سمجھیے کہ دلی میں تھوڑی خاک اڑا کر ہم واپس آ گئے۔ مسلمان اراکین لوک سبھا نے جس حوصلہ شکن انداز میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا اس سے عسکری صاحب کچھ خوش نہیں تھے۔ ایک مسئلہ یہ بھی تو ہے کہ یہ جو آدرش وادی لوگ ہوتے ہیں وہ بہت اونچا اڑتے ہیں۔ زمینی حقیقتوں کا ادراک انہیں واجبی ہوتا ہے۔ بہت جلدی یہ پتہ چلا کہ شاید وہی لوگ اپنے ردعمل میں زیادہ صحیح تھے اور شاید زیادہ باخبر بھی۔ ہمیں تو میرٹھ میں بس اتنا اندازہ تھا کہ فضا میں کچھ دھرا ہے۔ بری خبریں آ رہی تھیں مگر دور پرے سے۔ وہ تو جب دلی میں قیامت برپا ہوئی تب پتہ چلا کہ یا یوں کہہ لیجیے کہ ؎

گرنے لگی کڑی پہ کڑی تب خبر پڑی

قیامت تو اب میرٹھ کے دروازے تک آ گئی تھی اور افواہیں بھی اڑنے لگی تھیں کہ بلوائی دلی سے نبٹ کر میرٹھ کا رخ کریں گے۔ مطلب یہ کہ ؎

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

وہ جو اردو کلچرل کانفرنس کا بلبلہ اٹھا تھا، وہ جس تیزی سے اٹھا تھا اسی تیزی سے بیٹھ گیا۔ اب شہر کا رنگ دگر تھا۔ فضا میں دھرا ہی تھی پہلے سے بڑھ کر۔ اس گھنی آبادی میں مسلمانوں کے محلے اب کچھ چھدرے نظر آتے تھے۔ میں جس محلہ میں رہتا تھا وہاں کتنے سرکاری ملازمین کے گھر تھے۔ ان کا جانا تو پہلے سے ٹھہر گیا تھا۔ سو وہ ایک ایک کر کے کم و بیش سب جا چکے تھے۔ سو کتنے گھر خالی ہو گئے تھے۔ قیامت خیز فساد دلی میں تو ہوا ہی آس پاس سے اور ایسی ہی خبریں آ رہی تھیں۔ ادھر سپیشل ٹرینوں کا سلسلہ بھی چل پڑا تھا۔ ان ٹرینوں نے عجب اثر کیا۔ چلتی گاڑی کو دیکھ کر سوار ہونے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ اور یہاں تو یہ صورت تھی کہ پہلے ہی جیسے قدم اکھڑے ہوئے ہوں۔ اب جو لدی پھندی سپیشلیں پاکستان کی طرف رواں دیکھیں تو جسے ابھی تک جانے کا خیال نہیں آیا تھا، وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور ٹھساٹھس گاڑی میں وہ بھی کسی نہ کسی طرح گھس کر بیٹھ گیا۔ ادھر کرار صاحب کے ڈیرے میں جو دو نوجوان خاکساری جوش میں آ کر دور دور سے چل کر یہاں آن براجے تھے، انہوں نے دیکھا کہ جس مشن پر وہ آئے تھے، وہ مشن ہی اب معطل ہے۔ پھر وہ یہاں پڑے کیا کر رہے ہیں۔ ان میں ایک جوشیلا نوجوان یونس منصور تھا۔ وہ لاہور سے چل کر یہاں پہنچا تھا۔ اب کچھ کرنے کو نہ رہا تو اسے لاہور کی یاد ستانے لگی۔ لاہور کو جاتی سپیشلوں کو دیکھ کر اس نے بستر باندھا اور ایک بھلی صبح کو ایک سپیشل میں جا سوار ہوا۔ دوسرا کب اور کیسے رخصت ہوا، اس کا مجھے پتہ نہیں چلا۔

اب ہماری سنو۔ ہمارا روزانہ کا ورد اسی طرح جاری تھا۔ دن ڈھلے عسکری صاحب کا اپنے گھر سے نکل کر میری طرف آنا۔ میرا ان کے ساتھ ہو لینا، رخ کرار صاحب کے ٹھکانے کی طرف ہوتا۔ اب ہمارے ساتھ سلیم احمد بھی آن شامل ہوا تھا۔ سو اب یہ تین افراد کی ٹولی تھی جوان افراتفری کے دنوں میں زیادہ پابندی سے اپنے مرجع و محور کی طرف گامزن نظر آتی۔ شام گہری ہونے لگتی تو وہاں سے اٹھتی۔ پھر واپسی کا سفر اس طرح ہوتا کہ پہلے ہم ایک خاص نکڑ پر پہنچ کر عسکری صاحب کو الوداع کہتے۔ پھر وہ اپنے گھر کی طرف اور ہم دونوں اپنے گھروں کو جو ایک ہی سمت میں تھے اور ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ پھر ایک دن ہمیں خیال آیا کہ ہم جس نکڑ پہ عسکری صاحب کو چھوڑ کر اپنی راہ لیتے ہیں، وہاں سے آگے عسکری صاحب کے گھر تک کا راستہ تو عام تصور کے مطابق بہت غیر محفوظ ہے۔ سو ہم نے طے کیا کہ ہمیں انہیں گھر تک پہنچانا چاہیے۔ واپسی ہم اکیلے تھوڑا ہی ہوں گے۔ دو ہوں گے اور دو تو چون کے بھی ہوں تو بہت ہوتے ہیں مگر واپسی میں سلیم کی رگِ حمیت پھڑکتی اور یہ جتانے کا شوق کہ

ڈرتا نہیں دنیا میں مسلمان کسی سے
یہ پوچھ . علی سے

آخر اس نے کتنے مہینوں کاندھے پہ بیلچہ رکھ کے خاکساروں کے دستوں کے ساتھ چپ و راست کی تھی۔ بے شک اس کے کاندھے اب بیلچہ سے بے نیاز تھے مگر دل تو بہر حال اسی طرح خاکساروں والے جوش و جذبے سے معمور تھا میں نے اسے ٹہوکا بھی کہ بہت بہادرانہ شان دکھانے کی ضرورت نہیں۔ مبادا...... مگر ردعمل میں وہ اور اکڑ دکھانے لگتا تھا۔ خیر اس کی اکڑ نبھ جاتی تھی۔ اردگرد جو کچھ بھی ہو رہا تھا، میرٹھ اپنی حدوں میں تھا اور دن کے اوقات میں تو کچھ بھی پتہ نہیں چلتا تھا۔ گھنٹہ گھر کے بازار میں جو شہر کا مرکزی بازار تھا، وہی بھیڑ بھڑکا۔ پتہ ہی نہ چلتا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان اور پتہ چل بھی جاتا تو کوئی ایسا فرق نہیں پڑتا تھا۔

ہاں جب اس بازار سے گزر کر میں اپنے محلّہ پوروافیاض علی میں قدم رکھتا تو عجب احساس ہوتا کہ جیسے پورے محلّہ پر ویرانی کھنڈ گئی ہے۔ پہلے ان گلیوں میں دن بھر کتنی چہل پہل رہتی تھی۔ رنگ رنگ کی مخلوق آ رہی ہے، جا رہی ہے۔ سب سے بڑھ کر پھیری والے۔ دور سے بین کی آواز آنی شروع ہوئی۔ بچے بڑے گھروں سے نکلے۔ اے لو، سپیرے نے سانپوں سے بھری پٹاریاں سامنے رکھیں اور زیادہ جوش سے بین بجانی شروع کر دی۔ پھر بندر والا آیا اور بندر کا تماشا دکھا کر چلا گیا۔ پھر ملائی کے برف والے کی آواز سنائی دی "ملائی کا ریف" اور بچوں بڑوں کے منہ میں پانی بھر آیا مگر اس وقت مجھے سب سے بڑھ کر وہ بیسن کے حلوے والا یاد آ رہا ہے جو اپنے مقررہ وقت پر اس محلّہ میں نمودار ہوتا۔ دور سے آواز سنائی دیتی "پڑھو کلمہ محمد کا، خرید و حلوہ بیسن کا" اور بچے بے تاب ہو کر گھروں سے نکل پڑتے اور حلوے والے کے گرد بچوں کا ٹھٹھ لگ جاتا۔ اب وہ چہل پہل غائب تھی۔ پھیری والے بھی اب کم کم ہی ان گلیوں میں نمودار ہوتے تھے مگر بیسن کے حلوے والا اپنی وضع

پر قائم تھا۔ اسی طور مقررہ وقت پر اس کی آواز سنائی دیتی اور اس کی آواز میں اب کتنا سوز اور درد پیدا ہو گیا تھا ؎

مسلمانو نہ گھبراؤ شفاعت برملا ہو گی
پڑھو کلمہ محمد کا، خریدو حلوہ بیسن کا

اب بس ایک مٹھی بھر بچے ہی اس کے گرد منڈلاتے نظر آتے۔ وہ جوان گلیوں میں چھوٹی عمر والوں سے لے کر بڑی عمر کے لڑکے بالے سرگشت کرتے، گلی ڈنڈا کھیلتے، بھاگتے دوڑتے دکھائی دیتے اور کوئی کوئی دل جلا کبھی دگلی میں آ کر کبھی بیچ بیچ دل زدگی کے عالم میں تان لگاتا ؎

عاشقِ نامراد کو لازم ہے یہ دعا کرے
جس نے دیا ہے دردِ دل اس کا خدا بھلا کرے

وہ جانے اب کہاں گئے۔ وہ تو بھرے پرے خاندانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ان خاندانوں نے کوچ کیا تو وہ بھی کوچ کر گئے۔ اب کتنے گھر ہیں جن میں تالے پڑے نظر آ رہے ہیں۔ کتنے چلے گئے۔ کتنے جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور گلیوں، چوکوں میں خاموشی کا ڈیرا ہے۔

اردگرد یہ فضا دیکھ کر میں نے ایک روز قلم سنبھالا۔ لکھنے بیٹھ گیا۔ جب لکھ چکا تو میں نے رک رک کر اپنی تحریر کو پڑھا۔ ارے یہ تو میں نے افسانہ لکھا ہے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں ادب میں کہاں کہاں منہ مار رہا ہوں۔ میں اگر کچھ لکھ سکتا ہوں تو وہ تو افسانہ ہے۔

خیر اپنے لکھنے کا ذکر تو ضمناً آ گیا۔ اصل میں ذکر میں یہ کر رہا تھا کہ میرٹھ میں ان دنوں یار و اغیار کا احوال کیا تھا۔ جمے جمائے لوگ بھی اکھڑے اکھڑے نظر آتے تھے۔ جسے دیکھو ڈانواں ڈول پھرتا ہے، گھبرایا گھبرایا رہتا ہے۔ جو پر سکون نظر آتے تھے، وہ بھی شاید اندر سے جلے ہوئے تھے۔ عسکری صاحب کی سنو۔ دلی میں اینگلو عربک کالج سے جہاں وہ عوضی پڑھا رہے تھے، چھوٹے تو میرٹھ میں گھر آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں میرٹھ کالج میں انہیں جگہ ملی تو وہ بھی اسی طور کہ انگریزی کے ایک استاد لمبی چھٹی پہ تھے۔ ان کی خالی جگہ کو انہوں نے آ کر پُر کیا مگر ادھر ان کی چھٹی ختم ہوئی۔ ادھر عسکری صاحب فارغ۔ مگر خیر انہیں اعظم گڑھ کے کالج سے بلاوا آ گیا تھا۔ انہوں نے دوستوں، نیاز مندوں سے رخصتی لی اور اعظم گڑھ روانہ ہو گئے مگر عجب ہوا، کوئی پانچویں چھٹے دن دروازے پر دستک ہوئی۔ نکل کر دیکھا تو عسکری صاحب کھڑے ہیں۔ میں حیران کہ یہ تو اعظم گڑھ چلے گئے تھے۔

میری حیرانی دیکھ کر بولے کہ "یار، وہاں تو شہر میں الو بولتا ہے۔ شام ہوئی اور میں ٹہلنے نکلا تو سڑکوں پہ اندھیرا۔ پتہ چلا کہ یہاں تو بجلی ہی نہیں ہے۔ جس شہر میں بجلی نہ ہو وہاں کیسے گزارا ہو سکتا ہے۔ میں نے کھلا بستر باندھا اور الٹے پیروں واپس ہو لیا۔

خیر واپس تو آ گئے مگر اب شاید انہیں یہ فکر ستانے لگی تھی، اگرچہ اس کا اظہار نہیں ہوا کہ اب روزگار کی کیا صورت رہے گی۔ فی الحال تو ایک ہی سہارا تھا۔ کتابوں کی رائلٹی۔ مگر ان کا پبلشر یعنی مکتبۂ جدید تو لاہور

میں بیٹھا تھا۔ پھر کیا ہوا۔ سپشلیں تو چل ہی رہی تھیں۔ اچانک ایک روز اعلان کیا کہ لاہور جارہا ہوں۔ جا کر اپنے ناشر سے ملتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اب چھپنے چھپانے کی کیا صورت رہے گی۔

تو عسکری صاحب لاہور روانہ ہو گئے مگر اس کے بعد عجب گل کھلا۔ عشرے پندھرواڑے کے بعد عسکری صاحب کا ایک پیغام بذریعہ ریڈیو پاکستان ان کے گھر والوں کو موصول ہوا۔ ہاں ان دنوں ڈاک کا سلسلہ معطل تھا۔ پاکستان پہنچنے والوں کو بس ایک سہولت میسر تھی کہ اپنی خیریت اور اس کے ساتھ جو پیغام بھی اپنے عزیزوں کو دینا چاہتے وہ لکھ کر ریڈیو سٹیشن کے حوالے کرتے۔ وہ نشر ہو جاتا اور عزیزوں، دوستوں تک آ سانی پہنچ جاتا کہ ان دنوں ہر شخص تو ریڈیو پاکستان سے کان لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ تو عسکری صاحب کا پیغام اپنے گھر والوں کے لیے یہ تھا کہ میں یہیں رہوں گا۔ تم لوگ بھی آ جاؤ۔ مزید پیغام۔ انتظار سے کہو کہ تمہارے ساتھ وہ بھی آ جائے۔

ادھر پاکستان جانے کا سان نہ گمان مگر عسکری صاحب کا پیغام۔ جیسے کسی نے خاموش حوض میں اینٹ پھینک دی۔ میں دبدا میں پڑ گیا۔ پھر سوچا کہ میں نقد دم تو نہیں ہوں۔ کوئی آ گا پیچھا بھی تو ہے۔ گھر جاؤں، سوال ڈالوں۔ دیکھوں کیا جواب آتا ہے۔ سو ہاپوڑ کی راہ لی۔ والدہ تو اللہ میاں کی گائے۔ ان کی تو سمجھ ہی میں نہ آیا کہ ہاں کہیں یا ناں۔ والد صاحب اب دنیا کے معاملات سے یکسر بے تعلق ہو چکے تھے۔ اصل میں تو میرے بارے میں سارے فیصلے میری بڑی بہن نے اپنے ذمے لے رکھے تھے، ان پر مستزاد ہمارے بہنوئی صاحب۔ مگر اس گھر میں ابھی تک نہ اپنے حوالے سے نہ اولاد کے حوالے سے پاکستان جانے نہ جانے کا سوال سرے سے زیر بحث آیا ہی نہیں تھا۔ اور ہاپوڑ شہر میں بھی پریشانی کے اثر آثار نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ سو ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ گرمجوشی سے رخصت کریں کہ پاکستان جگ جگ جاؤ۔ تمہیں امام ضامن کی ضامنی میں دیا۔ نہ یہ کہا کہ ہمیں چھوڑ کے کہاں کالے کوسوں جارہے ہو۔ اصل میں اس وقت تک پاکستان جانے کا مطلب یہ نہیں لیا جارہا تھا کہ ہم اِدھر تم اُدھر۔ یہ کہ جو پاکستان جائے گا اس کا پیچھے رہ جانے والے عزیز واقربا سے ناتا ٹوٹ جائے گا اور ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کو ترس جائیں گے۔ مگر میں دبدا میں گھر گیا تھا۔ دبدا میں گھر واپس آیا۔

واپس آیا تو دیکھا کہ سلیم احمد نے بھی اپنے خاندان کے ساتھ رختِ سفر باندھ رکھا ہے۔ اس کی امت میں جو نوخیز شامل ہوئے تھے، وہ بھی اپنے گرو کے جلو میں چلنے پر تیار کھڑے تھے۔ ادھر عسکری صاحب کے اہل خاندان بھی کوچ کے لیے مستعد ہو بیٹھے تھے۔ مجھ سے پوچھا جارہا تھا کہ چل رہے ہو یا نہیں؟ اور میں حق دق کہ کیا کہیں کوچ کا نقارہ بجا ہے کہ سب چھوٹے بڑے عازم سفر ہیں ۔

قافلہ میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

اس چل چلاؤ میں بس میں بھی چل کھڑا ہوا۔

....

زمین بٹ گئی زمانہ بدل گیا

میں اب جو کچھ بھی ہوں ریل گاڑی کے اس مختصر سے سفر کا حاصل ہوں جو مختصر ہوتے ہوئے بھی کتنا طویل نظر آ رہا تھا۔ یوں وہ رات بہت کالی اور ڈراؤنی تھی کہ جب ریل چلتے چلتے اچانک رک جاتی تو پاسبان فوجی فوراً اتر کر اپنی ٹارچوں سے دور و نزدیک کا جائزہ لینے لگتے۔ مگر کیا چلنے سے پہلے میں نے اس سفر کے معنی و مطلب پر غور کیا تھا۔ کیا مجھے دھیان آیا تھا کہ میں ایک بکھرتی تہذیب کو جس نے بننے سنورنے میں کم و بیش ایک ہزار سال لیے تھے اس کے حال پر چھوڑ کر رخصت ہو رہا ہوں۔

مگر اس طرح تو اب میں سوچ رہا ہوں۔ اب جبکہ میں اپنی زندگی کا لمبا سفر طے کر کے سفر کے آخری مرحلہ میں ہوں۔ اب اس وقت کو دھیان میں لاتا ہوں تو لگتا ہے کہ میں سفر پر نہیں نکلا تھا۔ بس ایک رو تھی جس میں خلقت بہتی چلی جا رہی تھی۔ اسی رو میں میں بھی میرٹھ سے ایک امنڈتی خلقت کے ساتھ ریل میں سوار ہوا اور لاہور میں آن اترا۔ یہاں آ کر بے گھر، بے در بھٹکتا پھرتا، ٹھوکریں کھاتا' کسی جنگی میں وقت گذارتا۔ پھر شاید کچھ سوچ بچار کرتا۔ مگر یہاں شہر میں قدم رکھتے ہی ایک نئی مصروفیت شروع ہو گئی۔ جیسے شہر کہہ رہا ہو کہ پہلے مجھ سے ملو، پھر آگے کی سوچو۔ عسکری صاحب پہ جیسے ان دنوں سنیچر سوار تھا۔ صبح ہی صبح ناشتہ کے بعد تھوڑا وقت "مادام بواری" کے ترجمہ پر صرف کیا۔ پھر نکل کھڑے ہوئے۔ دوپہر کو مارے بڑاڑے آئے، کھانا کھایا، پلنگ پر کمر ٹکائی۔ پاؤں میں کھجلی ہوئی' اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر چل پڑے۔ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ صبح کے اوقات میں گھر سے گورنمنٹ کالج جہاں ان کے یار عزیز آفتاب احمد خاں لیکچراری کر رہے تھے۔ دن ڈھلے رخ پرانے شہر کی طرف ہے۔ بارود خانے کے آس پاس شاہد احمد دہلوی نے دلی سے اجڑ کر ٹھکانہ بنایا ہوا ہے۔ وہیں اشرف صبوحی سے دلی کی بولی ٹھولی سن لو، حکیم حبیب اشعر کے ہونٹوں سے پھول جھڑتے دیکھ لو۔ مطلب یہ کہ اجڑی ہوئی دلی سے ملو۔ مگر شاہد احمد سے جا کر ملو گے تو سمجھ لو کہ میاں ایم اسلم کی حویلی کا پھیرا بھی لگے گا۔ اس پھیرے کا مطلب ہے کہ اول میاں صاحب سے ان کے ناول کا ایک باب سنو۔ پھر بارود خانے کے کباب اور برفی اور جلیبی کے ساتھ چائے پیو۔ کبھی پھیرا حلقۂ ارباب ذوق کا کہ وہاں کے ادیبوں سے تعارف ہو جائے۔ جن سے وہاں تعارف نہ ہو سکے، ان سے مال روڈ پر چلتے ہوئے کسی بھی موڑ پر تعارف ہو

سکتا ہے۔ اس سڑک پر پیدل چلنا شرط ہے۔ انٹلکچوئل قسم کی مخلوق قدم قدم پر ملے گی۔ وہ بھی ملیں گے جنہیں تم نے شوق سے پڑھا ہے، نام بہت سنا ہے مگر شرف ملاقات کبھی میسر نہیں آیا۔

لو میں رو میں اپنی اوقات کو بھول کر ادیبوں سے اپنے تعارف کی داستان سنانے لگا۔ ارے صاحب، میری اولین حیثیت پاکستان میں قدم رکھنے کے بعد پناہ گیروالی تھی۔ پہلے تو مجھے اپنی پناہ گیری کا احوال سنانا چاہیے۔ یہ ادب ودب تو بعد کے قصے ہیں۔ ہاں یہ وضاحت بھی ہو جائے کہ ابھی نوواردوں کی حیثیت پناہ گیر ہی کی تھی۔ اسی لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ مہاجر کا لقب تو بعد کی پیداوار ہے اور جب مہاجر کا لقب اس خلقت کو میسر آ گیا تو پھر یہ لوگ یہ بھول ہی گئے کہ وہ اولاً تو خالی پناہ گیر تھے۔ مہاجر کے لقب کو انہوں نے پھر اس طرح اپنایا کہ پھر ان کی یہی حیثیت ٹھہر گئی۔

تو میں انتظار حسین اولاً پناہ گیر ثم مہاجر جب منھ اندھیرے اسپیشل ٹرین سے مغلپورہ سٹیشن پر اترا تو میں نقد دم ہاتھ میں ایک بیگ سٹیشن سے نکل ایک نقل مکانی کرنے والے خاندان کے پیچھے چلتا ہوا ایک ایسے کوچے میں پہنچا جو اجڑ کر اب پھر سے آباد ہو چلا تھا۔ کرشن نگر اس کوچہ کا نام تھا۔ ویسے تو جلد ہی اس کے نام کو مشرف بہ اسلام کرنے کی سعی نیک کی گئی تھی۔ نیا نام تھا اسلام پورہ۔ مگر جس آسانی سے ہم اپنے نام بدل لیتے ہیں گلی کوچے اتنی آسانی سے اپنے نئے نام کو قبول نہیں کرتے۔ سو اب بھی اس کوچہ کو خلقت کرشن نگر ہی کہتی ہے اور اس کی گلیوں کے نام بھی وہی پرانے چلے آ رہے ہیں۔ ارجن سٹریٹ، بدھشٹر سٹریٹ، بھیم روڈ۔ لگتا ہے کہ پانڈو اپنی صحرا نوردی کے دنوں میں اس راہ گزرے تھے۔ انہیں سے یہ گلیاں یادگار چلی آتی ہیں۔

تو میرا پہلا پڑاؤ اس کوچہ میں ہوا مگر کہاں، کیسے، کونسے گھر میں مجھے سر چھپانے کے لیے جگہ ملی۔ اس کی داستان اس طرح ہے کہ جو شخص اب سے ڈھائی تین ہفتے پہلے آ کر اس گھر میں مہمان ہوا تھا، میں اس کا مہمان بن کر یہاں آن اترا یعنی عسکری صاحب اپنے چچازاد یا پھوپھی زاد یا خالہ زاد بھائی کے مہمان اور میں ان کا مہمان یعنی مہمان در مہمان۔ ان دنوں اسی رنگ سے مہمانیاں چل رہی تھیں اور اپنے عروج پر تھیں۔ کوئی ایک قافلہ ہرج مرج کھینچتا، مرتا کھپتا، خاک دھول میں زُلتا شہر میں آن وارد ہوتا۔ کچھ ٹھکانے کی تلاش میں نو بجے نو بجے شہر سے نکل کر کسی پاس کے نگر میں جا پسارتے۔ کچھ یہیں کوچہ کوچہ خاک چھانتے کسی کونے کھدڑے میں سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈ نکالتے، وہاں پسر جاتے اور پالنے والے کی کریمانہ شان پر صدقے واری ہونے لگتے اور لاہور شہر میں وارد ہونے والے یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے اور خداوند کریم کی کریمی پر شکر ادا کرتے کہ یہاں محلے کے محلے خالی پڑے تھے اور ان کے خالی ڈھنڈار مکان نوواردوں کا جیسے انتظار ہی کر رہے تھے کہ بس گھر میں پڑے تالے کو توڑو اور ساز وسامان سے بھرے گھر میں بلا تکلف بس جاؤ۔ مت سوچو کہ وہ کون لوگ تھے جو سروں پہ منڈلاتی قیامت کو سونگھ کر اچانک دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنا بھرا گھر چھوڑ کر نکل بھاگے۔ مت دھیان دوڑاؤ کہ اب وہ بے گھر بے در کن راہوں میں بھٹک رہے ہوں گے۔ بس

اپنے کام سے کام رکھو۔ رب کا شکر ادا کرو کہ تم ایک جے جمائے گھر میں آن براجے ہو۔

پھر یوں ہوتا کہ بعد میں آنے والا کوئی لٹا پٹا خاندان سونگھتا سونگھتا اسی کوچے میں آ نکلتا اور یہ جان کر خوش ہوتا کہ فلاں گھر میں جو پناہ گیر آ کر بسے ہیں، وہ تو ان کے دور پرے کے رشتہ دار ہیں۔ کبھی رشتہ دور کا کبھی قریب کا نکل آتا۔ اس نودریافت رشتہ کو غیبی امداد تصور کرتے اور اس گھر کے کسی گوشے میں پسر کر سمجھ لیتے کہ آخر کے تیئں دارالامان پاکستان نے انہیں اپنی امان میں لے لیا۔ سولٹی پٹی خلقت کا تانتا لگا ہوا تھا۔ جس کے جدھر سینگ سماتے ادھر نکل جاتا۔ ڈھونڈنے والے خراب و خوار ہو کر آخر کسی ایسے کوچے میں آ نکلتے جس کے خالی گھر کبھی اپنے کھلے دروازوں کبھی اپنے مقفل دروازوں کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہتے اور اپنے اندر سمیٹ لیتے۔ کرشن نگر ایسا ہی ایک کوچہ تھا۔ پہلے یہاں عسکری صاحب آئے اور اپنے ایک عزیز کے ٹھکانے پر دستک دی۔ اب ان کا پورا گھرانہ یہاں آن وارد ہوا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے میں بھی یہاں ایک بیگ کے ساتھ آن دھمکا۔ ویسے تو میں ایک بھرے بکس اور ایک بستر کے ساتھ گھر سے نکلا تھا مگر وہ بکس اور وہ بستر تو سامان والے ڈبے میں رہ گیا۔ سپیشل ٹرین ہمیں مغلپورہ سٹیشن پر اتار کر سیٹی دیتی چھک چھک کرتی راولپنڈی کی طرف چلی گئی۔ میں حق دق کہ ارے یہ تو سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ ہاتھی معہ ہودا غائب۔ نہ سونے کے لیے بستر نہ تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے۔ بیگ کھول کر دیکھا۔ جانے کیا سوچ کر میں نے ایک قمیض اور ایک پائجامہ، ایک بنیان اس میں اپنے دوسرے چھوٹے موٹے سامان کے ساتھ رکھ لیا تھا۔ اطمینان کا سانس لیا کہ فوری مسئلہ تو پیدا نہیں ہوگا۔ ایک فالتو جوڑی کپڑوں کی موجود ہے۔ باقی ایک قمیض اور پتلون کوٹ تن پر پہلے ہی سے موجود ہے مگر جب رات ہوئی تو خدا یاد آیا۔ یہ ٹھنڈی رات بغیر لحاف گدے کے کیسے گزرے گی۔

خیر کوئی بات نہیں۔ پہلی رات جیسے تیسے گزر گئی۔ اگلی صبح عسکری صاحب نے ٹہوکا کہ چلو لنڈا بازار۔ پوچھا یہ کیسا بازار ہے۔ وہاں جانا اور اتنی عجلت میں، کیا ضرور ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس بازار میں پہننے، اوڑھنے اور برتنے کا سارا سامان سیکنڈ ہینڈ سستے داموں ملتا ہے۔ وہاں سے دو کمبل خرید لیں گے۔ لحاف کا نعم البدل۔ پھر رات کو مزے سے سونا۔ پھر یہی کیا۔ لنڈے بازار کی سیر کی۔ ہر مال کوڑیوں کے مول۔ دو کمبل خریدے۔ وہ بھی سمجھو کہ کوڑیوں کے مول ہی خریدے اور ابھی مہینہ نہیں گزرا تھا کہ اطلاع ملی کہ تمہارا سامان لاہور سٹیشن پر پڑا ہے۔ آ کر وصول کر لو۔ سوٹ کیس اور بستر دونوں بخیر و عافیت مل گئے۔ ارے بھائی پھر کیوں پناہ گیروں کی صورت بنائے پھرتے ہو اور کیوں ہجرت کے درد کے نام کا طوطا پال رکھا ہے۔ ذرا دھیان میں لاؤ ان شرفا کو جو اپنے اپنے قریوں میں اچھی گزر بسر کرتے تھے۔ کشادہ گھروں میں رہتے تھے۔ اچھا کھاتے تھے۔ اچھا پہنتے تھے۔ اپنے حالوں مگن تھے۔ غمِ ماضی سے بے نیاز، فکرِ فردا سے آزاد۔ مگر جب ان بے فکروں پر چھائے ہوئے آسمان نے رنگ بدلا اور قدموں تلے کی زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔ تو ان کے جمے قدم آن کی آن میں اکھڑ گئے۔ اپنے قریوں سے اجڑے اور ہرج مرج کھینچتے رنج سفر اٹھاتے جیسے تیسے کراچی پہنچے۔ تب

اطمینان کا لمبا سانس کھینچا۔ مگر اطمینان ابھی دور تھا۔ کوچہ کوچہ دھکے کھاتے پھرے۔ کتنوں کو زود یا بدیر سر چھپانے کی جگہ مل گئی۔ جنہیں کسی طور ایسا کونا میسر نہ آیا انہوں نے جھگیوں میں بسیرا کیا۔ جھگیوں میں یہ آرام طلب کیسے رہے ہوں گے۔ میں بہت دھیان دوڑاتا ہوں مگر اس زندگی کا تصور نہیں کر پاتا۔ میں تو بس اجڑے بچھڑے پھر سے آباد ہوتے کرشن نگر کو جانتا ہوں۔ اجڑنے والے اجڑ کر جا چکے تھے۔ اجڑ کر آنے والے کتنی خالی پڑے گھروں میں آباد ہو چکے تھے۔ کتنے آباد ہونے کے لیے ہاتھ پیر مار رہے تھے۔ پناہ گیروں کی ریل پیل ہے۔ ارے یہ کیسا اجڑا کوچہ ہے۔ بازار میں بھیڑ ہے۔ کندھے سے کندھا چھلتا ہے۔ آدمی سے آدمی بھڑ کر چلتا ہے۔ مگر ان کے اکھڑے اکھڑے قدم چغلی کھا رہے ہیں کہ یہ ساری مخلوق نو وارد ہے۔ یہاں کی گلیوں، کوچوں، بازاروں میں ابھی رچے بسے نہیں ہیں۔ اجڑی گلیوں گھروں کی بھی تو اپنی وضعداری ہوتی ہے۔ یہ اجڑی گلیاں، یہ نئے نئے بھرے گھر اپنے پچھلے مکینوں کو ابھی بھولے نہیں ہیں۔ نئے مکینوں سے یہ در و دیوار ابھی مانوس نہیں ہوئے ہیں اور وہ گھر جو ابھی خالی پڑے ہیں، ان کا احوال کچھ اور ہے۔ سارے دروازے بند ہیں مگر دوسری تیسری منزل کی کوئی ایک کھڑکی کھلی [illegible] گئی ہے۔ بے چراغ گھر کی یہ ایک کھلی کھڑکی رات کے سناٹے میں کھانے کو آتی ہے۔ اگر ہوا تیز چل پڑے تو اس کے پٹ دھاڑ دھاڑ کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ گویا اپنے اندر کے سناٹے کے ٹوٹنے پر احتجاج کر رہے ہیں۔

میں نے شاید اپنے ناول ''بستی'' میں اس نقشہ کو بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔ دلی میں بیٹھی کسی ہندی کہانی کار نے ہاں نام یاد آیا، راجی سیٹھ نے اس پر عجب رنگ سے ردعمل ظاہر کیا۔ ایک کہانی لکھی ''انتظار حسین زکو۔'' لکھا کہ تم محلّہ کا نام غلط بتا رہے ہو۔ یہ تو سنت نگر ہے۔ یہاں تو ہمارا گھر تھا اور وہ اپنے شاد آباد سنت نگر کو بیان کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اے بی بی اسی لیے تو میں نے اپنی طرف سے فرضی نام شام نگر رکھا تھا کہ کرشن نگر ہو، سنت نگر ہو، شانتی نگر ہو، ایسے سب اجڑے کوچوں کی اس میں سمائی ہو جائے۔

ہاں میں اپنا ذکر کر رہا تھا کہ مجھے تو ان صعوبتوں سے گزرنا ہی نہیں پڑا جو پناہ گیروں کی تقدیر میں لکھی گئی تھیں۔ جس سپیشل ٹرین میں آیا تھا نہ اس پر حملہ ہوا نہ دور سے گولی چلی اور نہ یہاں آ کر سر چھپانے کے لیے کوچہ کوچہ بھٹکنا پڑا۔ فکر روزگار نے بھی مطلق نہیں ستایا۔ یہ فکر میری ہونی چاہیے تھی مگر عسکری صاحب نے یہ فکر اپنے سر لے لی تھی۔ انہوں نے میرے وہاں پہنچتے ہی آفتاب صاحب کو نوٹس دے دیا تھا کہ انتظار کے روزگار کا کوئی بندوبست کرنا ہے اور آفتاب صاحب نے کیا خوب بندوبست کیا کہ چھوٹتے ہی مجھے فیض صاحب کے سامنے لا کھڑا کیا۔ گورنمنٹ کالج میں مشاعرہ ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔ فیض صاحب صوفی صاحب یعنی پروفیسر صوفی تبسم سے باتوں میں مصروف تھے اور میں دلچسپی سے دیکھ رہا تھا کہ اچھا یہ ہیں فیض صاحب، نقش فریادی والے فیض صاحب۔ سان نہ گمان آفتاب صاحب نے دھکیل کر مجھے آگے کر دیا۔ صوفی صاحب کو شاید پہلے سے کہہ رکھا تھا۔ انہوں نے فوراً ٹکڑا لگایا۔ فیض یہ نوجوان میرٹھ سے آیا ہے۔ ایم اے ہے...... بس

کچھ اسی قسم کی سفارش کہ اسے اپنے ''امروز'' میں کھپالو۔
فیض صاحب نے مجھے ایک نظر دیکھا۔ کہا کہ کل ہمارے دفتر میں آؤ۔
اصل میں پروگریسو پیپرز کی طرف سے اب ایک اردو اخبار کے نکالنے کی تیاریاں تھیں۔ مولانا چراغ حسن حسرت اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ فیض صاحب چیف ایڈیٹر۔ دھوم پڑی ہوئی تھی کہ اردو میں اب پہلی مرتبہ کوئی اعلیٰ معیار کا اخبار نکلے گا اور ادھر یہ احساس ستا رہا تھا کہ کیا ستم ظریفی ہے کہ ''نقش فریادی'' کے مصنف سے ہمیں نیاز حاصل ہو رہا ہے۔ ایک مداح، ایک قاری کی حیثیت سے نہیں بلکہ ملازمت کے امیدوار کی حیثیت سے پیشی ہو رہی ہے۔ پھر دل میں دھکڑ پکڑ کہ جانے کیسے کیسے سوال کریں کہ ہماری اعلیٰ قابلیت کی ساری قلعی کھل جائے۔ یہ تو بہت مشکل انٹرویو ہوگا۔
خیر میں وقتِ مقررہ پر جا پہنچا۔ کمرے میں کیسے داخل ہوں۔ کوئی چوکیدار چپڑاسی کار نہیں کہ نام کی چٹ اندر بھجوائیں۔ جھجکتے جھجکتے چق اٹھائی، اندر جھانکا۔ ''حاضر ہو سکتا ہوں۔'' اکیلے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ''آئیں آئیں۔'' اندر جاتا ہوں، ''بیٹھیں۔'' بیٹھ جاتا ہوں۔ جھجکتے جھجکتے کہا کہ ''وہ جو آپ نے ارشاد کیا تھا کہ......'' ''ہاں ہاں بھئی۔ ٹھیک ہے۔ اچھا تو تم میرٹھ سے آ رہے ہو۔'' ''جی۔'' چپ ہو گئے۔ وقفہ کے بعد۔ ''اردو میں ایم اے کیا ہے۔'' میں نے کہا ''جی''۔ پھر چپ ہو گئے۔ جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ آگے کیا پوچھیں۔ ''میرٹھ کالج سے کیا ہے؟'' ''جی ہاں، آگرہ یونیورسٹی سے۔''
تھوڑی دیر چپ رہ کر بولے ''دیکھیں ابھی تمہیں تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ ہم نے تمہارا نام لکھ لیا ہے۔ تمہیں اطلاع پہنچ جائے گی۔''
آگے کچھ کہنے سننے کے لیے تھا ہی نہیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ ملایا اور رخصت۔
میں حیران کہ اچھا یہ انٹرویو تھا۔ انہوں نے تو مجھ سے کوئی سوال کیا ہی نہیں۔ لکھنے لکھانے کے تجربے کے متعلق کچھ پوچھا ہوتا۔ کچھ بھی تو نہیں پوچھا۔ یہ انٹرویو کیا ہے یا ٹرخایا ہے۔ خیر رسم پوری ہو گئی۔ آگے جو ہو سو ہو۔ انتظار کرنا پڑے گا مگر کتنا، کب تک؟
مگر اس کے فوراً ہی بعد ایک اور صورت نکل آئی۔ بمبئی سے جو ہفتہ وار ''نظام'' نکلتا تھا، اس کے مالک وہاں سے اپنا ٹانڈا بانڈا اٹھا کر لاہور آ گئے۔ اب انہیں یہاں اس رسالہ کے لیے ایک ایڈیٹر کی ضرورت تھی۔ وہ نیاز مند تھے میاں ایم اسلم کے۔ ان سے اپنی ضرورت بیان کی۔ میاں صاحب نے شاہد صاحب سے ذکر کیا کہ چوہدری صاحب کو اپنے ہفت روزہ ''نظام'' کے لیے ایک ایڈیٹر کی تلاش ہے۔ کس کا نام تجویز کریں؟ شاہد صاحب نے میرا نام تجویز کیا۔ میاں صاحب نے فوراً ہی چوہدری صاحب کو بلا کر یہ نام پیش کر دیا۔ انہوں نے بے چوں و چرا تسلیم کر لیا۔ لیجیے ہم چشم زدن میں ہفت روزہ ''نظام'' کے مدیر بن گئے۔
ابھی ''نظام'' کی ادارت سنبھالے چند ہفتے ہی گزرے تھے کہ ہندوستان سے ایک مہمان آن وارد

ہوا۔ کوئی پناہ گیر۔ نہیں، صاحب نہیں۔ ایسا مہمان کہ اس کے وارد ہونے پر میں خود حق دق رہ گیا۔ جس عمارت میں اس وقت ''نظام'' کا دفتر قائم ہوا تھا، وہ حبیب بینک بلڈنگ کی چوتھی پانچویں منزل پر تھا۔ بینک کا ایک چپڑاسی ہانپتا کانپتا آیا۔ کہا کہ ''جی، آپ انتظار حسین ہیں۔'' میں نے کہا ''ہاں، کیا بات ہے؟'' بولا ''آپ کے ایک مہمان ہندوستان سے آئے ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں۔'' ''میرا مہمان ہندوستان سے؟ کون آ گیا اُدھر سے۔'' دوڑا دوڑا نیچے گیا۔ دیکھا کہ ریوتی کھڑا ہے۔ خوش بعد میں ہوا۔ پہلے تو اس کی صورت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یقین نہ آیا کہ وہ ریوتی ہے۔ آنکھیں مَل کر دیکھا۔ یقین آیا۔ گلے ملا۔ مگر فوراً ہی نہ دعا نہ سلام۔ گھبرائے لہجے میں کہا ''آنے سے پہلے مجھ سے پوچھا تو ہوتا کہ کیا حالات ہیں؟''

ادھر سے ترکی بہ ترکی جواب آیا۔ ''تو نے ادھر آتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ میں پاکستان جا رہا ہوں۔''

ویسے میں نے روانگی سے پہلے اسے خط لکھ دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے دیر سے ملا۔ خیر۔ میں نے اپنی طرف سے تو یہی سوچا تھا کہ کم از کم ابھی دفتر میں کسی سے اس غیر متوقع مہمان کا تعارف مت کراؤ۔ ہندو تو اس وقت لاہور میں دور دور کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اس نام کا سارا پانی ہندوستان کی طرف بہہ گیا۔ کوئی اگر ہوگا بھی تو لپ چھپ کر کسی دوست کے گھر بیٹھا ہوگا۔ جیسے ایک دفعہ میں ''ادب لطیف'' کے دفتر عارف عبدالمتین سے ملنے گیا تو تھوڑی دیر میں پردے کے پیچھے سے ایک اجنبی صورت نمودار ہوئی۔ تعارف کرایا گیا کہ یہ فکر تونسوی ہیں اور ہنوز پاکستان میں ہیں مگر آخر کب تک۔ چند ہی دنوں میں چلے گئے۔

مگر ہوا یہ کہ ''نظام'' کے چوہدری صاحب سے ریوتی بمبئی میں مل چکا تھا۔ انہیں دیکھ وہ فوراً ہی ان کے پاس گیا اور علیک سلیک کر لی۔ بس اس کے بعد اندیشوں کے بادل خود ہی چھٹتے چلے گئے۔ بس اب ایک ہی فکر مجھے پریشان کر رہی تھی۔ یہ کافر تو گوشت کی بو سے بھاگتا ہے۔ میرا یہاں گھر نہ بار۔ میں اس کے لیے سبزی، ترکاری کا کھانا کیسے فراہم کروں گا۔ مگر جب میں نے عسکری صاحب سے یہ ذکر کیا اور انہوں نے اپنی والدہ کو مطلع کیا کہ ایک ہندو مہمان آیا ہے اور گوشت سے سخت پرہیز کرتا ہے تو انہوں نے ہنسی خوشی سبزی ترکاری کا سالن تیار کرنے کی حامی بھر لی۔ مگر دوپہر کے کھانے کے لیے ہم گھر تھوڑا ہی بیٹھے رہیں گے۔ یہ مسئلہ بھی جلد حل ہو گیا۔ ارے ''نظام'' کے دفتر سے چار قدم کے فاصلہ پر وائی ایم سی اے تھا۔ اس کے ریستوران میں کام کرنے والے عیسائیوں سے ریوتی نے خود بات کر کے انہیں بتایا کہ میں ہوں سبزی خور۔ انہوں نے سبزی ترکاری کی ڈش فراہم کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ لیجیے یہ مشکل بھی حل ہو گئی۔

بس پھر ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ اطمینان سے سیل سپاٹوں میں یاروں سے ملنے جلنے میں گزرا۔ ترقی پسند دوستوں نے ملنے میں زیادہ گرمجوشی دکھائی۔ پہلے حیران ہوئے کہ اچھا یہ خیالی دوست کی صورت دیکھنے کے لیے پاکستان آیا ہے اور بلا خوف و خطر آیا ہے۔ اور پھر خوب تواضع کرتے۔ اب ہم بلا خوف و خطر شہر میں گھوم پھر رہے تھے۔ مجھے پہلے حیرت ہوئی اور پھر ایک مسرت بھرا اطمینان کہ قیامت گذر جانے کے بعد لاہور شہر کو اب

سکون آ گیا ہے۔ اب کسی کو کرید نہیں ہوتی کہ ہندوستان سے آنے والا کون مخلوق ہے اور کیا لینے آیا ہے اور پتہ چل بھی جائے کہ یہ کون مخلوق ہے تو بس ہلکا تجسس ہوتا ہے۔ نفرت کا جذبہ نہیں جاگتا۔

ریوتی کو رخصت کر کے میں اطمینان سے اپنے دفتر میں بیٹھا اور یکسوئی سے پرچے کو مرتب کرنے میں مصروف ہوا۔ ایک ڈیڑھ مہینے کی تیاری کے بعد "نظام" جو آگے بمبئی سے نکلا تھا، اب لاہور میں منتقل ہو کر ایک پاکستانی ہفت روزہ کی حیثیت سے شائع ہوا۔ بمبئی میں یہ ہفت روزہ ترقی پسند تحریک کے ترجمان کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ اب اس کا رنگ اور تھا۔

ترقی پسند حلقے حیران و پریشان کہ "نظام" تو ہماری تحریک کا ترجمان ہوا کرتا تھا۔ یہ کون ادارت کی کرسی پر آن بیٹھا کہ اس نے پرچے کی پالیسی بدل ڈالی۔ اس پر سہیل عظیم آبادی کو کچھ زیادہ ہی غصہ آ گیا۔ "قلمی تعاون" کے لیے میری عاجزانہ گزارش پر انہوں نے طیش میں بہت کچھ کہہ ڈالا۔ قیام پاکستان کے بارے میں قائداعظم کے بارے میں۔ چیلنج کیا کہ اس خط کو چھاپ کر دکھاؤ۔ نہیں چھاپ سکو گے کہ پاکستان میں نہ بولنے کی اجازت ہے نہ لکھنے کی۔

یہ خط تو میرے لیے سانپ کے منہ میں چھچھوندر کی مثال بن گیا۔ نہ اُگلے بنے نہ نگلے بنے۔ اپنے طور میں یہ سمجھتا تھا کہ سہیل عظیم آبادی کا نقطۂ نظر جو بھی ہو مگر صحافتی آداب کا تقاضا یہ ہے کہ جب انہوں نے یہ تقاضا کیا ہے کہ یہ خط "نظام" میں چھاپا جائے تو اسے چھپنا چاہیے مگر میں ڈر رہا تھا کہ اس خط کے چھپنے پر "نظام" پر سرکاری عتاب بھی نازل ہو سکتا ہے۔ میں نے اس پریشانی کا ذکر عسکری صاحب سے کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں تمہیں اس کے چھاپنے کی ترکیب بتاتا ہوں۔ تم اس خط کو بنیاد بنا کر اپنا اداریہ لکھو اور مراسلہ نگار سے اختلاف کرتے ہوئے پورا خط نقل کر دو۔ یہ تجویز میرے جی کو لگی۔ میں نے یہی کیا۔ لیجیے سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔ ہاں اس سے میرا ایک مقصد پورا ہو گیا۔ وہ جو میں سوچ رہا تھا کہ کوئی ایسا مسئلہ ہاتھ آئے کہ اس پر ایک بحث شروع ہو سکے تو لیجیے اندھے کے پاؤں کے نیچے بٹیر آ گیا۔ میں نے اپنے اداریے میں قارئین کو سہیل صاحب کے ارشادات پر اظہار خیال کی دعوت دی۔ دعوت کو پذیرائی ملی۔ حق میں اور خلاف خطوط آنے شروع ہو گئے۔ خلاف میں تو ایک ادھ ہی خط آیا ہوگا۔ جو خط آیا، سہیل صاحب کی حمایت میں آیا۔

تب میں نے عسکری صاحب کو اکسایا کہ کمال ہے سہیل عظیم آبادی نے پاکستان پر اتنا سخت حملہ کیا ہے اور آپ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہیں۔ لیجیے عسکری صاحب کی قومی غیرت جاگ اٹھی۔ قلم اٹھایا اور رواں ہو گئے۔ پاکستان میں آنے کے بعد انہوں نے قلم کہاں اٹھایا تھا۔ ریڈیو پاکستان کے پروگرام میں تقریریں یا کسی اخبار کے لیے کوئی بے ضرر سا مضمون۔ عسکری صاحب کے حساب سے یہ کیا لکھنا ہوا۔ مگر لکھتے کہاں۔ اردگرد جو رسالے نظر آتے تھے وہ سب ترقی پسند۔ "ساقی" ہنوز معطل تھا۔ "ہمایوں" اور "ادبی دنیا"

امن پسند رسالے تھے۔ ان کی امن پسندی عسکری صاحب کو وارا نہیں کھاتی تھی۔ اب جو انہوں نے مضمون لکھا تو ایسا کہ لاہور کے ترقی پسندوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ عبداللہ ملک نے فوراً قلم اٹھایا اور جوابی مضمون لکھا۔ عسکری صاحب نے ترقی پسندوں کی غیرت کو للکارا تھا۔ عبداللہ ملک کی غیرت نے جوش کھایا اور اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ مضمون انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسہ میں پڑھا گیا۔ ہاں یاد آیا۔ وہ عبدالسلام خورشید تھے جنہوں نے بحث کے بیچ سوال کیا کہ یہ مضمون چھپا کہاں ہے۔ مطلب یہ تھا کہ کس رسالہ یا اخبار نے یہ جرأت کی ہے کہ ترقی پسندوں کے خلاف ایسا مضمون چھاپ ڈالا ہے۔ عبداللہ ملک نے ''نظام'' کا نام بتایا اور سیدھا میری طرف اشارہ کیا کہ وہ رہا ''نظام'' کا ایڈیٹر جس نے یہ حرکت کی ہے۔ کتنی غصیلی نظریں ایک دم سے میری طرف اٹھ گئیں۔ مجھ سے باقاعدہ جواب طلب کیا گیا کہ یہ مضمون آپ نے شائع کیا ہے۔ میں نے ہاں یا نہیں میں جواب دینے کی بجائے یہ کہا کہ ملک صاحب، یہ مضمون مجھے دے دیں۔ یہ مضمون بھی ''نظام'' میں چھپے گا۔ باری صاحب صدر تھے۔ انہیں میرا جواب پسند آیا۔ مگر عبداللہ ملک نے ایک اور سوال اٹھایا۔

''جوں کا توں؟''

''جی ہاں، جوں کا توں۔''

''میرا کوئی فقرہ نہیں کاٹا جائے گا۔''

''بے شک کوئی فقرہ نہیں کاٹا جائے گا۔''

عبداللہ ملک نے اسے اپنی کامیابی جانا۔ میرے حساب سے یہ میری کامیابی تھی کہ میں نے یہ مضمون کس آسانی سے حاصل کر کے اور ''نظام'' میں اسے چھاپ کر ایک مدیر کی حیثیت سے اپنی غیر جانبداری ثابت کر دی اور ہاں میں نے بھرے جلسہ کے بیچ یہ وعدہ کیا تھا کہ عسکری صاحب کے خلاف بیان کیسا ہی سخت ہو مگر کوئی فقرہ قلم زد نہیں کیا جائے گا۔ اب اگر عبداللہ ملک ہی نے اگلے دن دفتر میں آ کر اپنے ایسے بعض فقرے قلم زد کر دیئے تو اس میں میری تو کوئی خطا نہیں تھی۔

بس پھر بحث کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہی تو میری دلی تمنا تھی۔ پھر عسکری صاحب نے اس بحث میں پاکستانی ادب کا سوال کھڑا کر دیا۔ اس سوال نے بحث کے لیے چچی کا کام کیا۔ بحث مزید بھڑک اٹھی۔ پھر یہ بحث ''نظام'' کے صفحوں سے نکل کر عسکری صاحب کی طرف سے ''ساقی'' میں اور ترقی پسندوں کی طرف سے ان کے اپنے رسالوں میں چل پڑی اور ترقی پسند شاعر احمد ریاض نے کیا خوب جواب دیا۔

کون کر سکتا ہے تقسیم ادب کی جاگیر

ابھی یہ بحث گرم تھی کہ ایک صبح آفتاب صاحب ''نظام'' کے دفتر میں آئے۔ بتایا کہ ''امروز'' نکلنے لگا ہے۔ فیض صاحب کی طرف سے بلاوا آ گیا ہے۔ اب کیا خیال ہے تمہارا؟ میں تذبذب میں پڑ گیا۔ آفتاب صاحب نے میرے تذبذب کو بھانپا۔ ہنسے اور بولے ''تم نے جو یہ بحث شروع کر رکھی ہے اور اس میں لطف

لے رہے ہو تو مجھے پتہ تھا کہ اس وقت تم اس پرچے کو نہیں چھوڑو گے۔"

بات آئی گئی ہوئی۔ ادھر "امروز" دھوم سے نکلا۔ فیض صاحب چیف ایڈیٹر تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت ایڈیٹر۔ باقی ٹیم میں پرانا وانا اکا دکا۔ زیادہ تر نوخیز پڑھے لکھے نوجوان۔ اخبار ایسا کہ پڑھے لکھے طبقہ نے اسے آنکھوں سے لگایا کہ آخر کے تئیں اردو میں بھی ایک سنجیدہ اخبار نظر آیا کہ ہر خبر مصدقہ اور زبان و بیان پر مجال ہے کہ کوئی انگلی رکھ سکے۔

ادھر "نظام" میں جلد ہی میرے دن گنے گئے۔ آخر کو مجھے "امروز" ہی میں جا کر اپنی صحافیانہ زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ خوب اخبار تھا۔ صورت شکل جدا، معیار جدا۔ لین دین کے معاملات جدا۔ اردو صحافت کے لیے یہ بھی نرالی بات تھی کہ اخبار میں کام کرنے والوں کو تنخواہ ماہ بہ ماہ ملتی رہے۔ گریڈ مقرر ہوئے۔ سالانہ ترقی کا رواج اور مہینے کی مقررہ تاریخ پر تنخواہ کی ادائیگی۔ ایڈیٹر کے کمرے میں مولانا چراغ حسن حسرت ابوالہول کی شان سے رونق افروز ہیں۔ ادیب ہونے کے طرے کے ساتھ آنے والوں سے ایک ہی سوال "مولانا، آپ نے طلسم ہوش ربا پڑھی ہے؟"

وہ اخبار ترقی پسند ادیبوں کا گھر آنگن تھا۔ اس دعوے کے ساتھ آتے جاتے رہتے تھے کہ یہاں ہمارا سکہ چلتا ہے۔ ایڈیٹر کے کمرے میں داخل ہوتے تو عجیب سوال سے پالا پڑتا "مولانا، آپ نے طلسم ہوش ربا پڑھی ہے۔"

سٹپٹا کر جواب دیتے "نہیں، مولانا۔"

"پھر مولانا آپ نے کیا پڑھا ہے۔"

پھر سگریٹ کا لمبا کش اور لمبی آہ سرد۔ زمانے کا شکوہ "کیا زمانہ تھا کہ گزر گیا۔ سرسید، شبلی، حالی، مولانا ذکاء اللہ، مولوی چراغ علی، ڈپٹی نذیر احمد، نصیر حسین خیال۔ کیا لوگ تھے کہ گزر گئے۔ اب ہمارے ادب میں کون ہے۔ عبدالمجید بھٹی جو کتاب کو ہاتھ نہیں لگاتے کہ کہیں ان کی اور یجنلٹی نہ ماری جائے۔"

ترقی پسند ادیبوں کی بلا جانے کہ یہ اردو ادب کی کونسی ارواح مقدسہ تھیں۔ ادب میں ان کے اپنے امامین تھے۔ اپنے پیر پیغمبر۔ ویسے اس سلسلۂ امامیہ کی جہاں تان ٹوٹتی تھی، اس نے مجھے بھی اچھا خاصا پریشان کیا۔ اس برگزیدہ فہرست میں نصیر حسین خیال کس راستے سے شامل ہوئے مگر حسرت صاحب کی فہرست اس نام کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔

طلسم ہوش ربا کی مت پوچھو۔ اسی پالے میں لا کر تو وہ ادب کے پہلوانوں کو پچھاڑتے تھے۔ عسکری صاحب سے اسی حوالے سے حسرت صاحب کی دوستی ہوئی۔ اسی حوالے نے ان کے بیچ بگاڑ پیدا ہوا۔ عسکری صاحب کی اپنی ادا تھی۔ کسی سے ملنے پر آئے تو اس طرح کہ یک جان دو قالب۔ بگڑے تو اس شان سے کہ اب اس کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں۔ تاثیر صاحب سے کتنی جلدی گاڑھی چھننے لگی۔ کتنے

دنوں تک یہ عالم رہا کہ روز دن ڈھلے گھر سے نکلے اور چلے تاثیر صاحب کے گھر کی طرف۔ پھر بگاڑ پیدا ہوا تو ایسا کہ ان کے خلاف دل کے سارے ہی پھپھولے پھوڑ ڈالے۔ پھر حسرت صاحب سے تعلقات بڑھے تو اس شان سے کہ جیسے ساری قلمی خدمات ''امروز'' کے لیے وقف ہو گئی ہوں۔ ''طلسم ہوش ربا'' نے دونوں کو اس طرح ملایا کہ اٹھتے بیٹھتے حسرت صاحب کا کلمہ پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں عسکری صاحب ''طلسم ہوش ربا'' سے انتخاب کر رہے تھے۔ اب اگر حسرت صاحب سے اس باب میں تبادلۂ خیال نہ کرتے تو اور کس ادیب سے کرتے۔ پھر جانے کیا بات ہوئی کہ بات کی بات میں یاری کٹ۔ کہنے لگے کہ ''طلسم ہوش ربا'' کے شناور بنتے ہیں میں نے طلسم میں آنے والے ایک لفظ کے معنی پوچھے تو کہنے لگے کہ یہ ایک قسم کے برتن کا نام ہے۔ ارے وہ تو پڑھتے ہوئے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کسی برتن کا ذکر ہو رہا ہے مگر کونسا برتن۔ وہ انہیں معلوم نہیں تھا۔

میں ایسے وقت میں ''امروز'' میں پہنچا جب عسکری صاحب کی حسرت صاحب سے یاری کٹ ہو چکی تھی۔ بس سمجھ لیجیے کہ ایک دوسرے سے بے تعلق ہو گئے۔ تاثیر صاحب سے لڑائی میں جو نوبت آ گئی تھی، وہ یہاں نہیں آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

حسرت صاحب سخت گیر ایڈیٹر تھے۔ اس دربار میں دوسری خطائیں معاف ہو سکتی تھیں لیکن زبان کی غلطی کے لیے معافی کا خانہ نہیں تھا۔ ''امروز'' کو وہ ایسا اخبار بنانے پہ تلے نظر آتے تھے کہ کوئی اس کی زبان پر انگلی نہ رکھ سکے۔ رفقائے کار ان کی سخت گیری سے نالاں رہتے تھے۔ اس کے باوجود ان کا احترام بھی بہت تھا اور حسرت صاحب کا کمال یہ تھا کہ جس پر مہربان ہوتے تھے، سخت گیری اس سے بھی اتنی ہی برتتے تھے۔ کچھ اس مثل کے قائل تھے کہ کھانے کو دو سونے کا نوالہ، دیکھو قہر کی نظر سے۔ سو احمد بشیر ان کا منظورِ نظر بھی تھا اور ان کا عتاب بھی سہتا رہتا تھا۔ ارے ہمارے بیچ وہی تو ایک جوانِ رعنا تھا مگر ایڈیٹر کے کمرے میں پیشیاں سب سے زیادہ اسی کو بھگتنی پڑتی تھیں مگر وہ بھی اپنے رنگ سے کسر نکالتا تھا۔ فیچر لکھ کر سمجھتا تھا کہ اس نے صحافت میں آج پھر ایک تیر مارا اور شکوہ یہ کہ تیر میں مارتا ہوں۔ ایڈیٹر کی کرسی پر داد لیتا ہے یہ بڈھا۔ داد دینے والوں پہ جتاتا ہے کہ جیسے سارے نکتے اسی نے مجھے سمجھائے تھے مگر شام ہوتے ہوتے ادھر سے سارا عتاب اور ادھر سے سارے شکوے شکایات طاق میں دھرے جاتے۔ حسرت صاحب دفتر سے اس طرح نکلتے کہ احمد بشیر ان کے ہم رکاب ہوتا۔

افسوس کہ حسرت صاحب کا زمانہ ''امروز'' میں لمبا نہیں کھنچا۔ ساتھ میں ہم سب کو نکلنا پڑا۔ حسرت صاحب انتظامیہ سے لڑتے لڑتے کچھ زیادہ ہی غصہ میں آ گئے۔ یہ ان کا مزاج تھا۔ فیض صاحب ہوتے تو انہیں سنبھال لیتے مگر وہ تو ان دنوں جیل میں تھے۔ ادھر ایک مسئلہ ایوب کرمانی صاحب کا بھی آ پڑا تھا۔ ویسے تو وہ بڑے پرجوش بائیں بازو والے تھے مگر کراچی میں جا کر جب وہاں کے پرچے کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر بن کر

بیٹھے تو جانے وہاں کیا گل کھلا کہ وہ میاں افتخار الدین کی نظروں میں مشکوک ہو گئے۔ سو جلد ہی فارغ کر دیے گئے۔ حسرت صاحب نے ان کا مقدمہ بھی جوش سے لڑا مگر کرمانی صاحب کے لیے اب میاں افتخار الدین کے یہاں کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔

اس لڑائی میں نوبت یہ آگئی کہ حسرت صاحب نے اپنا استعفیٰ داغ دیا، ساتھ میں باقی رفقائے کار نے بھی۔ سو دم کے دم میں ہم دامن جھاڑ کر ''امروز'' کے دفتر سے اٹھے اور باہر آگئے۔

مگر اس کے بعد کیا ہوا، کرمانی صاحب جلد ہی محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر بن گئے۔ عجب ثم العجب۔ تو ان کے بارے میں جو شک کیا گیا تھا، کیا وہ صحیح تھا۔ خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب ہم کیا کریں۔ ہم میں سے جس کے جہاں سینگ سمائے، ادھر نکل گیا۔ ادھر کراچی میں ریڈیو پاکستان میں ایک رائٹرز یونٹ قائم ہوا۔ حسرت صاحب کو وہاں سے پیشکش ہوئی۔ وہ احمد بشیر کو ساتھ لے کر ادھر چلے گئے۔ مجھے کوئی صورت نظر نہ آئی تو اپنے قلم پر بھروسہ کر کے فری لانسنگ پر کمر باندھی۔ ارے وہ جو میں نے اس زمانے میں اپنی پسند کے اکا دکا ناول کا ترجمہ کیا جیسے تورگنیف کا ''فادرز اینڈ سنز'' وہ اسی فری لانسنگ کا فیض تھا۔

۞........۞........۞

ساتھ اس کارواں کے ہم بھی تھے

''امروز'' سے نکلنے کے بعد کتنی دو پہریں اس طور گزریں کہ مولانا چراغ حسن حسرت آگے آگے ہیں اور ''امروز'' سے اجڑے ہوؤں کی پلٹن پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔ اور ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں۔ مت سمجھو کہ بیروزگار ہیں، سو خالی جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ یہ ایک مقصدی گشت ہے۔ مولانا اس تصور کے ساتھ نکلے ہوئے ہیں کہ وہ اپنا اخبار نکالنے کا اعلان کریں گے اور شہر کے سیٹھ سرمایہ لے کر ان کے حضور آن کھڑے ہوں گے۔ سو اب گشت شروع ہے۔ صبح سے نکلے ہیں، دو پہر ہونے کو آئی۔ جس سیٹھ کے در پر دستک دی، اس نے مولانا کے قدم چھوئے، رستے میں آنکھیں بچھائیں۔ خوش کن وعدوں کے ساتھ رخصت کیا۔

لیجیے اب ہم چلتے چلتے ریلوے روڈ پر آنکلے ہیں۔ وہ سامنے اسلامیہ کالج نظر آرہا ہے۔ ارے یہ تو وہی کوچہ ہے جس نے عرب ہوٹل کے نام سے عزت پائی تھی اور اب ہماری آنتیں بھی قل ہو اللہ پڑھنے لگی ہیں تو لیجیے مولانا قدم بڑھاتے ہیں اور ہمیں سمیٹ کر عرب ہوٹل میں داخل ہو جاتے ہیں اور میں حیران ہو کر ارد گرد نظر ڈالتا ہوں۔ اچھا تو یہ ہے وہ ادب کا گہوارہ جہاں ڈاکٹر تاثیر، پطرس بخاری، اختر شیرانی، مولانا چراغ حسن حسرت لیکن اگر میں اسی طرح نام گناتا چلا گیا تو پھر مجھے حمید نسیم کا نام بھی گنانا پڑے گا کہ جیسا کہ ہم سے بیان کیا ضیا جالندھری نے کہ موصوف نے اپنے مرشد سے خفگی کے عالم میں ڈینگ ماری کہ کیا بنے پھرتے ہیں یہ ڈاکٹر اور علامہ، اگر میں پیشاب کر دوں تو سوا ایسے ڈاکٹر اور علامہ پیدا ہو جائیں۔ ضیا جالندھری نے کہا کہ حمید نسیم، پھر ہو جائے ایک پیشاب۔ اور یہ سامنے اسلامیہ کالج ہے۔ کیا زمانہ تھا جب یہاں انجمن حمایت الاسلام کا جلسہ اس شان سے ہوتا تھا کہ علامہ اقبال یہاں آکر اپنی تازہ نظم سناتے تھے اور سنا میں نے اپنے کانوں سے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی زبانی کہ ایک برس یوں بھی ہوا کہ علامہ اقبال کے لیے پلنگ سٹیج پر بچھایا گیا۔ علامہ نے پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ کر اپنی نظم سنائی۔ بھلا کس باعث؟ عبداللہ چغتائی نے بتایا کہ علامہ کی طبیعت ناساز تھی۔ کرسی پر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اور اب اس کوچہ میں ویرانی کا ڈیرا ہے اور عرب ہوٹل کی ویرانی کی نگہبانی عبدالمجید بھٹی کے نام لکھی گئی ہے۔ ہم ''امروز'' سے اجڑے ہوئے بھٹکتے بھٹکتے ادھر آنکلے ہیں۔

پھر جب حسرت صاحب کو یہ احساس ہو گیا کہ یہ خوش کن وعدے زبانی جمع خرچ ہے تو اس گشت

نے دوسرا رخ اختیار کر لیا۔ مختلف اداروں کا دورہ کہ کس کو کہاں کھپایا جائے۔ شہرت بخاری ان دنوں پنجاب اسمبلی کی مجلس زبان دفتری میں کام کرتا تھا۔ وہیں میرے ایک فارسی کے استاد بھی میرٹھ سے آ کر پناہ گیر ہوئے تھے۔ شہرت نے مجھے سمجھایا کہ مجلس میں ایک جگہ خالی ہے۔ حسرت صاحب اگر حکیم احمد شجاع سے بات کریں تو تمہیں یہاں جگہ مل سکتی ہے۔ میں نے حسرت صاحب سے یہ ذکر کیا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو بات کرتے ہیں۔ وہاں پہنچے۔ حکیم احمد شجاع انہیں دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ دونوں گفتار کے دھنی۔ یادوں کی پٹاری کھل گئی۔ پھر چل سو چل۔ حسرت صاحب کو کیا یاد رہنا تھا، میں خود ان خوش گفتاروں کے بیچ آ کر بھول گیا کہ ہم کس مقصد سے آئے تھے۔ رخصت ہونے کے بعد باہر نکلے تو میں نے وجۂ آمد یاد دلائی۔ ''مولانا، اس وقت کیوں یاد نہیں دلایا؟ اچھا پھر آئیں گے۔'' پھر کہاں ادھر آنا تھا۔ رات گئی بات گئی۔ ہاں اس کے بعد تو مولانا کا ڈیرا ہی لاہور سے اٹھ گیا۔ کراچی میں ریڈیو پاکستان کا رائٹرز یونٹ ان کا انتظار کر رہا تھا۔

دھیرے دھیرے کر کے سب ہی رفقائے کار ہلے سے لگ گئے۔ مجھے جب کوئی راہ نظر نہ آئی تو ٹی ہاؤس کی راہ پکڑی اور فری لانسنگ کو سہارا بنایا۔ ویسے تو میں نے ٹی ہاؤس میں اس وقت قدم رکھا تھا جب وہ ابھی انڈیا ٹی ہاؤس تھا۔ میری آنکھوں دیکھتے وہ انڈیا ٹی ہاؤس سے پاک ٹی ہاؤس بنا اور پھر حلقے کے ادیبوں کو کافی نہ جان کر ہر رنگ کے ادیبوں اور ہر قماش کے دانشوروں سے بھرتا چلا گیا مگر ان دنوں تو یہاں میرے آنے جانے میں تھوڑا قاعدہ قرینہ تھا۔ یہ تو اب ہوا ناصر کاظمی کی صحبت میں بیٹھ کر کہ دوپہر اور سہ پہر کا اور شام اور پچھلے پہر کا امتیاز دھندلاتا چلا گیا۔ ادھر کراچی سے عسکری صاحب کا خط آیا کہ سلیم کہتا ہے کہ ناصر کاظمی کی صحبت انتظار کو خراب کر رہی ہے۔ یہ موقع اچھا ہے، اسے کراچی بلا لو۔ تو بھائی تو لاہور کو چھوڑ اور کراچی آ جا۔ مگر عسکری صاحب کی صحبت کا مطلب تھا محض عسکری صاحب۔ اور سلیم احمد کی صحبت کا مطلب تھا سلیم احمد بمعہ اس کی امت۔ اور میں نے سوچا کہ شاعر کی صحبت میں خراب ہونا اس سے بہتر ہے کہ آدمی سلیم کی امت کے بیچ جا کر خراب ہو۔ اس امت کو میں میرٹھ میں بھگت چکا تھا۔ کیا ضرور تھا کہ اب کراچی جا کر آزمائے ہوؤں کو آزماؤں لیکن ادھر منڈلی تو ہماری بھی پھیلتی جا رہی تھی۔ ناصر کاظمی، مظفر علی سید، احمد مشتاق، شیخ صلاح الدین، ناصر تو خیر اپنی ذات میں انجمن تھا۔ ادھر آ کر بیٹھا اور ادھر دور پرے کی میزوں سے شاعر اٹھ کر آنے لگے۔ ناصر صاحب، کوئی نئی غزل ہوئی؟ مطلب یہ کہ آپ سنائیں۔ اس بہانے ہم بھی اپنا کلام گوش گزار کریں گے۔ اس صورتحال کا علاج صرف مظفر علی سید کے پاس تھا۔ موصوف تیر و نشتر سے آراستہ بیٹھے رہتے تھے۔ بتاتے کہ خالی مصرعے جوڑنے کا نام شاعری نہیں ہے۔ مظفر کے جلے کٹے فقروں نے رفتہ رفتہ اپنا اثر دکھایا۔ بھیڑ چھٹنے لگی۔ بس گنے چنے دوست رہ گئے مگر ان گنے چنوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مظفر نے کافی ہاؤس میں کچھ سونگھا اور آ کر بتایا کہ ایک کھرا مصور شہر میں وارد ہوا ہے اور کافی ہاؤس میں نوخیز مصوروں کے بیچ بیٹھا ہے۔ ادھر اس مصور نے قیافہ سے جانا کہ یہ جو ریاض قادر کی میز پر ایک اپنی دھن میں مگن شاعر بیٹھا ہے وہ تو بیچ

بیچ کا شاعر لگتا ہے۔ یہاں سے اٹھ کر کدھر نکل گیا۔ تو اس طرح شاکر علی سونگھتے سونگھتے ٹی ہاؤس پہنچے اور ہمارے ساتھ گھل مل گئے اور ایسے گھلے ملے اور ہم ان کے اس طرح قائل ہوئے کہ "ہم" نے جو ایک ادبی رسالہ نکالا تو اس کی مہورت سمجھو کہ شاکر صاحب کی تجریدی مصوری سے کی۔

یہاں اس ہم کی وضاحت بھی ضروری ہے اور اس بات کی بھی کہ یہ رسالہ کن معنوں میں ہمارا تھا۔ سان نہ گمان۔ بس بیٹھے بٹھائے میں پکڑا گیا۔ انارکلی کے ایک کاروباری شخص پر ادب کا سودا سوار تھا۔ اس نے ایک ادبی رسالہ کا منصوبہ بنا رکھا تھا اور پروفیسر سید وقار عظیم کو منا رہا تھا کہ کسی طرح وہ اس کی ادارت قبول کر لیں۔ انہوں نے اپنا دامن بچایا اور گیند میری طرف کہ اس وقت میں وہاں حاضر تھا، لڑھکا دی۔ اب اس نے مجھ سے اصرار کرنا شروع کیا۔ ادھر میں سوچ رہا تھا کہ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔ مجھے کیا پتہ کہ موصوف کتنے پانی میں ہیں اور ادب کے نام کتنا نقصان اٹھانے کے لیے تیار ہیں۔ مگر وقار صاحب نے اس کی طرف سے وکالت شروع کر دی۔ میں نے فیصلہ کو اگلے دن پر ٹالا۔ ٹی ہاؤس میں یاروں کے بیچ اس پیشکش کا ذکر کیا۔ مظفر نے کہا کہ ہم نے جو نئی نسل ہونے کا اعلان کر رکھا ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہمارا اپنا ایک ادبی آرگن بھی ہونا چاہیے۔ فوراً ہاں کرو اور فوراً ہی اس نے کاغذ پنسل نکال کر نقشہ بنانا شروع کر دیا کہ یہ پرچہ کیسا ہوگا۔ اس میں کیا چھپے گا، کیا نہیں چھپے گا اور ساتھ میں رسالہ کا نام بھی تجویز کر دیا کہ وہ جو میراجی نے بمبئی میں بیٹھ کر "خیال" کے نام سے ایک رسالہ نکالا تھا، سمجھو کہ ہم اس کی تجدید کر رہے ہیں یعنی اس رسالہ کا نام "خیال" ہوگا۔

میں نے اگلے دن اورینٹل کالج میں وقار صاحب کے حضور جا کر اس دیوانہ ادب کو سمجھایا کہ سوچ سمجھ لو۔ ادبی رسالہ انارکلی بازار کا سودا نہیں ہے۔ یہ گھاٹے کا کاروبار ہے اور یہ جو تم نے رسالہ کا الٹا سیدھا نام رکھا ہے، وہ نہیں چلے گا۔ رسالہ کا نام ہوگا "خیال" اس کا ڈیکلریشن حاصل کرو۔ پھر آ کر معاملہ کی بات کرو۔

تو لیجیے سب معاملات طے ہو گئے اور معاملہ کی بات بھی طے ہو گئی اور اس پرچے کے واسطے سے مظفر علی سید کے جو ارمان پروان چڑھنے تھے اور ناصر کاظمی کے جو شوق تھے، ان کے مطابق پرچہ کے مندرجات طے ہو چلے تھے مگر "خیال" بعد میں نکلا۔ "خیال" سے پہلے "خیال" کا اشتہار نکلا۔ اس میں دو فقرے کام کے تھے۔

خیال پیدا ہو کر مرا نہیں کرتا

"خیال" کا ایک ایڈیٹر بھی ہوگا

پہلے فقرے کو فی الحال جانے دیں۔ دوسرے فقرے نے اپنا کام دکھایا اور تیر نشانے پر جا کر لگا۔ پہلے تو محمد طفیل مرحوم نے جن سے میری اچھی یاد اللہ تھی، میری بھی اور ناصر کی بھی۔ انہوں نے جلے بھنے لہجہ میں کہا کہ اچھا تو "خیال" کا ایک ایڈیٹر بھی ہوگا۔ نذیر چوہدری سمجھ رہے تھے کہ یہ اصل میں ان پر چوٹ ہے۔ ان

کا لہجہ بھی اتنا ہی ہلکہ شاید اس سے بڑھ کر جلا بھنا تھا۔ ادھر بھی مقصود یہی جتانا تھا کہ آگے تو ادبی رسالہ کا ایک پبلشر ہوتا تھا، ایک ایڈیٹر ہوتا تھا۔ اب ایڈیٹر غائب ہے۔ پبلشر ہی ایڈیٹر کے خلا کو پُر کرتا ہے۔ ''نقوش'' کس شان سے نکلا تھا۔ محمد طفیل کا اپنا ایک پبلشنگ ادارہ تھا۔ انہوں نے یہ رسالہ نکالا۔ خود پبلشر تھے۔ ایڈیٹر اس کے لیے احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کو چنا گیا۔ اسی زمانے میں ''مکتبۂ جدید'' نے ایک رسالہ ''اردو ادب'' کے نام سے نکالا۔ مکتبۂ جدید کے مالک رشید چوہدری اس کے ناشر تھے۔ ایڈیٹر اس کے سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری بنے۔ پرچے کی پالیسی منٹو اور عسکری کے اندازِ فکر کا عکس تھی جس طرح ''نقوش'' کی پالیسی قاسمی صاحب کے اندازِ فکر کا عکس تھی مگر ''نقوش'' میں جلد ہی وہ وقت آ گیا کہ بیچ میں سے ایڈیٹر نکل گیا۔ پبلشر ہی نے ایڈیٹر کے فرائض انجام دینے شروع کر دیے۔ ''سویرا'' میں بھی ایڈیٹر کا نام اب آرائشی تھا۔ نذیر چوہدری ہی پبلشر بھی تھے اور ایڈیٹر بھی۔ ارے ہاں یہ تو میں ادبی رسالوں کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ روزنامہ صحافت میں ابھی تک اخبار ایڈیٹر ہی کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ اسی حوالے سے اس کی پالیسی کا قیاس کیا جاتا تھا اور اس حوالے سے اخبار کی ساکھ کا تعین ہوتا تھا۔ ہاں لیجیے یہ تو میں بتانا بھول ہی چلا تھا کہ اب میری فری لانسنگ کا امتحانی زمانہ ختم ہو گیا تھا۔ اب میں روزنامہ ''آفاق'' سے وابستہ تھا جس کے ایڈیٹر ان دنوں پروفیسر سرور تھے۔ سرور صاحب کوئی منجھے ہوئے صحافی تو نہیں تھے مگر جامعۂ ملیہ سے نکل کر لاہور پہنچے تھے۔ درس و تدریس سے ان کا تعلق تھا۔ ساتھ میں اسلامیات کے عالم۔ ایڈیٹر کی کرسی پر رونق افروز ہونا انہیں زیب دیتا تھا مگر اس اخبار سے م۔ش جیسے منجھے ہوئے صحافی بھی تو وابستہ تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے بیچارے سرور صاحب اس کرسی پر کتنے دن بیٹھ سکتے تھے۔ سو جلدی ہی رخصت ہو گئے۔ خیر م۔ش کا صحافی کے طور پر بہت نام تھا۔ سو اس کرسی پر بیٹھنا انہیں بھی زیب دیتا تھا اور ایڈیٹر کے ہوتے ہوئے اخبار کی کوئی پالیسی بھی ہوا کرتی تھی اور اس پر سختی سے عمل بھی ہوتا تھا۔ خبروں کو ترجمہ کرنے والوں سے، ترتیب دینے والوں سے۔ فیچر اور تجزیے لکھنے والوں سے کالم لکھنے والوں سے پوچھا بھی جاتا تھا کہ یہ تم نے کیا لکھا ہے۔ اب زمانہ اور ہے۔ لو میں اپنے آپ کو فراموش کر رہا ہوں۔ بھول رہا ہوں کہ اس دشت بے اماں میں یہ برہنہ پا بھی تھا۔ خیر اس وقت یہ ذکر پیش از وقت ہوگا۔ ابھی تو میں ڈیسک پر کام کر رہا ہوں۔ اصل میں بات سے بات نکلی اور بات آج کل کی کالم نگاری تک پہنچ گئی۔ بات تو ''خیال'' سے چلی تھی۔

ارے میں نے کوئی ادبی رسالہ نکالنے کا، اس کے ایڈیٹر ہونے کا خواب کہاں دیکھا تھا۔ یہ خواب تو یارِ غار مظفر علی سید کا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو گمان ہو رہا ہے کہ ''خیال'' جس طرح نکلا اور جس قسم کا ردِعمل اس نے ادبی حلقوں میں پیدا کیا یہ تو اس کے خواب کی تعبیر تھی۔ ہاں اسی نے مجھے اکسایا تھا کہ یگانہ سے فرمائش ضرور کرنی ہے۔ میں نے جھجکتے جھجکتے یہ خط لکھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ شاید ادھر سے جواب ہی نہ آئے۔ وہ شاعر ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔ سوچے گا نہیں یہ کون انتظار حسین ہے۔ کس کھیت کی مولی ہے مگر

نہیں صاحب نہیں۔ جواب آیا اور اس شان سے آیا کہ غزل غائب۔ خط شکست میں لکھا ہوا ایک پورا مقالہ۔ اس تقاضے سے کہ عزیز، ہمت ہے تو چھاپو اس مضمون کو۔ میں نے یہ مضمون پڑھا اور مظفر علی سید کے حوالے کر دیا کہ لو پڑھو اور سر پیٹو۔ مانگی تھی غزل، عنایت ہوئی ہزل۔ سانپ کے منہ میں چھچھوندر۔ نگلے تو اندھا اگلے تو کوڑھی۔ خیر پھر بھی میں نے اس آڑھی ترچھی ٹیڑھی میڑھی تحریر سے چھان پھٹک کر کے دو قطعات برآمد کر لیے۔ انہیں کو پرچے کی زینت بنایا۔ لیجیے "خیال" منصۂ شہود پر آ گیا۔ حاصل بہت سی داد بہت سی بیداد۔

ویسے دوسرے پرچے نے زیادہ قیامت ڈھائی۔ تب تک حلقۂ ارباب ذوق میں قیوم نظر کا میں منظور نظر چلا آ رہا تھا۔ انہوں نے رسالے کی خبر سنی اور ساتھ میں یہ سنا کہ رسالہ کا "خیال" نام رکھ کر میرا جی سے رشتہ جوڑا گیا ہے۔ تب انہوں نے مجھے سمجھایا کہ اس پرچہ کو تم حلقۂ ارباب ذوق کے آرگن کے طور پر پیش کرو۔ میں نے یہ مشورہ سنا اور پی گیا۔ قیوم صاحب پھر بھی ہی سے اکھڑ گئے مگر کوئی تلخی نہیں، کوئی شکایت نہیں۔ کرم فرمائی اسی طرح۔ قہقہے کی وہی شان۔ اونچا قہقہہ قیوم صاحب کا امتیازی نشان تھا۔ جب ٹی ہاؤس کا دروازہ اس شان سے کھلتا کہ داخل ہونے والا دروازے کے برابر کاؤنٹر پر دم لیتا اور ساتھ میں ایک قہقہہ کہ پورا ٹی ہاؤس گونج جاتا، تب ہمیں پتہ چلتا کہ قیوم صاحب ٹی ہاؤس میں وارد ہو چکے ہیں۔ ٹی ہاؤس میں ان کے وارد ہونے کا مطلب تھا ایک پوری ٹولی کا وارد ہونا۔ امجد الطاف، ریاض احمد، اور یا سعید تو خیر ہوئے مگر اب قیوم صاحب گورنمنٹ کالج میں اردو کے پروفیسر بھی تو تھے۔ سو اب انہوں نے اپنے نیکر کو جوان کا خصوصی پہناوا تھا، اتار پھینکا تھا اور سوٹ میں نظر آتے تھے۔ خاص طور پر ان اوقات میں جب وہ کالج سے فارغ ہو کر ٹی ہاؤس میں قدم رکھتے تھے۔ ساتھ میں اکا دکا شاگرد۔ کلاس میں تو ہر قماش کی مخلوق ہوتی ہے۔ کنکر پتھر بھی ہوتے ہیں، بیچ بیچ میں کوئی چمکتا نگ بھی ہوتا ہے۔ قیوم صاحب کا طور یہ تھا کہ اپنی کلاس سے اچھے نگ چنتے، انہیں ادب وشعر کا سلیقہ سکھاتے، تراش خراش کرتے اور حلقہ میں پیش کرتے۔ کوئی تیز طرار ہوتا تو اسے حریفوں رقیبوں پہ چھوڑ دیتے۔ تو آج دوپہر کو وہ ایسے ہی ایک نوخیز شاگرد کو لے کر ٹی ہاؤس میں آئے تھے۔ میں نے اندر قدم رکھا تو فوراً پکارا "انتظار صاحب، ذرا ادھر آئیے۔ یہ نوجوان آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔"

میں اس میز پر پہنچا تو دیکھا کہ اس نوجوان نے "خیال" کا نیا شمارہ کھول رکھا ہے۔ اس صفحہ پر جہاں شاکر صاحب کی ایک تجریدی تصویر زیب قرطاس تھی اور عنوان تھا "سانڈ؟" شاکر صاحب نے تو اس کا عنوان "Bull" رکھا تھا۔ میں نے ترجمہ کر کے اسے سانڈ بنا دیا۔ پوچھنے لگا کہ "اس تصویر میں سانڈ کہاں ہے؟"

سوال نیڑھا تھا۔ تجریدی مصوری میں مخلوقات اور اشیاء کو ان کی اصل شکل وشباہت میں کہاں پیش کیا جاتا ہے۔ سو ان کی شناخت میں بھی ذرا مشکل ہی پڑتی ہے مگر اس پرچہ میں مظفر کا ایک مضمون چھپا ہوا تھا جس کا عنوان تھا "شدھ کلا" واضح ہو کہ ان دنوں مظفر پر سودا دو قسم کا سوار تھا اور دونوں کا تختۂ مشق "خیال" کو

بنا تھا۔ شاعری کے ذیل میں اس نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ کہاں کی رباعی، کہاں کی غزل۔ مجھے تو دوہے کہنے ہیں اور بھجن لکھنے ہیں اور ان کی زبان ہونی چاہیے، شدھ ہندی۔ سو اس نے دوہے لکھے، بھجن لکھے۔

دھیان کی مایا دیکھو شام جی

دھیان کی مایا دیکھو

اور یہ کہ "خیال" کو خالی ادبی رسالہ بن کر نہیں نکلنا ہے۔ اسے اپنے اوراق میں مصوری کو بھی جگہ دینی ہے اور آج کی مصوری تو تجریدی مصوری ہے۔ اس پرچے کو اس نئی مصوری کا شارح اور ترجمان بننا ہے تو اس نے "شدھ کلا" کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا، الل ٹپ نہیں لکھا تھا، ایک پروگرام کے تحت لکھا تھا لیکن اس وقت اس مضمون نے میری مشکل کشائی کی۔ میں نے اس جوان عزیز سے کہا کہ ورقے پلٹیے۔ اس رسالہ میں مظفر علی سید کا ایک مضمون ہے۔ اسے پڑھو، وہاں اس تصویر کی کنجی ہے۔ اس سے پتہ چل جائے گا کہ سانڈ تصویر میں کہاں ہے۔

پھر تعارف ہوا۔ پتہ چلا کہ جوان عزیز نے کالج میں نیا نیا قدم رکھا ہے۔ اڑنے نہ پایا تھا کہ گرفتار ہوا۔ قیوم صاحب نے اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ نام ہے سعید محمود۔ مگر قیوم صاحب کو یہ کب پتہ تھا کہ ان کے سائے میں تو اس جوان عزیز کو گنتی کے دن گزارنے ہیں۔ اسے آخر کو رفاقت میسر آنی ہے ناصر کاظمی کی، انتظار حسین کی۔

اور ہاں پاسعید۔ یار پوچھیں گے کہ یہ پاسعید کون ہیں اور سعید تو خیر ہوئے۔ پا کا لاحقہ کس خوشی میں لگا ہے۔ موصوف کو قیوم صاحب کی ناک کا بال ہونے کا شرف حاصل تھا۔ سائے کی طرح مرشد کے ہمراہ رہتے تھے۔ جہاں مرشد کا پسینہ گرتا وہاں اپنا خون چھڑکنے کے لیے تیار۔ قیوم صاحب کی شاعری پر ایک مقالہ باندھا اور حلقہ کی ایک نشست میں پڑھ کر سنایا۔ بتا رہے تھے کہ قیوم صاحب کی نئی نظم میں کونسا وصف ایسا پایا جاتا ہے کہ ہم عصروں کی شاعری سے اسے ممتاز ٹھہراتا ہے مگر اتنا کہہ پائے تھے کہ جو وصف پا...... کہ ورق تمام ہو گیا۔ ورق الٹنے میں دیر ہو گئی۔ بہر حال ورق الٹا اور پڑھنے لگے...... یا جاتا ہے۔ یاروں نے اس وقفہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ فقرہ پا پر ختم ہو گیا۔ اس "پا" کو انہوں نے عزیز محترم کے نام کے ساتھ جوڑ دیا۔ یوں سعید صاحب پا سعید بن گئے۔

پاسعید صاحب نے قیوم صاحب کے گزر جانے اور اپنے ریٹائر ہونے کے بعد ایک ماہنامہ "علامت" کے نام سے نکالا۔ حلقہ کی اس نسل کے ادیبوں کی نگارشات کی آخری آرام گاہ یہی رسالہ قرار پایا۔ ریاض احمد حلقے کے نفسیاتی نقاد تھے۔ آخر میں ان کی تنقید بھی "علامت" ہی میں آ کر آسودہ ہوئی۔

ہاں اسی زمانے میں قیوم صاحب کچھ اور شاگردوں کو بھی لے کر آئے تھے۔ قیوم صاحب نے ان کی تربیت کی اور حلقہ میں متعارف کرایا مگر سعید محمود جلد ہی ہماری منڈلی میں آ گیا۔ اس پر کسی نکتہ شناس نے

قیوم صاحب سے کہا کہ قیوم صاحب، آپ اپنے کالج سے ٹٹول کر کتنے اچھے نگ لے کر ٹی ہاؤس میں آتے ہیں، حلقہ میں روشناس کراتے ہیں مگر اچھے نگ سرک کر ناصر، انتظار کی میز پر جا بیٹھتے ہیں۔ بچا ہوا مال آپ کے پاس رہ جاتا ہے۔

ناصر سے قیوم صاحب کی زیادہ دنوں نبھ نہیں پائی۔ شاعر کے ساتھ شاعر کا نباہ یوں بھی مشکل ہوتا ہے اور یہاں تو دہری مشکل تھی۔ ادھر قیوم صاحب حلقہ کے معمارِ اعظم کا مرتبہ رکھتے تھے۔ ان کے اشارۂ ابرو پر حلقہ میں ادیبوں کی قسمتوں کا فیصلہ ہوتا تھا۔ ادھر ناصر کاظمی شاعری کا ابھرتا ہوا چمکتا ستارہ۔ کمک پر مظفر علی سید جس نے مغرب کے چھوٹے بڑے نقادوں کو گھول کر پی رکھا تھا۔ کیا قیوم نظر، کیا یوسف ظفر، کیا ضیا جالندھری، مظفر کو ان سب کی شاعری میں عیب ہی عیب نظر آتے تھے۔ مجھ سے قیوم صاحب کو براہ راست کوئی شکایت نہیں تھی۔ میں بس مظفر اور ناصر کی دوستی میں مارا گیا۔ ہم تینوں بیک بینی و دو گوش حلقہ سے نکالے گئے اور اس وقت تک باہر رہے جب تک خود قیوم صاحب کے اقتدار کا تختہ نہیں الٹ گیا مگر آگے چل کر جب انقلابیوں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے آ کر عزیز الحق کی قیادت میں کوس لمن الملکی بجایا اور ساتھ میں حلقہ کی بھی اینٹ سے اینٹ بجادی تو کم از کم مجھے قیوم صاحب بہت یاد آئے۔ مجھے کامل یقین تھا کہ اگر وہ اس وقت حلقہ میں ہوتے تو حلقہ کا وہ مردِ آہن اس بغاوت کا سر کچل دیتا اور ٹی ہاؤس کی میزوں سے اٹھ کر انقلابیوں کی جو بچھیرا پلٹن حلقہ میں آن گھسی تھی ان میں ایک ایک کو کولہو بچہ پلوا دیتا۔ اے لو یہ تو میں نے تاریخ عروج و زوال حلقۂ ارباب ذوق کی ورق گردانی شروع کر دی۔ ذکر تو اپنے رسالہ ''خیال'' کا تھا۔ خیر ''خیال'' نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ ''خیال'' کے تین شمارے چار دن کی چاندنی۔ ''خیال'' کے ناشر کے تکوں میں بس اتنا ہی تیل تھا۔ اس وقت جب میں نے اسے سمجھایا تھا کہ ادبی رسالہ انارکلی بازار کی جوتوں کی دکان نباشد۔ یہ گھاٹے کا سودا ہے تب اسے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ خیر اب بھی جلدی ہی ہوش آ گیا۔ تین شماروں میں کتنا گھاٹا ہوا ہوگا۔ یہ باب بند کر کے آئندہ کے گھاٹے سے بچ گیا مگر اصلی گھاٹا تو مظفر کا ہوا۔ اس کے کیرتن بھجن ''خیال'' کے دم تک تھے۔ پھر اس کے بعد اس چراغ میں روشنی ہی نہیں رہی۔ ارے پھر تو وہ عربی عجمی روایت کی طرف اس رنگ سے لوٹا کہ کون سور داس کون میرا بائی، اس نے پھر پلٹ کر ان کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ سچی بات ہے اب مظفر کا خیال کر کے مجھے افسوس ہوتا ہے کہ یہ پرچا اتنی جلدی کیوں بند ہو گیا۔ بند تو اسے ہونا ہی تھا مگر کیا مضائقہ تھا کہ سال سوا سال تک گرتا پڑتا چلتا رہتا۔ اتنی مدت میں مظفر پتہ نہیں کتنا کچھ کر ڈالتا مگر قدرت کو شاید یہ منظور نہیں تھا۔

مظفر سے میری یاری بہت شروع میں ہو گئی تھی۔ دوستی کی حد تک مظفر کو میری پاکستانی زندگی میں اولیت حاصل ہے۔ ابھی میں ''نظام'' میں تھا۔ اسی زمانے میں اس کے ابتدائی مہینوں ہی میں ہم دونوں ایک دوسرے سے جلدی مانوس ہو گئے تھے۔ بس انہیں دنوں جب اس دوستی کی داغ بیل پڑی تھی، اس نے فسادات

کے ادب پر ایک لمبا مقالہ لکھا جو" نظام" میں دو قسطوں میں چھپا تھا۔

میرے اور مظفر کے درمیان اولین رشتۂ اتحاد سرشار تھا۔ سرشار بحوالۂ خصوصی" فسانہ آزاد" میں نے اس سے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی جو فسانہ آزاد سے میرے شغف کی چغلی کھاتی۔ بس اس نے میری کہانیوں کی زبان و بیان سے یہ کھوج لگایا۔ میں نے جانا کہ یہ اس کی طرف سے میری کہانی کو خراج تحسین ہے۔ سو مجھے خوش ہونا ہی تھا مگر تھوڑا آگے چل کر ایک اور رشتۂ اتحاد نکل آیا۔ چیخوف۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ اس نے صحیح یا غلط یہ وہ جانے اس کا ایمان جانے، میری کہانیوں میں چیخوف کا اثر دریافت کر لیا۔ میں یہ سن کر پہلے سے بڑھ کر خوش ہوا کہ اس محاکمہ کو میں نے پہلے سے بڑھ کر اپنی کہانی کے لیے خراج تحسین جانا۔ تب بھی اور آج بھی جب میں کتنے کہانی کاروں کو پڑھ چکا ہوں چیخوف میرے لیے مختصر کہانی کا قبلہ و کعبہ ہے۔ پھر چیخوف ہمارا مشترکہ شغف بن گیا اور یہ لکھتے لکھتے مجھے کچھ یاد آیا۔ میں نے اپنی کتابوں کے بیچ رکھے ہوئے چیخوف کے منتخبات پر نظر ڈالی۔ ان میں سے کتنے میں نے خود خریدے تھے، کتنے مظفر نے خرید کر مجھے عنایت کیے تھے، کسی اچھے سے ریمارک کے ساتھ مگر ایک مجموعہ ذرا مختلف رنگ سے پیش کیا تھا" دیکھ کہانی ایسے لکھی جاتی ہے" یہ جوائس کی مختصر کہانیوں کا مجموعہ تھا۔ Dubliners۔ میں نے ایک بار پڑھا، دوسری بار پڑھا، تیسری بار پڑھا۔ کچھ سمجھ میں آیا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کہانی کیسے لکھی جاتی ہے۔

جوائس کی یہ کتاب استثنا تھی۔ زور روسی فکشن پر ہی رہا۔ کبھی کبھی لگتا کہ مظفر مجھے انگلی پکڑ کر روسی فکشن کی گلیوں کی سیر کرا رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ٹالسٹائی اور دوستوفسکی کی چکاچوند میں مجھے کہاں پتہ چلتا تھا کہ وہاں" اوبلوموف" ایسا ناول بھی لکھا گیا ہے۔

مظفر کے علم سے یاروں نے بقدر ظرف فائدہ اٹھایا مگر خود مظفر پر اس کا علم بھاری پڑا۔ اسے اپنے لکھے پر اعتبار ہی نہیں آتا تھا۔ پھر کتاب کیسے چھپواتا۔ بہت پڑھ کر کوئی اتنا اونچا معیار دل و دماغ میں قائم کر لے جس تک رسائی مشکل ہو جائے تو پھر یہی ہوتا ہے اور مجھے دیکھو کہ اس نے اپنے آخری دنوں میں میری افسانہ نگاری پر دو قسطوں میں ایک مضمون باندھا تھا۔ پہلی قسط شاید کسی رسالہ میں چھپی تھی کہ میں نے اسے پڑھ لیا۔ دوسری قسط کے ساتھ یہ ہوا کہ ٹی ہاؤس کی بالائی منزل میں حلقہ کے جلسہ میں وہ اپنا مضمون سنا تا رہا اور میں اپنی بے نیازی ظاہر کرنے کے چکر میں نیچے زاہد ڈار کے ساتھ بیٹھا چائے پیتا رہا۔ یہ دوسری قسط چھپی ہی نہیں کہ میں پڑھ سکتا۔ اس نے یہ کہہ کر بستہ میں رکھ لی کہ میں اس پر نظر ثانی کروں گا۔ مظفر کے کتنے مضامین نظر ثانی کے چکر میں چھپنے سے رہ گئے اور اب انہیں گم سمجھنا چاہیے۔ بیٹے، باپوں کی چھوڑی ہوئی ایسی جائیداد کی قدر کم کم ہی کرتے ہیں جن سے انہیں یافت کی توقع نہ ہو۔

اچھا مظفر سے فی الحال رخصتی لے لو۔ ابھی تو بیان کرنے کو بہت کچھ پڑا ہے۔ ہاں بات" خیال" کی ہو رہی تھی۔ ایک اور شخص بھی تو تھا جس نے" خیال" کے بند ہو جانے کے بعد بھی اسے بہت یاد کیا اور یاد

رکھا۔ بات کوئی بھی ہو رہی ہو، اچانک بے تکے پن سے ہنستے جیسے بہت کچھ یاد آ گیا ہو۔ کہتے "یار" خیال" پھر نکالو۔" یہ ہمارے شاکر صاحب تھے۔ کہیں دور سے چل کر انہیں دنوں لاہور پہنچے تھے۔ آتے ہی کافی ہاؤس میں ڈیرا کیا۔ پھر کبھی کبھار ٹی ہاؤس میں جھانکا۔ آخر کے تئیں ٹی ہاؤس ہی میں اٹھنے بیٹھنے لگے۔ کافی ہاؤس نے بھی تو وفا نہیں کی۔ انڈیا ٹی ہاؤس سے وہ زیلنز کافی ہاؤس بنا۔ یار سمجھے کہ نسبت ہی تو بدلی ہے۔ پہلے انڈیا کافی ہاؤس تھا، اب زیلنز کافی ہاؤس ہے۔ مگر زیلنز کافی ہاؤس نے کتنی عمر پائی۔ تھوڑے سال گزار کر وہ بھی بند ہو گیا۔ اچھے رہے وہ یار جنہوں نے زیلنز کے ہوتے ہوئے ہی ٹی ہاؤس میں اپنے لیے جگہ بنالی تھی۔ جو ٹی ہاؤس سے کترا کر چلے ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب جبکہ کافی ہاؤس کی دکان بڑھادی گئی ہے، وہ کہاں جائیں۔ شاکر صاحب کو میں نے پہل پہل کافی ہاؤس ہی میں دیکھا تھا۔ میں تو مظفر کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا وہاں پہنچا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مظفر کافی کی میز پر ایک شخص سے مخاطب ہے اور نئی مصوری پر رواں ہے اور وہ شخص ہونق بنا مظفر کا منہ تک رہا ہے۔ میرے پہنچنے پر سرسری تعارف کرایا کہ یہ شاکر علی ہیں۔ پھر اسی طرح رواں، جب ہم دونوں اس شخص سے رخصت ہو کر باہر آئے تو مجھے تھوڑا تجسس ہوا۔ پوچھا، یہ کون صاحب تھے۔ مظفر نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا "شاکر علی، ایشیا کا سب سے بڑا جدید مصور۔"

میں نے مظفر کے اس وقت کے بحاکمہ پر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا مگر رفتہ رفتہ اس مرد اجنبی کی خوشبو پھیلنی شروع ہوئی۔ پھر کچھ ملاقاتیں بھی ہوئیں مگر عجیب ملاقاتیں تھیں۔ ہم یار ہنس بول رہے ہیں اور وہ چپ۔ گم سم جیسے ہماری باتیں سن بھی رہے ہیں اور ادھر دماغ میں کوئی اور ہی چرخی چل رہی ہے۔ اس لیے جب بھی زبان کھولی تو کوئی ایسی بات، کوئی ایسا فقرہ اور وہ بھی ایسا کہ مکمل ہونے سے پہلے ہی جیسے بکھر گیا ہو اور جس کا ضروری نہیں کہ جاری گفتگو سے کوئی رشتہ بھی ہو۔

بس انہیں دنوں جب ابھی شاکر صاحب اس شہر میں نئے نئے تھے "خیال" کی داغ بیل پڑی۔ دوستوں کے بیچ طے یہ ہوا تھا کہ چونکہ ہماری نئی نسل ملی جلی ہے۔ اس میں ادیب بھی ہیں اور نئے مصور بھی ہیں اس لیے یہ پرچہ نئے ادب کے ساتھ نئی مصوری کا بھی احاطہ کرے گا۔ مظفر نئی مصوری پر لکھنے کے لیے تُلا بیٹھا تھا۔ میں نے شاکر صاحب سے گزارش کی کہ "خیال" کے لیے اپنے کام میں سے کوئی تصویر عطا کریں۔ جواب دیا کہ تصویر تو میں پیش کروں گا مگر ایک مضمون لکھا ہے وہ بھی چھاپ دیجیے۔ میں نے کہا کہ سبحان اللہ چپڑی اور دو دو۔ سو پہلے پرچے میں ان کی ایک تصویر چھپی۔ ایک مضمون اطالوی مصوری کے بارے میں اس کے ساتھ ایک تصویر عنایت کی۔ جنت سے نکلنا آدم وحوا کا حالت برہنگی میں۔ ارے اب کوئی پرچہ وہ تصویر چھاپ کر تو دکھائے مگر وہ بھلا زمانہ تھا۔ اماں حوا کی برہنگی پر کوئی انگلی نہیں اٹھی۔ تو سمجھ لیجیے کہ شاکر صاحب کا پاکستان میں یہ پہلا تعارف تھا۔ ابھی نہ ان کی تصویروں کی کوئی نمائش ہوئی تھی نہ ان کے متعلق کچھ چھپا تھا۔

"خیال" کا دوبارہ اجرا ہوا تو سہی مگر کب اور کیسے، یہ بعد میں۔ درمیان میں جو کچھ ہوا اس کا بیان

بھی ضروری ہے۔ سب سے بڑھ کر تو یہ ہوا کہ یاروں کی منڈلی میں تفرقہ پڑ گیا۔ یہ کہ ہم نئی نسل ہیں، پاکستان کی پہلی تخلیقی نسل۔ اس خیال کے ساتھ اکٹھے ہوئے تھے اور اسی خیال نے یاروں کے بیچ تفریق کا بیج بو دیا۔ چلے تھے اس خیال کے ساتھ کہ اپنا ایک منشور پیش کریں گے۔ وہ گویا ایک تحریک کا اعلان ہوگا اور منشور لکھنے بیٹھے شیخ صلاح الدین۔ بدشگنی تو یہیں سے ہوگئی۔ مظفر کو جو فریضہ انجام دینا تھا، وہ فریضہ سونپا گیا شیخ صلاح الدین کو۔ مگر آخر مظفر کا بھی تو یاروں کے بیچ اثر و رسوخ تھا۔ اندر ہی اندر ہنڈیا پکنے لگی کہ یہ شیخ صلاح الدین بیچ میں کہاں سے آن براجے۔ سو جب نئی نسل والوں کی پنچایت بیٹھی اور انگریزی میں لکھا ہوا یہ منشور پیش ہوا تو مظفر نے کھڑے ہو کر اس کی ہنڈی کی چندی کر دی اور اسے حمایت حاصل تھی مصوروں کی پوری ٹولی کی ماسوا حنیف رامے کے۔

ہاں میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ "خیال" کے ساتھ ہی مصوری کے نام ایک اور کلی بھی چٹکی تھی۔ خود مظفر نے اس کا انکشاف کیا تھا۔ تجویز پیش کی کہ "خیال" کا ٹائٹل حنیف بنائے گا۔ یہ ہمارے لیے نیا نام تھا۔ پتہ چلا کہ مکتبۂ جدید کے رشید صاحب کا چھوٹا بھائی حنیف جو گورنمنٹ کالج میں فلسفہ میں ایم اے کرنے کے عمل میں تھا، مصوری سے بھی شوق کرتا ہے۔ اچھا وہ نوجوان، میں نے سوچا کہ میں تو اس سے اور ہی رنگ سے متعارف ہوں۔ پہلی مرتبہ میں نے اس نوخیز کو منٹو صاحب کے یہاں اس شام دیکھا تھا جب وہ میرے افسانے میں جو کمی رہ گئی تھی، وہ مجھے سمجھا رہے تھے۔ وہ بھی اس افسانے کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے تڑپ رہا تھا لیکن منٹو صاحب اسے بولنے ہی نہیں دے رہے تھے۔ "چپ بیٹھو اور مجھے بات کرنے دو۔"

پھر میں نے سال دو سال بعد مال سے گزرتے گزرتے دیکھا کہ وہی لڑکا ہے مگر اب اس نے قد نکال لیا ہے۔ ایک درخت کے سہارے کھڑا مال سے گزرتی سائیکل سوار لڑکیوں کو تک رہا ہے۔ آنکھیں موند لیتا ہے، کھولتا ہے پھر انگشت شہادت فضا میں بلند کر کے ہوا میں ایک پیکر کا، نسوانی پیکر کا نقش بناتا ہے۔ پھر آنکھیں موند لیتا ہے اور اب مجھے پتہ چلا کہ وہ تو سچ مچ مصور بن چکا ہے۔ اس نے "خیال" کا ٹائٹل بنایا اور ایسا ٹائٹل کہ ہر دیکھنے والے نے اس پر واہ واہ کی۔ اس وقت مظفر اس کا گرو تھا لیکن جلد ہی اس نے ہماری صحبت میں بیٹھ کر ایک نیا مرشد تلاش کر لیا اور مظفر کو چھوڑ چھاڑ کر شیخ صاحب کی گود میں جا بیٹھا۔

ہم نے شیخ صاحب کو ناصر کے دوست کے طور پر جانا تھا۔ پہلے یوں ہوتا کہ ایک صاحب ٹی ہاؤس میں آتے۔ ناصر ہمارے بیچ سے اٹھ کر ان سے جا کر ملاقات کرتا۔ ان کے ساتھ نشست کر کے انہیں رخصت کر کے پھر ہمارے بیچ آن بیٹھتا اور ہم حیران کہ یہ کون اجنبی آتا ہے۔ ناصر سے ملاقات کر کے چلا جاتا ہے مگر پھر ناصر نے ہمارے بیچ ہی اس سے ملاقات شروع کر دی اور کتنی جلدی ہم سب اس کے علم و فضل کے قائل ہو گئے۔ اس وقت ہمیں اس خطرے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ ایک جنگل میں دو شیروں کا اکٹھا ہونا اس جنگل کے لیے کوئی اچھا شگن نہیں ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ شیرِ بیشۂ علم و حکمت۔ کنا چھنی جلد ہی شروع ہوگئی۔ حنیف

نے جواب حنیف رامے بن چکا تھا، گو د بدل کر رقابت کی آگ کو بھڑ کا دیا اور اس کے فوراً ہی بعد شیخ صاحب کی طرف سے یہ بیان آیا کہ سچا اور کھرا مصور تو حنیف رامے ہے۔ سوچیے کہ اس دعوے نے مصوروں کے بیچ کیا آفت بوئی ہوگی۔

ہاں جب ناصر کی "برگ نے" شائع ہونے لگی تو ناصر نے شاکر صاحب سے گزارش کی کہ آپ میری کتاب کا سرورق بنائیے۔ شاکر صاحب نے سرورق بنایا۔ ناصر نے بہت پسند کیا۔ ہم سب نے پسند کیا مگر جب حنیف تک یہ خبر پہنچی تو وہ مچل گیا کہ ناصر کی کتاب کا سرورق بنانے کا حق اگر کسی کو ہے تو مجھے ہے۔ اسے سمجھایا گیا، ناصر نے بھی بہت سمجھایا کہ وہ تو میرے کہنے پر شاکر صاحب نے بنایا تھا اور میں تو ناشر کو (کارواں پبلشرز) یہ سرورق حوالے کر چکا ہوں مگر حنیف اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ اس نے کارواں کے حمید صاحب کے پاس جا کر ناصر کے ساتھ اپنے حق رفاقت کو جتایا اور انہیں قائل کرنے میں کامیاب رہا۔ سو "برگ نے" حنیف رامے کے سرِ ورق کے ساتھ شائع ہوئی۔ لیجیے یہ ایک اور پیچ پڑ گیا۔ شاکر صاحب ناصر سے خفا خفا پھرنے لگے۔ میں نے ناصر کی طرف سے بہت صفائیاں پیش کیں مگر شاکر صاحب کے دل میں جو ایک گرہ پڑ گئی تھی وہ نہیں گئی۔ بس دب گئی۔

اصل میں یہ جو حنیف رامے کا بات بات میں مچل جانا تھا اس نے میرے اور ناصر کے لیے بہت الجھنیں پیدا کیں۔ شیخ صاحب کے وہ مسائل نہیں تھے جو ہمارے تھے۔ انہیں تو اس حلقۂ دوستاں سے غرض ہی نہیں تھی جس میں ہم اٹھتے بیٹھتے چلے آئے تھے اور اس اٹھنے بیٹھنے میں ہم نے محبت کے رشتے قائم کیے تھے مگر شیخ صاحب اپنے ملنے والے سے پوری وفا مانگتے تھے اور پوری وفا سے نوازتے تھے۔ وفا بلا شرکت غیرے۔ بس اس ایک وجہ سے ان کا حلقۂ ارادت پھیلنے سے پہلے ہی سکڑ گیا۔ ہمارے دوستوں میں سب سے سرکش مخلوق احمد مشتاق کو جانیے۔ اس نے تو چھپے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیا۔ پہلے ہی مرحلہ میں شیخ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ مظفر کو اس انکار اطاعت سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ شیخ صاحب کی خطائیں شیخ صاحب کے ساتھ، مظفر کی خطائیں مظفر کے ساتھ۔ احمد مشتاق کے یہاں یاروں کی کسی خطا کے لیے معافی کا خانہ نہیں تھا۔ مگر صحیح تولتا تھا۔ ترازو اس کے ہاتھ میں تھی۔ سو ہر یار کی خطاؤں کا پلہ ہمیشہ بھاری ہی دیکھا گیا۔ ادھر شیخ صاحب کی ترازو میں یاروں کی خوبیوں کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا۔ اور حنیف کی مصوری کو انہوں نے کیا خوب تولا کہ پلہ اس کا گراں ہوتا ہی چلا گیا۔

ناصر دوستوں کے معاملہ میں مرنجان و مرنج۔ احمد مشتاق سے بھی آخر دوستی رکھنی تھی اور شیخ صاحب اور حنیف رامے کی بھی دل شکنی منظور نہیں تھی۔ اور ناصر کی رضا میں میری رضا۔ مگر شاکر صاحب بھی تو دوست تھے بلکہ دوستوں سے بڑھ کر دوست۔ اور ان کی مصوری کی خوشبو تو اب پھیلتی ہی چلی جا رہی تھی۔ جب ناصر کی "برگِ نے" کے سرورق کا قصہ نیا پرانا ہو گیا اور شاکر صاحب کی طبیعت بھی بحال ہو گئی تو ایک خواہش نے

میرے اندر سر اٹھایا۔ میرا مجموعہ "شہرِ افسوس" اشاعت کا منتظر تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس کا سرورق شاکر صاحب سے بنوایا جائے۔ شاکر صاحب نے فوراً ہی حامی بھر لی مگر فوراً ہی بیمار بھی پڑ گئے اور ایسے بیمار پڑے کہ طبیعت سنبھلنے ہی میں نہیں آ رہی تھی۔ ادھر ناشر کا سخت تقاضا کہ سرورق کہاں ہے۔ آخر کو میں نے ہسپتال جا کر شاکر صاحب سے کہا کہ میں نے آپ کو سرورق کی ذمہ داری سے آزاد کیا۔ طبیعت پر بوجھ مت لیں اور اچھے ہو جائیں اور واقعی اس کے تیسرے ہی دن ان کی طبیعت بحال ہو گئی اور ہسپتال سے گھر منتقل ہو گئے۔

ہاں جب اس مجموعہ کی افتتاحی تقریب ہونے لگی تو جیسے شاکر صاحب سرورق والا چڑھا قرض یہاں اتارنا چاہتے تھے تقریب کی صدارت پر اس اعلان کے ساتھ آمادہ ہوئے کہ ان کہانیوں کے بارے میں انہیں ایک نکتہ سوجھا ہے، وہ بیان کریں گے۔ سٹیج پر سہیل احمد خاں ان کے برابر میں بیٹھے تھے۔ بعد میں بتایا کہ سامنے رکھے کورے کاغذوں پر وہ بہت تیزی سے دوسروں کی سنتے ہوئے کچھ لکھتے چلے جا رہے تھے مگر جب صدارتی کلمات کی باری آئی تو جانے کیا ہوا کہ چند فقرے اس رنگ سے ادا کیے کہ گونگا خود سمجھے یا گونگے کی ماں سمجھے۔ پھر سٹپٹا کر چپ ہو گئے۔

ارے وہ تو سٹیج تھا اور سامنے مائیک جو پوری تقریر کا مطالبہ کر رہا تھا مگر شاکر صاحب تو دوستوں کے بیچ بیٹھ کر بھی گفتگو اس طرح کرتے تھے کہ آدھا فقرہ بول کر چپ ہو گئے اور سمجھ لیا کہ فقرہ یار خود مکمل کر لیں گے اور مفہوم سمجھ لیں گے۔ ایک روز موڈ میں تھے۔ بولے "انتظار حسین، تمہیں پتہ ہے، ہم مولانا محمد علی کے خاندان سے ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا کہ "جب ہی۔"

چکرا کر بولے "جب ہی کیا۔"

تب میں نے اپنے "جب ہی" کی وضاحت کی اور کہا کہ "مولانا محمد علی قیامت کے مقرر تھے۔ ان کی گرمی تقریر کو تو تحریک خلافت بھی زیادہ دنوں تک نہیں سہار سکی۔ جلدی ہی ڈھے گئی۔ اب پتہ چلا کہ ان کے خاندان کے حصے میں جتنی قوت گویائی آئی تھی وہ بھی سب انہوں نے اپنی خطابت میں سمیٹ لی تھی۔ آپ کی قوت گویائی بھی اُدھر ہی سمٹ گئی۔"

مگر ایک دوست نے کیا خوب کہا کہ شاکر صاحب خود نہیں بولتے، ان کی تصویر بولتی ہے۔ میں نے کہا "مگر وہ بھی تجریدی زبان بولتی ہے جسے سمجھنے والے ہی سمجھتے ہیں۔"

۞........۞........۞

تو شب آفریدی، رتجگا آفریدم

ہم ہیں۔ رات کا ایک بجا ہے۔ خالی رستہ بول رہا ہے۔ ریگل چوک پر پہنچ کر میں ٹھٹکا۔ یہاں فٹ پاتھ سے اتر کر دو تانگے کھڑے تھے، چپ چاپ۔ تانگے والے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اور دیر کی تو پھر یہ سواری بھی نہیں ملے گی۔ ناصر نے شاید میری نیت بھانپ لی۔ پوچھا "کیا نیت ہے؟" میں نے جھجکتے ہوئے کہا "اب گھر نہ چلیں؟"

"گھر؟" ناصر نے مجھے گھور کے دیکھا "اب تو میری آنکھیں کھلنی شروع ہوئی ہیں۔"

ناصر کی آنکھیں بھی عجب تھیں۔ آدھی رات کے بعد کھلنا شروع ہوتی تھیں یعنی اس وقت جب میری آنکھیں ایک جھپکی کے لیے تملانے لگتی تھیں۔ کتنی راتوں کے بعد میری آنکھوں نے بالآخر ناصر کی شب بیدار آنکھوں کے ساتھ مفاہمت پیدا کر لی مگر ناصر سے رتجگے کی فضیلت پر کتنے خطبے سننے کے بعد۔ ناصر کا کہنا تھا کہ اللہ میاں نے رات پیدا کی۔ اس کے شب زندہ دار بندوں نے رتجگا ایجاد کیا۔ تو شب آفریدی، رتجگا آفریدم۔ رات اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ اسے سو کر ضائع کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ جوں جوں رات بھیگتی ہے، اس کا جادو جاگتا ہے۔ جادو بھری رات کے اپنے فضائل ہیں۔ رتجگے کی اپنی فضیلت ہے۔

مگر سفرِ شب میں پڑاؤ بھی تو آنے چاہئیں۔ ٹی ہاؤس تو بس گیارہ بجے تک کھلا رہتا تھا۔ وہاں سے نکل چل کھڑے ہوئے۔ یوں تو ان دنوں مال روڈ پر ریستورانوں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی۔ کافی ہاؤس کے برابر والے چائنیز ریستوران سے نکلو اور گنتے چلو جاؤ۔ ڈین، کیفے ٹیریا، شیزان، سٹینڈرڈ، شیراز، کیسینو، ونگا، انڈس۔ مگر بارہ بجے کے بعد تو ساری شاہراہ سنسان ہو جاتی تھی۔ پتہ نہیں کس دوست نے یہ راہ بھائی کہ ارے چیئرنگ کراس کے بغل میں میٹرو بھی تو ہے۔ ٹھیک ہے وہاں کی رونق اور طرح کی ہوتی ہے۔ بال روم، ڈانسنگ، کیبرے۔ مگر خالی شعر و ادب کی باتیں کرنے والوں پر بھی اس کے دروازے بند تو نہیں ہیں۔ بے شک بینڈ بجتا ہے اور جوان اور ادھیڑ عمر جوڑے رقص کرتے رہیں اور بے شک اس بیچ گھڑی دو گھڑی کے لیے ساری بتیاں گل ہو جائیں اور جس کی جو مراد ہے، وہ پوری ہو جائے مگر یاروں نے جو ایک گوشے میں چائے کی میز کے گرد اپنی سجا جما رکھی ہے، وہ اس میں مگن ہیں۔ ویسے اچٹتی سی نظر اِدھر اُدھر بھی ڈال لی جائے تو کیا

مضائقہ ہے کہ اب ہم رقص جوڑے فلور سے سرک کر اپنی اپنی نشستوں پر جا بیٹھے ہیں اور اب جو اندھیرا ہوتا ہے، وہ ایک نئی روشنی اپنے جلو میں لاتا ہے۔ ارد گرد تاریکی، فلور کے بیچ روشنی کا ایک ہالہ۔ اس ہالہ کے بیچ ایک گل بدن۔ کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے۔ پورے فلور پر پھرکنی سی پھرتی ہے۔

اور لیجیے اس ناچ کے بیچ ایک اور گل کھلا۔ وہ جو ایک صندلی بلی فنیجر کی کرسی کے پائے سے لگی بیٹھی تھی، پھریری لے کر اٹھی اور فلور پر پہنچ کر اس گل بدن کو حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ بے شک فوراً ہی اسے وہاں سے ہانک دیا جاتا ہے مگر میرے تصور میں اس منظر کا یہ بھی ایک جزو لازم بن گیا ہے۔ ہاں تو یہ منظر بھی وہاں دیدنی ہے اور۔

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے

مگر اس منظر کو لمبا تو نہیں کھینچنا۔ بس سمجھ لیجیے کہ گھڑی دو گھڑی کی بہار۔ اس کے بعد روشنی کا وہ ہالہ غائب۔ مرکری کے قمقمے پھر روشن ہو گئے۔ مگر کیا روشن ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی محفل کے برخاست ہونے کا وقت آن پہنچا۔ اہل محفل رخصت ہونے لگے۔ ہم بھی باہر آ گئے۔

مگر رات تو ابھی باقی ہے اور ناصر کاظمی کی آنکھوں میں نیند ابھی دور دور نہیں ہے۔ سو اب کہاں جائیں۔ ہاں ایک ٹھکانا ہے۔ چلو یہاں سے چلتے ہیں۔ لوہاری دروازے میں انارکلی کے موڑ پر ایک بکھنچر چائے خانہ ہے۔ چائے خانہ نہ کہیے، چائے کی دکان۔ اندر بیٹھنے والوں کے لیے صرف ایک بنچ۔ اس کے آگے لمبی سی میز اور ہم بھی کتنے تن ہیں۔ بس یہی گنتی کے چار پانچ مظفر علی سید، غالب احمد، احمد مشتاق، حنیف رامے، شیخ صلاح الدین اور یہ حقیر۔ ان میں سے کبھی ایک غائب دوسرا حاضر، کبھی دوسرا غائب تیسرا حاضر۔ کوئی ایسا غایب ہوا کہ پھر شہر ہی چھوڑ گیا۔ کوئی بس روٹھ گیا اور منڈلی سے کنارہ کش ہو گیا۔ بہرحال لاہور کی راتوں کی خیر، رتجگے جاری رہے۔ ان میں فرق اس وقت پڑا جب اچانک چپکے چپکے جاری رہنے والی محبت کا گل کھلا اور ناصر کی شادی ہو گئی۔

ناصر اور شادی...... یاروں نے سنا اور حیران ہوئے۔ پہلے حیران ہوئے، پھر کچھ پریشان اور افسردہ جیسے انہوں نے اس شاعر کا جو ایک رومانی سا تصور باندھ رکھا تھا، اسے دھچکا لگا ہو۔ ایسے شاعر جو ایک رومانی شخصیت کے روپ میں نمودار ہوتے ہیں، ان کے ساتھ وقت یہی ہوتی ہے کہ ان کی شخصیت ایک خاص تصور کی اسیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ بس جیسے وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز اپنی شاعرانہ کیفیت میں گم ہیں اور اس عالم میں گم وہ کتنے خوبصورت نظر آتے ہیں۔ ناصر بھی ان دنوں کتنا خوبصورت نظر آتا تھا۔ نامرادانہ زیست کرتا تھا۔ پراگندہ خاطر، پراگندہ طبع، چڑیوں، پھولوں، درختوں اور چاند کی باتیں کرتا تھا۔ اداسی کا گیت گاتا تھا۔ ایک ہی دھن، ایک ہی سودا۔ شعر کہنا اور اداس رہنا۔ ہاں رومانی شاعر عشق پیشہ بھی تو ہوتا ہے مگر اکثر یہ عشق یکطرفہ ہوتا ہے۔ اگر دوطرفہ ہو بھی تو آخر محبوبہ کے ماں باپ بھی تو ہوتے ہیں۔ وہ بیٹی کا ہاتھ کسی کو پکڑانے

سے پہلے یہ بھی تو دیکھتے ہیں کہ شاعری برحق مگر لڑکا کچھ کھاتا کماتا بھی ہے۔ سوراوی عشق میں ناکامی لکھتا ہے مگر اس سے تو رومانی شاعری کی رومانیت کو اور چار چاند لگ جاتے ہیں۔ مگر ناصر کاظمی کی تو شادی ہوگئی۔ شاعر کا سارا رومانی تصور خاک میں مل گیا۔ مداحوں پر اوس پڑ گئی۔ حریفوں کی بن آئی۔

شاعر کے مداح بھی بہت تھے اور حریفانِ حسد پیشہ بھی بہت تھے۔ اسی ٹی ہاؤس کی چھوٹی سی دنیا میں حلقہ کے مختلف نامور شاعروں سے لے کر سائیکل سٹینڈ پر کھڑے بیدل جالندھری تک سب ہی کی نظروں میں ناصر کی مقبولیت کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ بیدل جالندھری کا ذکر شاید میں نے کہیں پیچھے کیا ہے یا نہیں۔ بہر حال پھر ذکر کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ قندِ مکرر سہی۔ بیدل جالندھری ایک مخنی نوجوان۔ ٹی ہاؤس کے سائیکل سٹینڈ پر تعینات تھا۔ جب تک میں نے سائیکل چلائی، اس پر تکیہ کیا۔ رات کو ٹی ہاؤس سے آگے کا سفر درپیش ہوتا تو سائیکل اس کے حوالے کی اور پیدل چل پڑے۔ مگر بیدل شاعر بھی تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ ناصر کی غزل سے بڑھ کر غزل کہتا ہے۔ مجھ سے اسے ایک ہی شکایت تھی کہ ناصر کا ذکر کالم میں کرتے ہو۔ میری غزل کیا ان سے گھٹی ہوتی ہے۔ اس کا حوالہ کیوں نہیں دیتے۔ میں نے اس کی اس رائے سے بھی اختلاف نہیں کیا۔

مگر ناصر کے جو ہمدرد تھے، انہیں فکر ہوئی کہ اب شاعر کے روزگار کا کوئی بندوبست ہونا چاہیے۔ ان میں سب سے بڑھ کر حفیظ ہوشیار پوری تھے جن کی کوششیں بارآور ہوئیں اور ناصر جلد ہی ماہنامہ ''ہمایوں'' کا ایڈیٹر بن گیا اور ایک تھے ناصر کے مداح عبدالعلیم۔ ان کی کوشش سے ناصر کو ایک مکان الاٹ ہوا اور ناصر پرانی انارکلی کے اس چھوٹے سے کمرے سے نکل کر جہاں وہ رات کو کہیں پچھلے پہر جا کر بسیرا کرتا تھا، اب کرشن نگر کے ایک کشادہ مکان میں آن بسا۔

زمانہ یوں بھی کچھ بدلا بدلا نظر آ رہا تھا۔ وہ در و بام جہاں ؎

رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے

گر کر ملبہ کا ڈھیر بن چکے تھے۔ میٹرو ہوٹل نابود ہو گیا۔ اب وہاں واپڈا کی عمارت کھڑی ہونے لگی تھی۔ اینجلا کہاں گئی، اینجلا کے دیوانے کدھر نکل گئے اللہ ہی جانے۔ مگر میں نے ادھر سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ وہ صندلی بلی کہیں نہیں گئی۔ وہ اب ملبہ کے ڈھیر پر منڈلاتی پھر رہی تھی اور کتنی اداس نظر آ رہی تھی۔

مگر خیر اب مال روڈ پر ایک نیا ریستوراں لارڈز کے نام سے کھل گیا تھا جو ہماری اب کی شبانہ ضروریات کے عین مطابق تھا کیونکہ اب ان رتجگوں کا دور تو گزر چکا جب چڑیوں کی صبح کی چہکار کے ساتھ ناصر کی آنکھ میں نیند اترنی شروع ہوتی تھی اور ہم اپنے اپنے گھر کا رخ کرتے تھے۔ شادی خانہ آبادی کے بعد ناصر کے دن اور رات دونوں کا شیڈول تھوڑا بدل گیا تھا۔ دن میں ''ہمایوں'' کے دفتر میں حاضری دینی بھی ضروری تھی اور رات کو رات ہی کے بیچ واپس گھر جانا بھی لازم آتا تھا۔ لارڈز کم و بیش بارہ بجے تک کھلا رہتا

تھا۔ اس کے بند ہونے کے ساتھ ہماری بھی گھروں کو واپسی شروع ہو جاتی تھی اور اب لازم نہیں تھا کہ پیدل چل کر ہی گھر پہنچیں۔ ایک تانگہ والے سے ہماری اتنی یاد اللہ ہو گئی تھی کہ ہم چاہتے بھی تو اپنی پیادہ پائی کو طول نہیں دے سکتے تھے۔ وہ باقاعدگی سے ہمارا تعاقب کرتا اور پھر ہم پر لازم آتا کہ اسے زیادہ پریشان نہ کریں۔ یہ لیئق تانگہ والا تھا۔ میں اس کا ذکر اب سے پہلے کر چکا ہوں۔ میرے قارئین کے لیے بہرحال وہ اجنبی نہیں ہے۔ یہ لیئق کی مہربانی تھی کہ میں ناصر کو کرشن نگر اس کے گھر تک پہنچا کر ڈیڑھ دو بجے تک اپنے گھر اشتم پشتم پہنچ ہی جاتا تھا مگر اس وقت تک تو ہماری منڈلی کا نقشہ بھی اچھا خاصا بدل گیا تھا۔ کچھ دوست رخصت ہو گئے تھے۔ کچھ نئے دوست آن شامل ہوئے تھے۔

مگر اس بیچ بھی تو کچھ واقعات گذرے تھے۔ ناصر نے ڈیڑھ دو سال ''ہمایوں'' کے ساتھ گذارے مگر پھر میاں بشیر احمد کو اچانک احساس ہوا کہ پرچہ تو خسارے میں جا رہا ہے۔ اتنے خسارے کے تو وہ متحمل نہیں ہو سکتے۔ سو ''ہمایوں'' بند ہو گیا اور ناصر وہاں سے فارغ۔

اب ناصر کے دماغ میں عجب سمائی۔ یہ کہ ''ہمایوں'' بند ہو گیا تو کیا ہوا۔ میں اب خود ایک ادبی رسالہ نکالوں گا۔ میں نے اپنی طرف سے بہت سمجھایا کہ رسالہ یوں تھوڑا ہی نکلتا ہے۔ اس کے لیے سرمایہ چاہیے اور اگر تم نے اس کے لیے کوئی سرمائے والا دریافت کر بھی لیا تو وہ تو منافع مانگے گا اور ادبی رسالہ سے تمہیں کوئی منافع ہو گا تو اس سے منہ دھو رکھو۔ مگر ناصر کے دماغ میں جو بات سما گئی تھی، وہ نکلی نہیں اور جس دوست کے مشوروں پر وہ بہت اعتبار کرتا تھا، اس دوست نے بھی اس کے خیال کی تائید کی۔ یہ شیخ صلاح الدین تھے۔ تب ناصر نے قطعی انداز میں اعلان کیا کہ میں کوئی نیا پرچہ نہیں نکال رہا ہوں۔ یہ ''خیال'' کی تجدید ہو گی۔ تم اور میں مل کر اس کی ادارت کریں گے۔ ''اور مینجنگ ایڈیٹر؟'' میں نے سوال کیا۔ کہا کہ ''وہ میں ہوں گا۔ آخر ''ہمایوں'' کا تجربہ کس روز کام آئے گا۔'' خیر میرا شک زائل تو نہیں ہوا مگر ناصر کی تقریر ین کر ماند ضرور پڑ گیا۔ ہے تو یہ گھاٹے ہی کا سودا، میں نے سوچا، مگر ناصر یہ سودا کرنے پر تل ہی گیا ہے تو مان لو۔ کیا خبر ہے اس میں سے کوئی بہبود کا پہلو نکل آئے۔

سو ''خیال'' کے سن ستاون کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ جب ہم نے پہلے ''خیال'' نکالا تھا تو مجھ سے بڑھ کر مظفر جوش میں تھا بلکہ اس کے جوش ہی کو دیکھ کر مجھے اس منصوبے میں معنی نظر آنے لگے تھے۔ اب مظفر ملازمت کے چکر میں آ کر لاہور سے دور چلا گیا تھا مگر اب ہمارے نئے دوستوں میں سے ایک ایسا ہی تنگ نکل آیا۔ یہ سعید محمود تھا جو قیوم نظر کی انگلی پکڑ کر گورنمنٹ کالج سے چل کر ٹی ہاؤس میں آ نکلا تھا مگر وہ استاد سے بچھڑ کر ہماری منڈلی میں آن شامل ہوا تھا۔ سن ستاون نمبر کے منصوبے نے اس کے ذوق تحقیق کے لیے چٹی کا کام کیا۔ ایلیٹ پاؤنڈ کی شاعری کو طاق میں رکھ کر وہ اس موضوع پر مواد کی تلاش میں تاریخ کی وادی میں سرگرداں ہو گیا۔ میری مار پنجاب پبلک لائبریری تک تھی۔ اس نے شہر کی ساری لائبریریوں کو چھان ڈالا۔

ہاں جب ہم اپنے شاعر دوستوں کو اس واقعہ پر شعر کہنے پر سراکسار بے تھے تو میں نے ناصر سے کہا ''خیر نظمیں تو اس موضوع پر مہیا ہو جائیں گی اور ہو رہی ہیں مگر افسانہ کون لکھے گا؟''

اس نے برجستہ کہا ''وہ تم لکھو گے۔''

میں چکنم میں پڑ گیا۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ دیئے ہوئے موضوع پر افسانہ لکھنا، اس کا تو میں یوں بھی قائل نہیں تھا اور موضوع بھی چھوٹا موٹا نہیں، اپنی جگہ پر پوری تاریخ جو بہر حال اندر ہی اندر مجھے اکسا تو رہی تھی۔ ویسے اصل بات یہی ہے کہ مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی۔ ناصر کے سوا کسی اور نے کہا ہوتا تو بھلا میں اس راہ پہ آنے والا تھا۔ سوچتے سوچتے ذہن داستان کی طرف چل پڑا۔ ہاں اس زمانے کا جسے بیان کرنا مقصود تھا، اسلوب بیان داستان والا ہی تھا مگر داستانی تخیل تو تاریخ سے ماورا کسی اور ہی اقلیم میں پرواز کرتا تھا۔ ارے تو کیا داستان کو تخیلاتی اقلیم سے اتار کر تاریخ کی دنیا میں نہیں لایا جا سکتا۔ میرا من کو تخیلاتی اقلیم مبارک مگر میرا افسانوی تخیل تو اس وقت تاریخ سے شہہ پا رہا ہے۔ لیجیے قلم چل پڑا اور وہ داستان یا جو بھی اسے کہو، لکھی گئی جو ''جل گر جے'' کے عنوان سے سن ستاون نمبر کا حصہ بنی۔

خیر اس کا مجھے ایک فائدہ تو ہوا۔ وہ جو میں اتنے دنوں سے غل مچا رہا تھا کہ ہمارے نئے فکشن نے روایت سے رشتہ توڑ کر آغاز کیا ہے۔ یہ اس کی بڑی کوتاہی ہے۔ اب مجھے یہ تحریر لکھتے ہوئے اچانک احساس ہوا کہ میں روایت سے رشتہ جوڑنے کی راہ پہ چل نکلا ہوں۔ جیسے جس راہ کی تلاش میں تھا وہ راہ اب مل گئی ہے یا ملنے کی امید پیدا ہو گئی ہے۔

تو خیر ''خیال'' کا سن ستاون نمبر تو نکل آیا اور یاروں اور بزرگوں سے اس پر داد بھی مل گئی مگر ہوا وہی جس کا اندیشہ تھا۔ ناصر کی مینجنگ ایڈیٹری نے کچھ ہنر تو دکھایا۔ پھر بس ہو گئی۔ ''خیال'' سن ستاون نمبر سے شروع ہوا۔ سن ستاون نمبر پر ہی تمام ہو گیا۔ اگلا پرچہ نکلنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ سارے ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے مگر ناصر کا جو اپنا رسالہ نکالنے کا ارمان تھا، وہ پورا ہو گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ ارمان اسے مالی اعتبار سے پہلے سے زیادہ زیر بار کر گیا۔

خیر مضیٰ ما مضیٰ۔ اب مجھے عسکری صاحب کا وہ بیان یاد آ رہا ہے جو اسی سن ستاون میں شائع ہونے والے ان کے مضمون میں درج ہے۔ ''1957ء میں دنیا کے مسلمانوں کو جو سنگین مسائل درپیش ہیں۔ ان کے سامنے 1857ء کیا مال ہے۔ 1957ء میں ہماری آزمائش 1857ء سے بھی کڑی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم 1957ء کے ''غدر'' سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں۔''

خیر ان دنوں تو میرے دل و دماغ میں سن ستاون بسا ہوا تھا۔ اردگرد سے بے خبر سن ستاون کا وظیفہ پڑھے جا رہا تھا۔ تانتیا توپی، رانی جھانسی، نواب حضرت محل، بخت خاں، بس یہی ہستیاں دل و دماغ میں سما گئی تھیں اور کون کیا بیچتا ہے، اس سے غرض نہیں تھی۔ سو عسکری صاحب کا مضمون میں نے پڑھا اور اس سے سرسری

گزر گیا مگر جب 1957ء کے ختم ہوتے ہوتے سن ستاون کے بادل چھنٹے تو اردگرد پر نظر گئی۔ زمانہ کچھ بدلا بدلا نظر آیا۔ دنیائے عرب میں ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ فوجی انقلاب آج اس ملک میں کل اس ملک میں اور ہر ایک کو سوویت روس کی آشیرواد ملی ہوئی۔ امریکہ کا راگ گانے والے عرب ملکوں کے لیے لمحۂ فکریہ۔ عربوں میں آئی ہوئی اضطراب کی لہر گویا مجسم ہو کر جمال عبدالناصر بن گئی تھی۔ تو گیا عربوں کو اپنا نجات دہندہ مل گیا تھا۔ اور ہاں الجزائر۔ وہاں جدوجہد آزادی کی لے اور تیز ہو گئی تھی۔ اسی حساب سے جبر بھی بڑھ گیا تھا اور اذیتیں دینے کا عمل بھی شہرت پکڑ گیا تھا۔ اس کے خلاف ردعمل بھی اسی شدت سے ہوا اور خود فرانس کے ادیبوں، دانشوروں کے حلقہ میں۔ اس باب میں سب سے بلند آواز سارتر کی تھی جس کی گونج ٹی ہاؤس تک میں سنی گئی۔

اصل میں ٹی ہاؤس سے بھی تو ان دنوں نئے اردو ادب کے درجۂ حرارت کا پتہ چلتا تھا۔ عسکری صاحب کی "جھلکیاں" پڑھ لو۔ پھر ٹی ہاؤس میں آ کر فضا کو سونگھ لو۔ پتہ چل جاتا کہ ہوا کس رخ چل رہی ہے۔ تو یہاں ایلیٹ پاؤنڈ جوائس لارنس نئے پرانے ہو چکے تھے، اب یہاں سارتر کا میو کا سکہ چل رہا تھا۔ مگر الجزائر کے مسئلہ پر آ کر کامیو اپنی اگر مگر کے ساتھ پیچھے رہ گئے۔ سارتر نے بغیر کسی اگر مگر کے الجزائر کے مزاحمت کاروں اور دکھ اٹھانے والوں کی اس طرح دوٹوک حمایت کی کہ ہماری دنیائے ادب میں بھی ان کی بہت واہ واہ ہوئی اور عسکری صاحب سارتر کے اب پہلے سے بڑھ کر قائل ہو گئے۔

سارتر کے ناول، ڈرامے واہ واہ سبحان۔ ان کا فلسفۂ وجودیت وہ بھی سر آنکھوں پر مگر انہوں نے اپنے ادب کے نظریے کو جو ایک اچھی سی عام فہم اصطلاح کومٹ منٹ (Commitment) میں ڈھال لیا، اسے پر لگ گئے اور اس اصطلاح کے زور پر انہوں نے ادیب کے کاندھوں پر کتنی بھاری ذمہ داری ڈال دی۔ کہا کہ افریقہ میں اگر کسی حبشی کے ساتھ کچھ گزر رہی ہے تو پیرس میں بیٹھے ادیب پر لازم ہے کہ اس درد کو اپنائے اور بولے۔ ارے ارے یہ تو وہی مضمون ہے جو اب سے پہلے امیر مینائی نے اپنے ایک شعر میں باندھا تھا ؎

کانٹا لگے کسی کو تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

شعر تو خوب کہا مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ بات یہ ہے کہ امیر مینائی تو خالی خولی شاعر تھے۔ شعر کہا نبٹ گئے۔ سارتر نے اسی بات کو ایک نظریہ بنا دیا اور سارتر کی بات ہی اور تھی۔ ان کے ہونٹوں سے نکلی کوٹھوں چڑھی۔ اس بہانے الجزائر کے ستم زدوں کی بھی سنی گئی۔

ادھر میں نے دیکھا کہ عسکری صاحب گرمیوں کی چھٹیوں میں لاہور آئے تو ان کے پھیرے "لیل و نہار" کے دفتر میں بہت ہونے لگے اور سبط حسن سے ان کی گاڑھی چھننے لگی۔ "لیل و نہار" کے صفحوں پر ان کا قلم رواں نظر آنے لگا۔ بس "لیل و نہار" کے دفتر ہی میں کوئی ہنڈیا پکی تھی کہ اس کے بعد جلد ہی فیض صاحب کے اپنے "پاکستان ٹائمز" والے کمرے میں ایک مختصری میٹنگ ہوئی۔ تجویز زیر بحث یہ تھی کہ ادیبوں کی طرف سے

یوم الجزائر منایا جائے اور ایک جلسہ کیا جائے۔ اس کے لیے ایک انتظامی کمیٹی بنی۔ صدر فیض صاحب! جانے کس کی انگلی میری طرف اٹھی۔ سوسیکرٹری کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔ کمیٹی کے ممبران میں عسکری صاحب، اعجاز بٹالوی، حمید اختر اور کون تھا، یاد نہیں آ رہا۔

مگر یہ بھی خوب ہوا جس نے میری شمولیت کی خبر سنی اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور طنز بھرے لہجے میں کہا "اچھا تو تم بھی کمیونسٹ ہو گئے۔"

حالانکہ اس جلسہ میں کمیونسٹ کہو سوشلسٹ کہو، ترقی پسند کہو، وہ آٹے میں نمک کی نسبت سے بھی کم تھے۔ پریذیڈیم میں میاں بشیر احمد، سید امتیاز علی تاج، مولانا غلام رسول مہر۔ مقالہ نگاروں میں مولانا صلاح الدین احمد، محمد حسن عسکری باقی یاد نہیں۔ پچھلے ترقی پسندوں میں سے کون تھا، حمید اختر اور ہاں احمد ندیم قاسمی۔ انہیں بھلا کیسے بلاوا گیا۔ میں نے فیض صاحب سے گزارش کی کہ آپ اگر خود فون پر ان سے بات کر لیں تو مناسب ہو مگر وہ طرح دے گئے۔ میں نے سبط صاحب سے کہا کہ آپ کے قریب ہی تو ان کا کمرہ ہے، آپ کی طرف سے دعوت دی جائے تو مناسب ہو مگر سبط صاحب بھی کنی کاٹ گئے۔ "نہیں، آپ سیکرٹری ہیں۔ آپ ہی جا کر گذارش کریں۔"

خیر مجھے تو پھر یہ فرض ادا کرنا ہی تھا اور قاسمی صاحب نے تھوڑا تامل کیا مگر رضامند ہو گئے۔ مگر اس سے مجھے یہ پتہ چل گیا کہ اب ان کے بیچ جو پچھلے دنوں میں ہمسفر ہوا کرتے تھے، وہ پہلی سی یاری غمگساری نہیں رہی۔

اس زمانے میں الجزائر کے مجاہدین ہوں، انقلاب مصر ہو، مختصر یہ کہ خواب گراں سے بیدار ہوتے عربوں سے اظہار ہمدردی کا مطلب لیا جاتا تھا کہ آپ نے سوویت روس کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور کیمونسٹ ہو گئے۔ ویسے یہ بھی صحیح ہے کہ ان دنوں عسکری صاحب جیسا شخص بھی اب سوویت روس کے مداحوں میں شامل تھا۔ ارے ایک سوویت روس ہی تو تھا جو مغربی سامراج سے چھٹکارے کی کوششوں میں عربوں کی پشت پناہی کر رہا تھا تو عسکری صاحب بھی اپنی جگہ سچے تھے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ان دنوں ٹی ہاؤس میں باہر سارتر کا بہت چرچا تھا اور کتنے دانشور تو سارتر سے سند لے کر ہی الجزائر کی جدوجہد کے قائل ہوئے تھے اور آخر حلقۂ ارباب ذوق اس اثر سے کب تک بچا رہتا۔ وہاں بھی یاروں نے دیکھا کہ ہیئت کی بحث موقوف۔ الجزائر کے مسئلہ پر بحث ہو رہی ہے اور اس حوالے سے ادیب کی کمٹ منٹ کا سوال اٹھا ہوا ہے۔ ویسے حلقہ کا سیکرٹری ان دنوں میں تھا۔

حلقہ بھی تو اب وہ نہیں رہا تھا۔ قیوم صاحب ہی اب وہاں نہیں تھے۔ ارے انہوں نے تو مجھے، ناصر کو، مظفر علی سید کو، تینوں کو حلقہ کے گستاخ فرزند کہہ کر حلقہ بدر کر دیا تھا۔ جب ان کے خلاف بغاوت ہوئی اور انہیں حلقہ کو خیر باد کہنا پڑا تو دوستوں نے کہا کہ بہت ہو گئی، اب واپس آ جاؤ۔ تو میں اور ناصر پھر حلقہ میں آ گئے

تھے۔ مظفر پھر بھی نہیں آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں پہلے بھی حلقہ میں کہاں تھا۔ سوتم روٹھے ہم چھوٹے۔

مگر میں اور ناصر پھر سے حلقہ میں آ گئے تھے بلکہ میں نے تو اب حلقہ کے سیکرٹری کی جگہ سنبھال لی تھی۔ میں نے چھوٹتے ہی وہاں پہلا کام یہ کیا کہ الجزائر کے حوالے سے ایک بحث کرا ڈالی۔ بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ حلقہ میں ایسی بحثوں کا سلسلہ چل نکلا۔ جہاں ادب اور سیاست گلے ملتے نظر آتے تھے۔ مجھے اس وقت یہ گمان کب تھا کہ حلقہ میں جو یہ بدعت شروع ہوئی ہے آخر یہ رنگ لائے گی کہ شعلہ نفس انقلابی نوجوانوں کی ایک ٹکڑی یہاں اکر کوس لمن الملکی اس دھوم سے بجائے گی کہ حلقہ میں بس پھر وہی وہ ہوں گے اور ان سے اشارہ لے کر ادب میں انقلاب کا راگ الاپنے والے۔ باقی لکھنے والے حلقہ کو سلام کر کے ادبی حلقہ کی بنیاد ڈالیں گے۔

ہاں الجزائر کے حوالے سے ایک کتاب دھیان میں آئی۔ اس کا ذکر بھی لازم آتا ہے۔ ایک کتاب فرانس سے چلی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر بہتی بہتی لاہور پہنچی۔ الجزائر کی جدوجہد سے شغف رکھنے والوں کے لیے وہ کتاب اس جدوجہد کی ایک قیمتی دستاویز بن گئی۔ کتاب کا نام تھا "The Question" اس کا دیباچہ لکھا تھا سارتر نے۔ اب کتاب کی تفصیلات تو یاد نہیں۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ گرفتار شدوں سے جو سلوک ہوتا تھا اور راز اگلوانے کے لیے جو اذیتیں دی جاتی تھیں ان کا ذاتی تجربہ کے حوالے سے ایک مفصل بیان تھا۔ اس بیان کا ترجمہ اردو میں ظفر صمدانی نے کیا۔ سارتر کے دیباچہ کا ترجمہ میں نے کیا۔ سعید محمود کے والد کے اشاعتی ادارے سے وہ کتاب "الجزائر کا سوال" کے عنوان سے شائع ہوئی۔

❀........❀........❀

برے بھلے مرے دن گزر رہے ہیں

لو یہ تو میں ذکر کرنا بھول ہی چلا تھا کہ کرشن نگر سے اب میرا ڈیرا اٹھ چکا تھا۔ یہ ذکر مجھے اس حساب سے بامعنی نظر آتا ہے کہ اب تک تو میں پناہ گیروں کی خلقت کے بیچ سانس لے رہا تھا۔ یہاں سے جب ڈیرا اٹھا تو ایک بالکل مختلف قسم کی فضا میں مجھے سانس لینا میسر آیا۔ مگر میں نے یہاں سے نکلنے کے معاملہ میں اپنی طرف سے کوئی عجلت نہیں دکھائی تھی بلکہ میں تو رفتہ رفتہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ میں عسکری صاحب کے ساتھ ایک مہمان کی حیثیت سے رہ رہا ہوں۔ ان کے تین بھائی حسن مثنیٰ، حسن ثالث، حسن رابع۔ وہ مجھ سے اتنے مانوس ہو گئے تھے اور میں ان کے ساتھ اتنا گھل مل گیا تھا کہ لگتا تھا کہ میں اسی خاندان کا فرد ہوں۔ اچھا لیجیے لگے ہاتھوں یہ جو چار بھائیوں کے نام ہیں ان سے جو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اسے بھی نبٹا تا چلوں۔ میں نے باتوں باتوں میں ایک دفعہ عسکری صاحب سے کہا کہ ''آپ کا نام تو غلط فہمی پیدا کرتا ہی ہے۔ یہ آپ کے بھائیوں کے نام بھی کچھ اس رنگ کے ہیں کہ لگتا ہے کہ یہ کوئی شیعہ خاندان ہے۔''

ہنسے۔ بولے کہ ''اس چکر میں دلی کے شیعوں کی ایک انجمن نے میرے لیے ایک استقبالیہ کا اہتمام کر ڈالا تھا۔ وہاں تقریروں میں اس پر بہت مسرت کا اظہار کیا گیا کہ ہمارے ایک شیعہ نوجوان نے ماشاءاللہ ادب میں بہت نام پیدا کیا ہے۔ ہمیں اس پر فخر کرنا چاہیے۔''

''آپ نے اس سلسلہ میں کوئی وضاحت نہیں کی؟''

''نہیں۔ وضاحت کی ضرورت بھی کیا تھی۔''

''اچھا خیر۔'' میں نے کہا۔ ''آخر یہ نام آپ بھائیوں کے کس خوشی میں رکھے گئے؟''

کہنے لگے ''بات یہ ہے کہ ہمارے والد کی ملازمت شکار پور میں تھی۔ ہمارا بچپن لڑکپن شکار پور میں ہی گذرا ہے اور شکار پور تمہیں پتہ ہی ہوگا کہ سیدوں کی بستی تھی۔''

''خوب پتہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''شکار پور کی ساری شہرت دو حوالوں سے تھی۔ شکار پور کے سید اور شکار پور کے بے وقوف۔''

''مگر ہمارا ان میں سے کسی مخلوق سے بھی تعلق نہیں تھا۔ ہمارا تو سرا وے سے تعلق تھا۔''

''اچھا سراوہ۔ وہ تو میرٹھ ضلع میں ہے اور وہاں کے ایک پیر صاحب بہت مشہور تھے۔''

''ہاں ہاں وہی سراوہ۔ مگر ہم زیادہ تر شکار پور ہی میں رہے۔ ہمارے والد کا سید خاندانوں سے میل ملاپ تھا۔ اسی چکر میں ہم مجلسوں میں بھی بہت آتے جاتے تھے۔ اس حد تک کہ نوحہ و ماتم میں بھی شامل ہو جاتے تھے۔ بس اس فضا کا اثر تھا کہ والد صاحب نے بیٹوں کے ایسے نام رکھے۔''

میں نے کہا کہ ''پھر آپ شکار پور سے آ کیوں گئے۔ اگر وہاں رہتے ہوتے تو اب تک آپ کا خاندان مومنین میں شمار کر لیا جاتا۔ بس بال برابر کی کسر رہ گئی۔''

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں تو ان بھائیوں کے ساتھ اچھا بھلا گھل مل گیا تھا۔ اور ہاں اس دوران میں عسکری صاحب کے ایک اور دوست آئے اور اسی گھر میں مہمان رہے۔ اب سوچتا ہوں تو حیرانی ہوتی ہے کہ ویسے تو وہ کوئی بڑا گھر نہیں تھا مگر مہمان وہاں اترتے جا رہے تھے اور وہ گھر کس کشادہ دلی سے انہیں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ یہ ابرار صدیقی تھے جو ''امروز'' میں نیوز ایڈیٹر بنے اور پھر کراچی سے ''امروز'' کے نکلنے کے ساتھ کراچی چلے گئے۔

میرا دانہ پانی اس گھر سے اس تقریب سے اٹھا کہ تھوڑے مہینوں کے بعد میرے دو بھانجے انصار حسین اور حسن ظہیر نقل مکانی کر کے لاہور میں آن وارد ہوئے۔ یہاں آتے ہی انہوں نے اپنی رہائش کا بندوبست اس طور کیا کہ فیروز پور روڈ پر نہر کے کنارے ایک کوٹھی کا ایک گوشہ کرائے پر لیا اور مجھے نوٹس دے دیا کہ ''ماموں اب تمہیں ہمارے ساتھ رہنا ہے۔'' اور ایک دوپہر کو وہ بچ بچ تانگہ لے کر آئے اور کہا کہ چلو ہمارے ساتھ۔ میں نے عسکری صاحب سے رخصت لی۔ ثالث اور رابع کو آبدیدہ دیکھا اور اپنا بستر اور بکس سنبھال تانگہ میں جا بیٹھا۔ تو لیجیے میں ایک عدد بستر اور ایک عدد بکس سے لدا پھندا اس کوچہ سے جہاں پناہ گیروں کی خلقت امنڈی ہوئی تھی، نکلا اور فیروز پور روڈ پر نہر کنارے کے کوچہ کی طرف جہاں پرندوں کی آوازیں زیادہ اور لوگوں کی آوازیں کم سنائی دیتی تھیں، روانہ ہوا۔

اگلے دن صبح ہی صبح میری آنکھ کھلی تو بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ سوچا کہ ذرا باہر نکل کر دیکھا جائے کہ یہ کس رنگ کا کوچہ ہے۔ زمین و آسمان کا یہاں کیا رنگ ہے۔ لوگوں کا کیا ڈھنگ ہے۔ گیٹ سے نکل کر جو نظر دوڑائی تو عین مقابل کی کوٹھی کے گیٹ پر ایک زیبا صورت نظر آئی۔ حیران ہوا کہ یہ تو کوئی سورن لتا کی ہمشکل ہے۔ آنکھیں مل کر دیکھا تو شبہ کو اور تقویت ملی۔ ارے یہ تو بنی بنائی سورن لتا ہے اور خدا کی قدرت پر حیران کہ اس نے دو شکلیں ایک ہی سانچہ میں ڈھال کر نکالی ہیں۔ ایک بمبئی میں طلوع ہوئی، دوسری کو کوسوں دور لاہور میں لا پھینکا۔ اتنی دیر میں گیٹ کے اندر سے دوسری شکل نمودار ہوئی۔ دوہرا بدن، لمبا قد، سانولی رنگت، کوئی مضائقہ نہیں کہ کالی شکل کہہ لو۔ ارے یہ تو نذیر اداکار ہے۔ تب سمجھ میں آیا کہ یہ جوڑی بمبئی کو سلام کر کے پاکستان میں آن براجی ہے۔ اندر جا کر میں نے اپنے عزیز بھانجوں کو یہ خبر فرحت اثر سنائی کہ قدرت نے

پاکستان میں انہیں سورن لتا کی ہمسائیگی بخشی ہے۔

رفتہ رفتہ کھلا کہ اس کوچہ میں ایسی کتنی ہی زیبا صورتیں اور بھی آباد ہیں۔ یہ تو میر نے دلی کے بارے میں کہا تھا کہ۔

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

لاہور کے اس کوچہ کو بھی انہیں کوچوں کے تسلسل میں دیکھو۔ قریب ہی پنچولی سٹوڈیو تھا۔ اس تقریب سے فلمی برادری نے علی العموم یہاں ڈیرے ڈالے تھے۔ سڑک پار کر کے چار قدم نہر کی طرف چلا تو بائیں ہاتھ پر ایک چھوٹا سا چائے خانہ نظر آیا۔ پیشانی پر جلی حرفوں میں لکھا تھا ''کیفے ڈی پھونس'' میں حیران ہو کر یہ نام پڑھ رہا تھا کہ ایک صاحب آگے بڑھے۔ بولے ''انتظار صاحب، کیا دیکھ رہے ہیں۔ آیئے ہمارے ساتھ ایک پیالی چائے کی پیجیے۔'' ''چائے بعد میں...... '' پہلے میں نے ایک وضاحت چاہی ''کیفے ڈی پھونس تو علی گڑھ میں تھا۔ کیا وہ بھی ہجرت کر کے پاکستان آ گیا ہے؟''

بولے ''یہ ہمارا کیفے ڈی پھونس ہے۔ اس میں بھی بڑا بڑا آدمی آ کر گرتا ہے۔ منٹو صاحب بھی ادھر سے گذرتے ہوئے یہاں ضرور پڑاؤ کرتے ہیں۔''

''منٹو صاحب کا یہ رستہ کیسے ہو گیا؟'' میں نے پوچھا اور انہوں نے بتایا کہ ''وہ سامنے مسلم ٹاؤن میں پنچولی سٹوڈیو ہے۔ وہاں ان کا آنا جانا رہتا ہے۔ جاتے ہوئے یہاں دم لیتے ہیں۔ ہمارے ساتھ چائے پی کر اس طرف جاتے ہیں۔''

پتہ چلا کہ موصوف کیفے ڈی پھونس ہی کے برابر کے گوشے میں ڈاکٹری کرتے ہیں۔ ڈاکٹری تو خیر کرتے ہی ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کوچے کی ساری خیر خبر رکھتے ہیں۔ کون نقل مکانی کر گیا۔ کون آ کر نیا نیا بسا ہے۔ کون کس مزاج اور کس قماش کا ہے۔ یہ سب ان کو خبر رہتی ہے۔ آپ کو کوئی مشکل درپیش ہے تو وہ مدد کرنے کے لیے تیار۔ یہ انہیں کا تو کرم تھا کہ انصار اور منوں کے لاہور سے رخصت ہونے کے بعد میں نے اس پرانے گوشہ کو سلام کیا اور اس بڑی عمارت کے ایک بالائی گوشے میں جس کے زیریں گوشے میں کیفے ڈی پھونس تھا، اپنی والدہ، والد کے ساتھ ڈیرہ کیا۔

ہاں یہیں کہیں ایک حجام نے بھی تو اپنا چھوٹا سا سیلون قائم کر رکھا تھا۔ میری جلد ہی اس سے بھی یاد اللہ ہو گئی۔ خوب شے تھا۔ حجاموں کی روایت چلی آتی تھی کہ سر پہ مشین چلا رہے ہیں اور باتیں کرتے جا رہے ہیں۔ مشین اور زبان دونوں تیز چلتی تھیں۔ اس روایت کو اس ہمارے دوست حجام نے بھی خوش اسلوبی سے نبھایا تھا۔ ایک روز صبح ہی صبح جو میں اس کے سیلون میں گیا تو اس نے ''آفاق'' کا پرچہ میرے سامنے رکھ دیا۔ آج کی اشاعت میں شاہد حمید کی لکھی ہوئی کوئی ادبی رپورٹ تھی جس میں میری تصویر چھپی تھی۔ حیرت سے بولا

''یہ تو آپ کی تصویر ہے نا۔'' میں نے کہا ''ہاں ہے تو میری ہی تصویر۔'' اس پر اس نے مزید حیرت کا اظہار کیا۔ ''آپ کی تصویر اخبار میں کیسے آ گئی؟'' میں نے کہا ''اتفاق کی بات ہے۔ بس آ گئی۔'' تھوڑے تامل کے بعد پوچھنے لگا ''پیسے کتنے لگے۔'' میں نے کہا ''کوئی پیسہ نہیں لگا۔ مفت میں چھپ گئی۔''

حیران ہو کر بولا ''یہ تو کمال ہو گیا۔'' پھر رک کر بولا کہ ''پھر تو میری بھی تصویر چھپ جائے گی۔ میں بھی بھیج دوں۔''

میں نے کہا ''ہاں ہاں ضرور بھیجو۔''

بات آئی گئی ہو گئی۔ خدا کی قدرت کہ تھوڑے دنوں بعد مجھے ''آفاق'' میں جگہ مل گئی۔ مگر میں نے اپنے ہیئر ڈریسر کو یہ بات نہیں بتائی۔

یہ ''آفاق'' کا دوسرا دور تھا۔ اس کے پہلے دور میں بھی میں نے اس اخبار میں اچھا خاصا وقت گزارا تھا۔ وہ بند ہوا تو سب یاروں کے ساتھ میں بھی فارغ ہو گیا۔ اب دوسری مرتبہ نکلا تو میں پھر یہاں آن موجود ہوا۔ اب کے یہ اخبار خاصی دھوم سے نکلا۔ دھوم سے نکلنا ہی تھا۔ اب وہ سہگل کا اخبار تھا۔ ایڈیٹر اس کے مولانا غلام رسول مہر تھے۔ منیجنگ ایڈیٹر میر نور احمد۔ میر صاحب ابھی پچھلے دنوں تک پنجاب کے محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر تھے اور حکومت پنجاب کے بہت اہم پرزے کی حیثیت رکھتے تھے مگر احمدیوں کے خلاف تحریک کے لپٹنے کے ساتھ دولتانہ صاحب کی حکومت لپٹ گئی تو ساتھ ہی میں میر صاحب کا بھی بستر لپٹ گیا۔ ادھر سے ریٹائر ہو کر اب وہ ''آفاق'' کے منیجنگ ڈائریکٹر تھے۔ لمبا قد، جثے کے اعتبار سے سینک سلائی۔ اسی حساب سے آواز دھیمی، بہت دھیمی۔ رک رک بولتے۔ سو فقرہ اس طرح ادا ہوتا جیسے بہت سوچ کر میر صاحب لب کشا ہوئے ہیں۔

ہفتے کے بیچ ''آفاق'' کا ایک خصوصی ایڈیشن نکلتا تھا۔ وہ میرے سپرد تھا۔ ایک روز صبح ہی صبح جب میں دفتر پہنچا تو میر صاحب نے مجھے بلایا اور اطلاع دی ''انتظار صاحب، آپ surplus ہو گئے۔''

میں کچھ سمجھا، کچھ نہ سمجھا۔ ہٹپٹا کر اس بزرگ کو دیکھا۔ تب انہوں نے آہستہ آہستہ وضاحت کی ''دیکھیے جس ایڈیشن کے آپ انچارج تھے، اسے تو اب ہم بند کر رہے ہیں۔ وہ نقصان میں جا رہا تھا۔ سو آپ اب Surplus ہو گئے۔''

ویسے تو مہر صاحب ایڈیٹر تھے۔ مجھے یہ اطلاع دینے کا ناخوشگوار فریضہ انہیں ادا کرنا چاہیے تھا مگر وہ عجب ایڈیٹر تھے۔ جب سے ایڈیٹر بنے تھے، سٹاف میں سے شاید ہی کسی نے ان کی صورت دیکھی ہو۔ پتہ نہیں صبح کے اوقات میں کس وقت آتے تھے اور اداریہ لکھ کر خفیہ خفیہ رخصت ہو جاتے تھے۔ صرف وہ چپڑاسی جو ان کے کمرے پر تعینات تھا، ان کے آنے جانے کی خبر رکھتا تھا۔ بس ان کی ایڈیٹری اسی حد تک تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میر صاحب منیجنگ ایڈیٹر بھی تھے اور وہی عملاً ایڈیٹر بھی تھے۔

"تو انتظار صاحب اب آپ کیا کریں گے۔ اگر آپ کو ہم ڈیسک پر لگائیں تو وہاں تو شاید آپ نہیں جائیں گے۔"

"جی ہاں، اس مرحلہ سے تو میں گزر لیا۔"

"پھر بتایئے، اس اخبار میں آپ اور کون سا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اچانک خیال آیا کہ ارے یہ جو اس اخبار میں ایک کالم مولانا عبدالمجید سالک "حوادث وافکار" کے عنوان سے لکھا کرتے تھے، وہ تو اب انہوں نے لکھنا بند کر دیا ہے۔ شوکت تھانوی نے تھوڑے دنوں لکھا مگر جانے کیوں، ان سے اخبار کا معاملہ زیادہ چل نہیں پایا۔ اب اخبار کسی نئے کالم نگار کی تلاش میں ہے۔ میں نے جھٹ تجویز پیش کر دی" مناسب سمجھیں تو "حوادث وافکار" میرے سپرد کر دیں۔"

میر صاحب نے مجھے غور سے دیکھا" انتظار صاحب، آپ کو معلوم ہے کہ یہ کالم سالک صاحب لکھتے تھے۔"

میں چپ۔ مجھے چپ ہونا ہی تھا۔ میر صاحب گویا یہ کہہ رہے تھے کہ تم صحافت میں جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش۔ مولانا عبدالمجید سالک بننے کے خواب دیکھ رہے ہو۔

مگر یہ کہہ کر میر صاحب خود ہی سوچ میں پڑ گئے۔ تامل کیا، پھر بولے" اچھا یوں کرتے ہیں۔" رک گئے۔ پھر سوچ کر بولے" آپ کا فیصلہ مہر صاحب کریں گے۔ آپ تو کہیں ان کے قریب ہی رہتے ہیں۔" میں حیران کہ انہیں یہ کیسے خبر ہے کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ میں نے کہا" جی ہاں وہیں کہیں قریب ہی میں رہتا ہوں۔"

"تو پھر یوں کیجیے کہ آپ روز صبح کو اپنا کالم لکھ کر ان کے پاس پہنچ جایا کریں۔ وہ آپ کے بارے میں رائے دیں گے۔"

اصل میں مہر صاحب نے اب دفتر آنا بھی چھوڑ رکھا تھا۔ گھر ہی سے لکھ کر بھجوا دیتے تھے۔ میں نے بھی سوچا کہ چلو اس بہانے مہر صاحب سے نیاز تو حاصل ہوگا۔ میں نے تو ابھی اس مردِ محقق کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ سو کالم لکھ جیب میں ڈال گھر سے نکل ان کے دروازے کو جا کھٹکھٹایا۔ ملازم نے دروازہ کھولا۔ نام لکھ کر چٹ اس کے حوالے کی۔ ایک آواز اس شان سے گونج رہی تھی کہ دروازے تک سنائی دے رہی تھی۔ میں حیران کہ کیا یہ مہر صاحب ہیں جو اتنی بلند آواز سے کسی سے مخاطب ہیں۔ اندر گیا تو حیران ہوا کہ اچھا یہ تو مہر صاحب ہی تھے۔ وہ بآواز بلند بول رہے تھے اور ایک صاحب بزرگ صورت تیز تیز لکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے" عزیز بیٹھو۔ ابھی فارغ ہوتا ہوں۔" اور پھر اسی شان سے رواں ہو گئے۔

پھر سانس لینے کے لیے رکے۔ کالم الٹ پلٹ کر دیکھا۔ بولے" اچھا عزیز، میں نے یہ کالم رکھ لیا ہے۔ پڑھوں گا۔"

میں نے سلام کیا اور واپس ہو لیا۔ اگلی صبح کو گیا تو پھر وہی نقشہ کہ مہر صاحب بآواز بلند رواں ہیں اور

ادھر اس بزرگ کا قلم رواں ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ نشتر جالندھری ہیں جو مہر صاحب کے کاتب ہونے کا فرض انجام دے رہے ہیں۔

چار پانچ دن یہ عمل جاری رہا۔ غالباً چھٹے ساتویں دن انہوں نے کہا کہ "عزیز، اب تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے رپورٹ میر صاحب کو بھیج دی ہے۔"

میں دفتر پہنچا تو میر صاحب نے مجھے خوش خبری سنائی "انتظار صاحب، آپ پاس ہو گئے۔ مہر صاحب نے آپ کو پاس کر دیا۔ اب صورت یہ ہو گی کہ کالم آپ اول وقت میں لکھ کر میری میز پہ رکھ دیجیے اور بے فکر ہو جایئے۔"

سو میں روز صبح ہی صبح کالم لکھ کر چپڑاسی کے حوالے کرتا کہ میر صاحب کی میز پہ رکھ آؤ اور بے فکر ہو جاتا۔ کسی کسی دن بلاتے اور کسی فقرے پہ انگلی رکھ دیتے کہ "یہ جو فقرہ ہے، یہ تو زائد ہے۔ بات تو اس کے بغیر بھی پوری نظر آ رہی ہے۔ یا یہ کہ یہ جو آپ نے لکھا ہے، لہجہ کچھ زیادہ درشت ہو گیا۔"

اس بیان سے یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ ان دنوں کالم نگاری کو بہت ذمہ داری کا کام سمجھا جاتا تھا۔ یہ کہ کالم لکھنے والا اہل بھی ہو اور اس کے یہاں احساس ذمہ داری بھی ہونا چاہیے۔ یہ کہ بات کرنے کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ قلم بگٹٹ دوڑتا چلا جا رہا ہے۔ قصہ مختصر کالم نگار کو بے تحاشا بہار نہیں ہونا چاہیے۔

خیر اس طرح میری کالم نگاری کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے میں ایک ہفتہ وار ادبی کالم "محفلیں" کے عنوان سے انہیں "آفاق" کے صفحوں پر ضرور لکھتا رہا تھا۔ یہ کالم "خنداں" کے قلمی نام سے لکھا جاتا تھا مگر اس کے بارے میں ادارے کو کبھی تردد نہیں ہوا کہ اس کالم میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ اصل میں اس زمانے تک اردو اخباروں میں کالموں کی روایت اب کی روایت سے ذرا مختلف تھی۔ ہر اخبار میں اداریے والے صفحہ پر ایک کالم بھی ہوا کرتا تھا۔ سمجھ لیجیے کہ وہ اداریے ہی کی توسیع ہوتا تھا۔ اداریے میں تو حالات حاضرہ پر بہت سنجیدگی سے گفتگو ہوتی ہے۔ اس میں ظاہر ہونے والی رائے اخبار کی رائے سمجھی جاتی ہے۔ کالم میں حالات حاضرہ پر، سیاسی غیر سیاسی شخصیتوں پر ہلکے پھلکے انداز میں یا سمجھ لیجیے کہ طنز و مزاح کے رنگ میں تبصرہ آرائی ہوتی تھی۔ اداریے کی طرح یہ کالم بھی اخبار کا ترجمان ہوتا تھا۔ اس کی نمائندہ مثال مولانا چراغ حسن حسرت کا "حرف و حکایت" تھا جو سندباد جہازی کے قلمی نام سے لکھا جاتا تھا۔ "امروز" سے ان کی رخصتی کے بعد احمد ندیم قاسمی نے یہ کالم لکھنا شروع کیا اور لمبے عرصے تک لکھا۔ "آفاق" کے دوسرے دور میں مولانا عبدالمجید سالک نے "حوادث و افکار" کے عنوان کے تحت اس رنگ کا کالم لکھنا شروع کیا تھا۔ تقسیم کے پہلے سے حسرت و سالک کی کالم نگار کی حیثیت سے شہرت چلی آ رہی تھی۔ جب ہی تو یہ کالم مجھے سپرد کرتے ہوئے مجھے اتنا جانچا تولا گیا تھا۔ باقی "محفلیں" کے عنوان کے تحت جو "خنداں" کے قلمی نام سے میں لکھتا تھا، وہ تو بس سمجھ لو کہ "ادبی

پھلجھڑی'' تھی۔ سو میرے حصے میں جو داد بیداد آتی تھی وہ زیادہ تر اسی کالم کے حوالے سے آتی تھی۔ ایک شکایت عجب آئی اور وہ شکایت سیدھی مینجنگ ایڈیٹر سے کی گئی۔

میر صاحب نے مجھے طلب کر لیا۔ بڑے تامل کے بعد ہوں ہاں کرتے کرتے انہوں نے کہا ''انتظار صاحب، آپ نے لطیفی صاحب کو کیوں ناراض کر دیا ہے۔ وہ آپ سے سخت خفا ہیں۔'' یہ کہتے کہتے انہوں نے لطیفی صاحب کا بھیجا ہوا پوسٹ کارڈ میرے سامنے بڑھا دیا۔ لکھا تھا کہ ''یہ جو آپ کے دفتر میں ایک شخص انتظار حسین کام کرتا ہے، وہ اصل میں عبدالمجید سالک کا گماشتہ ہے۔ اس شخص کے پڑوس میں رہتا ہے۔ اس سے ہدایات لے کر میرے خلاف آپ کے اخبار میں الٹی سیدھی تحریریں لکھتا رہتا ہے۔ حال ہی میں اس نے میرے ساتھ بڑی واردات کی ہے۔ اس نے میرا دماغ چرا لیا ہے۔''

اس آخری بات پر مجھے مسکرانا ہی تھا۔ میر صاحب کے لبوں پر ہلکا سا تبسم آیا۔ بس اسی پہ بات ختم ہو گئی۔

یہ م۔ حسن لطیفی کا ذکر ہے۔ خوب آدمی تھے۔ آگے لدھیانہ میں بود و باش تھی۔ وہاں کے صاحب حیثیت لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ کوٹھی کا نام ''شاطو'' رکھا ہوا تھا۔ پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اپنے خرچ پر کتابیں چھاپتے رہتے تھے۔ لدھیانہ کے متعلق تحقیق کر رکھی تھی کہ ''پرانے عہد نامے'' میں جوارضِ لُد کا ذکر آیا ہے، وہ یہی لدھیانہ ہے مگر تقسیم کے وقت کی رستاخیز میں سب کچھ لٹ گیا۔ جب لاہور پہنچے تو انداز فقیرانہ تھا۔ دماغ بھی قدرے چل بچل ہو گیا تھا ۔

میر کا طور یاد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا

پتہ نہیں کیسے یہ بات ان کے دماغ میں بیٹھ گئی تھی کہ مولانا عبدالمجید سالک ان کے سخت دشمن ہیں۔ میرا قصور یہ تھا کہ میرا ٹھکانہ سالک صاحب کے قرب و جوار میں تھا یعنی مسلم ٹاؤن میں مہر صاحب کے متصل ان کی کوٹھی تھی۔ مسلم ٹاؤن سے باہر نہر کے کنارے میرا ٹھکانہ تھا۔ سو کالم میں اگر کبھی ان کا ذکر آ گیا تو سمجھتے تھے کہ ان کے دشمن سالک کے اشارے پر اس نے میرے خلاف زہر اُگلا ہے۔ لمبے لگ لگ، دبلے پتلے، مستقل پہناوا ایک اوورکوٹ گھٹنوں سے نیچا ٹخنوں سے تھوڑا اونچا۔ اپنے خیالوں میں گم۔ لدھیانہ میں اپنے ٹھکانے پر جمے بیٹھے تھے۔ وہاں سے اکھڑے تو ایسے بے ٹھکانے ہوئے کہ پھر کہیں جم کر نہ بیٹھ سکے۔ مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ آج یہاں کل وہاں۔ تھوڑے عرصے سعید محمود کا گھر بھی ان کا ٹھکانہ رہا تھا۔ ان کے اس ٹھکانے سے میرا عجب رنگ سے تعارف ہوا۔

سعید محمود نے کبھی خود ذکر نہیں کیا کہ لطیفی صاحب کا ڈیرا ان دنوں اس کے گھر پر ہے۔ وہ گھر میرے رستے میں پڑتا تھا۔ صبح ہی صبح جب میں دفتر جانے کے لیے سائیکل پر سوار گھر سے نکلتا تو سعید کی کوٹھی

کے قریب سے گزرتے ہوئے عجب منظر نظر آتا کہ چڑیاں سینکڑوں کی تعداد میں ایک اضطراب کے عالم میں اڑتی پھر رہی ہیں اور چیں چیں کر رہی ہیں۔ ایک صبح گزرتے گزرتے ایک تجسس میں میں نے احاطہ کے اندر نظر دوڑائی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لطیفی صاحب کچھ دانہ دنکا بکھیر رہے ہیں۔ کتنی چڑیاں ارد گرد منڈلاتے منڈلاتے ان کے کاندھوں پر ان کے سر پر ٹک گئی ہیں اور چہک رہی ہیں۔ شاید اپنے حصے کا رزق ان سے طلب کر رہی تھیں۔

خالی چڑیاں نہیں، لطیفی صاحب کا کچھ اور مخلوقات سے بھی اچھا خاصا ربط وضبط تھا۔ ٹی ہاؤس میں شام پڑے جب آتے اور دوستوں کی کسی بھی میز پر آ بیٹھتے۔ یار پوچھتے "لطیفی صاحب چائے چلے گی۔"

جواب دیتے " کوئی مضائقہ نہیں۔ ساتھ میں دو توس بھی منگا لیجیے۔"

چائے کے ساتھ دو توس بھی آ جاتے۔ توس اٹھا کر فوراً ہی ہاؤس سے نکل جاتے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آتے اور پھر اطمینان سے چائے پیتے۔ مجھے کتنے دنوں تک تجسس رہا کہ یہ دو توس آخر کس کے لیے منگائے جاتے ہیں۔ ایک شام میں ٹی ہاؤس میں داخل ہونے لگا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لطیفی صاحب توس بدست ٹی ہاؤس سے نکلے ہیں اور ایک کتا تیزی سے ان کی طرف لپکا ہے۔ انہوں نے توس کتے کے آگے ڈالے اور پھر واپس ٹی ہاؤس میں۔

کبھی ایسا ہوتا کہ عجلت میں ٹی ہاؤس میں داخل ہوئے اور دوستوں سے مطالبہ کیا کہ کسی کے پاس ایک چونی ہو تو عنایت کرے۔ چونی لے کر نکل جاتے۔ پھر واپس آئے نہ آئے۔ ایک مرتبہ یہ بھی دیکھا کہ چونی جس دوست سے لے کر گئے تھے، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد واپس آئے اور چونی واپس کر دی۔ " کیوں لی تھی؟ کیوں واپس کی؟" پوچھا تو بتایا کہ میں ایک فقیر سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ یہیں کھڑا رہ۔ میرے پاس اس وقت کچھ نہیں ہے۔ کسی دوست سے کچھ پیسے لے کر آتا ہوں مگر میں وہاں پہنچا تو وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ آس پاس کی گلیوں میں اسے تلاش کرتا پھرا۔ کہیں نظر نہیں آیا۔

تو یہ تھے لطیفی صاحب۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

اسی پراگندہ طبعی میں ایک روز خاموشی سے دنیا سے سدھار گئے۔ ان کی موت کی خبر اخبار میں کیوں نکلنے لگی تھی۔ پراگندہ طبع لوگ ان نامی شخصیتوں میں شمار نہیں ہوتے جن کے مرنے جینے کی خبریں اخباروں میں نکلا کرتی ہیں۔ سو ان کے گزر جانے کا پتہ یاروں کو رفتہ رفتہ ہی چلا۔ مجھے جب پتہ چلا تو میں نے اسی کالم میں جس سے انہیں بہت شکایت رہا کرتی تھی، انہیں بہت یاد کیا۔ وہ چڑیاں بھی یاد آئیں جنہوں نے یقیناً اپنے داتا کے جانے کا سوگ کیا ہوگا۔ ساتھ میں وہ کتا بھی یاد آیا جو روز شام کوئی ہاؤس کے باہر ان کا انتظار کیا کرتا تھا اور آخر میں لطیفی صاحب کا ایک شعر بے طرح یاد آیا۔

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا کہ تم نے فراموش کر دیا

لیجیے انہیں دنوں کے حوالے سے ایک اور شخصیت کی یاد آئی۔ جون کا مہینہ، دوپہر کا وقت۔ سورج جیسے سوا نیزے پہ اترا ہوا ہو۔ میں دفتر کی بالکنی سے باہر جھانکتا ہوں۔ ایک بزرگ سوٹ میں ملبوس، سر پہ سولر ہیٹ، ہاتھ میں چھڑی۔ سامنے مال کے فٹ پاتھ پر رخ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ مولانا صلاح الدین احمد ہیں۔ اسی مال پر ''آفاق'' کے دفتر سے تھوڑا پرے ''ادبی دنیا'' کا دفتر ہے۔ روز مقررہ وقت پر دفتر سے اٹھتے ہیں اور پیدل نگینہ بیکری کی طرف چل پڑتے ہیں۔ ان کی وضعداری میں یہ دونوں تینوں باتیں شامل ہیں۔ موسم کوئی بھی ہو سوٹ میں ملبوس نظر آئیں گے۔ مینہ بوندی کا عالم ہو یا گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ ہو، چلیں گے پیدل ہی۔ مقررہ وقت پر نگینہ بیکری پہنچنا ہے۔ انہیں دیکھ کر میرے پیروں میں بھی کھجلی ہونے لگتی۔ کالم تو لکھ ہی چکا ہوں۔ کیوں نہ تھوڑی دیر کے لیے ٹی ہاؤس کا پھیرا لگا آؤں۔ سو میں بھی دفتر سے نکلتا ہوں اور ان کے پیچھے پیچھے ہو لیتا ہوں۔ دیکھا، خوش ہوئے۔ بولے ''انتظار صاحب میں نے تمہارے کالم کے سب تراشے اپنی فائل میں لگا رکھے ہیں۔''

بزرگ سے داد ملی۔ خون پلیوں بڑھ گیا۔ یہ مشفقی بھی تو ان کی وضعداری کا حصہ تھی۔ خوردوں کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ جس کی تحریر بھا جاتی اسے کھلے دل سے داد دیتے۔

ہاں اور وہ شخصیت نامی گرامی پہلوان رستم زماں گاماں۔ اس سے ملاقات کی تقریب کیسے پیدا ہوئی۔ یونس منصور کا ذکر میں کر ہی چکا ہوں۔ تقسیم سے پہلے علامہ مشرقی کے کیمپ سے نکل لاہور سے ٹکٹ کٹایا اور میرٹھ جا کر کرار صاحب کے کیمپ میں ڈیرا جمایا۔ تقسیم کے بعد پھر واپس لاہور۔ ان دنوں وہ راوی پار اپنے عزیزوں کے ساتھ جن کی یہاں زمینیں تھیں، گزر بسر کر رہا تھا۔ اس نے ذکر کیا کہ وہیں راوی پار ایک باغ ہے جس میں گاماں پہلوان کا اکھاڑہ ہے۔ گاماں پہلوان کا نام سن کر لڑکپن کا سارا زمانہ سامنے آن کھڑا ہوا۔ ان دنوں گاماں پہلوان کا ہمارے بیچ طوطی بولتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا پہلوان رستم تھا۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر گاماں ہے اور وہ جوزیسکو پہلوان تھا، وہ کوئی دیو تھا جسے پچھاڑ کر گاماں نے دنیا میں اپنی پہلوانی کا ڈنکا بجایا تھا۔ میری بات چھوڑیں۔ چھوٹے بڑے سب ہی اس زمانے میں گاماں کو جانے کیا کچھ سمجھتے تھے۔ ہیروئے اعظم۔ اس انمل اضافت کے لیے معذرت خواہ ہوں مگر گاماں کی عظمت کو اور کیسے بیان کروں۔

خیر تو یونس منصور سے پروگرام طے ہوا اور ایک صبح ہم اس باغ میں جا گھسے۔ اپنے اخبار کا حوالہ دے کر گاماں سے اپنا تعارف کرایا۔ خیر تعارف تو ہو گیا مگر میں کچھ سٹپٹایا ہوا تھا۔ میں نے رستم زماں گاماں پہلوان کا کیا تصور باندھا تھا۔ کوئی قد آور کیم شحیم شخصیت ہوگی۔ چلتا ہوگا تو دھرتی کا دل دھڑکتا ہوگا لیکن یہاں میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اپنی ڈبائی کا الطاف پہلوان یاد آ گیا۔ جب اس نے کشتی میں ببوا پہلوان کو پچھاڑا تھا

ر اس کا جلوس نکلا تھا تو وہ کتنا شان وشوکت والا پہلوان نظر آ رہا تھا اور یہ گاماں پہلوان..... مگر یہ پہلوان تو ب اپنا لنگر کھول چکا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی زبان سے اس کی کشتیوں کا احوال سن کر اس کی شخصیت کا رعب مجھ طاری ہوتا چلا گیا۔

باغ میں نارنگیوں کے درخت بہت تھے اور نارنگیوں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ کتنے زمانے کے بعد میں رنگیاں کھا رہا تھا اور وہ بھی گاماں کے ہاتھوں سے۔

خوش خوش واپس آ کر اس ملاقات کو ''آفاق'' کے لیے قلم بند کیا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر اخبار کے اس اشے کو میں نے احتیاط سے رکھا ہوتا۔ پھر یہ بتا سکتا کہ میں نے کیا پوچھا، گاماں نے کیا جواب دیے۔

یہ ایک بڑے پہلوان کا احوال تھا۔ اب ایک شیر بیشۂ تحقیق کا بھی حال سن لیجیے۔ ڈاکٹر عبداللہ غتائی۔ میں نے ان سے استفسار کیا تھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ ایاز کی قبر لاہور میں ہے۔ اس بزرگ نے جواب ثبات میں دیا اور ایاز اور لاہور کے رشتہ کے حوالے سے ایک مختصر تحقیقی مقالہ ''آفاق'' کے مذ ہبی ایڈیشن کے لیے عنایت کیا۔ تحریر ایسی کہ لکھیں عیسیٰ پڑھیں موسیٰ۔

ڈاکٹر صاحب فنا فی التحقیق تھے۔ ذرا چھیڑا اور رواں ہو گئے۔ ایک جلسہ میں علامہ اقبال پر گفتگو رتے کرتے ایک مقالہ نگار نے اپنی تحقیق بتائی کہ ایک مرتبہ علامہ سید سلیمان ندوی لاہور تشریف لائے تھے تو امہ صاحب نے اپنے گھر پر ان کے لیے دعوت کا اہتمام کیا تھا۔

اس پر ڈاکٹر صاحب کی رگ تحقیق پھڑ کی۔ تڑپ کر سٹیج پر پہنچے اور کہا کہ فاضل مقالہ نگار کی تحقیق ادھوری ہے۔ انہوں نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ باورچی کون تھا اور اس نے کیا کیا کھانے پکائے تھے۔ پھر انہوں نے تفصیل سے اس باورچی کے متعلق بتایا۔ اس سے میں نے جانا کہ عبداللہ چغتائی صاحب نے علامہ اقبال سے زیادہ ان کے باورچی کی سیرت وحیات کے بارے میں تحقیق کی ہے۔ پھر بتایا کہ اس شام اس نے کون ون سے کھانے تیار کیے تھے اور علامہ سلیمان ندوی نے کونسا کھانا زیادہ رغبت سے کھایا تھا۔

اب جو لاہور کے ریگل چوک میں مسجد شہدا اپنے ایک مینار کے ساتھ کھڑی ہوئی ہے، وہ آسانی سے تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ پہلے اس کی تعمیر کو عبداللہ چغتائی کی تحقیق سے نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔ انہوں نے پہلے بیانات جاری کیے کہ یہ مسجد مسجدوں کی روایتی طرز تعمیر کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ مسجد کے چار مینار ہوتے ہیں اور اس کا طرز تعمیر طے شدہ ہے۔ جب مسجد بنانے والے نہ مانے تو پھر انہوں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ غرض محقق نے تو اس ضمن میں تحقیق کے دریا بہا دیے تھے مگر مسجد پھر بھی بن کر کھڑی ہو گئی۔

''آفاق'' کے واسطے سے بیان کرنے کو اور کیا کیا کچھ ہے مگر آخر کو اس اخبار کے ساتھ پھر وہی ہوا جو پہلے ہو چکا تھا۔ اب کے بھی ''آفاق'' نے لمبی عمر نہیں پائی۔ خیر اس میں ''آفاق'' کی تخصیص نہیں ہے۔ پاکستان میں صحافت کی روایت ہی کچھ اس طرح کی ہے۔ بعض مائیں اولاد کے معاملہ میں بہت بدنصیب ہوتی

ہیں۔ بچے تو جنتی ہیں اور بچے بہت ہونہار بھی نکلتے ہیں۔ چشم بددور شباب بھی بھر کر آتا ہے مگر کمبخت عمر دغا دے جاتی ہے۔ عین بھری جوانی میں گزر جاتے ہیں۔ ہماری بڑی بوڑھیاں ایسی ماؤں کو مرت بیائی کے نامبارک نام سے یاد کرتی تھیں۔ اخباروں کی حد تک پاکستان بھی مرت بیائیوں کی قسمت لے کر آیا ہے۔ کیسا کیسا اخبار، کیسی کیسی دھوم سے نکلا مگر پنپا نہیں۔ جیسے مرت بیائیوں کے جنوں میں سے ایک دو نام خدا بچے رہ جاتے ہیں باقی بھری جوانی میں اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ یہاں بھی بس دو ڈھائی اخبار ایسے ہیں جن کی عمر نے وفا کی ورنہ ہم نے یہی دیکھا کہ کوئی اب گیا کوئی تب گیا۔ ارے پروگریسو پیپرز والے اخبار کیسی مضبوط بنیادوں پر کھڑے تھے۔ پاکستان ٹائمز بھی، امروز بھی اور مشرق کتنا مقبول اخبار تھا مگر انہیں ڈکٹیٹروں کی نظر کھا گئی۔ ایوب خاں، یحییٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو کو کسی نہ کسی طرح یہ اخبار سہہ گئے مگر ضیاء الحق نے نظر بھر کر انہیں دیکھا اور شتابی سے تینوں ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ باقی کس کس کا ذکر کیا جائے۔ جو تقسیم کے پہلے سے جمے جمائے چلے آتے تھے جیسے سول اینڈ ملٹری گزٹ وہ نہ پنپ سکا تو باقیوں کا کیا ذکر ہے۔

''آفاق'' جب دوسری مرتبہ نکلا تو کامیاب کاروباری ہاتھوں میں تھا۔ خیال یہی تھا کہ اب یہ اخبار سہگل انڈسٹریز کا حصہ ہے۔ اب اسے کیا جوکھوں ہے مگر اخبار کے کاروبار کی اپنی بدیا ہے۔ وہ کاروباریوں اور صنعت کاروں کی سمجھ میں مشکل سے آتی ہے۔ سہگل برادرز نے جلدی ہی کان پکڑ لیے۔ ایسے اکھڑے، کہا کہ ہم اس اخبار سے باز آئے۔ ''آفاق'' کے کارکنوں کو ہم نے یہ جائیداد بخشی۔ وہ اسے اپنی ملکیت جانیں اور شوق سے چلائیں۔ ''آفاق'' کے کارکن یہ ازغیبی دولت پا کر کتنے خوش ہوئے۔ سمجھ رہے تھے کہ ان کے نام کی لاٹری نکل آئی مگر کسی بھی کاروبار، کسی بھی صنعت کا کارکنوں اور مزدوروں کی ملکیت میں چلے جانا اس کے لیے کوئی اچھا شگن نہیں ہوتا۔ کارکن اور مزدور بس کارکنوں اور مزدوروں ہی کے جامے میں رہیں تو اچھے لگتے ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں ''آفاق'' کے کارکنوں کو کہ اب وہ ''آفاق'' کے مالک تھے، دن میں تارے نظر آنے لگے۔ اب انہیں ایک عدد مالک کی تلاش تھی کہ اخبار کو اس کی ملکیت میں دے کر خود پھر سے خالی کارکن بن جائیں۔ انہوں نے مالک تو اپنے حساب سے اچھا ہی ڈھونڈ نکالا تھا۔ شفاء الملک محمد حسن قرشی۔ کیسے کیسے بیمار نے شفاء الملک کے ہاتھوں شفا پائی لیکن ''آفاق'' کے روگ کا علاج ان کے پاس بھی نہیں تھا۔ ہم ''آفاق'' والوں کی تقدیر ہی کھوٹی تھی ۔

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی

بڑے قرشی صاحب نے تو شاید کسی بھی دن ''آفاق'' کے دفتر میں آ کر نہیں جھانکا۔ ہاں ان کے چھوٹے فرزند حکیم ریاض قرشی دفتر میں آ کر بیٹھتے تھے۔ وہ بھی کانٹے کے حکیم تھے۔ مجھے انہیں دنوں اس کا ذاتی تجربہ ہوا۔

میں اصل میں ان دنوں درد گردہ کا شکار تھا۔ ایک صبح اس قیامت کا درد اٹھا کہ درد دور کرنے کی جو طے شدہ گولیاں تھیں، وہ کئی کھا گیا۔ کچھ اثر نہ ہوا۔ پڑوس کے ڈاکٹر نے آ کر انجکشن لگایا، وہ بھی کارگر نہ ہوا۔

میں نے دفتر میں فون کیا۔ اپنی حالت بتائی اور اطلاع دی کہ دفتر حاضر نہیں ہو سکوں گا۔ ریاض قرشی نے میرا حال سنا تو کہا کہ کوئی بات نہیں۔ چپڑاسی ابھی دوا لے کر پہنچ رہا ہے۔ چپڑاسی آیا اور عجب دوا ساتھ لایا۔ کالے نمک کی ڈلی۔ کہا کہ گلاس میں نیم گرم پانی ڈال کر اس ڈلی کو توڑ کر تھوڑا سا حصہ گھول لیجیے اور گھونٹ گھونٹ پیجیے۔ کمال ہو گیا۔ وقفے وقفے سے چند گھونٹ یہ کالے نمک والا پانی پیا، درد غائب۔ میں ریاض قرشی کی حکمت کا قائل ہو گیا۔

جب میں اگلے دن دفتر پہنچا تو حکیم صاحب نے کہا کہ تمہارے گردے میں پتھری ہے۔ اس کے لیے میں معجون بنا کر دوں گا مگر اس کے لیے دو کالے بچھو درکار ہیں۔

''حکیم صاحب میں دو کالے بچھو کہاں سے لاؤں۔''

بولے ''لاہور میں کالا بچھو کہیں نظر نہیں آئے گا۔ یہ صوبہ سرحد میں ملے گا۔''

مجھے خوب سوجھی۔ میں نے پشاور میں مقیم ''آفاق'' کے نامہ نگار سے گزارش کی۔ اس نے جھٹ پٹ دو کالے بچھو کہیں سے پکڑ کر ایک ہنڈیا میں بند کیے اور مجھے بھجوا دیے۔ میں نے وہ ہنڈیا ریاض قرشی کی نذر کی۔ وہ کالے کالے بچھو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بولے ''یہ بچھو تو چٹان میں ڈنک مارے تو اس میں دراڑ پڑ جائے۔ آپ کے گردے کی پتھری کیا بچتی ہے۔ معجون کی چند خوراکوں میں چورا ہو کر پیشاب کی راہ نکل جائے گی۔''

مگر معجون کی تیاری میں ہفتہ عشرہ تو لگنا ہی تھا۔ اس عرصے میں ''آفاق'' نے اپنا رنگ دکھایا اور میری تنخواہ کی ادائیگی میں لیت و لعل کی۔ مجھے تاؤ آیا اور کہلا بھیجا کہ ''آفاق'' سے میرا رشتہ ختم۔

حکیم ریاض کا فون آیا کہ ''انتظار صاحب، کم از کم اپنی معجون تو آ کر لے جایئے۔''

میں نے جواب دیا کہ ''حکیم صاحب اب یہ معجون کسی اور بیمار کو چٹایئے۔ میرے درد کی دوا آپ کے پاس نہیں ہے۔''

بس اسی کے ساتھ ''آفاق'' سے میرا رشتہ منقطع ہو گیا۔ پھر وہی میں اور وہی میرا آخری سہارا، فری لانسنگ۔ ویسے یہ جو میں ابھی پاکستان کے اخباروں کا احوال سنا رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے جو میرے ساتھ ہوا وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ خیر اب تو ماشاءاللہ سے ہمارے منجھے ہوئے صحافی لاکھوں، کروڑوں میں کھیلتے ہیں مگر جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں ان دنوں میں لائق صحافیوں کو بھی ایسے دن دیکھنے پڑتے تھے۔ ایسا ہوتا کہ اخبار بند ہو جاتا اور وہ سڑک پر آ جاتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ اخبار کے اندر سیاست چل پڑتی۔ کبھی نالائقوں کی چالاک ٹولی کا بول بالا ہو جاتا اور لائق صحافی اخبار سے باہر نظر آتے۔ تھوڑے دنوں فری لانسنگ کر کے وقت گزارا اور پھر کسی اخبار میں جت گئے۔ میں ایسے وقفوں کو اس اعتبار سے غنیمت جانتا کہ اس عرصے میں کسی ایک ڈیڑھ اچھی کتاب کا، کسی ناول کا، کسی علمی موضوع پر لکھی ہوئی کتاب کا ترجمہ کر ڈالتا۔

جرنیلی بندوبست کے سائے میں

مارشل لا کیا خوب لگا۔ اگلے دن انڈے سستے ہو گئے۔ بس اس ایک ادا نے لوگوں کو لوٹ لیا۔ جرنیل ایوب خاں کی جے جے کار ہوگئی۔ یاروں نے اس سے شگن لیا کہ اب ہمارے سارے دلدر دور ہو جائیں گے اور کراچی میں تو یار لوگ نو آمدہ جرنیلی بندوبست کی ناک کے نیچے بیٹھے تھے۔ انہوں نے شاید کچھ زیادہ ہی سونگھ لیا۔ سات ادیبوں کی طرف سے ایک بیان جاری ہوا کہ اے آمدنت باعثِ ابادی ما۔ خوش آمدید، خوش آمدید۔ کچھ ادیبوں کی بہبود پر بھی توجہ ہو جائے تو سبحان اللہ۔ ان سات ادیبوں میں جمیل الدین عالی تو تھے ہی، غلام عباس بھی تھے۔ قرۃ العین حیدر بھی تھیں۔

اس بیان نے عجب اثر کیا۔ دم کے دم میں وہ ساری تشویش جو مارشل لا کے نفاذ سے ادیبوں کے حلقہ میں پیدا ہوئی تھی، دور ہوگئی۔ بس سمجھو کہ سوکھے دھانوں پہ پانی پڑ گیا۔ کراچی سے جمیل الدین عالی کی طرف سے مژدہ ملا کہ سال چڑھتے کے ساتھ ہی کراچی میں رائٹرز کنونشن ہوگا۔ شرکت کے لیے تیار ہو جایئے۔ لیجیے سفر کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کچھ دعوت نامے ازخود آئے۔ کچھ فرمائش کر کے منگوائے گئے۔

اس بہانے میں نے بھی لاہور سے قدم باہر نکالا۔ اب تک تو ہاتھ پیر توڑے لاہور میں بیٹھا تھا۔ گیارہ برس بعد اس شہر سے نکل کر کراچی کی صورت دیکھی۔ کراچی کو دیکھا۔ کراچی کا سمندر دیکھا۔ عسکری صاحب نے کہا کہ چلو میں تمہیں سمندر دکھاتا ہوں۔ میں نے اب تک بس ندیاں دیکھی تھیں۔ گنگا ندی، جمنا ندی، راوی ندی۔ سمندر کا نام سنا تھا، دیکھا اب آ کر۔ عسکری صاحب نے اپنے محبوب شاگردوں کو ساتھ لیا، سلیم احمد کو بلا بھیجا کہ بھئی آ کر انتظار سے مل لے۔ سو اس شان کے ساتھ ہم نے سمندر سے ملاقات کی۔ کہا ہم اونٹ پر بیٹھیں۔ کہا تم اونٹ پر بیٹھو۔ کہا سلیم احمد ساتھ بیٹھیں گے۔ کہا سلیم احمد بھی ساتھ میں بیٹھیں۔ یوں زندگی میں پہلی بار سمندر دیکھا اور پہلی بار اونٹ پر بیٹھا۔

ادھر کنونشن جاری تھا۔ کمیٹیاں بیٹھی تھیں اور اپنے اپنے کام میں جتی ہوئی تھیں۔ دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا۔ جو اچھل کر سامنے آیا اس کا نام رکھا گیا پاکستان رائٹرز گلڈز۔ ویسے تو سٹیج پر سب سے بڑھ کر جمیل الدین عالی نظر آ رہے تھے اور اس زور شور سے نظر آ رہے تھے کہ مخالفوں کی جلی کٹی سن کر اتنا بھڑکے کہ

بے ہوش ہو گئے۔

مگر دھیرے دھیرے عقب سے ایک اور چہرہ نمودار ہوا اور پھر وہ نمایاں ہوتا چلا گیا۔ اب کھلا کہ اصل چہرہ تو یہ ہے۔ شہ کا بڑا مصاحب۔ قدرت اللہ شہاب۔ شہر میں آبرو کا اس سے اندازہ لگایئے کہ کتنے شاعروں نے جلدی جلدی اپنے دیوان چھپوائے اور انتساب قدرت اللہ شہاب کے نام کیا ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

رازداں سب سے بڑھ کر ممتاز مفتی۔ اس راز سے تو پردہ انہوں نے ہی اٹھایا کہ اس مرد خدا کو پیغام کہیں اوپر سے آتے ہیں۔ مفتی صاحب پر آگے جب فرائڈی نفسیات کے اسرار و رموز منکشف ہو رہے تھے تو انہیں لاشعور کی تاریک گہرائیوں سے اشارے ملا کرتے تھے۔ اب جب شہاب صاحب کی صحبت بابرکت میسر آئی تو ان پر کھلا کہ یہاں تو اوپر سے پیام آتے ہیں۔ اب یاروں پر کھلا کہ شہ کی مصاحبی تو بس ایک پردہ ہے۔ پردے کے پیچھے کیا ہے۔ راز، راز، راز۔

ولی را ولی می شناسد۔ شہاب صاحب کو اگر کسی نے پہچانا تو مفتی صاحب نے پہچانا اور مفتی صاحب کو کسی نے پہچانا تو وہ شہاب صاحب نے۔ جب ہی تو وہ انہیں یاروں کے بیچ سے نکال کر ایوان صدر میں لے گئے اور یہاں پہنچ کر مفتی صاحب نے دیکھا کہ ایوب خاں کا یہ ایوان صدر تو ایک حیرت کدہ ہے اور شہاب صاحب۔ افسر کے بھیس میں کوئی پہنچا ہوا بزرگ۔ ایک دفعہ میں نے اس باب میں ان کی گفتگو سنی تھی۔ کہنے لگے کہ یہ شخص کسی آرڈر سے منسلک ہے۔ کہیں اوپر سے پیغام آتے رہتے ہیں۔ ادھر سے جاتے رہتے ہیں۔ کیسے پیغام، میں نے پوچھا۔ کہا کہ یہ تو میں نہیں جانتا۔ اگر کچھ جانتا بھی ہوں تو بتانے کی اجازت نہیں۔

کیا خبر ہے کہ پاکستان رائٹرز گلڈ بھی اوپر سے آنے والے کسی ایسے ہی پیغام کا ثمر ہو۔ بہر حال چند ایک برس گلڈ کی بہت دھوم رہی۔ بس یہ لگتا تھا کہ پاکستانی ادب کی دنیا میں سدا برت لگی ہوئی ہے۔ امیدوار تو سب ہی تھے۔ پانے والوں نے پایا بھی۔ سیر و سفر کی بھی صورتیں پیدا ہوئیں۔ سب سے بڑھ کر وہ سفر تھا جو مغربی پاکستان کے ادیبوں نے مشرقی پاکستان کا کیا۔ کراچی سے لاہور تک ڈونڈی پٹ گئی کہ ادیب عازم ڈھاکہ ہوا چاہتے ہیں۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ تپش شوق نے ہر ذرے پہ اک دل باندھا۔ کتنے ذرے اس سفر کی برکت سے آفتاب مہتاب بن گئے۔

مگر دو ڈھائی ادیب ایسے بھی نکلے جو اس سارے قصے سے دامن بچا کر نکل گئے۔ محمد حسن عسکری، مولانا صلاح الدین احمد۔ پھر پتہ چلا کہ جوش صاحب بھی کنونشن سے کنی کاٹ گئے۔ عسکری صاحب نے دعوت دینے والے کے لہجہ میں جانے کیا سونگھا کہ جواب دیا۔ ''آ جاؤں گا۔ پولیس کو بھیج کر بلوالیں۔'' ادھر لاہور میں مولانا صلاح الدین احمد نے شرکت سے معذرت کر لی۔ پھر جلد ہی حلقہ ارباب ذوق کے سالانہ اجلاس میں

صدارت کرتے ہوئے گلڈ کے قیام پر جامع تبصرہ کر ڈالا کہ ادیب تو پیغمبر ہوتے ہیں۔ شاعری جزویست از پیغمبری۔ بھلا پیغمبروں نے بھی کبھی گلڈ بنائے تھے۔

مگر گلڈ شعلۂ مستعجل نکلا۔ جلد ہی بجھ گیا۔ ایوب خاں کے دس سالہ دور کے انجام کا بھی انتظار نہیں کیا۔ اصل میں جن کے دم سے یہ رونق لگی تھی وہی گلی چھوڑ گئے۔ وہ دن ہوا ہوئے جب شہاب صاحب ایوب خاں کی ناک کا بال تھے۔ یہ تو مفتی صاحب جانیں کہ شہاب صاحب کی رخصتی رسمی سرکاری تبادلہ تھی یا کسی بالائی پیغام نے یہ گل کھلایا تھا۔ بہرحال ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا، اسے الطاف گوہر صاحب نے پُر کیا اور اس طرح پُر کیا کہ یار لوگ شہاب صاحب کو بھول گئے۔ ادب میں قدم تو الطاف گوہر صاحب کا بھی تھا۔ آخر انہوں نے میراجی کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ تھنکرز فورم کو ان کی طرف سے جواب آن غزل سمجھا جائے۔ تجمل حسین اس کے کرتا دھرتا تھے اور رائٹرز گلڈ کی مرغی تو بس کیمپ کے اندر بولتی تھی۔ بس کراچی سے ڈھاکہ تک اس کی مار تھی۔ تھنکرز فورم نے افریشیائی ادبی کانفرنس کا انعقاد کر کے اپنی بلندی پرواز کا ثبوت فراہم کیا مگر ان تلوں میں جتنا تیل تھا، وہ اس ایک کانفرنس پر صرف ہو گیا۔ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

مگر پھر ایوب خاں ہی کا چراغ گل ہو گیا۔ کہاں کا گلڈ کیسا تھنکرز فورم۔ ذوالفقار علی بھٹو ایوب خاں کے آثار کو کیوں پنپنے دیتے اور اس کی آل اولاد کو کیوں منہ لگاتے۔ انہوں نے اپنے رنگ سے کلچرل اور ادبی ادارے قائم کیے۔ ادب کے نام اکیڈیمی آف لیٹرز کا ظہور ہوا۔ مگر کیا ظہور ہوا۔ بھٹو دور میں تو اس ادارے کے ہونے نہ ہونے کا پتہ ہی نہ چلا۔ اس کے تن مردہ میں ضیاء الحق نے آ کر روح پھونکی اور اس شان سے روح پھونکی کہ بھٹو صاحب کی پھانسی کے ہفتے عشرے بعد ہی اس کی مہورت ہوئی اور جرنیل ضیاء الحق کے سبز قدموں نے اسے رونق بخشی۔ مگر اس پہلے اجتماع میں ادیبوں نے کم کم شرکت کی۔ کیسے شرکت کرتے۔ ابھی تو بھٹو کی قبر کی مٹی بھی نہیں بیٹھی تھی۔ مگر اگلے برس میلہ اچھا جما۔ پھر یہ میلہ رونق پکڑتا ہی چلا گیا۔ ہر برس جرنیل صاحب شریک ہو کر میلہ کی رونق بڑھاتے۔ اپنے خطبہ میں ادب پر اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کرتے اور ادیبوں کو مفید مشورے دیتے۔ میں اس پر زیادہ خامہ فرسائی نہیں کروں گا کیونکہ میں تو سنی سنائی کہہ رہا ہوں۔ ان میلوں میں شرکت کا شرف حاصل ہوا ہوتا تو ان کے بیانات کو زیادہ اعتماد سے نقل کرتا۔ پتہ نہیں اکیڈیمی آف لیٹرز کی اس وقت کی انتظامیہ نے اتنی غفلت کیوں برتی اور ان گراں قدر خطبوں کو کتابی شکل میں کیوں شائع نہیں کیا۔

ارے میں گلڈ کا ذکر کرتے کرتے کہاں سے کہاں نکل آیا۔ آخر اس زمانے میں خالی گلڈ ہی کی رونق تو نہیں تھی اور رونقیں بھی تھیں۔ بیچ میں تھوڑا اپنی بے رونقی کا بھی ذکر ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ میں یہ ذکر کر ہی چکا ہوں کہ ایوب خاں کا مارشل لا، روزنامہ ''آفاق'' کو جس سے میں وابستہ چلا آ رہا تھا، راس نہیں آیا۔ جلد ہی بند ہو گیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ روزی کا ایک در بند ہوتا ہے تو دوسرا کوئی در کھل بھی تو سکتا ہے۔ صحافتی زندگی میں یہ ہوتا رہتا ہے اور ہم جیسوں کے لیے فری لانسنگ کا در تو یوں بھی مستقل کھلا رہتا ہے۔ تو میں نے

اس وقفہ سے فائدہ اٹھا کر کچھ کام کی کتابوں کے ترجمے کر ڈالے۔ تھوڑی اِدھر اُدھر کالم نگاری بھی کی حتیٰ کہ انگریزی میں بھی قلم چل نکلا۔ یہ سب فری لانسنگ کی برکتیں تھیں۔

اور ہاں ایک شام کیا ہوا۔ ہم ٹی ہاؤس میں بیٹھے گپ بازی کر رہے تھے کہ اچانک ڈاکٹر نذیر نمودار ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کا بھی کوئی بھروسہ تو نہیں تھا۔ شہر میں سائیکل پر سوار دوڑے پھرتے تھے۔ اب گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے مگر سائیکل تو دم کے ساتھ تھی۔ اس سے کیسے قطع تعلق کر لیتے۔ بس ایسے ہی کبھی ٹی ہاؤس میں بھی آ نکلتے۔ چائے پیتے پیتے مجھ سے مخاطب ہوئے "انتظار حسین، تمہارا تو اخبار بند ہو گیا۔ اب کیا کر رہے ہو؟" میں نے کہا "پیشۂ آزادگاں۔ فری لانسنگ۔"

بولے "یار کوئی بتا رہا تھا کہ تم نے اردو میں ایم اے کر رکھا ہے۔"

"ہاں، کیا تو تھا۔"

"تو پھر تم ہمارے یہاں آ کر اردو کیوں نہیں پڑھاتے؟"

"آپ بلائیے، بندہ حاضر۔" (مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس دم)

"تو پھر کل تم میرے دفتر ذرا تھوڑی دیر کے لیے آ جاؤ۔ ایم اے کی سند ساتھ لے کے آنا۔"

"اور کوئی دوسری سند سرٹیفکیٹ وغیرہ؟"

"کچھ نہیں، بس ایم اے والی سند کافی ہے۔"

میں اگلی صبح ان کے دفتر پہنچ گیا۔ انہوں نے شعبۂ اردو کے صدر کو بلایا۔ میرا ان سے تعارف کرایا۔ بتایا کہ انہیں ہم اپنے کالج میں اردو کے شعبہ میں شامل کر رہے ہیں۔

اس تعارف کے بعد ایک درخواست میری طرف سے ٹائپ کرائی گئی۔ اس پر میں نے دستخط کیے اور واپس ہو لیا۔

کوئی ڈیڑھ دو ہفتے کے بعد ڈاکٹر صاحب پھر ٹی ہاؤس میں وارد ہوئے۔ تقرری کا پروانہ ہاتھ میں تھما دیا۔ ادھر سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا۔ مگر جب میں نے تنخواہ پر نظر ڈالی تو مجھ پر اوس پڑ گئی۔ میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب، جب میں نے صحافت میں قدم رکھا تھا اس وقت میری اسی کے لگ بھگ تنخواہ مقرر ہوئی تھی۔"

بولے "ہاں۔ یہ تم نے ٹھیک دھیان دلایا۔ چلو ہم ڈھائی تین Increments دلائے دیتے ہیں۔"

یہ امید دلا کر ڈاکٹر صاحب چلے گئے مگر پھر ڈیڑھ دو ہفتے بعد آئے تو تھوڑے شرمندہ تھے۔ کہنے لگے "یار، یہ جواب یہاں سیکرٹری تعلیم لگا ہے، وہ میری سنتا ہی نہیں۔ اصل میں میری اس سے کوئی ایسی یاد اللہ نہیں۔ کوئی صاحب اُدھر ہی کے ہیں تمہاری طرف کے۔ اُس سے کوئی سفارش نہیں لڑا سکتے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب، میں نے ادھر والے کی سفارش پر بھروسہ کیا تھا۔ اب یہ بیچ میں کوئی ادھر والا آن ٹپکا۔ میں اس کے لیے سفارش کہاں ڈھونڈتا پھروں۔"

اس پر ڈاکٹر صاحب نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ بس اسی قہقہہ پر معاملہ ختم ہوگیا۔

وہ بات آئی گئی ہوگئی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ جلد ہی ایک نئی صورت پیدا ہوئی۔ لاہور سے ایک نیا اخبار دھوم کے ساتھ نکلنے لگا تھا۔ روز نامہ مشرق۔ میرے کچھ کرم فرما بیچ میں پڑے اور اس اخبار سے میں بطور کالم نگار وابستہ ہوگیا۔ اب تک میرے دماغ کے کسی گوشے میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اخبار نویسی سے یہ وابستگی عارضی ہے۔ مجھے بالآخر کوئی ایسی ملازمت کرنی ہے جو میرے ادبی مشاغل سے میل کھاتی ہو لیکن گورنمنٹ کالج کی پیشکش جب ٹھکانے لگ گئی اور ''مشرق'' میں جانے کی صورت پیدا ہوئی تو میں نے سوچا کہ شاید صحافت ہی میرا مقدر ہے تو اب اسے ہنسی خوشی قبول کرلو۔ پیشہ میں عیب نہیں رکھیے، نہ فرہاد کو نام۔ مہاکوی کبیر کی مثال سامنے رکھو۔ کرگھا اور شاعری کا آپس میں بھلا کیا تعلق ہے۔ اس سے بڑی انمل اور کیا ہوگی۔ تو بھائی کالم نگاری کو چرخا پونی جانو۔ گاڑھے گزی کا کاروبار اپنی جگہ۔ ریشمین کام اپنی جگہ۔ ایسی خانہ بندی کرکے میں مطمئن ہوگیا مگر فوراً ہی ایک گرہ اور پڑگئی۔ اس کا احوال یوں ہے کہ میں اس وقت کے صحافتی دستور کے مطابق ایک فرضی نام یعنی ''خنداں'' کے نام سے ''آفاق'' میں ایک کالم لکھا کرتا تھا۔ اسی نام سے میں نے ''مشرق'' میں کالم لکھنے کا ڈول ڈالا مگر پہلے ہی کالم پر پکڑا گیا۔

''مشرق'' کے کرتا دھرتا عنایت صاحب نے مجھے سامنے بٹھایا اور سمجھایا کہ یہ فرضی نام نہیں چلے گا۔ آپ کا کالم آپ کے اصلی نام سے چھپے گا۔ اس پر میں گھبرایا۔ میں نے کہا کہ اردو کالم نگاری کا دستور تو یہی چلا آتا ہے کہ کوئی مناسب سا اخباری نام رکھ لیا جاتا ہے اور اس نام سے کالم لکھا جاتا ہے۔ عنایت صاحب بولے ''ہم اس دستور کو نہیں جانتے۔ ادب میں آپ کا جو نام ہے اس سے بھی تو ہم فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، لہٰذا آپ کے نام سے چھپے گا اور ساتھ میں آپ کی تصویر بھی چھپے گی۔'' لیجیے یک نہ شد دو شد۔ میں بہت گڑبڑایا۔ گڑبڑانا ہی تھا۔ میں نے جو اپنے حساب سے خانہ بندی کی تھی، وہ اب مجھے ٹوٹتی پھوٹتی نظر آرہی تھی۔ اپنی اس پریشانی کا ذکر میں نے ناصر کاظمی سے کیا۔ اس بندۂ خدا نے ایسا فقرہ کہا کہ میں بالکل ہی ڈھیر ہوگیا۔ کہا کہ ہاں اب تم دوسرے احسان بی اے بن جاؤ گے۔ احسان بی اے اس زمانے کے مقبول کالم نگار تھے۔ ان کا کالم ان کی تصویر کے ساتھ روز نامہ ''کوہستان'' میں شائع ہوا کرتا تھا مگر ناصر نے میری پریشانی کا اندازہ کرکے فوراً ہی پینترا بدلا۔ کہا کہ تم سے پہلے بھی لکھنے والوں کو ایسی ہی صورتحال کسی نہ کسی رنگ میں پیش آتی رہی ہے۔ انہوں نے اسے چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور اپنی ادبی حیثیت پر آنچ نہیں آنے دی۔ یہ صورتحال تمہارے لیے ایک چیلنج ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم اس پیشہ کے بیچ اور کالم نگاروں کی گنوردل میں اپنی افسانہ نگار والی شناخت کو کیسے برقرار رکھتے ہو اور اس کے بعد اس پر ایک اچھا خاصا حوصلہ افزا خطبہ۔ اس سے میری بہت ہمت بندھی۔

ہمارے اخبار کے ناظم الامور نے ایک اور بات کہی کہ دیکھیے آپ کیا لکھتے ہیں اور کیا لکھنا چاہتے ہیں، ہم اس میں دخل نہیں دیں گے۔ یہ کالم کس رنگ، کس نوعیت کا ہونا چاہیے۔ یہ خود آپ کو طے کرنا ہے۔

بس ایک خواہش ضرور رہے گی کہ یہ کالم ادبی ثقافتی حلقوں تک ہی محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ اسے بھائی گیٹ کے تھڑوں پر بھی پہنچنا چاہیے۔ لیجیے یہ ایک اور چیلنج آ گیا اور اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اب سے پہلے ''آفاق'' میں جو کالم نگاری کر تا رہا تھا، اس کے بارے میں تو کبھی سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں تھا کہ کیا لکھ رہے ہو اور کیسا لکھ رہے ہو۔ قلم اس راہ پر چل پڑا سو چل پڑا۔ اخبار کا کالم اپنی جگہ ایک صنف ہے۔ اس کے اپنے تقاضے ہیں۔ تو پہلے تھوڑا سوچ سمجھ لو اور پھر قلم اٹھاؤ۔ ایک فیصلہ تو میں نے فوراً ہی کر لیا کہ سب کوچوں میں جائیو، بس سیاست کے کوچے میں قدم مت رکھیو۔ اس فیصلہ کا اولین محرک تو یہی تھا کہ جب اس کوچے سے نہ تمہیں رغبت ہے نہ شناسائی تو وہاں تاک جھانک کر کے خراب ہونا کیا ضرور ہے۔ اس کے ساتھ کچھ اندیشہ ہائے دور دراز نے بھی اس فیصلہ پر اکسایا۔ سو جب ''مشرق'' پریس ٹرسٹ میں شامل ہو گیا تو ایک اشارہ ملنے پر میں نے فوراً ہی عذر پیش کیا کہ میں تو غیر سیاسی کالم لکھتا ہوں۔ سیاسی موضوعات کچھ دوسرے لکھنے والوں کو تفویض کیے گئے ہیں۔ میں ان کے کوچے میں دخل در معقولات کیسے کروں۔ ویسے جہاں سے یہ اشارہ آیا تھا، وہ حلقۂ ارباب ذوق کے ادیبوں کے غیر سیاسی مزاج سے خوب آشنا تھے۔ آخر وہ ہیں کے تو پروردہ تھے۔ سو انہوں نے درگزر ہی سے کام لیا۔ ادھر جان بچی لاکھوں پائے۔

اور اب رفتہ رفتہ مجھے پتہ چل رہا تھا کہ اخباری کالم کی رونق سیاسی نوک جھونک پر موقوف نہیں۔ اس سے باہر بھی بہت کچھ رونق کا سامان ہے۔ ادب، کلچر، معاشرتی معاملات و مسائل، پھر بازاروں، گلی کوچوں میں، فٹ پاتھوں پر، زندگی بکھری پڑی ہے۔ اس کے مضحک پہلو بھی ہیں، المناکیاں بھی ہیں۔ بس دیکھنے والی آنکھ اور بیان کرنے والا قلم پاس ہونا چاہیے۔ اس واسطے سے کالم آج نہیں تو کل بھائی دروازے کے تھڑوں پر پہنچے گا اور وہ پہنچا۔ لیجیے ''مشرق'' والوں کا تقاضا بھی پورا ہو گیا اور میری سمجھ میں بھی آیا کہ اس کا ایک مثبت پہلو بھی تو ہے کہ لکھنے والے کا اس بہانے عام زندگی سے، روزمرہ کے معاملات سے ربط و ضبط قائم ہو جاتا ہے۔ لیجیے اس پر مجھے وہ پان کی دکان یاد آ گئی۔ جہاں میرا ایک کالم شیشے میں فریم کیا ہوا آویزاں تھا اور جب تک وہ دکان اجڑ نہ گئی یہ کالم وہاں آویزاں رہا۔ وہ پان والا عجب تھا۔ پان بنا کر خاموشی سے آپ کے منہ کی طرف لے جاتا تھا۔ نو وارد گھبراتا کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ بنواڑی منہ سے کچھ نہیں بولتا اور پان کو ہاتھ میں بھی نہیں پکڑاتا۔ پھر چاہتا کیا ہے۔ آخر بھید کھلتا کہ یہ پان کی گلوری آپ کے ہاتھ میں نہیں پکڑائی جائے گی، سیدھی آپ کے منہ میں رکھی جائے گی۔ میں نے اس پر کالم باندھ دیا۔ اس عزیز پان والے نے کالم کی قدر پہچانی اور شیشے میں فریم کر کے دکان میں سجا دیا۔ مطلب یہ کہ یہ کالم دکانوں کے تھڑوں پر ہی پہنچ کر نہیں رک گیا، کسی کسی دکان کی زینت بھی بن گیا۔

تو اس طرح ''مشرق'' میں میری کالم نگاری پروان چڑھی جہاں میں نے پابندی سے پچیس سال تک کالم لکھا اور اب پیچھے مڑ کر ان پچیس برسوں پر میں نظر ڈالتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ان پچیس برسوں میں

پاکستان کی دنیا کیا سے کیا ہوگئی۔ جو واقعات گزر گئے اس کے بعد دنیا کو بدلنا ہی تھا۔ ہندوستان سے ایک جنگ، پھر دوسری جنگ۔ انجام شکست اور شکستگی۔ مشرقی پاکستان کا الگ ہو کر بنگلہ دیش بن جانا۔ ادھر پاکستان اب آدھا رہ گیا تھا۔ اس آدھے پاکستان کی زمام حکومت ذوالفقار علی بھٹو نے سنبھالی اور اسے نئے پاکستان کے خطاب سے نوازا۔ پھر نئے پاکستان میں نئے نئے گل کھلے۔ بھٹو صاحب کے عزائم بلند تھے اور اڑان اونچی تھی مگر انہیں وقت کتنا ملا۔ پانچ چھ برس کی مدت بھی کوئی مدت ہوتی ہے۔ چار دن کی چاندنی، پھر لمبی اندھیری رات۔ بھٹو صاحب کے منظور نظر جرنیل ضیاء الحق جلد ہی آن دھمکے۔ پھر انہوں نے نو برس تک کوس لمن الملکی بجایا۔ جرنیلی بندوبست کیا خوب کیا کہ کوڑوں اور پھانسیوں کا دور دورہ ہوا۔ بچپن سے جو سنتا آیا تھا اس حساب سے بڑی سزائیں دو ہی تھیں۔ کالا پانی یا پھانسی۔ کالے پانی کی سزا فرنگی راج کے ساتھ آئی، اسی کے ساتھ چلی گئی۔ اب وہ جدوجہد آزادی کی تاریخ کا حصہ ہے اور بیتے دنوں کی کہانی۔ پھانسی کا پھندا بھی کل تک شنید تھا، اب میرے لیے دید بن گیا۔ احمد مشتاق کا ایک شعر یاد آیا ؎

یہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں رہتے ہیں
مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے

اور اچانک ایک صبح مجھ پر کھلا کہ اس اپنے نئے مکان سے پھانسی کا تختہ دکھائی دیتا ہے۔ ویسے تو صبح ہی سے مجھے تجسس تھا کہ یہ آج ہمارے پچھواڑے کیا ٹھوک پیٹ ہو رہی ہے۔ دوپہر ہوتے ہوتے جب گلی میں دور کی گلیوں محلوں کے لوگ جوق در جوق آتے دکھائی دیئے تو تجسس بڑھا کہ کیا ہمارے محلہ میں کوئی میلہ لگا چاہتا ہے کہ خلقت اس ذوق و شوق سے ادھر آ رہی ہے۔ تب پتہ چلا کہ یہ جو ہمارے پچھواڑے جیل کے احاطے میں صبح سے ٹھوک پیٹ ہو رہی تھی، اصل میں پھانسی کا تختہ تیار ہو رہا تھا بلکہ تختے اور پھانسی کے تین پھندے۔ شوق تماشا شوقینوں کو کس کس کوچہ سے کھینچ کر جیل روڈ پر لے آیا تھا۔ جن گھروں پر ان کی یلغار تھی، ان میں ہمارا گھر بھی شامل تھا۔ ان گھروں کی چھتوں، منڈیروں پر ان کی نظر تھی۔ کوئی بھی ایسی جگہ جہاں سے پھانسیوں کا نظارہ کیا جا سکے۔ میں نے اپنی طرف سے بہت مزاحمت کی مگر میں ہار گیا۔ شوق تماشا جیت گیا۔ جب عین پھانسی کی گھڑی آئی تو میں نے دیکھا کہ جانے کس راستے سے ایک پورا ہجوم دیوار پھاند کر چھت پہ چڑھ گیا ہے۔ ان کی نظریں پھانسی کے پھندوں پر تھیں اور میری متوحش نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں۔

جب آدمی گھر بساتا ہے تو اگر ٹھہرا ہے تو اسے اپنے در و دیوار کھڑے کرنے کا بھی خیال آتا ہے۔ مگر اس سے کہیں بڑھ کر یہ خیال گھر میں آنے والی کو بے چین رکھتا ہے۔ اسی چکر میں یہ گھر بنا تھا مگر اب اس گھڑی اس انکشاف پر میں کتنا حیران ہوا کہ ارے ہم نے جہاں ڈیرا ڈالا ہے، وہ تو پھانسی گھر کا پڑوس ہے۔ اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں۔ کیا یہ محض اتفاق ہے۔ بس اسی کرید میں یہ واقعہ سرکتے سرکتے میرے ایک ناول میں سرک آیا۔ پھر واقعی اس میں مجھے اتفاق سے بڑھ کر معنی نظر آنے لگے۔ کتنے واقعات،

واقعہ کے پردے میں اپنے معنی چھپا کرلے جاتے ہیں۔کوئی کوئی واقعہ افسانہ و ناول میں، شعر میں راہ پالیتا ہے تو پھر اپنے معنی بتاتا ہے۔

مگر عجب ہوا کہ جب بڑی پھانسی لگی تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔رات کے کسی پہر میں یہ واقعہ گذرا اور پریس بے خبر رہا۔ادھر صبح کے اخبار اپنی بے خبری کی چغلی کھا رہے تھے اور ادھر دو ورقی ضمیمے خبر دے رہے تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو پھانسی چڑھ گئے۔مگر کوئی شور پڑا ہو، کوئی جلسہ کوئی جلوس، کسی شاہراہ پر کوئی ٹائر جلا۔ کسی بس کو آگ دکھائی گئی ہو، بالکل نہیں۔بس ایک لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور۔اسے کہتے ہیں ڈکٹیٹرانہ رعب داب بلکہ دلی کی کرخنداری زبان میں رعاب شعاب۔سو۔

زندگی کیا ہے آج سے اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

سو آؤ اس مضمون سے گزریں اور ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر چائے کی پیالی میں طوفان اٹھائیں اور جی کے پھپھولے پھوڑیں۔ضیاءالحق کی طرف سے کسی کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔یہ جو ٹی ہاؤس سے لے کر وائی ایم سی اے کے اس کمرے تک جہاں حلقۂ ارباب ذوق کا جلسہ اک شور انقلاب کے ساتھ برپا ہوا کرتا تھا، کل تک کتنی شور انگیز دنیا تھی۔وہاں جمع ہونے والے اس شعلۂ مستعجل عزیز الحق کو دیکھ کر سوچتے تھے کہ اچھا ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی۔نوجوانوں کو اس مضطرب ذات میں ایک دوسرا ماؤزے تنگ کسمساتا نظر آتا تھا مگر اپنی ازدواجی زندگی سے خفا ایک نامراد کی گولی نے دم کے دم میں سارے طوفان کو ٹھنڈا کر دیا۔ کسی ایک پر موقوف نہیں، پچھلی ایک ڈیڑھ دہائی میں پاکستان کے خاکستر سے جتنی چنگاریاں بھی اٹھیں وہ بس دم بھر کے لیے شعلہ بنیں۔جس تیزی سے شعلہ بنیں اسی تیزی سے خاک ہوگئیں۔پاکستان کی تقدیر میں دولخت ہونا تھا، وہ ہو گیا۔مشرقی پاکستان خون میں نہا کر بنگلہ دیش بن گیا۔

بنگلہ دیش سے میرا تعارف عجب رنگ سے ہوا۔کھٹمنڈو میں وہ ہماری پہلی شام تھی۔ہم سب اس وقت ڈنر کی میز پر اکٹھے تھے۔ہم سب کون، ہندوستان سے آئے ہوئے مندوبین۔بنگلہ دیش سے آئے ہوئے مندوبین۔پاکستان سے بھی چند ایک دانشور وہاں پہنچے تھے۔میں اور نیلم بشیر لاہور سے، ایک نوجوان جاوید بھٹو سندھ سے۔مجھ سے ذرا دور میز کے دوسرے کنارے پر نیلم بشیر بنگلہ دیشی خواتین کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔اچانک وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں "انتظار صاحب، آپ شہید اللہ قیصر کو جانتے تھے۔"

شہید اللہ قیصر، اس نام پر میں چونکا۔اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں، نیلم بشیر نے برابر میں بیٹھی ہوئی خوش شکل بنگلہ خاتون کی طرف اشارہ کیا "یہ پنا قیصر ہیں۔شہید اللہ قیصر کی بیگم۔میں تو اس زمانے کے بعد کی پیداوار ہوں۔آپ شہید اللہ قیصر کو جانتے ہوں گے۔"

میں نے اب اس بنگلہ بی بی کو غور سے دیکھا۔پھر میں نے انہیں سلام کیا۔جھجکتے ہوئے کہا "میں انہیں

کیسے نہ جانتا۔ میرا پیشہ صحافت رہا ہے۔ پاکستانی صحافیوں کی برادری میں ان کا بہت نام تھا۔ پھر وہ ناول نگار بھی تو تھے۔ ان کے ایک ناول کا اردو میں ترجمہ رائٹرز گلڈ نے کرایا تھا اور اہتمام سے شائع کیا تھا۔ "ملاح" میں نے یہ ناول پڑھ رکھا ہے۔ سو میں ان کی ان دونوں حیثیتوں سے آشنا ہوں مگر ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا۔"

پنا قیصر نے تامل کیا۔ پھر بولیں "آپ نے اس واقعہ کی خبر تو پڑھی ہوگی کہ کس طرح رات کی تاریکی میں کچھ نامور بنگلہ دانشوروں کو ان کے گھروں سے اٹھایا گیا اور پھر......" وہ رکیں۔ میں نے کہا "ہم نے یہ خبر پڑھی تھی۔ ان دانشوروں میں سے کتنے نام ہمارے لیے بہت جانے بوجھے تھے۔ ادھر سب ادیبوں، صحافیوں پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا تھا۔ بہت عجیب واقعہ تھا اور بہت المناک۔"

"یہ جنگ کے خاتمے سے دو دن پہلے کا واقعہ ہے۔ رات گئے ہمارے دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے شوہر باہر نکلے۔ ان کے ساتھ ہی چلے گئے۔ پھر واپس نہیں آئے۔"

کھانے کی میز پر باتیں کرتے کرتے سب ہی چپ ہو گئے اور کھانے کے وقت تک چپ ہی رہے۔

کھانے کے بعد چائے کا دور شروع ہوا۔ ایک بنگلہ لڑکی آہستہ سے میرے برابر آن بیٹھی۔ بولی "انکل، میری اماں بتا رہی ہیں کہ آپ میرے ابو کو جانتے تھے۔ آپ کبھی ان سے ملے تھے؟"

کتنی معصومیت سے اس نے یہ سوال کیا تھا۔ ایک پاکستانی باپ کی بنگلہ دیشی بیٹی۔ باپ جو پاکستان کے عالم نزع میں جان سے گزر گیا۔ بیٹی جس نے بنگلہ دیش میں آنکھ کھولی اور اب وہ پاکستان سے آنے والے ایک اجنبی سے پوچھ رہی تھی "انکل آپ میرے ابو کو جانتے تھے" اور جب میں نے اسے بتایا کہ تمہارے ابو پاکستان کے ممتاز صحافیوں اور ناول نگاروں میں شمار ہوتے تھے، سو میں انہیں کیسے نہ جانتا تو میں اس کا مستقل انکل بن گیا۔ اگلے دن صبح کو میں سبزہ زار میں اصغر علی انجینئر کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ وہ لڑکی نہیں اب وہ میرے لیے اجنبی لڑکی نہیں تھی، شوی تھی ہاں تو شوی نے جین پہن رکھی تھی۔ گلے میں کیمرہ لٹکا ہوا لپک کر ہماری طرف آئی۔ مجھ سے مخاطب ہوئی "انکل آپ کھڑے ہو جایئے۔" پھر انجینئر صاحب سے "انکل آپ بھی۔" ہم دونوں فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے کھٹ سے کیمرے کا بٹن دبایا اور ہماری تصویر بنالی۔ بس اسی آن پنا قیصر دوسری بنگلہ خاتون روبی رحمٰن کے ساتھ نمودار ہوئیں۔ اس نے انہیں پکارا۔ "اماں ادھر آ کر آپ انکل کے ساتھ کھڑی ہو جائیں۔ آنٹی آپ بھی۔" اور اس نے کھٹ کھٹ کئی بار بٹن دبایا اور تصویریں بنالیں۔

میں بھلا شہید اللہ قیصر کو کتنا جانتا تھا۔ بس نام سن رکھا تھا اور ہاں ان کا ناول "ملاح" پڑھا تھا مگر شوی کے لیے اتنا کافی تھا کہ پاکستان سے آیا ہوا ایک شخص اس کے ابو کو پہچانتا ہے اور وہ گھڑیوں میں مجھ سے کتنی مانوس ہو گئی اور بیٹی کو دیکھ کر ماں کو بھی اب اس پاکستانی سے مغائرت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بنگلہ دیش سے آنے والے وفد میں تین بیبیوں کی اپنی ایک ٹولی تھی۔ پنا قیصر، روبی رحمٰن، تیسری کا نام میں بھول گیا۔ وہ

تینوں نیپالی میزبان منجو کے ساتھ کوئی پروگرام بنا رہی تھیں۔ منجو انہیں بتا رہا تھا کہ اس ریسٹ ہاؤس سے قریب ہی دھولی خیل کی بستی ہے۔ وہاں ایک بڑا مندر ہے۔ آپ صبح میرے ساتھ چلیں۔ ان کا یہ اپنا پروگرام تھا۔ مگر عجب ہوا صبح کو میں ابھی نہا دھو کر فارغ ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پنا قیصر کھڑی ہیں "ارے آپ تیار نہیں ہوئے۔ دھولی خیل چلنا نہیں ہے۔"

"اچھا مجھے بھی چلنا ہے؟"

"کیوں نہیں۔ آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہے۔"

"تو پھر مجھے پانچ منٹ دیجیے۔ کپڑے بدل کر ابھی آتا ہوں۔"

"آیئے ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

میں نے جھٹ پٹ کپڑے بدلے اور باہر نکلا۔ دیکھا کہ تینوں بیبیاں جانے کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ ساتھ میں شوی اور ہاں ٹیگور بابا۔ ہاں اس وفد میں ایک بزرگ بنگالی بھی تھے۔ داڑھی بالکل رابندر ناتھ ٹیگور والی۔ بس ہم سب انہیں ٹیگور بابا کہنے لگے تھے۔ میں جلد ہی ان کے ساتھ بھی گھل مل گیا۔

ہاں مجھے یہ بھی تو بتانا چاہیے کہ آخر ہم یہاں کس خوشی میں جمع ہوئے تھے۔ بات یہ ہے کہ برصغیر میں ہمارے دیکھتے ہوئے نفرت کا جتنا بول بالا ہوا ہے اسی کے حساب سے ردعمل میں امن و آشتی کا پرچار کرنے والے گروپ بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ ایسا ہی ایک گروپ تھا۔ سدھارت جی نام والے ایک دانشور جو شاید جنوبی ہند سے تعلق رکھتے تھے، اس کے کرتا دھرتا تھے۔ انہوں نے اس اجتماع کے مقصد کی اس طرح وضاحت کی کہ برصغیر کی فضا تو اس وقت بہت مسموم ہے۔ ہم نے سوچا کہ اس فضا سے نکل کر کہیں جمع ہوں۔ تو اس مسموم فضا سے دور ہم یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ کوئی باقاعدہ پروگرام نہیں ہے کہ مقالے پڑھے جائیں، تقریریں ہوں اور پھر قراردادیں منظور ہوں اور اخباری بیان جاری ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ بس ہم باتیں کریں گے، سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ آخر ہمارے برصغیر میں یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ جس کے گمان میں جو آئے اور جو اس کا تجربہ ہے، وہ بیان کرے۔ سو نہ کوئی سٹیج نہ ڈائس نہ مائیک۔ نہ کوئی صدارتی کرسی نہ سامعین کے لیے کرسیاں۔ بس سیدھا سادھا فرش بچھا ہوا اس پر یار آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور لگے بولنے بات کرنے۔

اس بات چیت میں جب پنا قیصر کی باری آئی تو اس بی بی نے اس رات ہی کے حوالے سے بات شروع کی جس رات کا انہوں نے کل شام اشارتاً ذکر کیا تھا۔ شوہر کی تلاش میں ان کا گھر سے نکلنا، جا بجا ڈھونڈتے پھرنا، کیا کچھ دیکھنا، ایسا منظر باندھا کہ ان کی گفتگو کے بعد ایک سناٹا۔ پھر کسی نے تجویز پیش کی کہ اس وقت تو بات کرنی ممکن نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ نشست ملتوی کی جائے اور اس پر گفتگو بعد کی نشست پر اٹھا رکھی جائے کہ اس وقت تک ہم اس جذباتی فضا سے نکل چکے ہوں گے۔ سو ایسا ہی کیا گیا۔

لو اس پر مجھے اپنا بنگلہ دیش کا سفر یاد آ گیا۔ ایک دفعہ جب ڈاکٹر مبشر حسن اپنا قافلۂ امن لے کر

ڈھاکہ کی طرف چلے تو پانچویں سواروں میں میں بھی تھا۔ وہاں پہنچ کر مجھے یاد آیا کہ ارے کھٹمنڈو سے چلتے وقت شوی نے مجھے اپنا کارڈ دیا تھا۔ اسی سے مجھے پتہ چلا تھا کہ جسے میں کسن کالج گرل سمجھ رہا تھا وہ تو تعلیم سے فراغت پاکر ڈرامہ نگار اور ڈرامہ آرٹسٹ بن چکی ہے۔ کاش اس وقت وہ کارڈ میرے پاس محفوظ ہوتا تو میں فون پر کتنی آسانی سے پنا قیصر اور شوی سے رابطہ کرسکتا تھا۔ خیر ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں نے غلام محمد کو ڈھونڈ نکالا۔

غلام محمد اصلاً بہار کی مٹی تھے مگر انہوں نے بنگلہ دھرتی سے اپنے آپ کو اتنا پیوست کیا تھا کہ بنگالی بن گئے تھے۔ کہانیاں لکھتے تھے اردو میں۔ اسی تقریب سے میری ان سے یاداللہ چلی آتی تھی۔ مشرقی پاکستان کے انجام سے چند مہینے پہلے وہ کسی سرکاری کام سے لاہور آئے تھے۔ ملاقات ہوئی۔ غصے میں بھرے ہوئے تھے۔ مجھے اپنا فیصلہ سنا گئے۔ میں نے طے کیا ہے کہ میں اب اردو میں نہیں لکھوں گا۔ اب جب ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ بعد کے حالات نے کچھ ایسے گل کھلائے کہ اب وہ بنگلہ دیش والوں کی روش سے بھی دلبرداشتہ تھے۔

ان کے وسیلے سے ان کے ایسے دوست سے ملاقات ہوئی جو کبھی باہنی سے وابستہ رہ چکا تھا لیکن اب اس کے یہاں ایک ذہنی تبدیلی آچکی تھی۔ اب وہ ان دانشوروں کا مخالف تھا جو بنگلہ بھاشا سے فارسی، عربی کے اثرات مٹانے کے درپے تھے۔ کہتے تھے کہ بنگلہ کو خالص بنگلہ بناؤ۔ عربی فارسی کے جو لفظ اس میں راہ پا گئے ہیں، انہیں خارج کرو۔ اس نوجوان دانشور کا نام فرہاد مظہر تھا۔ وہ کہتا تھا کہ بنگلہ میں فارسی، عربی، اردو کے جو لفظ بھی ہیں وہ برقرار رہنے چاہئیں۔ فرہاد مظہر اردو سے یکسر نا آشنا۔ جتنی بھی بات ہوئی انگریزی میں ہوئی مگر میں نے دیکھا کہ ان کی بیگم فریدہ مظہر فرفر اردو بول رہی ہیں۔ سو میں بھی اردو میں شروع ہو گیا۔ پھر ان سے باتیں زیادہ ہوئیں، فرہاد مظہر سے کم۔ باتیں کرتے کرتے میں نے اطمینان کا اظہار کیا کہ غلام محمد کو تو میں نے ڈھونڈ نکالا۔ ان کے واسطے سے بنگلہ اردو کی اتنی اچھی جوڑی سے تعارف ہو گیا مگر مرحوم شہید اللہ قیصر کی بیگم پنا قیصر سے بھی ملنا چاہتا تھا۔ ان کا اتا پتہ مجھے نہیں ملا۔ پوچھا "پنا قیصر کو آپ کیسے جانتے ہیں؟"

میں نے کھٹمنڈو میں ان سے اپنی ملاقات کا احوال سنایا اور ساتھ میں ان کی تقریر کا بھی ذکر کیا۔ بولیں کہ "ارے آپ نے انہیں صرف انگریزی میں سنا ہے۔ ان کے اصل جوہر تو اس وقت کھلتے ہیں جب وہ بنگلہ میں بولتی ہیں۔ ہاں اب تو وہ پارلیمنٹ کی ممبر ہیں۔ ان کی مصروفیات اب بہت بڑھ گئی ہیں۔" یہ کہتے کہتے وہ اٹھیں، فون کا ڈائل گھمایا اور کسی سے بنگلہ میں باتیں کرنے لگیں۔ پھر ریسیور میرے ہاتھ میں پکڑا دیا "لیجیے بات کیجیے۔"

"کس سے؟" میں نے پوچھا۔ جواب دیا۔ "پنا قیصر سے۔" یہ سن کر میں کتنا خوش ہوا۔ پنا قیصر بتانے لگیں کہ "آج ہی شوی نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ انکل ڈھاکہ آئے ہوئے ہیں۔ اس نے ٹی وی پر آپ کو دیکھا تھا۔" تب میں نے معذرت کی کہ آپ کا فون نمبر مجھے دستیاب نہ ہو سکا۔ اب تو میں صبح روانہ ہو رہا ہوں۔

بس پھر میں نے شوی کی خیریت پوچھی۔ انہیں الوداعی آداب کیا۔ ہاں اگلی صبح جب میں سامان باندھ رہا تھا تو غلام محمد شوکت عثمان کو لے کر آن موجود ہوئے۔ ارے واہ بنگلہ کے اس مصنف سے تو میں پہلے مل چکا تھا۔ اب

غیر متوقع طور پر ملاقات کتنی خوشی ہوئی اور انہوں نے باری باری کتنے ہم عصروں کا نام لیا اور کہا کہ ان سب کو میرا اسلام پہنچانا۔ میں نے وعدہ کیا کہ ان سب دوستوں کو آپ کا سلام پہنچا دوں گا۔ بس خدیجہ مستور تک آپ کا سلام نہیں پہنچا سکوں گا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ حالات زمانہ اور اپنی بے خبری پر انہوں نے کتنا ماتم کیا۔ بس اسی ملاقات پر میرا ڈھاکہ کا سفر تمام ہوا۔

میں نے دوستوں کو یہ کہتے سنا تھا کہ اب ہمارے ساتھ ہم وطن اور حال بنگلہ دیش کسی موڑ پر مل جاتے ہیں تو کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔ شاید ایسا ہی ہو مگر میں نے اپنا تجربہ بیان کر دیا۔ وہ تو اس تجربے سے بالکل مختلف ہے۔

لو ان بچھڑے ہوئے اہل وطن کے ذکر پر مجھے ناصر کاظمی یاد آ گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو میں مشرقی پاکستان کے ایک ادبی سفر کا ذکر کر رہا تھا اس سفر پر میں تو نہیں گیا تھا، ناصر گیا تھا اور وہاں سے سبز جھیلوں کے دیس کے کتنے منظر آنکھوں میں لیے واپس آیا تھا۔ اپنی شاعری میں اس نے اس دیار کو اسی نام سے یاد کیا ہے۔ مشرقی پاکستان کے انجام کے جلد بعد ہی تو اس کی طبیعت بگڑی تھی اور ایسی کہ فوراً ہی ہسپتال پہنچ گیا۔ ان ایام میں سبز جھیلوں کا دیس جواب پرایا دیس بن چکا تھا، اسے ہر پھر کر یاد آتا رہا۔ آخری ایام کے اس کے اشعار بھی بتاتے ہیں ۔

جنت ماہی گیروں کی
ٹھنڈی رات جزیروں کی
سبز سنہرے کھیتوں پر
پھواریں سرخ لکیروں کی

یہ ڈھونڈتا ہے کسے چاند سبز جھیلوں میں
پکارتی ہے ہوا اب کسے کنارے پر

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے
یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمین کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوئے

بس یہی کچھ سوچتے سوچتے اس نے آنکھیں موند لیں اور اب کوئی کوئی ان بیتے دنوں کو یاد کرتا ہے

اور پوچھتا ہے ؎

کہاں ہے وہ اجنبی، مسافر
کہاں گیا وہ اداس شاعر

اسی کے پیچھے پیچھے ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے اندر کئی ایک اور شاعر چلے گئے۔ یوسف ظفر، باقی صدیقی۔
حلقۂ ارباب ذوق میں ان دنوں نعرہ بازوں کی ایک ٹولی اپنا ڈھول بجا رہی تھی۔ ناصر کا جلسۂ تعزیت تو خیریت سے گزر گیا مگر جب حلقہ کے پرانے رکن اگلی اتوار کو اس توقع پر پہنچے کہ حلقہ اپنے گزرے ہوئے شاعر یوسف ظفر کو یاد کرے گا تو اس ٹولی نے شور مچا دیا کہ کیا حلقہ پرانے دھرانوں کے تعزیتی جلسے کرنے ہی کے لیے رہ گیا ہے۔ خیر شور مچایا۔ وہ تو اس آس پر وہاں بیٹھے تھے کہ انقلاب اب آیا کہ اب آیا۔ ناصر کے تعزیتی جلسہ کی وجہ سے اس آمد میں پہلے ہی ایک ہفتے کی تاخیر ہو گئی تھی۔ یہ دوسرا تعزیتی جلسہ ہوتا تو انقلاب کی آمد مزید دو ہفتوں کے لیے ٹل جاتی۔ مگر انجم رومانی بگھر گئے اور حلقہ کی اس ہڑ بونگ سے اپنے قطع تعلق کا اعلان کر کے چلے گئے۔ ان کے ساتھ حبیب جالب بھی وہاں سے نکل آئے۔ پھر ان دونوں نے ٹی ہاؤس میں آ کر اعلان کیا کہ اصلی حلقہ تو ہم ہیں۔ یہ کونسی ریوڑ یہاں گھس آئی ہے۔ سو لیجیے حلقۂ ارباب ذوق دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ نیا قائم ہونے والا حلقہ حلقۂ ارباب ذوق ادبی کہلایا۔ برعکس اس حلقہ کے جس میں سیاسی ہڑ بونگ مچی ہوئی تھی اور اس حساب سے حلقۂ ارباب ذوق سیاسی اس کا نام پڑ گیا۔

اور لیجیے اب حلقۂ ارباب ذوق ادبی کی نشستیں ٹی ہاؤس کی بالائی منزل میں شروع ہو گئیں۔ کچھ پرانے حلقی جیسے شہرت بخاری، انجم رومانی، سلیم شاہد۔ کچھ نووارد چہرے۔ ان میں سب سے نمایاں سہیل احمد خاں تھے۔ اس نووارد کے ادبی جوہر اب کھلنے لگے تھے۔ تنقید میں بھی اور شاعری میں بھی۔ پھر اس نے اس حلقہ کا انتظام سنبھالا۔

یار پوچھیں گے کہ حبیب جالب کس خوشی میں اس حلقہ سے نکلے۔ اس خوشی میں کہ وہ تو چینی برانڈ کی انقلابی کی ٹولی تھی۔ ان کے حساب سے حبیب جالب ترمیم پسند تھا۔ پچھلے سب ترقی پسند ان کے حساب سے ترمیم پسند تھے۔ ان سب ترقی پسندوں کو روس و نیز ہندوستان کے کھاتے میں ڈال کر انقلابیوں کی یہ ٹولی اپنے حساب سے محب وطن بن گئی تھی۔ ایک چینی ٹکٹ میں دو مزے۔ انقلابی بھی محب وطن بھی۔

ادھر باسی کڑی میں اُبال آیا۔ قیوم نظر تک جب اس بٹوارے کی خبر پہنچی تو انہوں نے دعویٰ کیا کہ اصلی حلقہ تو میں ہوں۔ سو انہوں نے اپنے گمشدہ رفقاء کو کونوں کھدروں سے نکال کر اکٹھا کیا اور مسلم مسجد کے قریب ایک مناسب سا گوشہ تلاش کر کے اپنے حلقہ کے جلسے شروع کر دیے۔

مگر یہ سب گھڑی بھر کا تماشا تھا۔ ضیاء الحق کا مارشل لا آیا کھڑا تھا۔ جب وہ سروں پر آن ٹوٹا تو کیسا حلقۂ ارباب ذوق سیاسی اور کہاں کا حلقہ ارباب ذوق ادبی۔ باری باری سب ٹھنڈے ہو گئے۔ خیر

ادیب تو پھر بھی سرگرم رہے۔ٹی ہاؤس میں بحث کا باب اب بھی کھلا ہوا تھا۔بس موضوع بدل گیا تھا۔کہاں کی رباعی، کہاں کی غزل۔ پہلے یہ طے ہونا چاہیے کہ جرنیل ضیاء الحق کب رخصت ہو رہے ہیں۔یہی ہوتا تھا۔جب ادب کے لیے رستے بند ہو جائیں تو یاران ادب کے لیے دو ہی رستے رہ جاتے ہیں یا شراب و کباب یا سیاست یا دونوں۔

مگر ہماری دنیائے ادب میں ایک طبقہ ایسا بھی تو چلا آتا ہے جنہیں نہ کبھی شراب و کباب سے رغبت ہوئی نہ سیاست سے۔آخر ادبی سرگرمیوں کی بحالی انہیں کے ہاتھوں ہوئی۔جمیلہ ہاشمی کو ناول و افسانہ لکھتے لکھتے خیال آیا کہ فکشن کے قارئین برحق مگر اس کے سامعین کہاں گم ہو گئے۔اب تو کوئی ایسی محفل ہی نہیں ہوتی جہاں جا کر افسانہ سنایا جا سکے۔انہیں خوب سوجھی کہ شب افسانہ کا ڈول ڈالا جائے۔ایک شب اپنے دولت کدے پر انہوں نے کھانے دانے کا اہتمام کیا اور کتنے ہم عصروں کو بلاوا بھیجا کہ شب افسانہ میں تشریف لائیے۔افسانے سنیے اور کھانا کھائیے۔

شب افسانہ کا نسخہ بہت کامیاب رہا۔اسے مزید کامیاب بنایا بیگم حجاب امتیاز علی نے۔شب افسانہ کے بے قاعدہ سلسلہ میں انہوں نے ایک قاعدہ قرینہ پیدا کیا۔اس طرح کہ من و سلویٰ کے نام سے ایک ماہانہ محفل شبانہ کا ڈول ڈالا۔اس میں افسانے کے ساتھ شاعری کو بھی شامل کیا۔سو شاعروں، افسانہ نگاروں دونوں کو اس تنظیم کا رکن بنایا۔مقام انعقاد ہر مہینے بدلا ہوا۔اس مہینے ایک رکن میزبان، اگلے مہینے کوئی دوسرا میزبان۔شریک ہونے والوں کو پابند کیا کہ اپنے ساتھ ایک ڈش لے کر آئے۔ایک افسانہ یا ایک غزل۔اور ہاں دو موم بتیاں اور ایک ماچس کی ڈبیا۔آخر لوڈ شیڈنگ کو بھی تو ملحوظ رکھنا تھا۔اگر لکھنے والی ہے تو اپنے شوہر کو ساتھ لا سکتی ہے۔لکھنے والا ہے تو بیگم کو ساتھ لے کر آئے۔زیادہ سرگرمی جن بیبیوں نے دکھائی وہ تھیں کشور ناہید، نثار عزیز، بیگم ادا جعفری، بیگم شیخ منظور الٰہی اور جمیلہ ہاشمی تو تھیں ہی کہ انہوں نے ہی تو یہ راہ دکھائی تھی۔ویسے حجاب آپا خاتون شناس بی بی تھیں۔انہوں نے جلد ہی بھانپ لیا کہ جس پر پورا اعتبار کیا جا سکتا ہے وہ ہیں نثار عزیز۔مکمل وفاداری کی اہل۔جس کی طرف سے چوکنا رہنا چاہیے وہ ہیں کشور ناہید۔مگر جس خاتون نے سب سے پہلے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی وہ تھیں بیگم ادا جعفری۔ان سے انہیں شکایت یہ تھی کہ وہ من و سلویٰ والے نسخہ کو لے کر اسلام آباد چلی گئیں۔وہاں انہوں نے اسی نسخہ کو اپنی ایجاد بنا کر آزمایا۔بہر حال ایسی ادبی محفلوں کا سلسلہ ان کی وساطت سے اسلام آباد میں چل نکلا۔پھر کراچی میں بھی انہیں کی وساطت سے اس سلسلہ نے فروغ پایا۔

پاکستان میں آگے چل کر جب نئی خواتین نے آزادیٔ نسواں کا علم بلند کیا تو یہاں ادب میں تو پہلے ہی نسوانی کسمساہٹ کے آثار نظر آرہے تھے، سو کچھ بے چین روحیں ادھر لپک کر پہنچیں اور ہراول دستے میں شامل ہو گئیں۔کم از کم تین نام تو فوراً ذہن میں آگئے ہیں۔کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، فاطمہ حسن۔ویسے عجب ہوا کہ پاکستان میں مرد پیچھے رہ گئے۔اس آن دو تو تیں پوری قوت سے ابھر کر سامنے آگئیں...... ملا اور نئی

عورت۔ تو اس وقت ہم آپ دو پاٹوں کے بیچ میں ہیں۔

ہاں ادھر حلقۂ ارباب ذوق کے جب تینوں چراغ گل ہو گئے تو کسی کھوہ سے روشنی کی کرن بن کر مبارک احمد نمودار ہوئے۔ ہاتھ میں حلقہ کا علم لیے۔ مڑ کر کسی طرف نہیں دیکھا۔ نہ حلقہ کے پرانے ٹھکانے وائی ایم سی اے کی طرف، نہ ٹی ہاؤس کی طرف، نہ حلقہ کے نئے پرانے ادیبوں کی طرف۔ سیدھے چائنیز ریستوران میں گئے۔ چائنیز ریستوران جو آنجہانی کافی ہاؤس کی بغل میں واقع تھا۔ بس وہاں جا کر حلقہ کا علم گاڑ دیا۔ وہ اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر چائنیز پہنچتے پہنچتے کتنے سرفروش ان کے ساتھ آن شامل ہوئے تھے۔ وہاں انہوں نے حلقہ کا جلسہ کیا۔ لیجیے حلقہ مر کر پھر زندہ ہو گیا۔ اس کی ہفتہ وار نشستیں شروع ہو گئیں۔

مبارک احمد حلقہ کی پرانی بڈی۔ اس آڑے وقت میں حلقہ کو ان کے سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ موقعۂ واردات پر پہنچے اور اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ مگر ایک دوسرا فرض بھی تو انہیں پکار رہا تھا۔ نثری نظم کی تحریک مشکل میں پھنسی ہوئی تھی۔ دشمنوں کی اس پر یلغار تھی۔ حلقہ کو چالو کر کے انہوں نے اس طرف توجہ دی۔ نثری نظم کی تبلیغی مہم پر چل کھڑے ہوئے۔

مبارک احمد پیدائشی مشنری تھے۔ انہیں ہر دم کسی ایسے مقصد کی تلاش رہتی تھی جس کے لیے وہ اپنے آپ کو تج سکیں۔ ایسے کتنے مقصدوں کو انہوں نے باری باری اپنایا اور اسے ایک مقدس فریضہ جان کر اس کے فروغ کے لیے سرگاڑی پیر پہیہ کر دیا۔ اور صرف وہ ادب تک محدود نہیں تھے۔ ان کی جان کے لیے اور فکریں بھی تھیں۔ پاکستان میں جمہوریت کی گاڑی کونسی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے، بے نظیر بھٹو کس مشکل میں گرفتار ہیں۔ عالمی امن کو کونسے خطرے درپیش ہیں۔ انہوں نے باری باری ہر علم اٹھایا اور اس کی سربلندی کے لیے کام کیا۔ اس تگاپوئے دمادم ہی کے زور پر تو وہ ایک سدا بہار شخصیت بنے ہوئے تھے۔

اے لو، میں ایران توران کی ہانکے چلا جا رہا ہوں۔ اپنے قدموں کے نیچے سے جو زمین سرک رہی ہے اس کا کوئی ذکر فکر ہی نہیں۔ ''مشرق'' میں بہت رہ لیے۔ اب یہاں اپنے آخری ایام تھے مگر خود ''مشرق'' کے بھی یہ آخری ایام تھے۔ اصل میں تو جو اخبار پریس ٹرسٹ کی آغوش میں آ گئے تھے ان کا مستقبل اسی گھڑی سے مشکوک ہو گیا تھا۔ پھر بھی ''مشرق'' نے ایوب خاں اور یحییٰ خاں دونوں کا زمانہ خیریت سے گزار لیا مگر ضیاء الحق کا زمانہ اس پر بہت بھاری پڑا۔ مگر اس دفتر میں ہماری محفل تو پہلے ہی برہم ہو چکی تھی۔ یہ دور بھی ہم نے لشتم پشتم گزارا مگر ہمارا جانا بہرحال اب ٹھہر گیا تھا۔

ہماری محفل کی مت پوچھو۔ اخبار جب نیا نیا نکلتا ہے تو اس میں عجب گہما گہمی ہوتی ہے۔ ایسی گہما گہمی ہم نے سب سے پہلے ''امروز'' کے دفتر میں دیکھی تھی یا اب ''مشرق'' میں دیکھ رہے تھے۔ پہلے تو یہ سن لیجیے کہ اس اخبار نے آغاز کرتے ہی اخباری دنیا میں کیا گل کھلائے اور کیسے کیسے شگوفے چھوڑے۔ اس اخبار کے کرتا دھرتا اور روح رواں تو عنایت صاحب تھے۔ انہیں نرالی سوجھتی تھی اور خوب سوجھتی تھی۔ اپنے مزاج کے

عین مطابق انہیں ایک فیچر رائٹر مل گیا۔ ریاض بٹالوی۔ اسے بھی نرالی سوجھتی تھی۔ ایک مرتبہ جان بوجھ کر گم ہو گئے۔ ''مشرق'' نے شہر میں ڈونڈی پیٹ دی کہ ''مشرق'' کی آنکھ کا تارا، اڑتی چڑیا کا پکڑنے والا، شہر کے خفیہ دھندوں کا بھید پانے والا لاپتہ ہے۔ کسی کو پتہ ملے تو بتائے۔ کتنے حلقوں میں اس سے کھلبلی پیدا ہوئی۔ پولیس بھی چوکنی ہو گئی۔ ضرور چوکنی ہو گئی ہو گی۔ اپنی خفیہ کو بھی پتہ پانے کے لیے ادھر ادھر دوڑایا ہو گا مگر ریاض بٹالوی نے تو انہیں گمشدگی کے دنوں میں کتنے تھانوں میں تاکا جھانکا۔ انسپکٹروں، کانسٹیبلوں کے ساتھ گپ شپ کی۔ ان کی آنکھوں میں دھول جھونکی۔ پھر سب کو ہرا کر اپنی مہم کی کامیابی اور اپنی واپسی کا اعلان کیا۔ بتایا کہ تھانوں میں کیا ہوتا ہے۔ وارداتیں ہوتی رہتی ہیں اور وہ بے خبر رہتے ہیں۔ موصوف ایک مرتبہ کراچی جا کر مریض کا بھیس بنا کر ایک بڑے سرکاری ہسپتال میں جا کر داخل ہو گئے۔ چار چھ دنوں وہاں صاحب فراش رہے۔ جب وہاں سے رہائی ملی تو ہسپتال میں جو کچھ ہوتا دیکھا تھا، اس سے ایسا فیچر تیار کیا کہ ''مشرق'' کی جے جے ہو گئی۔ تو یہ تھے ریاض بٹالوی۔

''مشرق'' کے مطلع پر ایک نسوانی ستارہ نمودار ہوا۔ مسرت جبیں جن کے کالم کی پیشانی پر درج عبارت کہ ''عورتوں کے لیے ایک کالم جسے مرد بھی پڑھ سکتے ہیں۔'' عقلمندوں کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ مردوں نے اشارے کو سمجھا کہ انہوں نے عورتوں سے بڑھ کر اسے پڑھا اور کالم پر فریفتہ ہو گئے۔

جائے تنگ و مرداں بسیار۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں ہم کتنے رفیق ٹھنس ٹھنسا کر بیٹھتے تھے۔ کمین احسن کلیم جو اس وقت اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے، آگے چل کر ایڈیٹر بنے۔ حسن عابدی۔ پھر دو کالم نگار ائیں بھی آن براجیں۔ فریدہ جو اس وقت خالی فریدہ تھیں۔ فریدہ حفیظ ہمارے دیکھتے دیکھتے بن گئیں۔ البتہ مائل بہ فربہی اسی وقت سے تھیں۔ اس لیے ان کے لیے گنجائش پیدا کرنے کے لیے مجھے سکڑ کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ کمین احسن کلیم لکھنؤ سے وارد ہوئے تھے۔ شاید نئی شاعری کے کسی انتخاب میں ان کی دو ڈھائی نظمیں دیکھی تھیں مگر یہاں آ کر وہ خالص صحافی بن گئے۔ آ کر بس فوراً ہی لکھنا شروع کر دیتے۔ بولتے نہ بات کرتے کہ منہ میں شاید زبان ہی نہیں تھی۔ بس جب حکیم حبیب اشعر چہکتے ہوئے یہاں آن وارد ہوتے تو ان کا چہرہ بھی کھل اٹھتا۔ حکیم صاحب سے باتیں کرنے کا فریضہ بہر پھر کر مجھے ہی ادا کرنا پڑتا۔ حسن عابدی بھی کم کم ہی بولتے تھے۔ حسن عابدی سے میری رفاقت روزنامہ ''آفاق'' میں رہ چکی تھی۔ اس سے پہلے کیا کرتے تھے۔ بس لوگ پنڈی سازش کیس کے ستم زدوں کے ساتھ رنج اسیری کھینچتے تھے۔ خدا خدا کر کے وہاں سے رہائی پائی تو میرے قرب و جوار ہی میں کہیں انہوں نے ڈیرہ ڈالا تھا۔ ایک روز صبح ہی صبح پروفیسر احراز نقوی نے کہ وہ بھی لکھنؤ کا تک تھے، میرا دروازہ کھٹکھٹایا تو دیکھا کہ احراز نقوی ہیں اور ان کے ہمراہ ایک مخنی شخصیت۔ تعارف ہوا کہ یہ حسن عابدی ہیں۔ بس اس پہلی ہی ملاقات میں اس ناکام انقلابی سے اس رجعت پسند کا دل مل گیا۔ دل سے دل کو راحت ملی اور آخر وقت تک برقرار رہی۔ پہلے ''آفاق'' اور پھر ''مشرق'' میں ساتھ رہا۔ پھر زمانے بعد

جب میں نے ''ڈان'' میں لکھنا شروع کیا تو اولاً انہیں سے سابقہ پڑا اور کتنے گھٹے تھے کہ ''مشرق'' میں ہمارے یار دوست آتے اور ادب پر سو طرح کی بات ہوتی تھی مگر مجال ہے کہ کبھی انہوں نے چغلی کھائی ہو کہ وہ بھی شاعری میں قدم رکھتے ہیں۔ وہ تو جب ''مشرق'' اور ''اخبار خواتین'' سے فارغ ہو کر کراچی میں انہوں نے اپنا مجموعۂ کلام چھپوایا تب ہم پر کھلا کہ جسے ہم خالی انقلابی اور صحافی سمجھ رہے تھے، وہ تو اندر سے شاعر نکلا۔

ہاں اس کمرے سے باہر نیوز روم میں بھی تو کچھ یار بیٹھے ہوئے تھے۔ سب سے بڑھ کر سبحانی صاحب کہ صحافت کے سوا دو اور ہنر ان کی مٹھی میں تھے۔ دست شناسی اور ہومیو پیتھی۔ میرا ہاتھ دیکھ کر وہ بتا چکے تھے کہ ابھی خاصے عرصے تک کوئی بیرونی سفر تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس کے بس چند ہی دنوں بعد میں نے انہیں بتایا کہ میں امریکہ جا رہا ہوں۔ پھر ہاتھ دیکھا اور حکم لگایا کہ تم تو امریکہ نہیں جا رہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے تو ٹکٹ بھی موصول ہو چکا ہے۔ بالکل غیر متوقع طور پر وزیر اعظم کے صحافتی دستے میں مجھے شامل کر لیا گیا ہے۔ پرسوں مجھے روانہ ہو جانا ہے۔ کہا کہ اچھا دیکھیں گے اور چپ ہو گئے۔ میں پروگرام کے مطابق دو دنوں بعد روانہ ہو گیا۔ کراچی میں ہم سفروں کے ساتھ پرل کانٹی نینٹل میں عارضی قیام کیا۔ پتہ چلا کہ پہلے اٹلی جائیں گے۔ وہاں سے امریکہ۔ جلدی جلدی سب کے پاسپورٹ اکٹھے کیے گئے کہ اٹلی کا ویزا حاصل کیا جائے۔ یہ عمل جاری تھا کہ اچانک اطلاع آئی کہ پورا سفر ملتوی۔ امریکی صدر کو ناسازی طبع نے آ لیا۔ وہ ہسپتال میں ہے۔ بھٹو صاحب ادھر جاتے جاتے رک گئے۔ میں نے لاہور واپس آ کر سبحانی صاحب کے ہاتھ چوم لیے۔

دوسری مرتبہ پھر یہی ہوا۔ کولمبیا یونیورسٹی میں ایک اردو کانفرنس تھی۔ وہاں سے دعوت نامہ آیا۔ گھر بیٹھے ویزا بھی مل گیا۔ جانے میں ایک ڈیڑھ ہفتہ رہ گیا تھا کہ ادھر تو گیارہ والی واردات گزر گئی۔ اگلے دن کراچی سے جمیل جالبی کا فون آیا کہ میرے بیٹے کا ادھر سے فون آیا ہے کہ یہاں حالات خراب ہیں۔ فی الحال مت آئیے۔ تو میں تو نہیں جا رہا۔ میں نے کہا کہ جو ہم سفر کی نیت وہ ہماری نیت۔ میں نے فوراً ہی بندھا بستر کھول دیا۔

مگر جب اس کے سال ڈیڑھ سال بعد نیو یارک سے علی گڑھ اولڈ بوائز السنائی کی طرف سے بلاوا آیا تو میں نے سوچا کہ یہ جو مجھے خوبی قسمت سے گھر بیٹھے بٹھائے پانچ سال کا ملٹی پل ویزا مل گیا تھا، اسے پھپھوندی لگ رہی ہے۔ کیوں نہ اسے استعمال کیا جائے اور ویسے بھی سبحانی صاحب کی دست شناسی کے حساب سے بیرونی سفر کا باب میرے لیے اب کھل چکا ہے۔ سو چلو اٹھو۔ حرکت میں برکت ہے۔ سو میں بلا تکلف اٹھا اور بلا تکلف نیو یارک پہنچا۔ مگر اس شہر کے شور نے مجھے اتنا حواس باختہ کیا کہ تقریب سے نبٹ کر الٹے پاؤں واپس آیا اور توبہ کی کہ اب پھر اس دیار کا رخ نہیں کریں گے۔ امریکہ کی سرزمین کو چھونے کی رسم تو پوری ہو ہی گئی۔

لو میں کدھر نکل گیا۔ ذکر تو یہ تھا کہ ''مشرق'' میں چار دن اچھے گزر گئے۔ اس چھوٹے سے گوشے میں کیسے کیسے یار جمع ہو گئے تھے۔ کوئی دلی کا روڑا، کوئی لاہور یا کوئی لکھنوا۔ کوئی رنج اسیری کھینچ کر یہاں پہنچا

تھا، کوئی ٹی ہاؤس سے اٹھا اور یہاں آن بیٹھا۔ پھر ان یاروں کے یار، ایک جا رہا ہے دوسرا آ رہا ہے۔ ارے اب کا زمانہ تھوڑا ہی تھا کہ اخبار کے دفتر میں داخل ہوتے ہی قدم قدم پر شناخت کرانی پڑتی ہے۔ اندر سے کوئی ضامن بنے گا تب آپ دفتر میں داخل ہو سکیں گے۔ تب رنگ زمانہ اور تھا۔ جس یار کو گپ بازی کی سوجھی اس نے منہ اٹھایا اور اخبار کے دفتر میں آن دھمکا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں اور در کھلے رکھتے ہیں۔ اب ان دروں پر پہرے ہیں۔ اخبار نویس سات تالوں میں بند ہو کر بیٹھتے ہیں۔

ویسے زمانے کو قرار اس وقت بھی نہیں تھا اور جب جنرل ضیاء الحق کے سبز قدم آئے تو نئے نئے گل کھلے۔ ''مشرق'' پر تو پریس ٹرسٹ کا سایہ تھا۔ گل تو یہاں بھی کھلنے تھے۔ عنایت صاحب دنیا سے سدھار چکے تھے۔ اب آنے جانے کے لیے رستہ پہلے سے بڑھ کر ہموار تھا۔ باہر سے تھا کون آنے والا۔ اندر ہی سے ایک نیا گل کھلا۔ ضیاء الاسلام انصاری کے جو ہر کو اب ایک جوہر شناس میسر آیا۔ ضیاء الحق نے ضیاء الاسلام کی قدر کو جانا اور چیف ایڈیٹر کی کرسی پر بٹھا دیا۔ چیف ایڈیٹر انہیں ضیاء الحق نے بنایا۔ پیش امام وہ خود بن گئے۔ ''مشرق'' میں جو گنے چنے نمازی تھے، وہ ظہر کے وقت دفتر سے نکلتے اور قریب کی مسجد میں نماز ادا کرتے۔ اب ضیاء الحق کی دینداری نے کیا خوب اثر کیا کہ سرکاری دفتروں میں سب ہی نمازی بن گئے۔ ''مشرق'' میں ظہر کے وقت صفیں کھڑی ہوتیں اور ضیاء الاسلام انصاری بنفس نفیس امامت کا فریضہ انجام دیتے۔

ایک میں ہی اس امامت میں فریضۂ نماز ادا کرنے سے محروم رہا۔ رفقاء نے کریدا تو میں نے اپنی مجبوری بتائی کہ فقہ جعفریہ میں پیش امام کے لیے کچھ شرائط ہیں۔ وہ شرائط اگر وہاں پورے ہوں تب اس کی امامت میں نماز جائز ہے۔ پوچھا کہ اگر وہ شرائط پورے نہ ہوں تو پھر؟ جواب میں میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ پھر وہی جو علامہ اقبال نے کہا ہے کہ۔

ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر

یوں بھی اب اپنے چل چلاؤ کا وقت تھا۔ ایڈیٹر صاحب کی طرف سے ہدایت نامہ جاری ہوا کہ جس نے ''مشرق'' میں پچیس برس پورے کر لیے ہیں، اسے سلام رخصت کرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ پرانوں سے جان چھڑانے کا بہت مناسب طریقہ تھا۔ دفتر میں اس سے بہت کھلبلی پڑی۔ میں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ اب جبکہ میں نے اس اخبار میں عمر عزیز کے پچیس برس بخیر و خوبی گزار لیے ہیں تو سلام آخر کہو اور اس دفتر سے نکل لو۔ چلتے ہوئے سبحانی صاحب کو ہاتھ دکھایا کہ پنشن، پراویڈنٹ فنڈ، گرایجویٹی وغیرہ وغیرہ کے بارے میں میرے ہاتھ کی لکیریں کیا کہتی ہیں۔ انہوں نے ہاتھ دیکھے بغیر ہی کہہ دیا کہ لاتقنطوا من رحمتہ اللہ۔ میں یا قسمت یا نصیب کہتا دفتر سے نکل لیا۔

80........03........03

جوں غنچہ میرا اتنے نہ بیٹھے رہا کرو

سیر و تفریح کا عمل دخل میری زندگی میں بہت کم رہا ہے۔ ایک وقت تک نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو۔ جانے وہ کونسا اشارہ تھا جس نے مجھے اچانک اکسایا۔ بیٹھے بیٹھے اٹھ کھڑا ہوا اور سفر پہ نکل پڑا۔ عجب سفر تھا۔ راتوں رات زمان و مکان دونوں بدل گئے۔ جب صبح ہونے پر ریل سے اتر کر میں نے ارد گرد نظر ڈالی تو حیران ہوا کہ یہ کونسی اقلیم ہے۔ کل تک میں جہاں تھا وہاں زمین اور تھی فلک اور تھا۔ اب جہاں ہوں زمین اور ہے فلک اور ہے۔ کتنے پرانے ملک سے چل کر کتنے نئے ملک میں آ گیا۔ کل بنا تھا آج میں یہاں آن موجود ہوا۔ پھر جس نگر میں آ کر ڈیرہ ڈالا تھا، اسی سے پیوست ہو کر رہ گیا۔ کراچی سے یاروں، دوستوں کے عزیزوں کے بلاوے آتے رہے مگر حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔ آگے کے سفر کی ہمت نہیں تھی اور خواہش بھی نہیں تھی۔ سوچا کہ آگے جا کر کیا لو گے اور یہ جو چار دوست تمہیں یہاں مل گئے ہیں ویسے دوست کہاں ملیں گے۔ اور دیکھو جو گرمی جاڑا چھوڑ کر تم آئے تھے، وہ یہاں بھی ہیں۔ بس ذرا ساون بھادوں میں یہ نگر وہاں سے مار کھاتا ہے مگر آگے جاؤ گے تو یہ جو تنک سے ساون بھادوں یہاں ہیں، اس سے بھی جاؤ گے۔ سو یہی آخر کو ٹھہرا گھر ہمارا۔ اب میں ہوں، انتظار حسین ڈبائیوی ثم لاہوری۔

سفر سے شروع میں اتنا ابا تھا کہ جب رائٹرز گلڈ ادیبوں کا ایک لمبا چوڑا قافلہ لے کر مشرقی پاکستان چلا، ایسا قافلہ جس میں کم و بیش سب ہی معروف ادیب شامل تھے، تو میں نے معذرت کر لی اور صحیح معذرت کی کہ میں تو بنیادی طور پر اکے کی سواری ہوں، یاں قافلہ ہوائی جہاز سے روانہ ہو رہا تھا۔ یہ سواری میرے لیے اتنی اجنبی تھی کہ اس سے زیادہ تو اڑن کھٹولے کی سواری مجھے مانوس محسوس ہوتی تھی۔ کتنی مشکلوں سے میں اکے سے اتر کر ریل گاڑی میں بیٹھا تھا مگر اس میں بھی کتنے سفر کیے تھے، ایک ہاتھ کی انگلیوں سے بھی کم۔

مگر نئے زمانے میں رہ کر کوئی بھی شخص کتنے عرصے تک ہوائی جہاز کی سواری سے کترا سکتا ہے اور کب تک دور دیسوں کے سفر سے دور رہ سکتا ہے۔ وہ زمانہ بہت دن ہوئے گزر چکا تھا جب کوئی لندن کا پھیرا لگا آتا تھا تو اس کے نام کے آگے فخر یہ لندن ریٹرنڈ لکھا جاتا تھا۔ اب یہ عالم ہے کہ ایرا غیرا نتھو خیرا جس سے بات کرو پتہ چلتا ہے کہ وہ لندن ریٹرنڈ ہے یعنی ولایت پلٹ۔ لندن کو ہم ان دنوں ولایت کہا کرتے تھے۔

ہماری ڈبائی میں ایک بزرگ تھے جنہیں سب بیرسٹر صاحب کہتے تھے اور میں اور میرے ساتھ کے سب لڑکے بالے کتنی حیرت سے انہیں دیکھتے تھے اور کتنا رعب تھا ان کا ہم پر۔ وہ ولایت میں بسر کر کے آئے تھے۔ ان کے نام کے آگے لندن ریٹرنڈ لکھا جاتا تھا۔ مگر اب ہوا یوں کہ یوم میراجی کی تقریب تھی۔ الطاف گوہر اس کی صدارت کر رہے تھے۔ چائے کی میز پر ان سے علیک سلیک ہوئی تو اچانک ایک سوال کیا کہ اگر ہم آپ کو لندن بلائیں تو آپ آنا پسند کریں گے۔ میں ہکا بکا کہ میں یہ کیا سن رہا ہوں۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا، نیکی اور پوچھ پوچھ۔ اچھا تو پھر تیاری کر لیجیے۔ بس اس کے بعد ہی ادھر سے افتخار عارف کی طرف سے پروانہ آیا اور لندن کے سفر کا مژدہ جانفزا اپنے ساتھ لایا۔ میں نے ولایت کے بھولے بسرے گلیمر کو یاد کیا اور رنگ کھڑا ہوا۔ ارے لو، اس گلیمر کو قرۃ العین حیدر کے ہاتھوں جو زک لگا تھا، اسے تو میں بھولا ہی جا رہا تھا۔ اصل میں لندن پہنچ کر جب میں نے بی بی سی کا پھیرا لگایا تب مجھے یاد آیا کہ ارے یہ تو وہ اقلیم ہے کہ زمیں جس کی چہارم آسماں ہے۔ قرۃ العین حیدر نے "آگ کا دریا" میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ جس بی بی کا ذکر کیا وہ ہمارے لیے کوہ قاف کی پری بن گئی۔ جس صاحب کو اپنے قلم سے نوازا وہ ہمارے ڈبائی کے بیرسٹر صاحب سے بڑھ کر بیرسٹر نظر آیا اور ایک ایسے بیرسٹر کے ساتھ بیٹھ کر ہم نے ٹی ہاؤس میں کتنی بار چائے پی ہے۔ وہ تھے اعجاز حسین بٹالوی۔ اعجاز صاحب کا ذکر آیا تو مت پوچھو کہ اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔ مجھے انہوں نے کتنے طعنے دیئے کہ انتظار حسین، کبھی لاہور سے قدم باہر بھی نکالا کرو۔ آدمی ایک شہر میں بند ہو کر رہ جائے تو اسے پھپھوندی لگ جاتی ہے جیسے تمہیں لگ چکی ہے۔ اسی لیے تو میں تھوڑے عرصے کے بعد لندن کا پھیرا لگاتا ہوں۔ اور اب میں لندن کا پھیرا لگانے کے بعد اس جوگا ہوا ہوں کہ ان کی بات کا جواب دے سکوں تو وہ لندن سے بھی بہت آگے چلے گئے ہیں۔ خیر اعجاز صاحب کو تو ہم بی بی سی جانے سے پہلے بھی دیکھ چکے تھے اور حلقہ میں اور ٹی ہاؤس میں خوب برت چکے تھے مگر رضا علی عابدی کو بی بی سی جا کر ہی دیکھا تھا۔ بس انہیں دیکھ کر اندازہ لگایا کہ قرۃ العین حیدر نے بی بی سی کی جن پریوں اور پری زادوں کا ذکر کیا ہے وہ کیسے ہوں گے۔ انہیں کی دعوت پر تو میں نے پورا ایک دن بی بی سی میں بسر کیا تھا مگر میں تو جیسا پہلے تھا ویسا کا ویسا ہی رہا۔ پتہ چلا کہ وہ خالی بی بی سی کا فیض نہیں تھا۔ قرۃ العین حیدر کے قلم سے جو رومان ٹپکتا تھا، اس کا فیض بھی تو شامل تھا۔ تب وہ ٹکڑی ایسی نظر آتی تھی کہ جیسے کوہ قاف سے برآمد ہوئی ہو۔

مگر لندن کے حوالے سے مجھے جو مضمون باندھنا تھا، وہ اپنے سفرنامے میں باندھ چکا۔ آگے ذکر کیا تو مجھے اس تقریب کا بھی ذکر کرنا پڑے گا جو افتخار عارف نے اردو مرکز میں میرے لیے آراستہ کی تھی۔ آخر میں اردو مرکز ہی کا تو مہمان تھا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ اس میں فکر کا کونسا پہلو ہے۔ ارے ہاں یاد آیا۔ ابھی جب میں دلی سے لاہور آ رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دردانہ برابر سے گزرتے گزرتے ٹھٹھکی۔ یاد آیا کہ اس دانے کو تو میں نے کتنے برس پہلے بی بی سی میں دیکھا تھا۔ تب کا غنچۂ ناشگفتہ اب ڈہڈہاتا پھول بن چکا تھا۔ ارے پھولوں کا ذکر تو

مجھے ابھی کرنا ہے۔ آخر میں لندن سے مانچسٹر کیوں گیا تھا۔ صحیح ہے کہ وہاں میرا ایک بھانجا مسعود اقبال راہ تک رہا تھا مگر میرے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ وہاں سے چار قدم کے فاصلہ پر لیک ڈسٹرکٹ ہے۔ چل کے دیکھیں تو سہی۔ آخر وہاں فطرت نے کونسا جادو جگایا ہے کہ ورڈ سورتھ صاحب اس پر اتنے لہلوٹ تھے مگر ٹھہریئے وہاں جاتے جاتے جو ہم نے ایک شگوفہ پھوٹتے دیکھا تو اس کی بھی ایک جھلک دیکھ لیں۔ میں مانچسٹر کی بس کے ٹکٹ کے لیے قطار میں کھڑا تھا۔ مجھ سے آگے ایک میم زادی کھڑی تھی۔ اس سے آگے اس کا ساتھی ایک صاحبزادہ۔ انتظار کی گھڑیاں جب ذرا لمبی کھنچیں تو اس نوجوان نے پلٹ کر اس نوخیز میم کو گلے لگایا۔ لب سے لب ملے۔ بس پھر تو من شدی من تو شدم۔ معلوم ہوا کہ لندن کے متعلق جتنا سنا تھا، وہ ہوائی نہیں تھی مگر بہرحال یہ لندن کا کوچہ تھا۔ بھائی دروازہ نہیں تھا۔ مہذب لوگ ہیں، ایسی باتوں کو فطرت کے تقاضوں میں شمار کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں ٹوکتے نہیں۔

ہاں تو ذکر لیک ڈسٹرکٹ کا تھا۔ میں مسعود کی گاڑی میں بیٹھا لیک ڈسٹرکٹ کی طرف رواں تھا۔ سبزۂ وگل سبحان اللہ۔ اشجار بے شمار واہ واہ۔ اس سے بڑھ کر واہ واہ یہ کہ سب ایک سانچہ میں ڈھلے ہوئے۔ کسی درخت کی کسی شاخ کی مجال نہیں کہ وہ سانچہ سے سر نکالے اور اس کی پھننگ اونچی چلی جائے۔ فطرت یہاں آ کر کتنی مہذب، کتنی ضابطہ کی پابند ہو گئی ہے۔ ہر چند کہ یہ اس کی فطرت کے خلاف بات ہے۔ سبزۂ وگل پہ بہار آئی ہوئی تھی۔ پھول کیسے ڈبڈبا رہے تھے مگر رنگ ہی رنگ، خوشبو ندارد۔ یہاں پھول کھلتے ہیں، مہکتے نہیں اور درخت بہت سرسبز، بہت گھنے مگر بلندی کی شان سے ناآشنا۔ اے حضرت ورڈ سورتھ کبھی آپ ہندوستان، پاکستان کی طرف آئے ہوتے اور ہمارے برگد کو دیکھا ہوتا۔ الڈس ہکسلے نے تمہیں ٹھیک طعنہ دیا تھا کہ اس شاعر کا کبھی استوائی علاقہ میں گزر ہوا ہوتا تب اسے پتہ چلتا کہ فطرت کیا ہوتی ہے۔ خالی حسین نہیں ہوتی، ہیبت ناک بھی ہوتی ہے۔

اور ہاں یہ کیسی فطرت تھی۔ سبزۂ وگل بھی موجود۔ گھنے درخت بھی قطار اندر قطار کھڑے ہوئے مگر پرندوں کی چہکار سنائی نہیں دے رہی۔ اس دیار میں کیا پرندے نہیں پائے جاتے اور اگر وہ ہیں تو کیا وہ گونگے ہیں اور ہاں جب علامہ اقبال نے یہ کہا کہ۔

نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحرخیزی

تو میں کچھ زیادہ ہی حیران ہوا۔ میں تو لندن میں پہنچ کر سارے آداب سحرخیزی بھول گیا تھا۔ ارے بھائی ہم تو مرغ کی بانگ سن کر جاگتے چلے آئے تھے۔ پہلے مرغے نے بانگ دی، پھر کہیں دور سے مور کی جھنکار سنائی دی۔ پھر کہیں قریب میں کوئی چڑیا چہچہائی۔ جب ایسی کوئی آواز، کوئی بانگ، کوئی چہچہاہٹ سنائی نہ دے تو آنکھ کیسے کھلے۔ پھر بھی اگر علامہ نے آداب سحرخیزی کو برقرار رکھا تو اس پر حیرت ہی ہونی چاہیے۔ ارے میں نے تو ہائیڈ پارک جا کر کوؤں کو بھی ٹوہ کے دیکھا۔ ہر چند کہ اس گورے دیس کے سب کوے اتنے ہی

کالے تھے جتنے ہمارے دیس کے کوے ہیں مگر عادتیں سب گوروں والی ہیں۔ کائیں کائیں کرنا ہی بھول چکے ہیں۔ پتہ چلا کہ زاغ وزغن کا بے ہنگم شور ہمارے دیس تک ہے۔ ولایت کے زاغ وزغن بہت مہذب ہیں، بالکل شور نہیں کرتے۔ لے دے کے ایک ساقی فاروقی ہیں کہ لندن جا کر بھی کراچی والے آداب بالکل نہیں بھولے ہیں۔ اپنی تحریروں میں اسی طرح شور مچاتے نظر آتے ہیں۔ اس پر یاد آیا کہ میں نے پچھلے دنوں افتخار عارف سے پوچھا تھا کہ تم بھی لندن سے آ گئے۔ مشتاق احمد یوسفی پہلے ہی آ گئے تھے۔ زہرہ نگاہ بھی واپس کراچی آ چکی ہیں۔ پھر لندن کو کس کے سپرد کر کے آئے۔ کہا کہ ساقی فاروقی کے سپرد کر کے۔ میں نے کہا کہ پھر تو لندن کے لیے دعائے خیر ہی کرنی چاہیے۔

ویسے تو لندن سے میرا تعارف افتخار عارف نے بھی اچھا خاصا کرا دیا تھا مگر وہ بات کہاں مولوی مدن المعروف بہ ساقی فاروقی کی سی۔ ایک گھر کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ کہا کہ اوپر نظر ڈالو۔ وہ جو کمرہ ہے اس میں غریب ڈی ایچ لارنس ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور نیچے کی منزل میں اس کی چہیتی یاروں کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے۔ غور کرو اس کی بے کسی پر۔

کیٹس کے گھر جا کر اس نے کیٹس کا ذکر کم کیا۔ اس کی بلبل کا ذکر زیادہ کیا۔ بتانا شروع کیا کہ میں نے نظیر صدیقی کو بتایا تھا کہ جس بلبل نے کیٹس کو متاثر کیا تھا، وہ انہیں درختوں پر بیٹھی تھی۔ غالباً اس درخت پر جو سامنے نظر آ رہا ہے۔ ارے ساقی فاروقی جب تم نے درخت کا بھی تعین کر دیا تھا تو اس عزیز کو یہ پوچھنا ہی تھا کہ اس درخت کی کونسی شاخ پر۔ تو تمہیں چاہیے تھا کہ شاخ کا بھی تعین کرتے۔ آخر میں ایک ننھی سی تفصیل چھپا کے رکھ لی، بیچارے نظیر صدیقی۔

مگر لندن کے سوا بھی تو میں نے دیارِ مغرب کے پھیرے لگائے تھے۔ اوسلو، برلن، فرینکفرٹ، نیویارک، ٹورنٹو، ایڈمنٹن۔ سب سے خوب سفر ٹورنٹو کا تھا۔ میرے ہم سفر آصف فرخی تھے۔ یہاں ہمارے میزبان تھے منیر پرویز۔ انہوں نے اپنے مرحوم والد نامی گرامی ماہر تعلیم خواجہ اشکار حسین کے نام پر ایک ٹرسٹ قائم کر رکھا ہے۔ ساتھ میں رائٹرز فورم نام کا ادارہ بھی چلاتے ہیں۔ اچھا لیجیے مرغے کی بانگ تو یہاں بھی سنائی نہیں دیتی۔ نہ پرندوں کی چہچہاہٹ۔ صبح ہی صبح بس ایک غریب گلہری زرد پتوں کے فرش پر میرا استقبال کرتی تھی۔ آصف فرخی کو ان کا مطالعہ مبارک ہو۔ یہاں انہیں کتابیں بھی تو بہت مل گئی تھیں۔ بس میں اکیلا ہی آدابِ سحر گاہی بجالاتا تھا۔

میں نے کہیں یہ شکایت ٹورنٹو میں بھی کر دی کہ یہاں اول تو پرندے نظر نہیں آتے۔ نظر آتے بھی ہیں تو بس پھڑ پھڑاتے ہیں، چہکتے نہیں۔ منیر پرویز صاحب نے اسے اپنی عزت کا مسئلہ بنا لیا۔ اگر ایک چڑیا بھی انہیں اڑتی نظر آ جاتی تو مجھے متوجہ کرتے کہ دیکھ رہے ہیں آپ وہ چڑیا۔ پرندے یہاں بہت ہیں مگر یہ ان کی ہجرت کا موسم ہے۔ ہاں شاید ایسا ہی ہو۔ موسم بدل رہا ہے اور عجب رنگ سے بدل رہا ہے۔ درختوں میں

رنگوں کا طوفان اُٹھا ہوا ہے اور ان کے سائے تلے زرد پتوں کا فرش بچھا ہوا ہے اور ان کے بیچ ایک گلہری۔ کتنی پھرتی سے ادھر ادھر دوڑی پھر رہی ہے مگر یہ اتنی کالی کیوں ہے اور اتنی لمبی۔ ہماری اپنی طرف کی گلہری، اس کی پشت پہ ذرا نظر ڈالو۔ کتنی لہریا جیسے انگلیوں کے نشان۔ ارے ذرا رام بھگتوں کی بات دھیان سے سنو۔ یہ بیچ بیچ انگلیوں کے نشان ہیں۔ سری رام چندر جی کی انگلیوں کے نشان۔ بندروں نے اسے ستایا تھا۔ بیچاری بہت دکھی تھی۔ رام چندر جی نے پیار سے اس کی پیٹھ کو سہلایا اور دلاسہ دیا۔ تب سے یہ نشان چلے آ رہے ہیں۔ رام بھگت یہی کہتے ہیں۔

سو بھائی یاں سے نکلو۔ یہ دیارِ مغرب ہے۔ یہاں آدم گردی مچی ہوئی ہے۔ آدمی اپنے سوا باقی مخلوقات کو گردانتا ہی نہیں۔ ادھر ہماری بستیوں میں آدم لوگ اور چرند پرند کتنا ہل جل کر رہتے ہیں۔ ایک ہی گلی میں، ہم آپ بھی ہیں اور بھینسیں بھی ہیں۔ چھت پر کبوتروں کی کابک رکھی ہے۔ باقی کوے اپنے زور پر منڈیروں پہ اترتے ہیں اور کائیں کائیں کر کے اپنے وجود کا اعلان کرتے ہیں مگر خیر چلو دیارِ مغرب کو ہاتھ لگا آئے اچھا کیا۔ اور ہاں اس اقلیم کو بھی چھو آئے جو ہمارے خوابوں میں بسی ہوئی ہے مگر اٹھتے بیٹھتے اس پہ تبرا بھیجتے ہیں۔ عجب ماجرا ہے۔ پاکستان کا ہر غیرت مند اٹھتے بیٹھتے امریکہ پر تین حرف بھیجتا ہے اور ہر بے شعور اور ہر ذی شعور اور ہر بے غیرت اور غیرت مند امریکہ جانے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ سو اس کے ویزا دفتر کے سامنے لگی ہوئی قطار کبھی گھٹتے دیکھی نہیں گئی۔ میری سنو۔ کولمبیا یونیورسٹی (نیویارک) میں کوئی اردو کانفرنس ہونے والی تھی۔ دعوت نامہ مجھے بھی آیا۔ بس اسی تقریب سے اس دیار کا ویزا گھر بیٹھے میری گود میں آن پڑا مگر جاتا کیسے۔ نیل کنٹھ رستہ کاٹ گیا۔ عین وقت پہ نو گیارہ والا واقعہ ہو گیا۔ جمیل جالبی کا مجھے فون آیا کہ بھائی میں تو اب ادھر نہیں جا رہا۔ میرے بیٹے نے وہاں سے مجھے لکھا ہے کہ حالات اس وقت سازگار نہیں، مت آیئے۔ میں نے کہا کہ بھائی کالے کوسوں کا یہ سفر میں تمہارے بھروسے پہ کر رہا تھا۔ اب تم نہیں جا رہے ہو تو سمجھو کہ میں بھی نہیں جا رہا۔ تو خیر وہ سفر تو منسوخ ہو گیا مگر جب نیویارک سے علی گڑھ یونیورسٹی الُمنائی نے بلاوا بھیجا کہ یوم سرسید کی تقریب میں آیئے۔ ہم آپ کو سرسید ایوارڈ سے نوازیں گے تو میں نے سوچا کہ کیا مضائقہ ہے۔ امریکہ کا ویزا ضائع جائے یہ تو کفرانِ نعمت ہے۔ امریکہ کا سفر سرسید کے بہانے ہی سہی۔ تو میں جا پہنچا مگر نیویارک کا انبوہ دیکھ کر میں تو بولا گیا۔ ارے یہ نیویارک کے بازار کے ہزاری بزازی ہیں یا نئی دنیا کی گور دل ہے۔ نیویارک سے آگے جانے کا خیال ترک کیا اور الٹے پیروں واپس آ گیا۔

یانگی کے طور پر مغرب کے کچھ شہروں کی جھلک دیکھ لی۔ دیگ کے ایک دانے سے دیگ کے احوال کا پتہ چل جاتا ہے اور مغرب کے شہروں کا احوال تو یہ ہے کہ ان کے بازار، ان کے رہائشی علاقے، ان کے گلی محلے، ان کی شاہراہیں سب ایک سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ ان کی شاہراہوں پر درخت بھی اس شان سے کھڑے ہیں کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب کا گھیر سب کی اونچائی برابر۔ جیسے درخت قینچی سے برابر کے

تراش کر کھڑے کیے گئے ہوں۔ ریل میں بیٹھ کر سفر کرو جیسے میں نے برلن سے فرینکفرٹ تک کا ایک ایسا سفر کیا تھا تو مجال ہے کہ منظر میں کہیں فرق آ جائے۔ مگر میری آنکھیں تو اپنے اس برصغیر کے سفر کی عادی ہیں۔ سفر ریل گاڑی سے کریں یا بیل گاڑی سے، منظر بدلتا چلا جاتا ہے اور درخت کوئی میڑھا میڑھا، کوئی گھنا، کوئی چھدرا، کوئی بلند و بالا، کوئی پست۔ یہ تو قدرتی عمل ہوا۔ ادھر یورپ میں تو ساری فطرت ہی مصنوعی نظر آتی ہے۔ یکسانیت خلاف فطرت ہے۔ جنگلوں کی بات جانے دو، ہمارے تو باغ بھی ایسی یکسانیت برداشت نہیں کر سکتے۔

خیر دنیائے مغرب کے چند شہر دیکھ لیے، جی بھر گیا۔ دل کو وہی چینک لگی ہوئی کہ کسی طور ایسے سفر کی صورت نکلے کہ اپنی چھوڑی ہوئی انہیں گرد آلود بستیوں میں گھوم پھر کر دیکھیں کہ وہ میڑھے میڑھے رستے، وہ انگلیوں جیسی گلیاں کس حال میں ہیں۔ امریوں کا اب کیا نقشہ ہے۔ گھنے چھدرے نیم پیپل برگد اپنے آڑے ترچھے انداز میں کیا کہانی سناتے ہیں۔

کوئی اور صورت بن نہ پڑی تو حضرت نظام الدین اولیاء کا سہارا ڈھونڈا۔ ابھی خبر نکلی تھی کہ حضرت نظام الدین اولیاء کا عرس قریب ہے۔ پاکستان سے زائرین کا ایک قافلہ وہاں شرکت کے لیے جائے گا اور حسن اتفاق دیکھو۔ انہیں دنوں اسلام آباد کے ایک ڈنر میں شرکت کا موقع ملا۔ کتنے اخبار نویس موجود تھے۔ منجملہ ان کے میں اور منو بھائی بھی تھے۔ وہاں سیکرٹری اطلاعات حفیظ الرحمن نظر آئے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور عرض کیا کہ حضور والا آپ ہر وفد کے ساتھ ایک دو اخباری نمائندوں کو بھی بھیجتے ہیں، عرس میں جانے والے زائروں کے ساتھ اس روایت کو کیوں جائز نہیں سمجھتے۔ بولے "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا کہ یہی کہ نظام الدین اولیاء کے عرس پر جانے والے زائروں کے ساتھ کچھ اخباری نمائندوں کو بھی بھیجئے۔ کم از کم اپنے دوست منو بھائی کو ضرور بھیجئے۔ ان کے ساتھ میں بھی لگ لوں گا۔

ہنسے، بولے "تیاری کر لیجیے۔ آپ جا رہے ہیں۔" اور واقعی ہم زائروں کے ساتھ دلی کے سفر کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ داتا صاحب کی درگاہ میں جا کر سبز دوپٹہ گلے میں لپیٹا اور چل دیے۔

کیا مبارک سفر تھا۔ اس کی برکت سے بند دروازے کھلتے ہی چلے گئے۔

میں نے تو دلی کو مقطع سلسلۂ شوق جانا تھا مگر مقطع مطلع میں بدل گیا۔ دلی اب مطلع سلسلۂ شوق تھی۔ اب دور دور کے نگر میرے سفر شوق کی زد میں تھے۔ بس اس کے تھوڑے ہی مہینوں بعد نارنگ صاحب کی طرف سے ایک دعوت نامہ ملا۔ پریم چند کی صد سالہ سالگرہ کی دھوم تھی۔ جامعہ ملیہ میں اس تقریب سے ایک افسانہ سیمینار کا اہتمام تھا۔ میں دوڑ کر وہاں پہنچا۔ پھر دلی سے آگے علی گڑھ۔ آخر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بھی تو پریم چند کی یاد میں محفل سجانی تھی اور علی گڑھ پہنچ کر میں چونکا۔ ارے میں تو اپنی بستی کے کنارے آن لگا ہوں۔ یہاں سے ایک زقند بھروں تو دم بھر میں ڈبائی پہنچ جاؤں مگر میری زقند ضائع گئی۔ میری بستی نے مجھے پہچاننے ہی سے انکار کر دیا۔ کتنے چکر لگائے۔ کبھی اس راہ کبھی اس راہ۔ ہر راہ اجنبی نظر آئی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ اے دور سے

آنے والے تو کون ہے۔ ہم تجھے نہیں پہچانتے۔ بس میں دروازے کو چھوکر اپنا سامنہ لے کر واپس چلا آیا۔

علی گڑھ سے لکھنؤ کی راہ لی مگر اسی بیچ ایک گل اور کھلا۔ واضح ہو کہ اب وہ زمانہ نہیں تھا کہ ہم خود کو چھڑی چھانٹ مخلوق میں شمار کرتے تھے۔ جدھر منہ اٹھا اپنے نقدم کے ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ جو شریک حیات بنی تھی وہ اب شریک سفر بھی تھی اور اس بی بی کو ہندوستان میں قدم رکھتے ہی یاد آیا کہ ارے وہ تو بنارس کی منی ہے۔ اب انہیں اصرار ہے کہ مجھے بنارس جانا ہے۔ میں سمجھا رہا ہوں کہ ہمارے ویزا میں بنارس کی گنجائش نہیں اور اب آخر بنارس میں تمہارا کون بیٹھا ہے۔ سب تو پاکستان میں ہیں۔

''اے ہے وہاں مغل باجی ہیں اور ہمارا امام باڑہ ہے اور پھوپھی اماں۔ وہ تو اب الٰہ آباد میں ہیں۔ ان سے کنی کاٹ کر کیسے نکل جاؤں اور زہرہ باجی......''

''یعنی بنارس کے ساتھ الٰہ آباد بھی۔'' میں سخت سٹپٹایا۔ میں نے اس سوال کو نارنگ صاحب کی طرف لڑھکا دیا اور یہ نارنگ صاحب کی ہمت تھی اور کمال تھا کہ بھاگ دوڑ کر کے دونوں شہروں کا ویزا دلوا دیا۔ خیر ویزا تو ظالموں نے دے دیا مگر دن مقرر کر دیئے۔ ''بنارس میں دو دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا۔''

اسی بنارس، الٰہ آباد کے چکر میں ایک انکشاف اور ہوا کہ عالیہ کی زہرا باجی تو پریم چند کی بہو ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے سری پت رائے کی جیون ساتھی مگر اس سفر میں صرف انہیں سے تعارف ہوا۔ سری پت رائے کے درشن نہیں ہوئے کہ وہ تو دلی میں تھے۔ ان کی اولاد میں سے بھی کسی کو نہیں دیکھا۔ اگلے پھیرے میں ان کی بیٹی سارا رائے سے ملاقات ہوئی مگر تب تک زہرا باجی دنیا سے سدھار چکی تھیں۔

یہ جو اگلا پھیرا تھا اس میں ہم شمس الرحمٰن فاروقی کے مہمان بن کر ان کے گھر میں جا اترے اور انہوں نے عجب رنگ سے تواضع کی۔ ایک صبح ہمیں لے کر الٰہ آباد سے دور پرانی خستہ حال اینٹوں کی بنی شکستہ دیواروں کے بیچ لا کھڑا کیا۔ میں نے پوچھا ''یہ ہم کہاں ہیں؟''

بولے ''آپ کوشامبھی میں ہیں۔ وہی بستی جہاں مہاتما بدھ برسات کے دنوں میں باس کیا کرتے تھے۔''

''مگر وہ بستی تو کہیں نظر نہیں آ رہی۔''

''وہ بستی اب کہاں۔ پیوند زمین بن گئی۔ بس یہی چند خستہ حال اینٹیں اور ٹوٹی پھوٹی دیواریں اس سے یادگار ہیں۔''

اگلے دن اس مقام سے بھی دور گنگا کنارے جا اتارا۔ کہا کہ ''یہ وہ مقام ہے جہاں سے رام چندر جی ناؤ میں بیٹھ کر دوسرے کنارے جا اترے تھے۔ جنوب کے علاقے میں۔ یہاں سے بن باس کی اگلی منزلوں کا سفر شروع ہوا۔''

ارے واہ آن کی آن میں نئے ہندوستان سے نکل کر پراچین بھارت میں کس مقام پر آن کھڑا ہوا ہوں۔ آگے ساری رامائن پھیلی پڑی ہے۔

تو بس یوں سمجھیے کہ اب پورا ہندوستان کیا قدیم کیا جدید، میرے قدموں کی زد میں ہے۔ ایک پھیرا، دوسرا پھیرا، تیسرا پھیرا۔ مگر انہیں پھیروں میں ایک پھیرا الگ رنگ کا تھا۔ ہندوستان میں میرا تعارف ہندی دنیا میں بھی اچھا خاصا ہو چکا تھا۔ اب میری کہانیاں الوک بھلہ کی معرفت انگریزی میں اپنا تعارف کرا رہی تھیں اور میں ان کہانیوں کے ناشر ہارپر کولنز سے اس تقریب سے ایک ایوارڈ لینے دلی جارہا تھا بلکہ دلی سے پرے کلکتہ جہاں یہ تقریب ہونی تھی۔

اب یہاں یہ بتا دینا لازم آتا ہے کہ انگریزی میں میرا پہلا باقاعدہ تعارف تو محمد عمر میمن نے کرایا تھا۔ جانے کس آن میں میری کہانیاں پڑھیں کہ دل کو بھا گئیں۔ انگریزی میں خود کچھ ترجمہ کیں، کچھ دوسرے لائق لوگوں سے کرائیں۔ انہیں چھانا پھٹکا۔ ان کا تنقیدی مطالعہ کیا۔ مجموعہ کی صورت پیش کیا اور ہاں وہ جو اردو کے لیے وقف ایک بھلا سا انگریزی رسالہ تھا۔ ساؤتھ ایشین جرنل، ایسا ہی کچھ بھلا سا نام تھا۔ اس کا ایک شمارہ ان کہانیوں اور ان کے مطالعہ کے لیے وقف کر دیا اور کیا خوب بات تھی کہ میں لاہور میں، وہ یہاں سے بارہ پتھر دور امریکہ میں وسکونسن یونیورسٹی میں بیٹھے تھے۔ میری ذات کے کھرے کھوٹے سے آشنا نہیں تھے۔ بس میری کہانیاں ان کے پیش نظر تھیں۔ ویسے لکھنے والا اپنے نقاد کی آنکھوں سے اوجھل رہے اسی میں اس کا بھلا ہے۔ لکھنے والا بھی آخر بندہ بشر ہے۔ سو طرح کے عیب اس میں ہوتے ہیں۔ تحریروں کی حد تک وہ اپنے نقاد کو بھلا نظر آتا ہے۔ جب نقاد اسے دیکھتا بھالتا ہے تب اسے مایوسی ہوتی ہے کہ جس کی تحریروں کو ہم نے نوازا تھا، وہ خانہ خراب کچھ نہ نکلا۔

اب الوک بھلہ صاحب کی سنو۔ وہ افسانے سے متعلق ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ تقسیم کے واسطے سے ہندوستان پاکستان میں مختلف زبانوں میں جو کہانیاں لکھی گئی ہیں ان کی چھان پھٹک کر کے انگریزی میں ترجمے کر کے انہیں مرتب کیا جائے اور ایک تنقیدی مطالعے کے ساتھ انہیں پیش کیا جائے۔ ان کا یہ کام آگے چل کر تین جلدوں میں ہارپر کولنز (انڈیا) کی طرف سے شائع کیا گیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے پاکستان کا بھی ایک چکر لگایا تھا۔ بس اسی ترجمہ و تالیف کے دوران میں انہوں نے میرے افسانوں پر کچھ زیادہ توجہ صرف کی۔ تقسیم سے متعلق افسانوں سے قطع نظر کر کے کچھ اور کہانیوں کے بھی ترجمے کر ڈالے۔ یہ ترجمے ہارپر کولنز کے اہتمام میں چھپنے والے ایک انگریزی جرنل "یاترا" میں شائع ہوئے۔ اس ناشر کی طرف سے اسی رسالے کے ساتھ ساتھ ایک ادبی ایوارڈ کا بھی ڈول ڈالا گیا کہ ہر سال سارک ممالک کے لکھنے والوں میں سے کسی ایک کو یہ ایوارڈ دیا جائے۔ میری کہانیوں کے ان ترجموں پر مشتمل ایک مجموعہ بھی "Leaves" کے عنوان سے شائع ہو گیا۔ سو ہندوستان کا ایک بھرا پرا سفر اس خوشی میں ہو گیا۔

ایک سفر صرف اور محض ہندی کہانی کے حوالے سے ہوا۔ اس سفر میں ہندی والوں ہی کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا رہا۔ اسی بیچ دو ایسے سفر نکل آئے جن کا رنگ میرے باقی ہر سفر سے جدا تھا مگر پہلے یہ سنیے کہ یہ سفر جو اولاً

دلی تک محدود تھا، کس تقریب سے ہوا۔ میں ابھی اپنے یاترا ایوارڈ کا ذکر کر رہا تھا۔ جس کمیٹی نے اس ایوارڈ کا فیصلہ سنایا، اس میں ایک تو اسحٰق موری تھے۔ کنڑ کے ناول نگار اور ان دنوں ساہتیہ اکیڈمی کے چیئرمین تھے۔ دوسرے الوک بھلہ جو 'یاترا' کے ایڈیٹر بھی تھے اور تیسرے تھے ہندی کے نامی گرامی کہانی کار نرمل ورما۔ نرمل ورما سے میری پہلی ملاقات قرۃ العین حیدر کے گھر ہوئی تھی۔ کسی پچھلے سفر میں قرۃ العین حیدر نے مجھے کھانے پر بلایا تو ساتھ میں تین ہندی کے کہانی کاروں کو بھی بلا بھیجا۔ یہ تھے کملیشور، بھیشم ساہنی اور نرمل ورما۔ شاید قرۃ العین کا مطلب یہ تھا کہ کیا ہر وقت ہر آن اردو والوں کے بیچ بسر کر رہے ہو۔ اپنے ہندی کے ہم عصروں سے بھی ملو۔ محفل میں ایک ایک کملیشور تھے جو خوب چہک مہک رہے تھے۔ بھیشم ساہنی بھی بول تو رہے تھے مگر بہت تکلف سے مگر نرمل ورما تو گم متھان بیٹھے تھے۔ پورے وقت میں شاید دو چار فقرے بولے ہوں مگر مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔ ان سے ملنے کا زیادہ موقع اس وقت ملا جب مجھے 'یاترا' ایوارڈ کی خاطر دلی سے کلکتہ جانا تھا مگر کیا خوب ملاقات تھی۔ دلی سے کلکتہ کے سفر میں بس ساتھ ساتھ بیٹھے رہے۔ باتیں واجبی واجبی کیں۔ باتیں کرنے کا مجھے بھی کوئی ایسا ملکہ نہیں ہے اور نرمل ورما تو محفل میں ویسے بھی گونگے کا گڑ کھا کے بیٹھتے تھے۔ لیکن دلوں کے ملنے کے لیے کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپس میں بیٹھ کر باتیں بھی ملکائی جائیں۔ تو یہ سفر زیادہ تر خاموش گزرا مگر میرا خیال ہے کہ ہمارے بیچ دوستی سے ملتا جلتا ایک رشتہ قائم ہو گیا تھا۔

کلکتہ سے واپسی پر انڈیا انٹرنیشنل میں جو ایک چھوٹی سی تقریب ہوئی اور جس میں مجھے کتنے سوالوں کے جواب دینے پڑے وہاں نرمل ورما مع بیگم کے موجود تھے۔ بیگم یعنی گگن گل۔ تو جو ایک دو گرم سوال کیے وہ اس بی بی نے کیے۔ نرمل جی سنتے رہے اور چپ رہے۔

مگر افسوس کہ نرمل ورما سے تعلقات کا سلسلہ لمبا نہیں کھنچا۔ وہ دنیا سے جلدی گزر گئے اور ان کو گزرے ہوئے اب ایک سال ہو رہا تھا۔ دلی سے اپنے نئے کرم فرما سریش جی کا فون آیا کہ نرمل ورما کی برسی قریب ہے۔ اس موقع پر ہم نے ایک یادگاری لیکچر کا اہتمام کیا ہے اور یہ لیکچر آپ کو دینا ہے۔ میں نے تھوڑی عذر معذرت کی اور پھر رضامند ہو گیا۔

بس اس کے دوسرے ہی دن یا تیسرے دن دلی ہی سے ایک اور فون آ گیا۔ ''انتظار صاحب ہیں؟ میں سدھیر بول رہا ہوں۔ سنا ہے کہ آپ نرمل ورما کی تقریب میں دلی آ رہے ہیں۔''

''آپ نے صحیح سنا۔ بالکل آ رہا ہوں۔''

''تو پھر گیتانجلی نے آپ کے لیے ایک پروگرام بنایا ہے۔ لیجیے اس سے بات کیجیے۔''

اور اب گیتانجلی بول رہی تھیں۔ ''انتظار جی، آپ دلی آ رہے ہیں نا تو پھر سیر کا بھی کوئی پروگرام ہونا چاہیے۔ بندرابن ہم چلیں تو کیسا رہے گا۔''

''بندرابن۔'' میں چونکا اور چہکا۔ ''ارے یہ نگر ہندوستان کے نقشہ پر ابھی موجود ہے۔ میں تو سمجھتا

تھا کہ یہ دیو مالائی نگر تھا۔ دیو مالا سے نکلا، دیو مالا میں گم ہو گیا۔"

"نہیں، یہ نگر ہے اور ہم نے وہاں چلنے کا پروگرام بنایا ہے۔"

"بندرابن کی یاترا اور پھر تمہارے سنگ۔ اوشیہ چلوں گا۔"

مگر مجھے یہ بھی تو بتانا چاہیے کہ یہ سدھیر جی کون ہیں اور گیتا نجلی کے متعلق بھی تو یہ بتانا پڑے گا کہ رابندر ناتھ ٹیگور سے ان کا کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے۔ ان سے میری ملاقات ہمالہ پہاڑ کی بلندیوں پر ہوئی تھی۔ برصغیر میں امن شانتی، اس تقریب سے کھٹمنڈو میں دانشوروں کا کوئی اجتماع تھا جس کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔ اس کا بلاوا مجھے بھی آیا۔ سو میں بھی وہاں جا پہنچا۔ جب سارے مندوبین چائے پر اکٹھے ہوئے تو میں نے دیکھا کہ اس ہجوم میں سوائے امت موری کے یہاں مجھے کوئی صورت آشنا نظر نہیں آ رہا۔ بس انہیں سے ہنس بول رہا تھا۔ وہ ذرا کسی اور دوست کی طرف متوجہ ہوئے تو ایک معصوم صورت خوش ادا بی بی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ "آپ انتظار حسین ہیں؟"

"ہاں ہوں تو میں وہی۔"

"میں گیتا نجلی ہوں۔"

میں نے حیران ہو کر دیکھا۔ "ٹیگور کی گیتا نجلی؟"

"نہیں جی، میں گیتا نجلی شری ہوں۔ کہانی کار۔ ہندی میں لکھتی ہوں۔"

جلد ہی پتہ چلا کہ ان کا ایک جیون ساتھی بھی ہے...... سدھیر چندر کہ مضمون ان کا تاریخ ہے۔ وہ اچھے خاصے شستہ لہجہ میں اردو بول رہے تھے۔ میں نے کریدا تو پتہ چلا کہ اردو سے نا آشنا ہیں۔ میں حیران ہوا اور پوچھا کہ "یہ اردو لہجہ آپ نے کہاں سے چرایا؟"

بولے کہ "میں جامعہ ملیہ میں تاریخ کے شعبہ سے وابستہ رہا ہوں۔ اس لب و لہجہ کو آپ پروفیسر مجیب کا فیض صحبت جانیں۔"

دونوں کا تعلق گجرات کے علاقہ سے تھا۔ وہیں سے ایک مصور آئے ہوئے تھے، غلام محمد۔ ان سے بھی تعارف ہوا اور کتنی جلدی میں ان کے ساتھ گھل مل گیا اور اچھا خاصا دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا۔ ارے انہیں دوستوں کا تو فیض تھا کہ میں نے کھٹمنڈو کے سارے بدھ اور ہندو مندروں کی یاترا کر لی مگر اس وقت مجھے کب گمان تھا کہ آگے چل کر ان کے سنگ مجھے ایک اور یاترا کرنی ہے...... بندرابن کی یاترا۔

تو خیر اس دعوت کے بعد میں منہ اٹھا کر دلی کی طرف ہو لیا۔ سفر مبارک تھا۔ جب میں نے دلی میں قدم رکھا تو دو موسم اور دو تیوہار گلے مل رہے تھے۔ 21 اکتوبر (2006ء) کی تاریخ تھی۔ بے شک فلائٹ میں تاخیر کی وجہ سے تھوڑی کوفت ہوئی تھی مگر جب میں نے سریش شرما جی کی گلی میں قدم رکھا تو دیکھا کہ گلی دیوالی کے چراغاں سے جگمگ جگمگ کر رہی ہے۔ آتش بازی کی دھوں دھاں اس پر مستزاد۔ اور اس گھر میں جب

داخل ہوا تو دیکھا کہ دیوالی کی خوشی میں محفل سجی ہے اور میرا انتظار ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے گیتانجلی کا روئے زیبا نظر آیا۔ پھر سدھیر جی۔ لیجیے سفر کی ساری کلفت دور ہوگئی۔ اب میں بھی ان کے ساتھ مل کر دیوالی منا رہا تھا مگر مجھے یہ کیا پتہ تھا کہ اگلی شام کو عید کا چاند بھی ہو جائے گا اور جنہیں دیکھے کتنے دن بیت گئے ہیں ان کی اس مبارک صبح کو دید ہوگی۔

نرل ورما یادگاری لیکچر کی تقریب دیوالی اور عید کے عین بیچ انڈیا انٹرنیشنل میں منعقد ہوئی اور وہیں تو میں نے ڈیرا کیا ہوا تھا۔ لیکچر کا مرحلہ خیریت سے گزر گیا۔ داد تو ملنی ہی تھی۔ آخر میں مہمان تھا۔ وہ لیکچر یا مقالہ جیسا بھی ہو بہر حال اس میں مہمان کے نمبر بھی تو شامل تھے۔ ہاں ایک داد تھوڑی تفصیل مانگتی ہے۔ اگلی شام نارنگ صاحب سے میری ملاقات ٹھہری تھی۔ ان کے ساتھ میں نکلنے لگا تھا۔ دم بھر کے لیے کاؤنٹر پر ٹھہرا کہ چابیاں ان کے سپرد کردوں۔ اتنے میں ایک صاحب جو کرسی لے کر باہر نکلنا چاہتے تھے مجھے دیکھ کر ٹھٹکے۔ کرسی ایک طرف رکھ میرے پاس آئے۔ میرے مضمون کی بہت اچھے لفظوں میں تعریف کی۔ پھر کرسی اٹھا کر باہر نکل گئے۔ نارنگ صاحب بولے "انتظار صاحب، آپ نے پہچانا کہ یہ بزرگ جنہوں نے آپ کو داد دی ہے، کون تھے؟"

"کون تھے؟" اب مجھے تھوڑا تجسس ہوا۔

بولے "یہ مہاتما گاندھی کے پوتے راج موہن گاندھی تھے۔"

"ارے واقعی؟" اور مجھے جو ایک جھرجھری آئی تو نارنگ صاحب کو وہیں چھوڑ اس بزرگ کی طرف لپکا۔ جا کر بس لیجیے کہ ان کے قدم چھوئے اور کہا کہ "معاف کیجیے، میں نے تو آپ کو نہیں پہچانا تھا۔ ہمارے دوست نارنگ صاحب نے بتایا کہ مجھے کس بزرگ سے داد ملی ہے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اصل میں مجھے گاندھی جی سے داد ملی ہے۔ اس خوشی میں آپ کی طرف لپک کر آیا ہوں اور اب تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔"

بس پھر دو چار باتیں ہوئیں۔ پھر وہ اپنی راہ اور میں اپنی راہ۔ نارنگ صاحب ہی سے مجھے پھر پتہ چلا کہ آپ بہت خلوت پسند قسم کی مخلوق ہیں۔ انڈیا انٹرنیشنل کے روز کے آنے والوں ہیں مگر شان یہ ہے کہ بار میں آ کر اکیلے بیٹھے رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر شغل کرتے ہیں۔ کسی سے بات نہیں کرتے۔ اگر بار میں شور ہو تو بے دماغ ہو جاتے ہیں۔ باہر لان میں بھی سب سے الگ کسی گوشے میں بیٹھے نظر آئیں گے۔

خیر تو کھانا اس شب میں نے نارنگ صاحب کے ساتھ کھایا۔ نارنگ صاحب، منورما بھابھی اور میں۔ اس اچھی صحبت کے بعد میں اپنے کمرے میں آیا تو پتہ چلا کہ ابھی ابھی اعلان ہوا ہے کہ عید کا چاند ہوگیا۔ کل عید ہے۔ میں نے فوراً ہی قرۃ العین حیدر کو فون کیا کہ مجھے تو صبح آپ کی طرف آنا تھا مگر اب تو کل عید ہے۔ آپ کی اس حساب سے اپنی مصروفیات ہوں گی۔ بولیں "میری کوئی مصروفیات نہیں ہیں۔ آپ آئیں۔"

سو صبح ہی صبح میں آئی آئی سی سے نکل ذاکر باغ کی طرف ہولیا۔ شمیم حنفی کے گھر جا کر سوئیوں سے منہ میٹھا کیا۔ پھر وہاں سے ہم تینوں میں، شمیم حنفی، صبا بھابھی عیدملن کے لیے نکلے۔ پہلے اس علاقے میں باراں (شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی صاحبزادی) کے گھر پر دستک دی۔ عید کی مبارکباد دی۔ عید کے دسترخوان سے کچھ چکھا اور پھر وہاں سے سیدھے قرۃ العین حیدر کی طرف ہو لیے۔ پھر عید کا وہ پورا دن انہیں کے یہاں گزرا۔ اس عالم رنگ و بو میں قرۃ العین کی وہ آخری عید تھی۔ اگلے برس عید کے آس پاس کے دنوں میں وہاں پہنچا ہوا تھا۔ سب دوست زندہ سلامت تھے۔ بس قرۃ العین نہیں تھیں۔ اب وہ جامعہ کے قبرستان میں آرام کر رہی تھیں۔

تو لیجیے اب بندرابن کی یاترا پر چلتے ہیں مگر اچانک ایک اندیشے نے مجھے آلیا "سدھیر جی، آپ نے یہ بھی سوچا کہ میں مرد مسلمان اس پوتر نگر میں مجھے کون گھسنے دے گا۔"

"ارے انتظار صاحب، آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہم بندرابن کے گوسوامی جی کے مہمان ہوں گے۔ میں نے فون پر ان سے بات کی تھی کہ ہمارے ساتھ پاکستان کا ایک کہانی کار ہوگا۔ وہ مسلمان ہے۔ انتظار حسین۔ انہوں نے کہا کہ جگ جگ آئیں۔ وہ میرے مہمان ہوں گے۔"

ℬ .... ℭ .... ℭ

بندرابن کی کنج گلی میں

یہ بندرابن کی کنج گلی تھی مگر یہ کوئی ایک گلی تھوڑا ہی تھی۔ گلی در گلی۔ ہم ایک گلی سے نکلے، دوسری گلی میں۔ دوسری گلی سے مڑے تو تیسری گلی میں۔ ہمارے آگے پیچھے بندر۔ یا مولا، یہ گلیاں ہیں یا بھول بھلیاں ہیں۔ ہم آخر کہاں جا رہے ہیں۔ وہ در کہاں ہے۔ کس گلی میں ہے جسے ہمیں کھٹکھٹانا ہے۔ پھر اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ چپل دھول میں اَٹ چکے ہیں۔ میں نے گیتا نجلی کو مخاطب کیا "گیتا نجلی دیکھ رہی ہو۔ یہ گلیاں دھول میں کتنی اَٹی ہوئی ہیں۔ کیا ان شبھ دنوں میں بھی ان کا یہی نقشہ تھا۔ پھر تو رادھا جی کو کرشن جی تک پہنچنا مشکل پڑتا ہوگا۔ ان کی بانسری کا جادو اپنی جگہ مگر رادھا جی ننگے پیروں ان گلیوں سے کیسے گزرتی ہوں گی۔"

ابھی میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک گوری میم الٹی سیدھی سفید کھدر کی ساڑھی باندھے ننگے پیروں میرے برابر سے گزرتی چلی گئی۔ پیچھے پیچھے ایک گورا نوجوان۔ سر منڈھا ہوا۔ گلے میں جنیو، ماتھے پہ لمبا تلک۔ آنکھوں پر عینک چڑھی ہوئی؟ گیروا دھوتی باندھے ننگے پیروں کس بے تکلفی سے چلا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی بات کا جواب مل گیا تھا۔ گیتا نجلی کا جواب میں نے سنا ان سنا کیا۔

مگر جس راہ گزرا، رادھا کی بڑی بڑی تصویریں برابر سے جو لوگ گزرے، وہ ایک دوسرے کو رادھا رادھا کہتے اور آگے بڑھ جاتے۔ مجھے یاد آیا کہ ہماری ڈبائی میں ہندو لوگ سلام کے نام رام رام کہتے تھے۔ بہت تکلف کرتے تو کہتے جے رام جی کی۔ ادھر بندرابن میں رام رام غائب۔ سلام کے نام لوگ رادھے رادھے کہتے ہیں مگر کرشن جی کہاں ہیں۔ نہ ان کی کوئی تصویر نظر آئی نہ ان کا نام سنائی دیا۔ میں نے گوسوامی جی سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ یہ گوسوامی جی کون تھے۔ ارے انہیں کے آشرم کو تو ہم ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ ہمیں تو ان کا مہمان بننا ہے مگر ان کا آشرم ہے کہاں۔

لیجیے ہم نے ان کے آشرم کو ڈھونڈ نکالا۔ خوب جگہ ہے۔ کیسے صاف ستھرے دھلے منجھے کمرے ہمیں رہنے کو ملے ہیں۔ میں نے ان سے پہلا سوال یہی کیا "سوامی جی، معاف کیجیے بندرابن نے مجھے اچنبھے میں ڈال دیا ہے۔ یہاں تو رادھا ہی رادھا نظر آ رہی ہے۔ کرشن جی تو مجھے کہیں نظر نہیں آ رہے۔ جیسے بس یہاں رادھا جی ہی کا راج ہو۔"

سن کر قہقہہ لگایا۔ بولے "ارے وہ ماکھن چور۔ وہ تو اس نگر کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ رادھا جی یہاں تک کرر ہیں تو اس نگری پر تو انہیں کا راج ہوگا۔"

پھر گوسوامی جی نے کہا کہ بھائی تمہیں کیا پتہ چلے گا۔ میں تمہیں بندرا بن دکھاؤں گا۔ تو جیسے وہ آگے آگے، ہم پیچھے پیچھے۔ مگر چلنے لگے تو انہوں نے گیتا نجلی کو دیکھ کر ٹوکا۔ "یہ تم نے پرس کیوں لے رکھا ہے۔ اسے یہیں چھوڑو۔ یہاں کے بندر دو چیزوں کی تاک میں رہتے ہیں۔ عورتوں کا پرس اور مردوں کی آنکھوں پر چڑھی عینک۔"

میں نے گوسوامی جی کو دیکھا۔ انہوں نے عینک لگا رکھی تھی۔ پھر میں نے دل میں سوچا کہ وہ تو گوسوامی ہیں۔ بندرا بن کے بندر ان کا بہر حال لحاظ کرتے ہوں گے۔ خیر تو گوسوامی جی آگے آگے، ہم پیچھے پیچھے۔ کتنی گلیوں سے گزرتے چلے گئے۔ ہر گلی کنج گلی۔ اب کسے پتہ ہوگا کہ رادھا کون سی گلی میں رہتی تھی۔ گلیوں سے گزرے۔ اب ہم جمنا کے کنارے کنارے چل رہے تھے اور میں حیران کہ اچھا یہ جمنا ہے۔ بندرا بن میں آ کر اس کا کیا حال ہوگیا ہے۔ لگتا ہے کہ ندی نہیں کوئی نالا بہہ رہا ہے۔

گوسوامی جی چلتے چلتے ایک دم ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے "اس کدم کے پیڑ کو آپ دیکھ رہے ہیں۔"

کدم کا وہ گھنا پیڑ، گھنا اور پرانا۔ اس کی پھیلی ہوئی ٹیڑھی ترچھی شاخوں پر کتنے بندر کود پھاند رہے تھے اور کتنے لال پیلے نیلے ریشمیں سوتی پارچے بندھے ہوئے تھے۔

"یہ ہے وہ پیڑ جہاں کرشن جی گوپیوں کے کپڑے لتے سمیٹ کر آن چھپے تھے۔ وہ بیچاریاں ندی میں جہاں گردن گردن پانی تھا، کھڑی تپ کر رہی تھیں کہ کسی طور انہیں کرشن کنہیا کے سنگ کھیلنے کا موقع ملے۔ کرشن کنہیا نے ان کے ساتھ یہ کھیل کھیلا کہ انہوں نے جمنا میں اترتے سے جو اپنے کپڑے اتار کر کنارے پر چھوڑ دیئے تھے، انہیں سمیٹ کر چپکے سے بغل میں دبایا اور اس پیڑ پر چڑھ کر شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔" رکے، پھر بولے "بوجھو کہ اس پیڑ کا پتہ کیسے چلا؟ خود بندرا بن کا پتہ نشان کیسے ملا۔ وہ نگری تو کہیں بیتی شتابدیوں میں گم ہوگئی تھی۔ اصل میں چیتنیا نے اس جگہ کو دریافت کیا تھا۔"

یہ چیتنیا کون تھا۔ بنگال کا باسی۔ کرشن جی کا بھگت، کہہ لیجیے کہ عاشق صادق۔ وشنومت کا پرچارک۔ کرشن لیلا میں گم۔ اس کیفیت میں ناچ رہا ہے، گا رہا ہے۔ کلکاریاں مار رہا ہے۔ پری میں باس کر رہا تھا۔ ایک دن ترنگ اٹھی کہ چلیں بندرا بن چلیں۔ اڑیسہ کے جنگلوں سے گزر ہوا۔ اس جنگل میں شیر چیتے دندناتے پھرتے تھے۔ جس نے ان جنگلوں میں قدم رکھا جان سے گیا۔ چیتنیا اپنی ترنگ میں چلا جاتا تھا کہ ایک چیتا بیچ راہ پڑا سو رہا تھا۔ اس سے جا ٹکرایا۔ چیتا غرایا۔ چیتنیا کا سنگھی تھر تھر کانپنے لگا کہ لو مارے گئے مگر چیتنیا نے چیتے سے کہا کہ او چیتے شیام نام لے۔ یہ چیتنیا کی کرامات تھی یا کرشن جی نے اپنا معجزہ دکھایا۔ چیتا

ہرے کرشنا، ہرے کرشنا کا راگ الاپنے لگا۔ کتنے ہرن دوڑتے ہوئے آئے۔ وہ بھی چیتے کے ساتھ مل کر ہرے کرشنا کا ورد کرنے لگے۔ پھر کتنے شیر چیتے، لگڑ بھگے، تیندوے، بھیڑیے اس جلوس میں شامل ہو گئے۔ دیکھا آپ نے چیتنیا سے کیسی کیسی کرامات منسوب ہیں۔ سب کرشن بھگتی کا کرشمہ تھا۔ اس بھگتی میں جنس کی ایک لہر بھی شامل تھی۔ اس کی اپنی داستانیں کہانیاں ہیں۔

''تو چیتنیا بنگال سے چل کر یہاں آیا۔'' گوسوامی جی کہہ رہے تھے۔'' کتنے دنوں اس ویرانے میں بھٹکتا پھرا۔ ڈھونڈتا پھرتا تھا کہ بندرابن کہاں آباد تھا۔ کہاں ہے وہ جمنا تٹ جہاں گوپیوں نے اپنے کپڑے دھرے تھے۔ کہاں ہے وہ پیڑ جہاں کرشن مہاراج ان کپڑوں لتوں کو بغل میں دبا کر اس کی شاخوں کے بیچ جا چھپے تھے۔ کتنوں نے اسے پتہ نشان بتایا۔ پر اس کا جی نہ ٹھکا۔ بس چلتا رہا۔ بھٹکتا پھرا۔ کبھی اس راہ، کبھی اس راہ۔ بس ایک دن کسی شبھ گھڑی میں وہ چلتے چلتے ٹھٹھکا۔ ٹھیک کدم کے اس پیڑ کے سامنے۔ اسے تکتا رہا۔ پھر اعلان کیا کہ یہ ہے وہ پیڑ جہاں کرشن مہاراج گوپیوں کے کپڑے چرا کر اس کی شاخوں میں چھپ گئے تھے۔''

مت پوچھو کہ چیتنیا نے کیسے جانا کہ یہی وہ پیڑ ہے۔ عاشقوں سے ایسے سوال نہیں پوچھے جاتے۔ بس عشق نے بتایا، وجدان نے سمجھایا۔ چیتنیا کو یقین آ گیا کہ یہ ہے وہ جگہ جہاں بندرابن کسی بھلے سمے میں شاد آباد تھا اور کرشن کنہیا کی بنسری کی تانوں سے گونجتا تھا۔ جنہیں سن کر رادھا سدھ بدھ بھولتی اور نکل کھڑی ہوتی۔

تو صاحبو، اس ویرانے کے دن اب پھرنے کو ہیں۔ چیتنیا نے اس استھان کا پتہ لگا لیا ہے جہاں بندرابن آباد تھا۔ اب بندرابن دوبارہ آباد ہوا چاہتا ہے۔ گوسوامی جی بتاتے ہیں کہ اس بستی کو پھر سے بسانے کی منصوبہ بندی چیتنا نے اس طرح کی کہ چھ گوسوامیوں کا ایک بورڈ تشکیل دیا۔ ان میں تین مسلمان تھے۔ مسلمان؟ ہاں مسلمان۔ کہنے لگے کہ اس وقت بنگال میں مسلمانوں کا راج تھا۔ چیتنا کا حاکم طبقہ میں اچھا خاصا رسوخ تھا۔ اس نے اس طبقہ سے تین گوسوامی چنے۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو مسلمان ہیں۔ چیتنا نے کہا، پھر کیا ہوا۔ کرشن بھگت تو ہو۔ بولے، ہاں وہ تو ہم ہیں۔ تو بس تم لوگ ان گوسوامیوں میں شامل ہو جاؤ اس نگر کو پھر سے آباد کرنے کا جتن کریں گے۔

میں نے یہ بیان حیرت سے سنا۔ آہستہ سے ایک سوال کیا کہ چیتنیا تو کرشن بھگت تھا۔ اپنی بھگتی میں مگن، اپنے حال میں مست، اس میں اتنی دنیاداری کہاں سے آ گئی۔

گوسوامی جی مسکرائے'' وہ اتنا دیوانہ بھی نہیں تھا جتنا اسے لوگ سمجھتے تھے۔ دانا بینا آدمی تھا۔ خوب سمجھتا تھا کہ جن کا راج ہے، ان سے بنا کے رکھنی چاہیے۔ تو ان گوسوامیوں نے جن میں تین مسلمان تھے، بندرابن کی داغ بیل ڈالی۔''

اس سے میرا دھیان نرد چوہدری کی طرف گیا۔ اس نے اپنی کتاب ''ہندوازم'' میں بتایا ہے کہ چیتنیا کے چیلوں میں کچھ مسلمان بھی تھے اور ایسے ویسے نہیں خالص پٹھان مسلمان اور ان میں اس کا بہت خاص

چیلا بھی تھا۔ شاید وہی ہو جس کا ذکر گوسوامی جی نے کیا۔ کہنے لگے "چیتنا ئی جی کا ایک خاص الخاص چیلا مسلمان تھا۔ وہ پون ہری داس کہلاتا تھا۔ کرشن جی کے نام کی مالا جپتا رہتا۔ کبھی مندر نہیں جاتا تھا۔ دوسرے چیلوں نے اعتراض کیا کہ یہ کیسا کرشن بھگت ہے۔ کبھی مندر نہیں جاتا۔ چیتنیا جی بولے، اسے مندر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھگوان خود اس کے پاس آجاتے ہیں۔ جب وہ مرا تو چیلوں نے اس کی چتا جلانے کا بندوبست کیا مگر چیتنیا جی نے کہا کہ نہیں اس کی چتا جلائی نہیں جائے گی۔ دفن کی جائے گی اور چیتنیا جی نے اپنے ہاتھوں سے اسے دفن کیا۔"

چلتے چلتے اب ہم اس بڑے مندر کے سامنے پہنچ گئے تھے جو گوبند جی کا مندر کہلاتا تھا۔ گوبند کرشن جی کا وہ نام ہے جو رس لیلا سے متعلق ہے۔ اسی حساب سے یہ مندر تعمیر ہوا ہے۔ جب داخل ہوتے ہیں تو ایک لمبا چوڑا ایوان نظر آتا ہے۔ اس کے آخر میں ایک کوٹھری ہے جس میں کرشن جی کی مورتی بھی ہے اور ایسے زاویے سے بنی ہے کہ جب پورن ماشی کا چاند نکلتا ہے تو اس کی کرنیں اس طویل ایوان کو پار کر کے سیدھی مورتی پر پڑتی ہیں۔

گوسوامی جی ہمیں یہ بتا رہے تھے کہ اس بیچ ایک بندر چپکے سے ہمارے بیچ آیا، لپکا اور گوسوامی جی کی عینک اچک کر یہ جا وہ جا۔ گوسوامی جی کے بروقت انتباہ سے گیتا نجلی کا پرس تو بندروں کی دست برد سے بچ گیا مگر سوامی جی خود اپنی عینک کو بندر کے جھپٹنے سے نہ بچا سکے مگر آخر وہ بندر بندرابن ہی کا تھا اور عینک بندرابن کے گوسوامی کی تھی۔ گوسوامی جی نے اپنے چیلوں کو پکارا۔ "ارے کچھ کرو، بندر ہماری عینک لے گیا۔"

ایک چیلے نے فوراً کچھ روٹی، کچھ ڈبل روٹی کے ٹکڑے مٹھی میں دبائے اور دوڑا۔ بندر کے پیچھے پیچھے جواب بالکونی پہ پہنچ چکا تھا مگر چیلا تجربہ کار تھا۔ روٹی کے عوض جلد ہی عینک کا سودا ہو گیا اور عینک کو ذرا جو گزند پہنچا ہو۔ گوسوامی جی نے رومال سے عینک کا شیشہ صاف کیا اور فوراً آنکھوں پر چڑھا لی۔ بندرابن کے بندر تخریب پسند نہیں ہیں، نہ ہٹ دھرم ہیں۔ ان کی مانگ پوری کر دو اور گئی چیز کو واپس لے لو۔ اسے وہ بحفاظت تمام واپس کریں گے۔

اب ہم باہر نکل آئے تھے اور گوسوامی جی مندر کی بلند عمارت کی طرف اشارہ کر کے پوچھ رہے تھے "یہاں کوئی مورتی نظر آرہی ہے آپ کو؟"

"مورتی تو بعد کی بات ہے۔" میں نے کہا "یہ مندر تو مجھے مندر ہی نظر نہیں آرہا۔"

"جی ہاں۔ اس کا طرز تعمیر مختلف ہے۔ یہاں اسلامی اور ہندو طرز تعمیر کا امتزاج ہے۔ کہہ لیجیے کہ یہ مندر گنگا جمنی تہذیب کا مظہر ہے اور اب سنیے کہ اس تعمیر کی تاریخ کیا ہے۔" رکے اور پھر شروع ہو گئے" یہ مندر اکبر کی آشیر واد سے تعمیر ہوا تھا۔ اس وقت مسئلہ کیا تھا۔ اکبر کو مہارانا پرتاب سنگھ سے مقابلہ درپیش تھا اور اکبر یہ چاہتا تھا کہ ہندوؤں میں سے کسی بااثر گروہ کی اخلاقی حمایت اسے حاصل ہو جائے اور لڑائی خالی ہندو مسلمان

کی لڑائی کا رنگ نہ پکڑے۔ تو یہ مشن راجہ مان سنگھ کے سپرد کیا گیا۔ مان سنگھ متھرا سے ہوتا ہوا بندرابن میں آن براجا۔ یہاں کے گوسوامیوں سے ملا اور اکبر سے مہارانا پرتاب کے خلاف حمایت کی درخواست کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم ضرور حمایت کریں گے مگر ایک شرط کے ساتھ۔ وہ کیا شرط ہے۔ بولے کہ ہمیں بندرابن میں اپنا بڑا مندر تعمیر کرنا ہے مگر ہمارے وسائل اس کی اجازت نہیں دے رہے۔ مان سنگھ نے کہا کہ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ اکبر بادشاہ تمہاری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہے۔ جتنا پیسہ مانگو گے، ملے گا۔ بولے محض پیسے کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہماری تمنا یہ ہے کہ جو پتھر فتح پور سیکری کے قلعہ میں لگا ہے وہی اس مندر کے لیے حاصل کیا جائے۔ مان سنگھ اس شرط پہ پریشان ہوا اور بولا، قلعہ کی تعمیر کے بعد بادشاہ نے مناہی کر دی ہے کہ اب یہ پتھر کسی عمارت میں استعمال نہیں ہوگا۔ تو اور کچھ مانگو۔ وہ بولے، ہماری مانگ تو بس یہی ہے۔"

مان سنگھ مایوس واپس آیا اور اکبر کو بتایا کہ انہوں نے تو ایسی شرط رکھ دی ہے کہ پوری ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر وہ شرط بتائی۔ اکبر نے کہا کہ یہ شرط کیوں پوری نہیں ہو سکتی۔ ضرور پوری ہوگی۔ فوراً احکامات جاری کیے کہ فتح پور سیکری کے قلعہ میں جو پتھر لگا ہے، وہ بندرابن کے مندر کے لیے بھجوایا جائے۔

لیجیے وہ خاص پتھر جو فتح پور سیکری کے قلعہ میں لگا تھا، ادھر بندرابن ڈھلنے لگا۔ بندرابن کا بڑا مندر گوبند مندر تعمیر ہونے لگا۔ مگر تعمیر نے کیا رنگ پکڑا۔ سوامی جی کہتے ہیں کہ بندرابن کے ان گوسوامیوں نے جو چیتنیا کے مقرر کردہ تھے، یہ سوچا کہ جب اکبر بادشاہ نے ہم پر یہ عنایت کی ہے تو ہمیں بھی اس مسلمان بادشاہ کے مذہبی جذبات کا کچھ احترام کرنا چاہیے۔ سو طے یہ ہوا کہ مورتیاں سب اندر ہوں، باہر کی دیواروں پر نہ بنائی جائیں۔ بس اسی احساس کے تحت طرز تعمیر بھی بدلا گیا۔

ہاں باہر کی بلند و بالا دیواروں پر طاق ضرور بنے ہوئے تھے۔ ان میں مورتی کوئی نہیں تھی مگر ہر طاق میں ایک بندر بیٹھا تھا اور ایسا دم سادھے ہوئے کہ جیسے یہ بندر نہیں، بندر کی مورتی ہے۔ دیوار کی بلندیوں پر نظر دوڑاتے دوڑاتے نیچے آس پاس نظر ڈالی تو دیکھا کہ بندروں کی وہ ٹولی جو پہلے ہم سے بے نیاز دور بیٹھی تھی، آہستہ آہستہ چل کر ہمارے قریب آ گئی ہے۔ گوسوامی جی نے کہا کہ "ان باندروں کے تیور کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے۔ بہتر ہے یہاں سے اب سرک لیں۔" اور ہم مندر کے گرد ایک چکر لگا کر واپس اپنی گاڑی میں آ بیٹھے۔

صبح منہ اندھیرے دروازے پر دستک ہوئی "انتظار صاحب آرتی دیکھنی نہیں ہے۔"

"بالکل دیکھنی ہے۔"

جلدی سے اٹھا۔ ہبڑ دبڑ کپڑے بدلے۔ کلی کی، منہ پہ چھپاکے مارے اور باہر نکل آیا۔ سدھیر اور گیتانجلی تیار کھڑے تھے۔ باہر قدم نکالا تو دیکھا کہ ابھی تو بہت اندھیرا ہے۔ روشنی تھی تو بس دیوں کی اور دیئے اس وقت ہر گھر کی ڈیوڑھی میں جل رہے تھے اور ہر ڈیوڑھی مندر بنی ہوئی تھی۔ گوشے میں ایک مورتی' اس کے گرد رکھے دیئے جھلملا رہے ہیں۔

ایک گلی سے گزرے تو گھپ اندھیرا۔ نہ آدمی نہ آدمی کی ذات۔ ہاں ایک چبوترے پر بہت سے بندر ایک دائرے کی صورت بیٹھے تھے مگر بالکل چپ۔ سر جھکے ہوئے آنکھیں موندی ہوئیں۔ ارے کہیں شیام نام کی مالا تو نہیں جپ رہے۔ سر جیسے واقعی شردھا میں جھکے ہوئے ہوں۔ ہاں یاد آیا، پچھلی شام بھی تو ایک اندھیرے سے پالا پڑا تھا۔ آشرم کے باغیچے میں ٹہلتے ٹہلتے کانوں میں بھجن کی آواز آئی۔ "یہ بھجن کہاں ہو رہے ہیں۔" اور ہم ان آوازوں کا تعاقب کرتے کرتے ایک تاریک ہال میں جا گھسے۔ لوگ اسی طرح شردھا سے سر جھکائے بھجن سننے میں غرق تھے۔ اندھیرا بہت تھا۔ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون لوگ ہیں۔ میں سرکتا سرکتا ان کے بیچ میں جا گھسا اور کسی نہ کسی طرح اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ بنالی۔ جب بھجن ختم ہوئے اور ایک دم سے اجالا ہوا تو میں نے دیکھا کہ میں گوریوں کے بیچ گھسا بیٹھا ہوں۔ کسی کا سر منڈا ہوا، کسی کے بال بکھرے ہوئے اور سب کے بر میں ساڑھیاں۔ مگر ساڑھی جو سلیقہ مانگتی ہے وہ غائب مگر بھگتی اور عشق میں سلیقہ کو کون پوچھتا ہے۔ اپنا پہناوا اتار الٹی سیدھی ساڑھی، کوئی جوگیا کوئی سفید باندھ لی اور ہرے رام ہرے شیام الاپنے لگیں۔ تو ایک دم سے روشنی ہوگئی اور بھاشن شروع ہوگیا مگر ہم تو بھجن سننے گئے تھے۔ بھاشن شروع ہوا تو ہم سرک آئے اور میرا خیال تھا کہ یہاں آرتی میں بھجن بھی ہوں گے۔ کوئی بھلا سا بول سننے کو ملے گا۔

میں تو ارتی اتاروں رادھے شیام کی

مگر خالی ارتی اتاری گئی۔ بھجن نہیں ہوا۔ میں تھوڑا مایوس ہوا۔

تو صبح سویرے منہ اندھیرے آرتی کی گہما گہمی بھی دیکھ لی۔ اب دیکھنے کو کیا رہ گیا تھا۔ بندرابن کی گلیوں کی خاک بھی چھان چکے۔ بندر دیکھے، مندر دیکھے۔ ہاں ایک مندر رہ گیا تھا۔ سو صبح ہی صبح ہمیں گوسوامی لے کر نکلے۔ وہ مندر جو دکھانا چاہتے تھے وہ تو آشرم کے پڑوس ہی میں تھا۔ واجد علی شاہی مندر۔ واجد علی شاہی کس تقریب سے۔ گوسوامی جی بتانے لگے کہ یہ مندر اس شخص نے بنوایا ہے جو نواب واجد علی شاہ کا خزانچی تھا اور کتھک میں ان کا گرو تھا۔ 1857ء کی قیامت میں لکھنؤ سے نکلا۔ چونکہ خزانچی تھا، اس لیے بہت سی دولت لے کر نکلا اور بندرابن آن براجا۔ جب باغیوں کی پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی اس کے لیے بھی یہاں دوڑ آئی مگر اس نے بندرابن کی زمین پکڑی اور کہا کہ پھانسی دینی ہے تو یہیں دو۔ خیر کسی طریقہ سے معافی تلافی ہوگئی۔ اس نے یہاں ایک مندر بنوایا اور اہتمام کیا کہ جو نقشہ واجد علی شاہ کے دربار کا تھا وہی نقشہ یہاں جمایا جائے۔ سو ایسا ہی کیا گیا کہ کہیں چوسر کی بساط بچھی ہے، کہیں پتنگ بازی کا نقشہ ہے۔

اور ہاں گوسوامی جی نے کہا کہ میں نے جو آپ کو بندرابن کی یہ تاریخ بتائی ہے وہ ان دستاویزوں پر مبنی ہے جو یہاں سے مجھے دستیاب ہوئی ہیں۔ انہیں لے کر میں پروفیسر عرفان حبیب کے پاس گیا۔ انہوں نے پہلے تو ان دستاویزوں کو دیکھنے ہی سے انکار کر دیا۔ کہا میں مذہبی قصوں میں نہیں پڑتا۔ میں نے اپنا دفتر سمیٹا اور یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ میں تو سمجھتا تھا کہ میں ایک مورخ سے مل رہا ہوں۔ اس پر انہوں نے تامل کیا۔

دستاویزوں کو الٹا پلٹا۔ کہا کہ اچھا انہیں میرے پاس چھوڑ جایئے۔ تو اب ان دستاویزوں کی بنیاد پر اس علاقے کی تاریخ پر کام ہو رہا ہے۔

یہ کچھ بتانے کے بعد گو۔ ای جی کہنے لگے "اگر ہم تاریخ کو صحیح طریقہ سے پڑھیں تو ہندو مسلمانوں کے بہت سے جھگڑے ختم ہو جائیں۔" پھر اپنے بیان میں انہوں نے ایک ٹکڑا اور لگایا۔ بولے کہ "اورنگزیب تو مفت میں بدنام ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ زیادتی تو اصل میں شاہجہاں نے کی تھی۔ اورنگزیب نے تو بلکہ اس زیادتی کی تلافی کی تھی۔ شہنشاہ اکبر نے ہندوؤں کو جو رعایات دی تھیں، وہ شاہجہان نے واپس لے لیں۔ اکبر کے جاری کیے ہوئے ایسے سارے احکامات منسوخ کر دیئے۔ اورنگزیب نے تخت پر بیٹھنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ اکبر کے منسوخ احکامات کو بحال کر دیا۔ ہندوؤں سے جو رعایات چھن گئی تھیں، وہ انہیں واپس مل گئیں۔"

دن چڑھ چکا تھا اور اب ہمیں واپس ہونا تھا۔ بندرابن کی سب گلیاں چھان ماریں اور ہاں بندرابن میں ایک بازار بھی تو ہے۔ اس کا بھی چکر لگا لیا۔ بس ایک ملاقات ہونے سے رہ گئی۔ وہ جو ہندی کے مشہور کہانی کار ہیں، وبھوتی نارائن رائے وہ ان دنوں اپنی سرکاری ڈیوٹی پر آگرہ میں تھے۔ انہیں بھی سدھیر نے فون کر دیا تھا مگر آگرہ کا تو ہمارا پروگرام منسوخ ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا میں خود بندرابن پہنچوں گا۔ مگر خوب ہوا کہ وہ بندرابن کے کنارے پہ آ کر ٹھٹھک گئے۔ فون آیا کہ بندرابن میں بیٹھ کر ہم پی نہیں سکتے۔ یہاں بندرابن میں فلاں بار میں بیٹھے ہیں۔ آپ انتظار حسین کو لے کر یہاں آ جائیں تو اچھی ملاقات رہے گی۔ سدھیر نے مجھ سے ذکر کیا۔ میں نے بہت حیرت سے پوچھا کہ "اچھا بندرابن میں شراب پر پابندی ہے۔"

"جی ہاں۔ یہاں نہ پی سکتے ہیں نہ پلا سکتے ہیں۔ یہ بندرابن ہے۔"

"ارے سبحان اللہ۔ بندرابن کی یہ روایت تو اسلامی روایت سے جڑ گئی۔ پھر تو مہمانوں پر بھی فرض ہے کہ بندرابن کی اس روایت کا احترام کریں۔"

"ٹھیک کہا۔ نہیں جاتے وبھوتی جی سے ملنے۔ پھر کبھی مل لیں گے۔"

تو وہ جو ایک کہانی کار سے اور ایسے کہانی کار سے جس نے "شہر میں کرفیو" جیسی کہانی لکھی ہے، ملاقات کی ٹھہری تھی وہ ہونے سے رہ گئی۔ تو لیجیے بندرابن کی بہت خاک چھان لی۔ اب واپس دلی چلتے ہیں۔

❧ .... ❧ .... ❧

حسینی برہمن زادی کیا کہتی ہے

ارے ابھی تو ایک اور سفر درپیش ہے۔ سنگیتا کے فون پہ فون آ رہے ہیں کہ بھوپال کب پہنچ رہے ہو مگر اب یہ خالی بھوپال کا سفر نہیں رہا۔ سنگیتا نے بتایا ہے کہ انہیں تاریخوں میں ادھر اجین میں کالی داس فیسٹیول منعقد ہو رہا ہے۔ وہاں جانا بھی ضرور ہے۔ ارے اجین ...... کہانیوں کتھاؤں والا شہر۔ راجہ بکرماجیت۔ بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی۔ کیا خوب ہندیا ترا ہے۔ میرا ایک قدم پراچین بھارت میں، دوسرا قدم نئے ہندوستان میں۔ ابھی اجنتا ایلورا کی گپھاؤں میں بھٹک رہا تھا اور ابھی لکھنؤ یونیورسٹی میں مسعود حسن رضوی ہال کا فیتہ کاٹ کر اس مبارک ایوان کے افتتاح کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ کل میں بنارس میں مہاتما بدھ قیم والے ہرن بن میں تھا (ارے اب وہ ہرن بن کہاں رہا ہے۔ نہ بن ہے نہ ہرن ہے) اور آج لکھنؤ میں اخباری نمائندوں کے نرغے میں ہوں اور جیسے انہوں نے پاکستان میں آزادیٔ اظہار کا سوال اٹھا کر اپنی دانست میں مجھے لاجواب کر دیا۔ آزادیٔ اظہار۔ ارے آپ لوگ پاکستان کے ٹی وی چینل نہیں دیکھتے۔ پرویز مشرف پر بے بھاؤ کی پڑ رہی ہیں۔ وہاں تو بوتل سے آزادیٔ اظہار کا جن اس رنگ سے نکلا ہے کہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا اور تم مجھ سے گھٹن کی بات کر رہے ہو۔ ارے عزیزو! تم کس دنیا میں رہتے ہو۔ ہندوستان والوں کے ساتھ یہی تو مشکل ہے کہ اپنے اردگرد کی دنیا بدلتے دیکھ رہے ہیں لیکن سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں کچھ نہیں بدلا۔ زمین جنبد نہ جنبد گل محمد۔

ادھر ہم ہیں کہ کل تک واقعی وہ گھٹن تھی کہ الٰہی توبہ اور اب یہ دیکھ کر پریشان ہیں کہ آزادیٔ اظہار کا منہ زور گھوڑا ٹی وی چینلوں پر بگٹٹ دوڑ رہا ہے۔ خیر تو اب بھوپال کا سفر درپیش ہے مگر بیچ میں سریش جی نے ایک پروگرام اور رکھ لیا ہے۔ "آپ کو ہمارے ادارے میں ایک لیکچر دینا ہے۔"

"لیکچر۔ لیکچر تو پروفیسر دیا کرتے ہیں۔ میں کہانی کار ہوں۔ مجھ سے کوئی کہانی پڑھوائیے۔"

"نہیں، یہاں آپ کو لیکچر ہی دینا ہے۔ موضوع ہم نے سوچ رکھا ہے بلکہ اس کا اعلان بھی کر دیا ہے۔"

"وہ کیا موضوع ہے۔" اب مجھے تجسس ہوا کہ الٰہی اب مجھے کونسی آزمائش سے گزرنا ہے۔

بولے ''کاشی اور کربلا۔''

''کاشی اور کربلا۔'' میں سٹپٹایا۔ ''کاشی اور کربلا۔ یہ کیا موضوع ہوا۔ میں سمجھ نہیں پایا۔''

''بس یہی موضوع ہے اور آپ نہیں سمجھیں گے تو پھر اس موضوع کو کون سمجھے گا اور سمجھائے گا۔''

''سوچنا پڑے گا۔''

''سوچ لیجیے۔ ہم نے تو طے کرلیا ہے۔ دعوت نامے بھی جاری ہو چکے ہیں۔''

کاشی اور کربلا۔ کربلا اور کاشی۔ دل ہی دل میں اس عنوان کو الٹ پلٹ کر کے دہراتا رہا۔ یہ کیا موضوع ہوا۔ یہ تو انمل ہے مگر یہی دو نام دہراتے دہراتے مجھے محسن کاکوری کے نعتیہ قصیدے کا مطلع یاد آ گیا۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل

اور پھر گریز۔

چھوڑ کر میکدۂ ہند و صنم خانۂ برج
آج کعبہ میں بچھائے ہے مصلا بادل

مگر کربلا تو کعبہ سے دور ہے۔ یہ سوچ رہا تھا کہ روپ کماری کے مرثیے کا ایک مصرعہ حافظہ میں گونج گیا۔

نجف ہمارے لیے ہر دوار و کاشی ہے

لو اب تو واقعی کربلا کاشی سے نزدیک دکھائی پڑ رہی ہے۔ بس اسی طرح کے آڑے ترچھے حوالے ذہن میں آتے چلے گئے۔ انہیں حوالوں کے بیچ کہیں میں نے پریم چند کے ڈرامے ''کربلا'' کا حوالہ دے دیا جہاں ان برہمن بھائیوں کا تذکرہ ہے کہ کس طرح وہ کربلا پہنچے اور امام حسین کی حمایت میں تلوار اٹھائی۔ ان بھائیوں سے میرا دھیان حسینی برہمنوں کی طرف گیا مگر اب حسینی برہمن کہاں نظر آتے ہیں۔ شاید وہ بھی ہند اسلامی تہذیب کے کتنے آثار و نشانات کے ساتھ رل مل کر مٹ گئے۔

میں نے تقریر کیا کی۔ بس اس رو میں بولتا چلا گیا۔ بولتے بولتے دھیان میں ذاکروں کی کتنی تقریریں تصور میں پھر گئیں۔ ارے ہاں محرم کی مجلسوں میں ایک حوالہ ہندوستان کا بھی تو آیا کرتا تھا۔ امام حسین اتمامِ حجت کر رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ مجھے تم سے جنگ مقصود نہیں ہے۔ میں اس پر بھی تیار ہوں کہ یہاں سے نکل کر کسی دوسرے ملک چلا جاؤں۔ کتنے ملک ہیں۔ ایک ملک ہندوستان ہے۔ میں اس طرف نکل جاؤں گا اور میں یہاں گفتگو کرتے کرتے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ جو امام کے خطبہ میں ہندوستان کا حوالہ آیا ہے، اس کی کیا معنویت ہے۔

اور پھر مجھے اور اور قسم کی باتیں یاد آنے لگیں۔

عزاخانوں میں عزاداروں کا گریہ۔ ذاکر رقت آمیز لہجہ میں کہہ رہا ہے۔ عزادارو! مولا اس وقت کربلا میں نہیں ہیں (پھر کہاں ہیں، میں سنتے ہوئے سوچا کرتا تھا) محرم کے چاند کے ساتھ وہ کربلا سے نکلتے ہیں اور ہندوستان کی طرف آ جاتے ہیں۔ تو عزیزو! مولا اس وقت کربلا میں نہیں ہیں۔ وہ یہاں ہیں ہمارے عزاخانوں میں، ہمارے درمیان۔

یہ بیانات کیا کہتے ہیں۔ ہندوستان میں آ کر اس واقعہ نے کیا معنی پائے۔ ہند اسلامی تہذیب اپنی جگہ مگر اس کے بیچ محرم کی تہذیب نے یہاں آ کر کیا رنگ پکڑا۔ یہاں کی تہذیبی اور مذہبی روایتوں سے عوامی سطح پر جب اس کا گھال میل ہوا تو ایک ہند محرم تہذیب نے جنم لیا۔

میں نے اپنی گفتگو ختم کر کے سانس لیا ہی تھا کہ سامعین کے بیچ سے ایک لڑکی کھڑی ہوئی۔ بولی ''میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ حسینی برہمن آج بھی موجود ہیں۔ میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔ میرے ماتا پتا ہیں۔ ہم لوگ حسینی برہمن ہیں۔''

ایک حیرانی اور خوشی نے مجھے آ لیا۔ حیران کہ اچھا حسینی برہمن ایسے خوبصورت لوگ ہوتے ہیں۔ خوش کہ میں نے ایسی جنس کو جو ان زمانہ نایاب ہے، دریافت کر لیا ہے۔ چائے کی میز پر میری نظر اسے ڈھونڈ رہی تھی مگر وہ خود ہی آ گئی۔ بولی ''میں آپ سے کسی وقت ملنا چاہتی ہوں۔ آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''ہاں ضرور۔ تم سے ملاقات ہونی چاہیے۔ میں آئی آئی سی میں ٹھہرا ہوا ہوں۔'' میں نے کمرے کا نمبر بتا دیا۔ اس نے نمبر نوٹ کیا۔ کہا ''میں آپ کو فون کروں گی۔''

رکی، پھر بولی ''ہاں میرا نام ہے نونیکا دت۔ یاد رکھیے۔ میں آپ کو فون کروں گی۔'' بس اتنا کہا اور چلی گئی۔ لگتا تھا کہ بہت عجلت میں ہے۔

اگلے دن فون اگر آیا بھی ہوگا تو میں کونسا اپنے ٹھکانے پہ بیٹھا رہا جو سنتا۔ ہاں اگلی صبح کو تو میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ وہی جو میں ابھی کہہ رہا تھا کہ سنگیتا کے فون پہ فون آ رہے تھے۔ مجھے بھوپال جانا تھا لیکن اب مجھ پہ یہ بتانا بھی تو واجب آتا ہے کہ یہ سنگیتا ہے کون۔ میری ملاقات اس سے کس خوشی میں ہوئی۔

لاہور میں محمد علی ردولوی کے گھرانے کے چشم و چراغ ہیں کاظم صاحب۔ بہت خوب آدمی ہیں مگر میری ان سے رسم و راہ نہیں تھی۔ ہوتی بھی تو کس تقریب سے۔ ان کی دنیا اور۔ ان کے مشاغل و مصروفیات اور۔ مگر پھر ہوا یوں کہ ان کی والدہ کے بارے میں کہ محمد علی ردولوی کی بیٹی ہیں، ایک دستاویزی فلم بنائی جا رہی تھی۔ اس بہانے مجھے یاد کیا گیا اور مجھے ان کے یہاں جانے اور ان سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ خیر فلم کے مراحل بخیر و خوبی طے ہو گئے۔ بات ختم۔

اب مہینوں بعد اچانک ادھر سے کاظم صاحب کی بیگم صاحب کا فون آیا کہ آج ہمارے ساتھ روزہ افطار کیجئے۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ بیگم صاحب کے برابر ایک لڑکی کھڑی ہے۔ روشن چہرہ، ماتھے پہ بندی،

آواز میں ایک لپک۔ بیگم صاحب نے تعارف کرایا کہ یہ سنگیتا ہیں۔ بھوپال سے آئی ہیں۔ کہتی تھیں کہ مجھے انتظار حسین سے ملنا ہے، کیسے ملوں؟ جان نہ پہچان۔ ہم نے کہا کہ ہم آپ کو ملائیں گے۔ اچھا مگر بھوپال سے کس تقریب میں آنا ہوا۔ وہ بھی سن لیجیے۔ برابر میں ایک اور لڑکی کھڑی تھی۔ بینائی سے محروم مگر کن رس، موسیقی کا شوق، سنگیتا کے کوئی بھائی ہیں سنگیت کار۔ کاظم صاحب کے دوست۔ انہوں نے اس لڑکی کو موسیقی کی تعلیم کی خاطر ان کی نگرانی میں دے دیا۔ بھوپال جا کر وہ ان کے گھر رہی۔ موسیقی کے سبق لے کر اب وہ واپس آئی تھی۔ سنگیتا اسے یہاں پہنچانے آئی تھی۔ کہنے لگی کہ ''بس آپ سے ملنا تھا۔ ایک دن کے لیے اسلام آباد جاؤں گی۔ وہاں کشور ناہید سے ملوں گی اور احمد فراز سے، پھر واپس۔''

مگر واپس جا کر وہاں سے فون آیا کہ آپ کو بھوپال آنا ہے۔ کب آ رہے ہیں۔ بھوپال جاؤں۔ کیسے، کس تقریب سے۔ لیجیے تقریب خود بخود پیدا ہو گئی۔ نرل ورما کی تقریب میں گیا تھا۔ سنگیتا کی تحریک پر بھارت بھون سے ایک دعوت نامہ آ گیا اور میں بھوپال کے لیے چل کھڑا ہوا۔ بھوپال پہنچ کر اور ہی گل کھلا۔ یاروں نے شور مچایا، اجین چلو، اجین چلو۔ شور مچانے والے کون تھے؟ سنگیتا تو خیر ہوئی، وہاں ادیبی باجپئی بھی تھے۔ کیا باغ و بہار آدمی نکلے۔ اپنے بھائی اشوک باجپئی سے بڑھ کر اور انکشے، اپنی طرز کے مصور مگر اجین میں کیا ہے۔ وہ تو کتھا کہانیوں کا نگر ہوا کرتا تھا۔ حقیقت میں بھی اس کا وجود ہے، پتہ نہیں۔ ارے وہ کالی داس کا نگر ہے۔ اسی حساب سے تو وہاں کالی داس سمارو ہو رہا ہے۔ اچھا یہ بات ہے تو چلو اور ہم اجین کے لیے چل کھڑے ہوئے۔

واقعی وہاں تو کالی داس سمارو کی بہت دھوم دھام تھی۔ ناٹک کے ماہرین اور ناٹک کے رسیا ہندوستان کے دور دور کے شہروں سے اپنی اپنی منڈلیوں کے ساتھ آ رہے تھے۔ کالی داس کے ناٹک کھیلیں گے۔ ایک ناٹک کو تو ہم نے بھی دیکھ لیا۔ افتتاحی تقریب کے بعد ہی تو اس کا نمبر آ گیا تھا۔ یہ تھا کالی داس کا ''مالویکا'' اس کے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر تھے پانیکر جی۔ ڈانس ڈرامے کی صورت اسے پیش کیا تھا مگر زبان ایسی کہ ہمارے لیے تو یونانی تھی۔ سنگیتا تھوڑا سمجھا دیتی تو کچھ سمجھ میں آ جاتا مگر وہ جو عزیز لکھنوی نے ''وکرم اروشی'' کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، میرے لیے تو وہ اردو بھی یونانی ہے۔ ہم نے تو لے دے کر اختر حسین رائے پوری پر اعتبار کیا تھا کہ اردو بھی جناتی نہیں لکھتے اور سنسکرت زبان سے بھی آشنا تھے۔ کہیں اپنے شروع کے زمانے ہی میں ان کا ''شکنتلا'' کا ترجمہ پڑھا تھا۔ اس وقت تو ہمیں ان باتوں کا پتہ ہی نہ چلا جن کی طرف اب گیان چند جین نے اپنی متنازعہ تصنیف میں اشارے کیے ہیں کہ شکنتلا کے بچے کا عقیقہ بھی کرا دیا۔ ارے پھر ختنے بھی کرا دیئے ہوتے اور دشنیت کی زبان سے فاتحہ درود کی بات بھی کہلوا دی اور شکنتلا کے منہ سے کہلوا دیا ''کللہ اٹھو۔'' اس پر گیان چند کو طنز و تعریض کرنی ہی تھی۔

ارے لو، میں کدھر نکل گیا۔ ایسے عجوبے تو ہمارے اردو ترجموں میں بہت نظر آئیں گے۔ میں تو

کالی داس سمارو کی گپھا کبھی کا ذکر کر رہا تھا۔ اجین کا نگر۔ کالی داس کا جشن۔ لکھنوں، ناٹک کاریوں کے بیچ ایک بزرگ نظر آئے۔ سفید داڑھی، بر میں شیروانی اور پائجامہ۔ میں حیران کہ یہ انمل کیسی ہے مگر وہ بھی کالی داس پر اپنے کام ہی کی تقریب سے یہاں تھے۔ ان سے علیک سلیک ہوئی۔ یہ محمود ذکی تھے۔ کالی داس کے ترجمے بھی اردو میں کیے ہیں اور ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ ''کالی داس، ایک مطالعہ'' اس میں انہوں نے خوب داد تحقیق دی۔ بتایا ہے کہ انگریزی میں سب سے پہلا ''شکنتلا'' کا ترجمہ سر ولیم جونز کا ہے جو اس نے 1789ء میں کیا تھا مگر اردو میں اس سے بہت پہلے اس کھیل کا ترجمہ ہو چکا تھا۔ ایک بزرگ تھے نواز کبشیر۔ انہوں نے اورنگ زیب کے فرزند شاہ عالم کی تحریک پر 1680ء میں یہ ترجمہ کیا تھا۔ تب سے اب تک ان کی تحقیق کے مطابق کالی داس کے سارے کھیل اور ساری شاعری یعنی جو دستیاب ہے، اردو میں ترجمہ ہو چکی ہے۔

میں نے پوچھا ''ذکی صاحب، آپ اجین میں آ کر بس گئے ہیں یا اجین ہی کی مٹی ہیں اور کالی داس سے شغف کیسے پیدا ہوا؟''

بولے ''ہم جدی پشتی اجینی ہیں اور جب اجینی ہیں تو پھر کالی داس سے بھی شغف پیدا ہونا ہی تھا اور یہاں سنسکرت کے ایک ودھوان تھے سوریہ نرائن ویاس۔ انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ ان کی تحریک پر سب سے پہلے میں نے وکرم اروشی کا ترجمہ اردو میں کیا۔ پھر کالی داس پر ایک کتاب لکھنے کا ڈول ڈالا۔ خاص طور پر اردو میں اس کے ترجموں کے حوالے سے۔''

کالی داس سمارو کی گپھا کبھی اپنی جگہ مگر اس صدیوں پرانے نگر میں آئے ہیں تو کچھ اس کی بو باس بھی تو سونگھیں۔ اودیا باچپئی نے کہا کہ اس نگر کے آس پاس کچھ پرانے مندر ہیں۔ انہیں دیکھ لیں۔ میں نے کہا کہ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ تو ہم پرانے مندر دیکھنے نکل پڑے۔ اجین سے نکلے اور اوبڑ کھابڑ رستوں پر پڑ لیے۔ کہاں کہاں گئے اور کیسا کیسا پرانا مندر دیکھا۔ بے آباد، ویران، کھنڈر، دیواریں کاہی سے کالی پڑی ہوئی جیسے واقعی راجہ بکرماجیت کے زمانے کی یادگار ہو۔ تو لیجیے اس بہانے اجین کے نواح کی بھی خاک چھانک لی۔

ہاں صبح سیمینار کی نشست تھی۔ سوچا تھا کہ وہاں جھانکیں گے اور واپس بھوپال چل پڑیں گے مگر وہاں تو کلیدی مقالہ ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اندرناتھ چودھری رواں تھے۔ وہ تھمیں تو میں کالی داس کو خراج تحسین پیش کروں اور پھر ناظمین سے معذرت کر کے اپنے سفر پر روانہ ہوں۔ اس میں اتنی دیر لگ گئی کہ جب ہم بھوپال پہنچے تو بھارت بھون میں اس تقریب کا وقت آن پہنچا تھا جہاں مجھے اپنی کہانیاں سنانی تھیں۔

بھارت بھون بھی کیا خوب ادارہ بنایا ہے۔ نئے بھوپال میں سارے فنون اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز۔ بھوپال بھی تو اب دو ہیں۔ نواب بھوپال والا بھوپال تو مع اپنے شیش محل کے پرانا بھوپال بن گیا۔ نیا شہر، نئی اس کی رونقیں۔ میزبانوں نے ہمیں ہوٹل اشوک میں ٹھہرایا تھا یعنی ایسے ہوٹل میں جس کے متصل ایک جھیل بہہ رہی تھی۔ کھڑکی سے جھانکو تو لگتا تھا کہ ہم سمندر کنارے بیٹھے ہیں۔ حد نظر تک پانی ہی پانی۔ موجیں ہی

موجیں۔ اگلے دن سانچی کی یاترا کی۔ لو ہمارا تو بھوپال کا سفر مکمل ہو گیا۔ اشوک کے تعمیر کردہ بدھ دروازے دیکھے۔ ہر دروازہ جاتک کتھاؤں میں گندھا ہوا یعنی ستونوں پر کتھائیں، مورتیوں کی صورت آراستہ۔

ارے ہاں سنگیتا کی یونیورسٹی میں بھی تو جھانکا تھا۔ وہاں بدھا جاتکوں سے گزر کر ایک زیادہ ہی مشکل سوال نے مجھے آن پکڑا۔ عربی اور اردو کے شعبوں کے بزرگوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ ایک پروفیسر صاحب نے سوال کیا کہ ''ابن صفی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

میں نے کہا کہ ''ابن صفی کے معاملہ میں میں کورا ہوں۔ ان کے فکشن سے قطعی نابلد۔''

وہ حیران ہوئے۔ دل میں میری جہالت پر خندہ زن ہوئے ہوں گے۔ تب مجھے خیال آیا کہ ہماری اردو میں فکشن کے میدان میں کتنے بیسٹ سیلر ہیں اور میں ان سے نابلد ہوں۔ پنجابی میں جسے کہتے ہیں چٹا ان پڑھ۔

اور ہاں سنگیتا کے گھر پر بھی تو دستک دی تھی۔ اس کے پتا جی سے ملے۔ کتنے سیدھے سچے بزرگ تھے۔ نابینا لڑکی کا ذکر آیا تو کہنے لگے ''ہم نے اسے بیٹی بنا کر رکھا۔ کچھ اعتراض بھی ہوئے۔ ہم نے کہا کہ یہ تو ہماری بیٹی ہے۔''

تو یوں بھوپال کا سفر تمام ہوا۔ پھر پھر کر پھر دلی میں یعنی بندرابن گئے۔ پھر بھوپال کی طرف نکل گئے۔ وہاں سے اجین۔ کالی داس سے ملاقات کر کے واپس بھاگم بھاگ بھوپال آئے۔ بھوپال کو دیکھا بھالا۔ واپس پھر دلی میں۔ اب سر پر واپسی کا سفر سوار تھا۔ آخر گھر کو بھی تو لوٹنا تھا۔

❀........❀........❀

پریم چند فیلوشپ کا سندیسہ

''مبارک، مبارک۔''

''ارے بھائی، از کجا می آیداین آواز دوست اور مبارک باد کس بات کی۔''

''میں شہریار بول رہا ہوں، علی گڑھ سے۔''

''علی گڑھ سے اور شہریار۔ سبحان اللہ۔ تری آواز کے اور مدینے لیکن اے بھائی شہریار۔ مبارکباد تم کس بات کی دے رہے ہو۔''

''تمہیں ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے پریم چند فیلوشپ مل رہی ہے۔''

''پریم چند فیلوشپ۔'' میں چکرایا۔ یہ کونسی فیلوشپ ہے اور اگر ہے تو یہ فیلوشپ سرحد پار کر کے میرے پاس کیوں آئے گی۔ ویسے بھی میں کس گنتی میں ہوں۔ تین میں نہ تیرہ میں۔ مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام اور اگر سچ مچ ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے یہ عنایت ہوئی ہے تو اس کے تو چیئرمین اپنے نارنگ صاحب ہیں۔ ان کی طرف سے کوئی اشارہ، وہ تو نہیں ہوا۔ میں چکنم میں پڑ گیا۔

دل میں کن سن تو ہوئی اور نارنگ صاحب کے پیغام کا تھوڑا انتظار بھی کیا۔ پر جب اس طرف سے کوئی سن گن نہ ہوئی تو سوچا کہ اس بات کو شہریار کی شاعری کے زمرے میں ڈالو اور بھول جاؤ مگر مہینے ڈیڑھ مہینے بعد پھر وہی آواز ''انتظار صاحب، مبارک ہو۔''

''ارے یار شہریار، کیوں ہوائی اڑاتے ہو اور آخر کس خوشی میں گئی گزری مبارکباد کو دہرا رہے ہو۔''

''مگر اب واقعی اعلان ہو گیا ہے۔''

''مگر نارنگ صاحب کی طرف سے تو مجھے کوئی ایسا پیغام نہیں آیا۔''

''وہ بھی آجائے گا۔''

اور اب کے تو واقعی نارنگ صاحب کی طرف سے بھی فون پر خوشخبری مل گئی اور ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے بھی باقاعدہ مراسلہ موصول ہو گیا۔ اب پتہ چلا کہ اصل میں پریم چند جی کی تقریب سے اکیڈمی نے ان کے نام پر ایک فیلوشپ کا اجرا کیا ہے۔ اس کا دائرہ سارک ممالک تک وسیع ہے۔ ان ممالک میں سے کسی

منتخب کہانی کار کو سال کے سال یہ فیلوشپ عطا ہوگی۔ اس برس سے آغاز ہوتا ہے۔ یہ پہلی فیلوشپ ہے۔
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند
سو دعوت دی گئی ہے کہ تین مہینے کے لیے آؤ۔ ساہتیہ اکیڈمی کے مہمان بنو۔ ہندوستان میں گھومو پھرو۔ تاریخی تہذیبی مقامات کی سیریں کرو۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اس کا تو سان گمان بھی نہ تھا۔ خواب البتہ دیکھا تھا کہ کبھی گھورے کے دن پھریں اور ایسا شبھ سمے آئے کہ ان بستیوں کو جن کی بچپن لڑکپن میں خاک پھانکی تھی اور ان بستیوں کو جنہیں ایک دفعہ دیکھا تھا، دوسری دفعہ دیکھنے کی آرزو ہے اور ان بستیوں کو جنہیں دیکھنے کی حسرت لیے پھرتے ہیں کہ اپنے جیتے جی ایک دفعہ دل بھر کے برت لیں۔ بس بیل گاڑی میں بیٹھیں اور نگر نگر خاک پھانکتے چلے جائیں۔ ارے یہ تو سچ خواب کی تعبیر نکل آئی۔ ہم تو اسے دیوانے کا خواب سمجھ رہے تھے۔

تو ساہتیہ اکیڈمی کے فیض سے جو ہند یاترا کا شرف حاصل ہوا، خوب ہوا۔ اس یاترا کی کیا پوچھتے ہو۔ یاتری کی حیثیت پہ مت جاؤ۔ یاترا کی منزلت کو دیکھو۔ مسافر کم مرتبہ سہی مگر مسافر نواز صاحب مرتبہ لوگ تھے۔ ہندوستان کی عالی مقام یونیورسٹیاں تھیں۔ ان میں بیٹھے ہوئے علماء و فضلاء تھے اور وہ شہران کی کیا پوچھتے ہو۔ ان میں پراچین کال کے وہ نگر بھی تھے جن میں قدیم ہندوستان کی روح بولتی ہے اور وہ شہر بھی تھے جو زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ ہم بے شک اب اجڑے دیار ہیں مگر ہم ہند اسلامی تہذیب کی امانت کو سنبھالے بیٹھے ہیں۔

مگر اسی پروگرام سے آس پاس میں تھوڑی یاترا پہلے کر چکا تھا۔ اسے کیسے فراموش کروں۔ بھلا بندرابن کی یاترا کو فراموش کیا جا سکتا ہے اور کوشامبی۔ اور گنگا کا وہ کنارا جہاں سے شری رامچندر جی ناؤ میں بیٹھ کر دوسرے کنارے پہ جا اترے تھے۔ مطلب یہ کہ کتنی یاترائیں اس ایک یاترا میں آن جڑی ہیں اور کتنے نگر، شاد آباد نگر، اجڑے بے آباد نگر، کوئی اپنی قدامت میں پیوست اور اپنے اجاڑ پن میں مگن، کوئی نئی زندگی میں رچا بسا۔ یہ سب بستیاں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑ گئیں اور یاترائیں آپس میں ایسی گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ بس ایک بڑا سا گچھا بن گیا ہے۔ کیا ان کے بیان کو بھی میں اس بیان میں سمویا ہوا جانوں اور ہاں ساہتیہ اکیڈمی نے اس سے پہلے بھی تو تمہیں یاد کیا تھا، اس بہانے بھی تم دلی سے نکل کر گھومے پھرے تھے۔

ہاں اس سے پہلے جو ساہتیہ اکیڈمی نے مجھے بلاوا بھیجا تھا، اس پہ پہلے میں حیران ہوا۔ پھر معذرت خواہ ہوا۔ نارنگ صاحب آپ کو تو پتہ ہے کہ میں رجعت پسند ہوں۔ پنجابی محاورے میں بات کروں تو کہو کہ چٹا رجعت پسند۔ ادھر سے جواب آیا کہ خوب پتہ ہے۔ جب ہی تو تمہیں مدعو کیا گیا ہے۔ سجاد ظہیر پر باتیں تو ترقی پسندوں ہی کو کرنی ہیں مگر میں نے سوچا کہ کسی رجعت پسند کو بھی تو بلا کر پوچھا جائے کہ وہ بنے بھائی کے بارے میں کیا کہتا ہے۔

بات معقول تھی اور اب مجھے بھی دلی جانے کا یہ بہانہ بھلا نظر آیا۔ مگر سیمناروں میں تو تو جو بات بھی کی جاتی ہے ثقاہت اور متانت سے کی جاتی ہے۔ بھول چوک میں کوئی ایسا ویسا کلمہ منہ سے نکل جائے تو وہ الگ بات ہے جیسے میرے منہ سے نکل گیا مگر وہاں درگزر سے کام لیا جاتا ہے۔ تقریب کے وقار کا بھی تو آخر خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اصل میں میں نے تو اپنے حساب سے مضمون لکھا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ مجھے اپنا مضمون افتتاحی اجلاس میں پڑھنا ہے اور اس حساب سے اس مضمون کو کلیدی مقالہ کے نام سے یاد کیا جائے گا۔

خیر ہنگامہ بحثی اور گرماگرمی اگلے دن کے اجلاسوں میں ہوئی۔ پہلے اجلاس کی صدارت میرے حصے میں آئی۔ یہ صدارت بھی مجھے اٹکل نظر آئی۔ اس اجلاس کو تو محاسبہ اجلاس کہنا چاہیے۔ ترقی پسند تحریک کا محاسبہ۔ ترقی پسند ادیبوں کے اقوال و اعمال کا محاسبہ۔ پوری کمیونسٹ پارٹی کے عمل کا محاسبہ۔ ذرا غور کیجیے کہ جلسہ ایسا اور صدارت میری۔ وہاں ایک بزرگ وارد ہوئے۔ ایس ایس نور۔ سفید داڑھی، قدرے نورانی۔ میں تو یہ سمجھتا آیا تھا کہ نورانی داڑھی صرف مرد مسلمان کی ہوتی ہے بشرطیکہ وہ ملا نہ ہو مگر ایس ایس نور تو سکھ تھے۔ پارٹی کے پرانے ممبر۔ پنجابی کے ادیب مگر کیسی صاف ستھری اردو میں بات کر رہے تھے۔ پارٹی کے رہنماؤں پر سخت تنقید کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ انہوں نے فرینکفرٹ سکول کو در خور اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ ان کی سن لیتے تو پارٹی کا اس طرح بیڑا غرق نہ ہوتا۔ پھر ترقی پسند تحریک پر برس پڑے۔ برستے برستے انہوں نے میری طرف غور سے دیکھا۔ پھر کہنے لگے کہ میں نے ایک میٹنگ میں یہ سوال کیا تھا کہ کیا انتظار حسین کے افسانے رجعت پسندانہ ہیں۔ یہ شخص متھ (Myth) کو جس طرح Transform کرتا ہے .... فقرہ لمبا تھا، پوری طرح یاد نہیں رہا۔

ہاں کل سے اب تک جو بات بار بار کہی جا رہی تھی اور کہنے والوں میں ڈاکٹر قمر رئیس بھی شامل تھے، وہ یہ تھی کہ بنے بھائی تو انتہا پسند نہیں تھے مگر لکھنے والے انتہا پسندی پہ اترے ہوئے تھے۔ میں نے صدارت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹکڑا لگایا کہ یہ تو حضرت موسیٰ اور ان کی امت والا قصہ ہو گیا۔ ہادی برحق کچھ کہہ رہا ہے۔ امت الٹ بات کر رہی ہے۔ تو کیا ترقی پسند ادیبوں کو عہد حاضر کا بنی اسرائیل تصور کیا جائے۔

بچی بات ہے یہ بات مجھے بس جزوی حد تک صحیح نظر آ رہی تھی۔ اصل میں ایسا کہنے والے آخری دور کے سجاد ظہیر کی بات کر رہے تھے۔ یہ بات بھول رہے تھے کہ ہر تحریک انتہا پسندی سے اپنا آغاز کرتی ہے۔ اعتدال تو تحریک کے گرم و سرد سے گزرنے کے بعد آتا ہے۔ ابتداء میں تو کیا قائدین کیا پیرو کار سب کا معاملہ یکساں ہوتا ہے۔ یہی کہ

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم

سجاد ظہیر بھی سمجھو کہ ابتدائے عشق میں تو آگ ہی آگ تھے۔ مجھے دیکھو میں ان کی ابتداء کی تحریروں کو لے اڑا۔ ارے یہ تو اس زمانے کی بات ہے جب ابھی ترقی پسند تحریک کی داغ بیل نہیں پڑی تھی۔

میں نے ''انگارے'' میں ان کے افسانے پڑھے اور ان کا مختصر ناول ''لندن کی ایک رات'' اور ریشہ خطمی ہو گیا کہ ارے ابھی تو اردو میں شاید ہی کسی نے جوائس کا نام سنا ہو اور شاید ہی اکا دکا کو پتہ ہو کہ نئی افسانوی تکنیک کس چڑیا کا نام ہے اور شعور کی رو، آزاد تسلسل، داخلی خود کلامی کیا بلائیں ہیں۔ سجاد ظہیر نے انہیں اپنی افسانوی تحریروں میں برت کر اردو فکشن کو ان سے متعارف کرا دیا مگر جلد ہی تحریک شروع ہو گئی اور پھر جب ''لندن کی ایک رات'' چھپ کر آئی تو بنے بھائی کہہ رہے تھے کہ ''اب میں اس مسودے کو پڑھتا ہوں تو اسے چھاپتے ہوئے رکاوٹ ہوتی ہے۔ یورپ میں کئی برس طالب علم کی حیثیت سے رہ چکنے کے بعد اور تعلیم ختم کرنے کے بعد چلتے وقت پیرس میں بیٹھ کر چند مخصوص جذباتی کشمکش سے متاثر ہو کر سوڈیڑھ سو صفحے لکھ دینا اور بات ہے اور ہندوستان میں ڈھائی سال مزدوروں، کسانوں کی انقلابی تحریک میں شریک ہو کر کروڑوں انسانوں کے ساتھ سانس لینا اور ان کے دل کی دھڑکن سننا دوسری چیز ہے۔ میں اس قسم کی کتاب اب نہیں لکھ سکتا اور نہ اس کا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔''

میں نے یہ ابتدائیہ پڑھا۔ بے ساختہ منہ سے نکلا ''بکری نے دودھ دیا، دودھ دے کر مینگنی کر دی'' پھر قلم سے بھی یہی فقرہ سرزد ہو گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ بنے بھائی کے چاہنے والے بہت برہم ہیں۔ ظاہر ہے کہ دودھ کی حد تک تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بس ایک مینگنی کا لفظ بار خاطر ہوا ہے مگر اس میں میری کیا خطا ہے۔ دودھ بھی بکری ہی نے دیا، مینگنی بھی بکری ہی نے کی۔

اچھا لیجیے سجاد ظہیر سیمینار سے تو نبٹ لیے۔ اب میرٹھ کا سفر درپیش ہے۔ ایک تو عبید صاحب نے شور مچا رکھا ہے کہ ڈبائی میں تو ہم نے شوٹس لے لیے لیکن میرٹھ کالج میں آپ نے چھ سات برس گزارے ہیں اور اس شہر کے گرم و سرد کو بھی دیکھ رکھا ہے۔ وہاں آپ کا چلنا ضرور ہے ورنہ ہماری دستاویزی فلم تو ادھوری پڑی رہے گی۔ عبید صاحب سے میں نے یاروں کا تعارف کرایا ہے یا نہیں کرایا ہے۔ اگر کرا چکا ہوں تو چلیے قند مکرر سہی۔ میں نے جب لندن کا پھیرا لگایا تھا تو بی بی سی میں ایک نوجوان سامنے آن کھڑا ہوا ''انتظار صاحب، میرا نام عبید صدیقی ہے۔ میں آپ ہی والے کالج میرٹھ کالج کا طالب علم رہا ہوں۔''

''واہ واہ سبحان اللہ۔ بھولی ہوئی منزل کو کہاں آ کر یاد دلایا ہے۔''

''اور آپ عاصم سبزواری کو تو جانتے ہوں گے۔ وہ میرے ماموں ہیں۔''

''ارے واہ واہ، کیا حال ہے عاصم کا۔ وہ تو ہمارے ساتھ کا پڑھا لکھا ہے۔ اکٹھے چھ سال گزارے یعنی فرسٹ ایئر سے ایم اے اردو کے آخری برس تک۔''

رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ عبید صاحب بہت تنک مزاج ہیں۔ ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ گھڑی بھر میں تن بھن ہو جاتے ہیں۔ ادھر سے شاید کوئی ناانصافی ہوئی، بس بگڑ گئے۔ بی بی سی ایسے ادارے کو لات ماری اور دلی کی راہ لی۔ اب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماس کمیونی کیشن کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ دستاویزی فلمیں بناتے

ہیں اور اپنے ہنر کی داد پاتے ہیں۔ بس اسی ریلے میں مجھے بھی نواز ڈالا۔ سوچا کہ یہ شخص تو یہیں کی مٹی ہے۔ تعلیم کے مراحل طے کرنے کے بعد یہاں سے گیا ہے تو اس کی دستاویزی فلم تو سہولت کے ساتھ بنائی جا سکتی ہے۔ تو ڈبائی تک کے مراحل تو طے ہو گئے۔ اب ویڈیو کے ساز و سامان سے لد پھند کر اپنی پوری ٹیم کے ساتھ میرٹھ چلنے لگے ہیں اور کیا خوب بندوبست کیا کہ میرٹھ کالج کو پیغام بھیجنے کے ساتھ عاصم سبزواری کو بھی پیغام بھیج دیا کہ آنے والا دن بچا کر رکھنا۔ آپ کو اپنے ایک کلاس فیلو کے ساتھ وقت گزارنا ہے۔ ادھر ریوتی کو نوٹس دے دیا کہ آپ کو بھی ساتھ چلنا ہے۔ اور ہاں ادھر چودھری ہر چرن سنگھ یونیورسٹی سے وہاں کے شعبۂ اردو کے سربراہ اسلم جمشید پوری، نے بھی تو ایک تقریب کا اہتمام کر رکھا تھا۔

47ء سے پہلے کا زمانہ ہمارے دیکھتے دیکھتے ماضی قریب کی حدوں سے گزر کر ماضی بعید بن گیا۔ میرٹھ کالج کے در و دیوار حیران ہو کر دیکھ رہے ہوں گے کہ یہ کس زمانے کے میرے فرزند کس کھوہ سے یہاں آ نکلے ہیں۔ صورتیں تو کچھ کچھ جانی پہچانی لگتی ہیں۔ ان سے بڑھ کر پرنسپل صاحب حیران ہوئے ہوں گے، خاص طور پر میری نیازمندی دیکھ کر۔ میں یوں عرض پرداز ہوا کہ "محترم پرنسپل صاحب، ہم آپ کے تین پرانے شاگرد، اس کالج کے اولڈ بوائے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ میں تو پاکستان سے آ رہا ہوں۔ ساہتیہ اکیڈمی کے ایک سیمینار میں آیا تھا۔ اپنے کالج کو دیکھنے کو جی چاہا تو ادھر آیا ہوں۔ ساتھ دینے کے لیے دو کلاس فیلو مل گئے۔ یہ عاصم سبزواری ہیں۔ یہ تو میرٹھ ہی میں رہتے ہیں، یہاں کے مشہور وکیلوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ دوسرے ریوتی سرن شرما ہیں۔ دلی میں رہتے ہیں۔ تھیٹر اور ٹی وی کے شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ انہیں ضرور جانتے ہوں گے۔"

انہیں حیران و پریشان دیکھ کر میں نے کہا کہ آپ ہماری عمروں پہ نہ جائیں۔ جس کرسی پر آپ تشریف رکھتے ہیں۔ وہ استاد الاساتذہ کی کرسی ہے۔ اس کرسی کو ہم نے چھ برس تک سلام کیا۔ اب زمانے بعد ایک مرتبہ پھر سلام کو حاضر ہوئے ہیں اور یہ کہتے کہتے مجھے اپنے زمانے کے دو پرنسپل یاد آ گئے۔ جب میں نے اس کالج میں قدم رکھا تھا تو کرنل او، ڈونل اس کے پرنسپل تھے۔ درخواست لے کر کبھی ان کے حضور جانا ہوتا، چق اٹھا کر May I con in, Sir کہا۔ اشارہ پا کر میز کے قریب پہنچ کر درخواست سامنے رکھ دی۔ کبھی کوئی سوال نہیں پوچھا۔ فوراً دستخط کر کے منظوری دی اور ہم کمرے سے باہر۔ پریڈ گراؤنڈ میں البتہ ان کے روبرو ہوتے تھے۔ آخر ریٹائرڈ کرنل تھے۔ پریڈ کراتے ہوئے سچ مچ کرنل بن جاتے تھے۔ میرے سیکنڈ ایئر میں پہنچتے پہنچتے یا شاید سال کے آخر میں ریٹائر ہو گئے۔ وہ آئرش تھے۔ ریٹائر ہو کر آئرلینڈ چلے گئے۔

کرنل او، ڈونل کے بعد پروفیسر چیٹرجی ترقی پا کر پرنسپل بن گئے۔ لمبا قد، بنگالی تھے مگر گورے چٹے۔ بر میں بنگالی طرز کا کرتا۔ سفید بگلا سی دھوتی۔ مگر ایک دفعہ عجب رنگ سے کالج میں داخل ہوتے دیکھا۔ ننگے پاؤں، سر پہ استرا پھرا ہوا۔ صرف چوٹی برقرار۔ باقی چندیا صاف۔ پتہ چلا کہ ان کے پتا جی سورگباشی ہو

گئے ہیں۔ بیٹا باپ کا سوگ منا رہا ہے۔ جس روز جوتی پہن کر آئے اس روز جانا کہ سوگ کے دن ختم ہوئے۔ سوگ کی جو ریت رسمیں ہوتی ہیں وہ پوری ہوئیں۔ اب پیروں میں جوتی ڈالنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

تو خیر آمدم برسر مطلب۔ پرنسپل صاحب جو میرے زمانے کے دونوں پرنسپلوں کے مقابلہ میں کم عمر نظر آ رہے تھے، اپنے تین معمر شاگردوں سے بہت خوش تھے۔ اس پر بھی تو خوش ہوں گے کہ ایک شاگرد پاکستان سے آ کر ان کے چرن چھو رہا ہے۔ انہوں نے پھر ہمیں ساتھ لیا اور کالج کی سیر کرانی شروع کی۔ ایک ایک شعبہ میں لے جا کر سٹاف سے تعارف کرایا اور شعبہ کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ میں اپنی جگہ پر حیران اور خوش کہ ہمارے کالج میں تب سے اب تک کتنی توسیع ہوگئی ہے۔ کتنے نئے شعبے کھل گئے ہیں اور کتنے نئے در و دیوار اُگ آئے ہیں۔ یا اللہ اس کالج کا اتنا بڑا رقبہ تھا کہ کتنے نئے بلاک بن گئے ہیں۔ اس وقت تو ہمیں یہ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ اردو کے شعبہ کی اب کیا صورت ہے، اس کا کچھ زیادہ پتہ نہیں چلا۔ بس چلتے چلتے اس شعبہ میں بھی جھانک لیا اور شعبہ کے سربراہ سے بھی ملاقات کر لی۔ ہماری آؤ بھگت اصل میں ہر چرن سنگھ یونیورسٹی میں ہوئی جہاں شعبۂ اردو کے سربراہ جشید اسلم نے ایک محفل سجا رکھی تھی۔

جشید اسلم پتہ چلا کہ بہت متحرک شخصیت ہیں۔ اپنے شعبہ کے فروغ کے لیے بہت کام کیا ہے۔ تقریبات بھی دھوم دھام سے کراتے ہیں۔ میں ابھی دلی میں تھا کہ انہوں نے مجھ پہ کمند پھینکی اور کھینچ بلایا۔ محفل ایسی سجائی کہ شہر کی معتبر شخصیتیں وہاں جمع تھیں۔ ایک معتبر شخصیت حکیم سیف جو اس تقریب کی صدارت کر رہے تھے، پھر سب کچھ وہی ہوا جو ایک استقبالیہ تقریب میں ہوا کرتا ہے یعنی ہماری تعریف و توصیف اور ہماری انکساری۔ میرٹھ کالج میں تو اصل میں ہم گھر کی مرغی تھے۔ یہاں اس یونیورسٹی میں اپنی افسانہ نگاری کے ناتے ایک معزز مہمان تھے۔ تو گلے میں گجرے بھی یہیں پڑے اور سپاسنامہ بھی یہیں پیش کیا گیا۔ ارے گجروں اور سپاسناموں کا تو ابھی ذکر آنا ہے۔ کیا پوچھتے ہو گجروں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔ مشکل سے اس ڈھیر تلے سے نکل کر واپس گھر آ پاؤ گے۔ یہ سب پریم چند فیلوشپ کی کرامات تھیں۔ اس کرامات کا ذکر تو ابھی ہوتا ہے۔ فی الحال تو میرٹھ میں ہوں۔

بس اب ایک رات میرے پاس تھی۔ اس بیچ فیض عام کالج کے پرنسپل صاحب کے دولت کدے پر جا کر ڈنر سے بھی فیض یاب ہوا اور تحصیل کے عقب میں جا کر رام چندر کی ریوڑھی گزک کے گمشدہ ذائقے کو بھی پالیا۔ بس اس ریوڑی گزک کے ساتھ ہی میری میرٹھ یاترا پوری ہوگئی۔

صبح ہوئی اور دھوم پڑی کہ چلو ڈبائی چلو۔ میں نے کہا کہ عزیز واب ڈبائی کس لیے؟ عبید صاحب نے کہا، ابھی ڈبائی جا کر کچھ اور شاٹ لینے ہیں۔ سبحان اللہ۔ ڈبائی کے جتنے پھیرے ہو جائیں کم ہیں۔

پریم یاترا

باب حضر بند۔ سفر کا دفتر صحیح معنوں میں اب کھلا ہے۔ صبح سفر شام سفر۔ پاؤں میں جیسے سنیچر ہے۔ ہندوستان کی وشال دھرتی پر دوڑتا پھرتا ہوں۔ آج یہاں کل وہاں۔ پورب پچھم اتر دکھن کی کوئی قید نہیں۔ ابھی اجنتا کی نیم تاریک گپھاؤں میں مہاتما بدھ کو ہنستے روتے اداس ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اور اب اور جنوب میں جا کر سری رنگا پٹم میں ٹیپو سلطان شہید کے مزار کے سامنے سر نیوڑھائے کھڑا ہوں۔ وہاں سے جو زقند لگائی تو کلکتے میں۔ مٹیا برج میں ایک ایک سے پوچھ رہا ہوں کہ یہاں نواب واجد علی شاہ آسودہ خاک ہیں۔ کچھ پتہ ہے کہ وہ امام باڑہ جہاں وہ آرام کر رہے ہیں، کس طرف ہے۔ کلکتے سے اڑے اور راجستھان میں جا اترے۔ جھیلوں کے نگر اودے پور میں میرابائی کے آثار ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ وہ آثار کہیں نظر نہیں آ رہے۔ یہاں تو مہارانا پرتاپ سنگھ کا بول بالا ہے۔ وہاں سے پلک جھپکنے میں لکھنؤ زمین جس کی چہارم آسمان ہے اور متھرا نگری کو بھولے جا رہے ہو۔ اس سے ورے بندرابن نگر وہاں کا پھیرا تو تم پہلے ہی لگا چکے ہو۔ وہاں رادھا جی راج کرتی ہیں۔ رادھے رادھے کا ورد کرو اور بندرابن کی کنج گلیوں میں گھومو پھرو، بس ذرا بندروں کی طرف سے چوکنے رہو۔ تو خیر ہر پھر کر پھر دلی میں۔ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔ ابھی کتنے نگر اور ہیں اور ان کی طرف سے بلاوے پہ بلاوا آ رہا ہے۔

مگر ٹھہرو۔ کچھ پتہ تو چلے کہ یہ نگر نگر کی سیر کس تقریب سے اور ایسے دیس میں جہاں کے دروازے بے شک دور پار والوں کے لیے کھلے ہوں مگر ہم ہجرت کے ماروں پر ایک بار بند ہوئے تو جیسے سدا کے لیے بند ہو گئے ہوں۔ کیوں گئے تھے یہاں سے منہ موڑ کر۔ کار جہاں دراز ہے اب انتظار کرو۔ انتظار میں برسوں گزر گئے۔ دربان جیسے در بند کر کے لمبی تان کے سو گئے ہوں۔ یاد آیا میں نے حضرت نظام الدین اولیاء کو ایک دفعہ یاد کیا تھا۔ ارے وہاں ایرا غیرا سب عرس پر جاتے ہیں۔ کیا یہ حقیر فقیر نہیں جا سکتا۔ اے لو ترت کے ترت مراد پوری ہو گئی اور بائیس خواجہ کی چوکھٹ پر جا کر دستک دے دی۔ بس پھر دروازہ کھلا تو کھلتا ہی چلا گیا اور اب منشی پریم چند سے کہانی کا رشتہ کام آیا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ حضرت میں علی گڑھ سے شہر یار بول رہا ہوں۔ مبارک ہو۔ یہ علی گڑھ سے آواز آئی۔ تری آواز مکے اور مدینے مگر مبارکباد کس بات کی۔ اس بات کی کہ تمہیں پریم چند فیلو شپ مل گئی ہے۔ پریم چند فیلو شپ۔ یہ کونسی فیلو شپ ہے اور میں کہ تین میں نہ تیرہ میں، اس کا مستحق کیسے

ٹھہرا۔ مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام۔ بس تیاری کرو یہاں آنے کی، ہم نے تمہیں بتا دیا۔ ساہتیہ اکیڈمی نے تمہیں نوازا ہے۔ اچھا، اگر ایسا ہے تو پہلے تو نارنگ صاحب کی طرف سے ہمیں کوئی اشارہ ملتا۔ ارے وہ بھی مل جائے گا۔

دل میں کن من تو ہوئی اور نارنگ صاحب کے پیغام کا تھوڑا انتظار بھی کیا۔ جب ادھر سے کوئی سن گن نہ ہوئی تو سوچا کہ اس بات کو بھی شہریار کی شاعری کے زمرے میں ڈالو اور بھول جاؤ۔ یہی کیا۔ مگر مہینے ڈیڑھ مہینے بعد پھر وہی آواز۔ انتظار صاحب مبارک ہو۔ اب کس بات کی مبارکباد دے رہے ہو۔ اسی بات کی جو پہلے بتائی تھی۔ اب اعلان ہو گیا ہے۔ ستمبر 2007ء کا مہینہ خوب چڑھا۔ اس کے ساتھ ہی میں دلی میں جا اترا۔ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں قیام ہے۔ اکادمی کی طرف سے صدف صاحب آئے بیٹھے ہیں۔ پوچھ رہے ہیں کہ آج کا کیا پروگرام ہے۔ اس وقت کس سے ملنا ہے۔ شام کی کیا مصروفیت رہے گی۔ گاڑی تیار کھڑی ہے۔ ارے ایسے تو افسر شاہی کے ناز نخرے ہوتے ہیں۔ ہم کہاں یہ تکلفات کہاں مگر ہم اب ہم تھوڑا ہی ہیں، پریم چند فیلوشپ کو سرخاب کا پر جانو۔ تو اب اس سرخاب کے پر کے ساتھ ہماری حیثیت کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ آگے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ گلے میں اتنے پھولوں کے گجرے پڑیں گے اور سر پر اتنی چادریں اڑھائی جائیں گی کہ ان کے بیچ دب کر رہ جاؤ گے۔ خیر مجھے کہاں جانا ہے۔ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ پہلے سیدھے ریوتی کی طرف، وہاں سے نکلے تو تیر کے موافق ذاکر باغ میں شمیم حنفی کی سمت۔ آج اتوار ہے۔ سو اتنی فرصت ہے۔ فیلوشپ کے ادب آداب کے ساتھ تو ملاقاتیں کل سے شروع ہوں گی۔ سب سے پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا پھیرا لگانا ہے اور وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن کے دفتر میں دستک دینی ہے۔ پھر شہر میں اور یونیورسٹیاں بھی تو ہیں۔ دلی یونیورسٹی ہے، جواہر لال نہرو یونیورسٹی ہے۔ انڈیا کلچرل کونسل ہے۔ ارے ہاں اس کے ڈائریکٹر جنرل تو پون ورما جی ہیں۔ غالب پر دھوم کی کتاب لکھ چکے ہیں۔ سو ہمارے آپ کے لیے وہ اب اجنبی کہاں رہے۔ پاکستان کے قائل۔ بھلا بوجھو کس تقریب سے قایل ہوئے۔ کہنے لگے، مجھے ایک دفعہ پی آئی اے کی فلائٹ میں سفر کرنا پڑا۔ دیکھا کہ وہاں انگریزی اخباروں کے ساتھ اردو کے اخبار بھی مہیا ہیں۔ خوش بھی ہوا، حیران بھی۔ انڈین ایئرویز میں ہم بھلا یہ تصور کر سکتے ہیں کہ انگریزی اخباروں کے ساتھ ہندی اخبار بھی مہیا ہو۔ انگریزی برحق مگر قومی زبان کی قیمت پر تو اس کا بول بالا نہیں ہونا چاہیے مگر ہندوستان میں تو یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اور میں دل میں خوش ہوا کہ پی آئی اے نے کم از کم زبان کے معاملہ میں تو پاکستان کی لاج رکھ لی۔ خود پاکستان اس معاملہ میں اپنی لاج رکھنے کا قائل ہو یا نہ ہو۔

آئی آئی سی جہاں اپنا بسیرا ہے، خوب جگہ ہے۔ دن عید رات شب برات۔ جب ذرا اپنے کمرے سے گردن نکالی یہی دیکھا کہ کوئی نئی چہل پہل ہے۔ فلاں سیمینار ختم ہوا۔ یار ہنستے بولتے رخصت ہو رہے ہیں۔ اب کوئی اور سیمینار شروع ہونے لگا ہے۔ اس کے حساب سے نئے چہرے، نئی چہل پہل، نئے ہنسی ٹھٹھے۔ دن ڈھلنے لگا ہے۔ سدھیر اور گیتانجلی آن پہنچے۔ ارے تم کمرے میں گھسے بیٹھے ہو۔ ادھر پرشوتم اگروال

جی نے جو کبیر پر کتاب لکھی ہے، اس کی رونمائی ہو رہی ہے۔ ہمارے تمہارے دوست غلام شیخ بھی آئے ہوئے ہیں۔ وہ کبیر پر بات کریں گے۔ وہاں کبیر بانی بھی سنائی جائے گی۔ نیکی اور پوچھ پوچھ، چلو چلتے ہیں۔ باہر نکلے تو دیکھا کہ اشوک باجپائی چلے آ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ انامیکا ہیں۔ ان کی اپنی انا اپنی سج دھج ہے۔ تو لیجیے یہ تو پورا قافلہ بن گیا۔ اس جلو میں میں نے کبیر کی تقریب میں قدم رکھا۔ کبیر پر باتیں سنیں۔ کبیر بانی سنی۔

اور اب اپنی تقریب۔ آخر ساہتیہ اکیڈیمی کو اپنے مہمان کی دلی میں بھی تو رونمائی کرنی ہے۔ ہند یاترا پر رخصت کرنے سے پہلے دلی شہر کو بھی تو بتانا ہے کہ یہ ہیں وہ ذات شریف جنہیں ہم نے پریم چند فیلوشپ سے نوازا ہے۔ دیکھ لو، پرکھ لو، کچھ پوچھنا ہے تو پوچھ لو۔ ساہتیہ اکیڈمی کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہندی اور کتنی دوسری زبانوں کے ادیب جمع تھے۔ نارنگ صاحب نے بحسن و خوبی اپنے مہمان کا تعارف کرایا۔ بس پھر وہی سوال جواب کا سلسلہ۔ میری ایک عادت بہت اچھی ہے۔ تقریبوں میں جو کہتا ہوں وہ بھی یاد نہیں رہتا۔ جو سنتا ہوں، وہ بھی یاد نہیں رہتا۔ بس ایک سوال یاد رہ گیا ہے۔ وہ سوال ہی ایسا ہے کہ ہندوستان میں جاؤ اور تقریب میں مہمان خصوصی بن کر بیٹھو تو یہ سوال کسی نہ کسی صورت ضرور کیا جائے گا کہ جناب تقسیم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ غلط ہوئی یا صحیح ہوئی۔ ارے یہ ظالم سوال آخر کب تک پوچھا جائے گا۔

خیال زلف دوتا میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

میں نے عرض کیا، عزیزو! یہ سوال کرنے کا وقت گزر گیا۔ بہت دیر ہوگئی۔ جب برصغیر کی تاریخ موڑ مڑنے کے لیے تلی کھڑی تھی اس وقت یہ سوال بہت برمحل تھا۔ تاریخ کے موڑ مڑنے سے پہلے سوچ سمجھ لینا چاہیے۔ پھر وہ تمہاری نہیں سنے گی۔ جب تاریخ موڑ مڑتی ہے تو پھر ہمارے آپ کے جذبات واحساسات کو خاطر میں نہیں لاتی۔ ان سے بے نیاز اپنے عمل سے غرض رکھتی ہے۔ تو وہ وقت تو گزر گیا۔ اب تو نصف صدی سے بھی زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ اب یہ سوال ہمارے ہاتھوں سے نکل کر مورخوں کے پالے میں چلا گیا۔ وہ اپنے اپنے حساب سے اس واقعہ کا تجزیہ کر رہے ہیں۔ یہ تجزیے ہوتے رہیں گے مگر تاریخ کی سواری تو بہت آگے نکل گئی۔ وہ تو واپس نہیں آئے گی۔ سو جو ہو چکا ہے، اس کے ساتھ مفاہمت کر لو۔

اس وقت تو کچھ اسی طرح کا الٹا سیدھا جواب دے کر میں اپنے حساب سے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گیا تھا مگر اب سوچ رہا ہوں کہ وہ بھی تاریخ کی عجب گھڑی تھی۔ ہندوستان کا مطلع خون آشام ہوتا چلا جا رہا تھا۔ فضا میں سخت تناؤ تھا مگر طرفین کے بیچ اختلافات کم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ اس وقت سب کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ اب تقسیم پر لکھنے والے بار بار یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ آخر مفاہمت کیوں نہیں ہوئی۔ ہندوستان کی ادبی محفلوں میں ہم جیسوں سے تقسیم کے متعلق جو سوال کیے جاتے ہیں، ان کی تہہ میں بھی یہی بے چینی ہوتی ہے کہ آخر اختلافات کی خلیج کیوں اتنی گہری ہوگئی کہ پاٹی نہ جا سکی۔ اس پہ مجھے مہابھارت کا ایک مقام یاد آ رہا ہے۔ جب

کورو پانڈو یدھ نبٹ گئی اور پھر پانڈو بھی راج پاٹ سے فارغ ہو کر اتم یاترا پہ چل نکلے اور اوبڑ کھابڑ رستوں میں کھیت ہو گئے اور دوارکا سمندر میں غرق ہو گیا اور ہوتے ہوتے ارجن کا پڑپوتا جنمی جے راج سنگھاسن پہ بیٹھا تو اس نے ایک بڑا یگیہ کیا۔ وہاں ویاس جی بھی پہنچے۔ جنمی جے نے چاندی کے مگن میں گلاب کیوڑے کے پانی سے ان کے پیر دھوئے۔ مہابھارت کی کتھا سنی۔ پھر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ''مہاراج، آ گیا ہو تو ایک پرشن کروں۔''

''کر ضرور کر، میرے پتر۔''

''مہاراج دونوں ہی طرف بڑے بڑے گنی گیانی ودھوان موجود تھے۔ ان میں سے کسی نے نہیں سوچا کہ آپس کی لڑائی کا انت کیا ہوتا ہے اور جنگ میں کتنا خون بہتا ہے، کتنی تباہی ہوتی ہے۔''

ویاس جی نے جواب میں ٹھنڈا سانس بھرا۔ بولے ''پتر، آدمی کی مت ماری جاتی ہے۔ اور ہونی ہو کر رہتی ہے۔ ہونی کو کون روک سکتا ہے۔''

یہ کہہ کر اٹھے اور واپس جنگلوں میں چلے گئے۔

ویاس رشی نے کہا کہ ہونی ہو کر رہتی ہے۔ ہمارے زمانے کی بصیرت اسے تاریخی عمل بتاتی ہے۔ سے کا چکر کہو یا تاریخی عمل۔ ہونی ہو کر رہی۔ اب بیٹھے پچھتاتے رہو۔ سب سے زیادہ مولانا ابوالکلام آزاد پچھتائے۔ اپنی کتاب "India loins Freedom" میں لکھا کہ مجھ سے چوک ہوگئی۔ اس تاریخی برس میں کانگریس کی صدارت سے خود دستبردار ہو گیا اور نہرو کا نام صدارت کے لیے تجویز کر دیا۔ ویسے یہ چوک نہ بھی ہوتی تو کیا فرق پڑتا۔ شاید پھر اس پر پچھتاتے کہ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے فیصلہ کا اختیار مجھے تھا مگر فیصلہ کیا نہرو نے۔ ویسے مجھے اس سارے قصے میں سب سے بے بس سب سے غم زدہ شخصیت گاندھی جی کی نظر آتی ہے۔ کتنے بااختیار ہوا کرتے تھے۔ اب آ کر کتنے بے اختیار ہو گئے۔ ساری عمر اہنسا کے پرچار میں بتا دی۔ پرارتھنائیں، بھاشن، بھوک ہڑتالیں مگر ؎

لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

حیوانیت سی حیوانیت۔ تشدد کی اس گرم بازاری کے بعد گاندھی جی کو ان لوگوں کے بیچ جینا کتنا بے معنی نظر آتا ہوگا۔ آخر گوڈ سے نے انہیں اس مشکل سے نجات دلائی۔

اے لو، میں بہک کر کدھر نکل گیا۔ ذکر تو یہ تھا کہ ساہتیہ اکیڈمی نے دلی میں ہماری منہ دکھائی کرائی اور ساتھ عزت کے بندیاترا کے لیے رخصت کیا۔

ہاں اس بیچ ایک تقریب جامعہ ملیہ میں بھی تو ہوئی تھی۔ یہاں طلباء اور طالبات کا جمگھٹا تھا۔ وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن صدارت کر رہے تھے۔ شمیم حنفی اور شمس الحق عثمانی کہ اب یہاں شعبۂ اردو کے صدر ہیں، تقریریں کر رہے تھے۔ مطلب یہ کہ دلی شہر میں اچھی خاصی رونمائی ہو گئی۔

....

علی گڑھ سے ڈبائی تک

دلی سے علی گڑھ جانا سفر ایسا ہے کہاں کا۔ مگر ذرا ریل گاڑی کو فراموش کرو اور سڑک سڑک چل کر علی گڑھ چلو۔ پھر خدا کی قدرت کا جلوہ دیکھو۔ وہ سفر مجھے یاد ہے جب ہمارا چھوٹا سا قافلہ جس میں کشور ناہید بھی شامل تھیں بلکہ سب سے بڑھ کر شامل تھیں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے ایک چھوٹی سی بس میں بیٹھ کر علی گڑھ چلا تھا۔ تب پتہ چلا کہ دلی سے علی گڑھ چلیں تو پورے بلند شہر کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ ارے کیسی خاک، وہ خاک تو اس کنارے سے اس کنارے تک امریوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ہماری ڈبائی میں آم کنکے دھڑی کیوں بکتے تھے۔ یہ دھرتی جواب میرے لیے خواب بن چکی ہے، سچ مچ سونا اُگلتی ہے بلکہ سونے سے بڑھ کر وہ شے جسے آم کہتے ہیں۔ لیکن اس وقت وہ آموں کے سارے باغ میری نظروں سے اوجھل تھے۔ ریل گاڑی میں بیٹھا علی گڑھ کی طرف دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اے لو، دم کے دم میں علی گڑھ کا سٹیشن آ گیا۔ آگے اس سٹیشن کا اپنا ہی ایک رنگ تھا۔ نووارد کو کسی سے پوچھنا نہیں پڑتا تھا کہ یہ کونسا سٹیشن ہے۔ بھیڑ بھڑکے میں سیاہ شیروانیوں کی افراط سے پتہ چل جاتا تھا کہ یہ علی گڑھ کا سٹیشن ہے مگر اب تو سیاہ شیروانی خود یونیورسٹی کے اندر مشکل سے نظر آتی ہے۔ علی گڑھ کے پلیٹ فارم پر کہاں دکھائی دینے لگی تھی۔ ویسے بھی اب یہ پلیٹ فارم یہ سٹیشن علیگ طلباء کی قلمرو میں شامل نہیں رہا۔ البتہ جنگلی کبوتر اب بھی زمانے سے بے خبر یہاں اسی طرح تڑپتے پھڑکتے نظر آتے ہیں۔ سو بس جنگلی کبوتروں اور شہریار، ابوالکلام قاسمی اور پروفیسر خورشید کے چہروں کو دیکھ کر ہم نے شگن لیا کہ اب ہم علی گڑھ میں ہیں۔ پروفیسر خورشید سے تعارف نیا نیا تھا۔ شعبۂ اردو کے صدر اب وہی ہیں۔

اب کی نہیں کہتا۔ اب تو علی گڑھ دیکھی بھالی چیز ہے۔ بچپن لڑکپن کی کہتا ہوں۔ علی گڑھ دیکھا نہیں تھا۔ سنا بہت کچھ تھا۔ تین چیزیں وہاں کی بہت مشہور تھیں۔ علی گڑھ کے تالے، علی گڑھ کے گریجویٹ، علی گڑھ کی نمائش۔ اس نمائش کے متعلق انہی دنوں سے حافظہ میں ایک شعر جو علی گڑھ سے اڑ کر پہنچا تھا، محفوظ چلا آتا ہے ؎

سجاوٹ میں، بناوٹ میں، لگاوٹ میں، دکھاوٹ میں
علی گڑھ کی نمائش ہند بھر میں سب سے بہتر ہے

اور تین چیزیں تھیں جنہوں نے اس نمائش کو ہند بھر میں سب سے بہتر بنایا تھا۔ سیاہ شیروانیاں، سیاہ

برقعے، پشاوری کباب پراٹھے۔ اب جو آ کر دیکھا تو نہ سیاہ برقعے، نہ سیاہ شیروانیاں، گنوروں زیادہ نظر آئی۔ ہاں پشاوری پراٹھے کباب میں اب بھی وہ ذائقہ ہے کہ اسے کھا کر احساس ہوا کہ کراچی میں جو پشاوری پراٹھا یار کھاتے ہیں، وہ علی گڑھ کے پراٹھے کباب کا منہ چڑاتے ہیں اور ہاں علی گڑھ کے گریجویٹ۔ ہماری ڈبائی میں تعلیم کی انتہا یہ تھی کہ لڑکا جیسے کیسے میٹرک کر لے۔ جس نے خوبی قسمت سے کبھی فرسٹ کلاس لے لی تو شور مچ گیا کہ لڑکے کو علی گڑھ بھیجو۔ وہاں گریجویٹ بنے گا اور ڈپٹی کلکٹر بن کر لوٹے گا۔ پھر ڈبائی والوں کے آسمان کا تارہ بن جائے گا مگر میں نے اپنے ہوش میں کتنوں کو علی گڑھ جاتے دیکھا، گریجویٹ بن کر واپس ہوتے ہوئے کسی کسی کو دیکھا اور ڈپٹی کلکٹری۔ وہ تو ڈبائی والوں کے لیے بس ایک خواب ہی بنی رہی۔ ترقی کی انتہا یہ تھی کہ نوجوان تھانیدار بن جائے۔ جو تھانیدار بن گیا، اس کی ماں پھر تھانیداری ہی کو ڈپٹی کلکٹری سمجھنے لگتی تھی۔ کس ٹھسے سے بیبیوں کے بیچ بیٹھ کر کہتی تھی کہ دشمن کے کان بہرے میرا پوت تھانیدار ہے۔ ڈالی ماشاءاللہ سے اتنی آتی ہے کہ گھر کے نوکر چاکر بھی نہال ہو جاتے ہیں اور کیا پوچھو ہو رعاب شعاب اتنا ہے کہ اس کی ایک گھڑکی سے ملزموں کا پیشاب خطا ہو جاتا ہے۔

یہ شاید ابوالکلام قاسمی نے پوچھا تھا کہ جب ڈبائی اور علی گڑھ میں اتنی آمد و رفت تھی تو آپ میرٹھ کالج کیسے پہنچ گئے۔ ارے بھائی میں نے خود تو علی گڑھ سے کنی نہیں کاٹی تھی۔ کالج کی پڑھائی کا وقت آنے سے پہلے ہی وقت نے ہمارے ٹبر کو ڈبائی سے دھکا دے کر ہاپوڑ پہنچا دیا تھا۔ پھر مجھے کالج میں پڑھائی کے لیے میرٹھ ہی جانا تھا۔ تو اس وقت کے علی گڑھ کی تو دید ہوئی نہیں۔ اب آ کر دیکھتا ہوں تو وہ علی گڑھ جس کے بہت چرچے سنے تھے، نظر نہ آیا۔ نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے۔ دھومیں مچانے والے وہ سب شاعر کیا ہوئے۔

یادگار بزم دلی ایک حالی رہ گیا

اب بس ایک شہریار کا دم ہے۔ جتنی دھوم گھر میں اور گھر سے باہر ہے، وہ اسی ایک نام کی ہے اور بھائی جب تم نے بتایا کہ تمہارے لیے جو ہم نے تقریب کا اہتمام کیا ہے اس کی صدارت جذبی صاحب کریں گے تو میں کتنا خوش ہوا کہ اچھا گزری ہوئی برسات کا ایک بادل ابھی تک منڈلا رہا ہے اور مجھے ان کی اشیرواد کا شرف حاصل ہوگا مگر کتنی مشکلوں سے وہ اس تقریب میں پہنچے۔ سچ مچ چراغ سحری۔ ساری بتی جیسے جل چکی ہو۔ لو کتنی مندی ہو گئی تھی۔ اگرچہ جب غزل سنائی تو جانے کہاں سے توانائی واپس آ گئی۔ اور اب جو آیا ہوں تو وہ شمع مندی ہوتے ہوتے بجھ چکی ہے۔

اور ہاں اس یونیورسٹی کے کتنے روشن ستاروں کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا میں دودپور کی گلیوں میں جا نکلا۔ اب اگر کسی کو اسلوب احمد انصاری اور ڈاکٹر مختار الدین آرزو کی دید مقصود ہے تو وہ ان گلیوں میں جائے اور اپنا شوق دید پورا کر لے اور ہاں وہ نرالی شخصیت پروفیسر وقار بھی تو یونیورسٹی کی گہما گہمی سے اکتا کر یہیں کہیں کسی کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئے ہیں۔

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ یونیورسٹی کی پرانی نشانیوں میں سے بس ایک برقع ہی رہ گیا ہے۔ پہلی ہی تقریب میں جہاں پروفیسر اسلوب احمد انصاری صدارت کر رہے تھے، دیکھا کہ برقعے قطار اندر قطار ہیں۔ پہلے میں حیران ہوا کہ ابھی کل پرسوں میں جامعہ ملیہ میں تھا، وہاں برقعے کا نشان دور دور تک نہیں تھا۔ یہاں آیا ہوں تو برقعے ہی برقعے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ سیاہ برقع کی جائے پیدائش تو یہی ہے۔ اسی نگر میں سب سے پہلے مسلمان شرفاء کی بیٹیوں نے ڈیوڑھی سے باہر قدم نکالا تھا اور بغل میں کتابیں داب کر سکول چلی تھیں۔ اب یہ بیٹیاں انگریزی پڑھ رہی تھیں۔ چولا تو بدلنا ہی تھا۔ نانیوں دادیوں کے کلغی والے سفید برقع میں لپٹ کر تو سکول کالج نہیں جا سکتی تھیں۔ انہوں نے اپنے لیے الگ ایک نئی تراش نئے رنگ کا برقع وضع کیا اور یہ برقع نسوانی آزادی کا نقیب بن کر اسی نئی درسگاہ میں لہرایا۔ تو یہ جو برقعے یہاں قطار اندر قطار نظر آ رہے ہیں ایک روایت کے تسلسل میں ہیں اور بجا ہیں۔ مگر جب ایک مسلمان لڑکی پیرس میں جا کر ضد کرتی ہے کہ پیرس والو کان کھول کر سن لو کہ میں اپنے قصبہ سے برقع میں آئی ہوں۔ برقعے ہی میں رہوں گی۔ نقاب بھی نہیں اٹھاؤں گی تو لگتا ہے کہ پیرس اب اپنے ایبسرڈ ڈرامے سے بڑھ کر ایک اور ایبسرڈ ڈرامے کا تماشا کر رہا ہے مگر سیاہ شیروانی کو کہ اس یونیورسٹی کا طرۂ امتیاز تھی کونسا یوم سیاہ دیکھنا پڑا کہ گم ہو گئی۔

اگلی صبح منہ اندھیرے جب میں گیسٹ ہاؤس سے نکل سیر کی غرض سے باہر آیا تو کیا دیکھا کہ ایک لڑکی جینز میں ملبوس سکوٹر پر سوار اس شان سے اڑی چلی جا رہی ہے کہ موبائل کان سے چپکا ہوا ہے۔ تب میں نے جانا کہ اب یہاں برقع بھی ہے اور جینز بھی ہے۔ برقعے والی اپنی راہ، جینز والی اپنی راہ۔ عیسیٰ بدین خود، موسیٰ بدینِ خود۔ رہو اور رہنے دو۔ مگر یہ اصول تو یہاں اس وقت سے چلا آ رہا ہے کہ جب سرسید نے سنی مسجد شیعہ مسجد کی تجویز کو رد کر کے یہاں بس ایک مسجد بنوائی تھی۔ سنی ہے تو سنیوں کے وقت پر آ کر جماعت میں شامل ہو۔ شیعہ ہو تو شیعوں کے وقت پر آ کر نماز کا فریضہ ادا کرو۔ وہی دستور اب تک چلا آ رہا ہے۔

میرے صبح و شام، یہاں اس طور گزر رہے ہیں کہ وہی لاہور کے حساب سے منہ اندھیرے اٹھے، منہ ہاتھ دھویا۔ لپک جھپک لباس بدلا اور سیر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ نہ یہاں سبزہ سبزۂ بیگانہ ہے نہ پرندے اجنبی ہیں۔ بس لگتا ہے کہ پرانے سنگھی ساتھی ہیں۔ زمانے بعد مل رہے ہیں۔ ارے، یہ تو سب وہی چہچہے ہیں جو میں نے اپنے پچھلے جنم میں ڈبائی میں سنے تھے۔ ہر چہچہاہٹ پر میں چونکتا ہوں ؎

از کجا می آید ایں آواز دوست

کیا ڈبائی کے درختوں میں چہچہاتے سب پرندے اڑ کر یہاں آ گئے ہیں۔ انہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں آیا ہوں۔ ویسے لازم نہیں کہ ہر پرندے کی آواز کو میں دوسری آوازوں سے الگ شناخت کر سکوں۔ پچھلے پھیرے میں یہاں شمیم حنفی بھی آئے ہوئے تھے۔ مجھے وہ ہر پرندے کی آواز سے ایسے تعارف کرا رہے تھے جیسے سمجھ رہے ہوں کہ اب یہ سب پرندے اس عزیز کے لیے اجنبی ہیں اور یہ سب آوازیں اس کے حافظہ

سے بسر چکی ہیں۔ شمیم حنفی کیسی باتیں کرتے ہو اور کیسا کفر بکتے ہو۔ بھلا جس کسی نے ایک مرتبہ کوئل کی کوک سن لی وہ اسے بھول سکتا ہے۔ ارے یہ آواز تو جنت کے دروازے تک ہمارے ساتھ جائے گی اور ہاں اندر بھی یہی لے جائے گی کیونکہ باغ بہشت سے جس بدقسمت پرندے کو نکال باہر کیا گیا وہ صرف مور ہے اور یہی بات ہے اگر کوئل کو جنت بدر کیا گیا ہوتا تو پھر ہم جنت کی آرزو ہی نہ پالتے۔ یہی ایک آواز تو میرے پچھلے جنم اور اب کے جنم میں رشتہ اتحاد بنی ہوئی ہے کہ یہ آواز ہماری فردوس گم گشتہ میں بھی گونجتی تھی اور اب جب میں منہ اندھیرے باغ جناح میں سیر کو جاتا ہوں تو یہاں بھی میرے کانوں میں رس گھولتی ہے۔ ہاں پپیہے کی آواز کی شناخت میں مجھ سے خطا ہوئی۔ شمیم حنفی نے بتایا تو یاد آیا کہ یہ بھلی آواز بھی کبھی میری سنگھی ساتھی ہوا کرتی تھی۔ اب دھیان سے کیسے بسر گئی۔ اس کی وجہ بھی سن لو۔ یہ جو مجھے ابوالکلام قاسمی کی ادارت میں شائع ہونے والا ''تہذیب الاخلاق'' ماہ بہ ماہ پہنچتا ہے اس کے اوراق میں چھپنے والی اور کوئی تحریر پڑھوں یا نہ پڑھوں سالم علی نے اس برصغیر کے پرندوں کی جو زبنا لکھ رکھی ہے اس کے اردو ترجمے کی قسطیں ضرور پڑھتا ہوں۔ پپیہے کے بیان پر آ کر میں ٹھٹھکا۔ لکھا تھا کہ اس پرندے نے اپنی اڑان پر خود ہی پابندی لگا رکھی ہے۔ لگتا ہے کہ شمالاً جنوباً ایک لکیر اس طرح کھنچی ہے کہ پاکستان کا سارا علاقہ لکیر کے پرلی طرف ہے۔ کبھی اس لکیر کو پار نہیں کرتا۔ اس لیے اس کی پی کہاں کبھی پاکستان کے کسی علاقہ میں سنائی نہیں دے گی۔ اے پپیہے، تجھے اس دیار کے باغ باغیچوں میں آنے سے کس نے روکا تھا۔ تو نے اپنی آواز میں خود ہی یہ کوتاہی پیدا کر لی ہے۔ ویزا پاسپورٹ کے جھمیلے تو بس اس برصغیر میں بسنے والی بدنصیب اولاد آدم کے لیے ہیں۔ اب جو میں ہندیاترا پہ نکلا ہوا ہوں اور منہ اٹھا کر جس نگر میں بھی نکل جاؤں، کوئی نہیں پوچھے گا کہ اے راندۂ درگاہ تو نے یہاں قدم کیسے رکھا۔ تو یہ منشی پریم چند کا فیض ہے۔ ان کے نام کی فیلوشپ میرے لیے پروانۂ راہداری بنی ہوئی ہے۔

اے لو میں صبح کی سیر پہ نکلا تھا۔ کیمپس کے باغ باغیچوں میں چہکنے والے پرندے مجھے بہکا کر کہاں سے کہاں لے گئے۔ تو ہو گئی ادھر ادھر کی بہت سیر۔ واپس اپنی راہ پر آتا ہوں۔ میں سنا رہا تھا کہ یہ جو چند صبحیں مجھے اس نگر میں میسر آئی ہیں، وہ کیسے گزر رہی ہیں۔

صبح منہ اندھیرے مہمان خانے سے نکل کیمپس کی کھلی فضا میں نکل جاتا ہوں تو سیر سے واپس آ کر نہاتا دھوتا ہوں۔ ناشتہ کرتا ہوں اتنے میں شہریار آ جاتے ہیں۔ نارنگ صاحب نے مجھے شہریار کی سپردگی میں دیا تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ شاعر ہے۔ مہمان کی دیکھ بھال کی کھیکڑیں کیوں اٹھائے گا مگر یہ شاعر تو بہت ذمہ دار نکلا۔ کیسی خبر گیری کی کہ جب خطرے کی بو آئی تو جلدی سے گاڑی میں بٹھا یونیورسٹی کی حدود سے نکال سٹیشن پر پہنچایا کہ خیریت سے آئے تھے، خیریت سے جاؤ اور لکھنؤ سدھارو۔ مگر ابھی تو بیچ میں دن امن والے ہیں۔ ناشتہ سے فارغ ہوتا ہوں کہ کوئی بھلا سا طالب علم گاڑی لے کر آ جاتا ہے۔ چلو خورشید صاحب کے کمرے میں۔ برابر ہی وہ ہال ہے جہاں آج آپ کو اپنا افسانہ ''کشتی'' سنانا ہے۔ بھائی ''کشتی'' کی کیا تخصیص ہے۔

بس قاسمی صاحب نے یہی طے کیا ہے۔اب فلاں شعبہ میں تقریب ہے۔ وہاں آپ کو "زرد کتا" سنانا ہے۔ "زرد کتا" ہی کیوں۔بس قاسمی صاحب نے یہی پروگرام بنایا ہے۔ابوالکلام قاسمی خوب ہیں۔ پسند ان کی، پڑھنے والا میں۔ اور پھر سوال جواب اور سوال ہیں کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آرہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ صدارت تو ایسی ہر تقریب میں شہریار ہی کی ہوتی ہے۔صدر کی اخلاقی حمایت مہمان مقرر کو حاصل ہو تو پھر حاضرین محفل کے تیور جو بھی ہوں ان سے دو بدو ہونا مشکل نہیں ہوتا۔تو سنو کہ یونیورسٹی لٹریری کلب کی طرف سے جلسہ کا جو اہتمام ہوا تھا،اس کے صدر بھی شہریار ہی تھے اور شعبۂ صحافت میں جو تقریب ہوئی وہاں بھی صدر وہی تھے۔اس کے بعد جو وہاں انٹرویو ہوا،اس میں بھی پیش پیش وہی تھے۔ اگرچہ ان کے ہمراہ شافع قدوائی بھی تھے۔انہیں تو خیر ہونا ہی تھا کہ وہ اس شعبہ کے صدر تھے۔

یونیورسٹی سے باہر جن وادی لیکھک سنگھ کی طرف سے جو تقریب کا اہتمام ہوا وہاں بھی صدارت انہیں کی تھی اور ہاں شہر کی انتظامیہ کی طرف سے جو ایک استقبالیہ دیا گیا، وہاں بھی وہ پیش پیش نظر آئے۔ وہاں کیا خوب واقعہ ہوا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ہندی کے مشہور کوی گوپال داس نیرج و نیز شہریار نے مل کر مجھے ایک شال اڑھائی۔ بہت نیک شگن تھا۔اس کے بعد پورے سفر میں کتنی شالیں مجھے اڑھائی گئیں کہ میں شالوں میں لپٹ کر رہ گیا۔ ہاں اس کا مطلب اور بھی تو تھا۔اب سے پہلے یہ ہوتا آیا کہ یونیورسٹی کے مہمان ہوئے اور اسی مہمانی کے مزے لوٹ کر واپس ہو لیے یعنی علی گڑھ میرے لیے بس یونیورسٹی سے عبارت تھا۔اب پتہ چلا کہ علی گڑھ تو یونیورسٹی سے باہر بھی پھیلا ہوا ہے اور یہ کہ پورا علی گڑھ مجھے نوازنے پر آمادہ ہے۔نیکی اور پوچھ پوچھ۔

ارے ہاں شعبہ اردو کے ریسرچ سکالروں سے بھی تو ایک ملاقات ٹھہری تھی۔ یہاں بھی شہریار سائے کی طرح میرے ساتھ تھے۔ان سے نبٹ کر بالائی منزل میں گیا جہاں لسانیات کی طالبات میرے لیے ڈھیروں سوالات لیے بیٹھی تھیں۔ایک طالبہ نے لگے ہاتھوں یہ سوال بھی کر ڈالا کہ جب آپ کالم انگریزی میں لکھتے ہیں تو افسانہ انگریزی میں لکھنے میں کیا قباحت ہے۔وہ انگریزی میں کیوں نہیں لکھتے۔ ارے واہ، کیوں لکھیں انگریزی میں۔ہمارا مرنا جینا اردو میں ہے۔افسانے کے نام اگر ہماری بخشش ہوتی ہے تو اسی زبان کے وسیلہ سے ہوتی ہے۔وہ اور ہوں گے کہ جنہوں نے یہ دیکھ کر کہ انگریزی کے اہل زبان اب اپنی زبان میں کالے پیلے لکھنے والوں کو بھی گھاس ڈالنے لگے ہیں۔انہوں نے اردو کو چھوڑ انگریزی میں قسمت آزمائی شروع کر دی۔تھوڑی کوشش سے اگر ونر پرائز مل جائے تو سودا برا نہیں مگر ہمیں اردو میں لکھ کر جتنا مل گیا وہ ہمارے لیے بہت ہے۔کالم نگاری کا معاملہ الگ ہے۔وہ میرا پیشہ ہے۔انگریزی فی الحال میری پیشہ ورانہ زبان بنی ہوئی ہے۔انگریزی میں میری دوڑ بس یہیں تک ہے۔

اے لو یہاں سے ڈبائی جانے کی بھی راہ نکل آئی۔ وہ بھی شہریار ہی کا کارنامہ ہے۔اس یار کو خوب سوجھی کہ ڈبائی کا جب ایک دانہ علی گڑھ میں موجود ہے اور دانہ بھی کونسا مُنیب الرحمٰن کا لائق بھانجا حلیم میاں۔ان کی ہمراہی میں کیوں نہ جاؤ۔یہ تو خوب سوجھی۔اسی ٹوہ میں تو میں تھا کہ اپنے کنبہ برادری کا کوئی مل جائے تو اس

کی انگلی پکڑوں اور کہوں کہ وہ بستی اب مجھے اجنبی جان کر راہ نہیں دیتی۔ اب تم مجھے ان گلیوں کوچوں میں لے کر چلو۔ جہاں کی خاک چھانتا چھانتا میں کہیں سے کہیں نکل گیا۔ لیجیے بھائی منیب الرحمٰن کا ذکر درمیان میں آ گیا ہے تو ڈبائی ہی کے واسطہ سے ان کی ایک نظم سن لیں۔

ایک قصبہ تھا ڈبائی، مرا آبائی وطن
تھا بہت سال ہوئے، ایک محلہ اس میں
نام تھا جس کا محلہ شیخاں
اس محلے میں تھے ہم رشتہ گھرانے آباد
میرے والد کی بنائی ہوئی منزل تھی وہاں
اگلے وقتوں کی حویلی کی طرح
جس میں سب ساتھ رہا کرتے تھے

ارے کہیں یہ کرامت منزل کا تو ذکر نہیں ہے۔ یہ پورا گھرانہ کرامت والوں کے نام سے جانا جاتا تھا اور شہریار کی تجویز کا کیا خوب نتیجہ برآمد ہوا کہ علیم صاحب جب اپنی کار میں بٹھا کر مجھے ڈبائی لے گئے تو سیدھے اسی کوچے کے بیچ لے جا کر کھڑا کر دیا اور میں حیران ہو کہ دیکھ رہا ہوں کہ یہاں تو سب کچھ اسی طرح ہے جس طرح میں نے بچپن لڑکپن میں دیکھا تھا۔ کرامت منزل یعنی کئی گھروں کا وہ جھرمٹ جو کرامت منزل کہلاتا تھا۔ آگے چند قدم چل کر ایک مانوس پھاٹک دکھائی دیا۔

''یہ محسن صاحب کی کوٹھی ہے۔ آپ اسے پہچانتے ہیں؟''

''خوب پہچانتا ہوں۔ محرم کے محرم یہاں مجلس عزا کی تقریب سے آنا جانا رہتا تھا۔''

''وہ اس سے آگے مالا گڑھیا کا امام باڑہ ہے۔'' علیم صاحب نے ایک اجڑی بجڑی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

مالا گڑھیا کا امام باڑہ۔ اس نام کے ساتھ کتنا کچھ مجھے یاد آ گیا۔ ارے یہ تو وہی امام باڑہ ہے جس کے منبر پر بیٹھ کر ایک مرتبہ میں نے بھی کچھ الٹا سیدھا پڑھا تھا۔

اور لیجیے علیم صاحب ہمیں اپنے گھر لے کر جا رہے ہیں۔ ہمیں میں نے اس تقریب سے کہا کہ ساتھ میں پریم کمار بھی تو ہیں۔ پریم کمار علی گڑھ کے ایک کالج میں ہندی کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ پچھلے پھیروں میں انہیں کی رہنمائی میں تو میں نے اپنا گمشدہ گھر ڈھونڈ کر نکالا تھا۔ ہاں تو جس کمرے میں میں بیٹھا ہوں اس کا ایک دروازہ دوسرے کمرے میں کھلتا ہے۔ یہ دروازہ اس وقت کھلا ہوا ہے اور سامنے پلنگ پر ایک بزرگ بی بی چپ چاپ بیٹھی ہیں۔ ان کا رخ ہماری ہی طرف ہے لیکن شاید بینائی کمزور ہے اور وہ پوری طرح دیکھ نہیں پا رہیں کہ یہ کون اجنبی یہاں آئے بیٹھے ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے اچانک منیب الرحمٰن صاحب کی ایک اور نظم یاد آ جاتی ہے۔

دس برس زندگی کے بیت گئے
آخری بار مجھ کو آئے ہوئے
آج آنکھوں کو اس جگہ ہر چیز
اجنبی اجنبی سی لگتی ہے
میری چھوٹی بہن جھکے شانے
غم کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
ایک کمرے سے دوسرے کمرے
سست قدموں سے چلتی پھرتی ہے
میرے بہنوئی کے تکلم میں
نقص فالج کا کار فرما ہے
کتنے بدلے ہوئے ہیں یہ دونوں
وقت سب سے خراج لیتا ہے
سوچتا ہوں کہ عمرِ رفتہ کو
میں بہت دور چھوڑ آیا ہوں
دن کے پچھلے پہر نومبر میں
چائے نوشی کا دور جاری ہے
اور اک دوسرے سے ہم تینوں
اپنی یادیں بیان کرتے ہیں
بات بے ساختہ نکلتی ہے
اور باتوں سے بات چلتی ہے
ہم زمانے میں لوٹ جاتے ہیں
جب اسی طرح دس برس پہلے
چائے نوشی کا دور جاری تھا
اور ہم بات چیت کرتے تھے

بس اس سے مجھے خیال آیا کہ ارے یہ وہی بی بی تو نہیں ہیں۔ اب مجھے بے کلی ہونے لگتی ہے۔ ارے تھوڑا انتظار کرلو۔ علیم صاحب شاید چائے کے انتظام کی خاطر اندر گئے ہوئے ہیں۔ وہ تمہارا ان سے تعارف کرائیں گے مگر اتنا انتظار کون کرے۔ میں خود ہی ان کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہوں۔ آداب کہتے ہوئے

عرض کرتا ہوں" آپ ویسے تو مجھے نہیں پہچانیں گی لیکن اگر میں اپنے والد کا نام بتاؤں تو شاید آپ پہچان لیں۔ ان کا نام تھا منظر علی۔"

"اچھا اچھا وہ جو دو بھائی تھے، منظر علی نذر حسین۔ ہم انہیں منظر ماما نذر ماما کہا کرتے تھے۔ ہمیں یہی بتایا گیا تھا کہ یہ تمہارے ماما ہوتے ہیں۔"

اور اب مجھے تھوڑا سکون میسر آتا ہے کہ میری بستی نے مجھے پہچان لیا ہے۔ زمین جتنی مہربان ہوتی ہے اتنی ہی ظالم بھی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ اس سے ناطہ توڑ لیں تو وہ بھی ایسی ان جانی بن جاتی ہے کہ پھر آپ لاکھ اس سے اپنائیت جتائیں وہ ذرا ہنکارا نہیں بھرتی لیکن خیر میں اس داستان کو زیادہ طول نہیں دیتا۔ اب خیال آرہا ہے کہ یہ سارا قصہ تو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ کچھ جس سیاق و سباق میں پہلے بیان ہوا وہاں بھی درست تھا، یہاں بھی درست ہے۔

تو چلو واپس علی گڑھ چلتے ہیں۔ وہاں واپس ہو کر پہلے علیم صاحب کے گھر میں دم لیں۔ وہیں کھانا کھایا۔ ان کی بیگم انچولی والی ہیں۔ اصرار تھا کہ آگے آؤ تو یہیں ٹھہرو۔ مگر دوبارہ اس گھر میں جانا بھی ہوا تو اس تقریب سے کہ انہیں دنوں خیب الرحمٰن یہاں آئے بیٹھے تھے۔ لپک جھپک آیا، لپک جھپک یہاں سے واپس ہوا۔ یونیورسٹی میں ہونے والی تقریب ادھر انتظار کر رہی تھی۔

تو لیجیے علی گڑھ بہت رہ لیے اور اس طرح رہے کہ علی گڑھ سے ڈبائی تک کی خاک چھان ڈالی اور اس شہر علم میں سب ہی سے مل لیے۔ اسلوب احمد انصاری کی دہلیز بھی چھو لی۔ ڈاکٹر مختار الدین آرزو کے قدم بھی چھو لیے۔ قاضی عبدالستار کی گھن گرج بھی دیکھ لی۔ گھن گرج سی گھن گرج، ایسی شخصیت کو بیان کرنے کے لیے دفتر چاہئیں۔ تو اب اس شہر سے کوچ کرتے ہیں مگر ٹھہریے، چلتے چلتے عجب گل کھلا۔ عین رات کے وقت، آدھی رات ادھر، آدھی رات ادھر۔ کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ دروازہ کھولا۔ گیسٹ ہاؤس کے نگہبانوں کو دیکھا کہ پریشان کھڑے ہیں۔ میں گھبرایا۔ "خیر تو ہے۔ کیا بات ہے؟" "صاحب کیسی خیر۔ یہاں سے قریب ہی جو کلب ہے، اس میں طلباء نے آگ لگا دی ہے۔" "اچھا، مگر ہمارے مہمان خانے تک تو وہ آگ نہیں آئی ہے۔ نہیں۔ بس پھر ہم یہی کر سکتے ہیں کہ منہ لپیٹ کر پڑ رہیں اور سو جائیں۔"

صبح منہ اندھیرے شہریار نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھولا تو فوراً تاکید کی کہ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ پولیس آتی ہی ہوگی۔ پھر یہاں پہرہ بیٹھ جائے گا۔ اس سے پہلے نکل لو۔ سو جلدی جلدی تیار ہوا۔ گاڑی میں بیٹھا۔ ترنت کے ترنت سٹیشن جا پہنچا۔ وہاں دوست پہلے سے موجود تھے۔ خورشید صاحب، ابوالکلام قاسمی، یونیورسٹی کو ایک ہنگامہ کے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔ اب لکھنؤ میری منزل مقصود ہے۔ لکھنؤ بلکہ لکھنؤ زمیں جس کی چہارم آسماں ہے۔

80........03........03

آہ لکھنؤ واہ پٹنہ

ارے یہ ریل گاڑی تھی یا ہوائی جہاز تھا۔ کس تیزی سے اور کس آرام سے اس غریب الدیار کو لکھنؤ پہنچایا ہے۔ اے لو وہ ہمارے میزبان کھڑے ہیں۔ ارے تم انیس اشفاق ہو۔ واقعی پچھلے پھیرے میں (اس پھیرے کو بھی تو بہت برس ہو گئے) اس نام کے ایک چھریرے نوجوان کو دیکھا تھا۔ اب ماشاء اللہ کیا قد نکالا ہے اور کیا فربہ اندام پایا ہے۔

اچھا تو یہی وہ لکھنؤ ہے جس کی دید کی آرزو لے کر گھر سے نکلے تھے اور نارنگ صاحب کو خبردار کیا تھا کہ اور کسی نگر جاؤں یا نہ جاؤں، لکھنؤ مقرر جاؤں گا۔ ارے وہ کونسا لکھنؤ تھا جس کا تصور باندھ کر تم لکھنؤ کے لیے چلے تھے۔ تصور باندھنے کی مت پوچھو۔ تصور تو جانے کب سے ہم نے واجد علی شاہی لکھنؤ کا باندھ رکھا تھا۔ یہ اندر سبھا ہے۔ واجد علی شاہ خود راجہ اندر بنے کتھک میں غرق ہیں۔ قدموں کے نیچے گلال کا فرش بچھا ہے۔ جب رقص کر چکیں تو دیکھنا اس لال فرش پر بانسری بجاتے کرشن کنہیا کی تصویر بنی ہوگی اور یہ آنکھوں کا میلہ ہے۔ پری چہروں کا ہجوم ہے۔ گھومنے کو ہم بھی جاتے ہیں اور وہ رہا بڑا امام باڑہ۔ پھر چھوٹا امام باڑہ۔ فلاں امام باڑے میں میر انیس زیب منبر ہیں اور فلاں عزا خانے میں مرزا دبیر۔ مگر تاریخ کا وہ ورق تو زمانے نے کب کا الٹ دیا اور مولانا محمد حسین آزاد نے تو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ دلی برباد، لکھنؤ ویران۔ مگر دلی کا مضمون دوسرا ہے۔ کہتے ہیں دلی سات مرتبہ اجڑی، سات مرتبہ بسی۔ اجڑتی ہے اور پھر بس جاتی ہے۔ بہت ہوا تو جگہ بدل لی اور نام تھوڑا بدل لیا۔ سن ستاون میں وہ دلی اجڑی تھی جو جہان آباد کہلاتی تھی۔ 1947ء میں پھر وہی دلی اجڑی مگر پھر کیا ہوا۔ دلی نے جگہ بدل لی۔ شاہجہاں والی دلی پس منظر میں چلی گئی۔ نئی دلی نے رونق پکڑی۔ اب نئی دلی اپنی نئی رونقوں کے ساتھ شاد آباد ہے۔ مگر لکھنؤ نازک مزاج بستی نکلی۔ ایک ہی مار میں بیٹھ گئی۔ کہنے کو یہ شہر یو پی جیسے بڑے صوبے کا صدر مقام ہے۔ پھر بھی اجڑا اجڑا ہے۔ جو رونق چلی گئی، وہ واپس نہیں آئی۔

مگر لکھنؤ بہر حال لکھنؤ ہے۔ موجود کو دیکھتا ہوں اور گزشتہ کو تصور میں لاتا ہوں۔ انیس اشفاق ساتھ ہیں۔ مجھے امام باڑوں میں جھنکاتے پھر رہے ہیں۔ بڑا امام باڑہ دیکھا، چھوٹا امام باڑہ دیکھا۔ امام باڑہ شاہ

نجف میں جھانکا۔ حضرت عباس کی درگاہ کو دیکھا۔ اسے دیکھ کے تھوڑا حیران ہوا۔ انیس اشفاق سے کہا کہ آگے میں یہاں آیا تھا تو اس درگاہ کو اجڑا اجڑا پایا تھا، اب تو یہ درگاہ زرق برق نظر آ رہی ہے۔ بولے، کسی گروہ کی خوشحالی بدحالی کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے معبدوں، مقبروں، ماتم خانوں کو دیکھو۔ جب آپ پہلے آئے تھے تب سے اب تک شیعوں کے ولدر اچھے خاصے دور ہو گئے ہیں۔ کمائی کر کے خوشحال ہو گئے ہیں۔ بس اسی خوشحالی کی یہ بہار ہے۔

ارے ہاں تال کٹورے کی کربلا اس کا ذکر اتنا پڑھتا آیا ہوں۔ اشتیاق ہوا کہ اسے بھی دیکھتے چلیں مگر دو ڈھائی دن میں آدمی کتنا کچھ دیکھ سکتا ہے اور ایسے شہر میں جہاں کا ہر اجڑا کوچہ پکار کر بلاتا ہے کہ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ میں گئی رونقوں کا امانت دار ہوں۔ خیر خانم کا بالا خانہ تو پچھلے پھیرے ہی میں دیکھ لیا لیا تھا۔ خانم بی اپنے بالا خانے کی رونق اپنے ساتھ لے گئیں اور یہ جو اس کے آس پاس اصغر علی محمد علی کا مہکتا خانۂ عطار تھا، وہ اب خانۂ ویران ہے۔ رونق کے گوشے اجڑ کر کچھ مٹ گئے۔ کچھ اجڑے بجڑے کھڑے ہیں مگر اجڑے در و دیوار کا اپنا جادو ہوتا ہے۔ رہ گئیں لکھنؤ کی گلیاں، ان کی خاک کچھ یہ سوچ کر چھانی کہ ارے یہ لکھنؤ کی گلیاں ہیں۔ کچھ اس واسطے سے کہ عالیہ علم ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ یہ پچھلے پھیرے کی بات ہے۔ میری ایک بہن نے جنہوں نے چند علم کھڑے کر کے گھر کو اچھا بھلا عزا خانہ بنا لیا تھا، فرمائش کی تھی کہ لکھنؤ جاؤ تو وہاں سے علم کے پنجے لے کر آنا مگر کتنی گلیاں چھان ڈالیں۔ کسی ٹھٹھیرے کے یہاں سے پنجے برآمد نہیں ہوئے۔ تب کسی بھلے مولائی نے کہا کہ مسلمان ٹھٹھیرے سے گزر رو۔ فلاں گلی میں جاؤ جہاں ہندو ٹھٹھیرے بیٹھے ہیں۔ پنجے وہی بناتے ہیں۔ لکھنؤ کے عزا خانوں میں علم انہیں کے دم سے سجتے ہیں۔ اس گلی میں گئے تو واقعی پنجے وہیں سے دستیاب ہوئے اور ہاں ایک بی بی نے، ارے اور کونسی بی بی انیس اشفاق کی بہن ہی ہوں گی وہی عالیہ کو لیے لیے پھر رہی تھیں انہوں نے علموں کے سلسلہ میں یہ ذوق و شوق دیکھ کر سونے کے دو چمکتے دمکتے پنجے شاید اپنے عزا خانوں سے نکال کر ہمیں دے کر گویا نذرِ مولا کر دیے۔ لیجیے ہم تو نہال ہو گئے۔ اسے کہتے ہیں جوئندہ یابندہ۔

لیجیے اس وقت میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ہوں۔ ارے یہ تو میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں آ کر مجھے ایک عجب شرف حاصل ہوگا۔ دوستوں نے بتایا کہ اس یونیورسٹی میں سید مسعود حسن رضوی کے نام سے جو ہال تعمیر ہو رہا تھا، وہ اب تیار کھڑا ہے۔ اس کا افتتاح تمہارے ہاتھوں ہونا ہے۔ سبحان اللہ۔ ویسے تو فیتہ کاٹ کر افتتاح کرنا بس ایک رسم ہے مگر چونکہ لکھنؤ کی سرزمین پر ایسے مبارک ایوان کا جو سید مسعود حسن رضوی جیسے محقق و عالم سے منسوب ہے، مجھے فیتہ کاٹنا ہے، اس لیے یہ رسم اب میرے لیے رسمی چیز نہیں ہے۔ اس واسطے سے تہذیب کے اس اجڑے دیار میں مجھے ایسا شرف حاصل ہو رہا ہے جس پر میں فخر کر سکتا ہوں۔

دوستوں نے بتایا کہ یہیں ایک اور بھی ہال زیرِ تعمیر ہے۔ وہ پروفیسر سید احتشام حسین سے منسوب ہے۔

خیر تو میں نے فیتہ کاٹا۔ ہم اس ایوان میں داخل ہوئے۔ وہاں ایک تقریب کا اہتمام تھا۔ پھولوں کے گجرے اور ایک دوشالا میرا انتظار کر رہے تھے۔ شارب ردولوی نے مضمون پڑھا۔ ہندی کے دو ممتاز ادیب یہاں زیب محفل ہیں۔ ایک تو مدرا راکشس ہیں اور دوسرے ہیں، ہاں وہی جن کے ناول ''شہر میں کرفیو'' نے اردو میں منتقل ہو کر اردو والوں کو لوٹ لیا۔ ان سے بندرا بن میں ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی۔ یہاں موجود تھے اور سٹیج پر تشریف رکھتے تھے لیکن پولیس افسر جو ہوئے، بیچ تقریب میں کوئی ہنگامی کال آ گئی۔ معذرت کی اور یہ جا وہ جا۔

مگر ہنگامہ خیز محفل وہ تھی جو ہندی والوں نے برپا کی تھی۔ سوالوں کی بوچھاڑ تھی اور میں تھا۔ ویسے تو میں نے شارب ردولوی سے توقع باندھی تھی کہ وہ میرا اسہارا بنیں گے مگر وہ تو میری مدد کو نہ آئے، امداد غیب سے آئی۔ ایک سرو قد خوش شکل لڑکی داخل ہوئی اور لیجیے یاروں کا دھیان بٹ کر ادھر سے اُدھر چلا گیا۔ بتایا گیا کہ یہ بی بی تمہارے افسانوں پر کام کر رہی ہے۔ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی سے وابستہ ہے۔ ساتھ میں جو سفید بھبھوکا بی بی ہے، یہ اس کی استانی و نیز گائڈ ہے مگر سلسلۂ کلام شروع ہوا تھا کہ اخباروں، ٹی وی والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک گیا نہیں کہ دوسرا آن دھمکا۔ دوسرے کے بعد تیسرا۔ اور ابھی میں بی بی کے سوال سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے نے آن پکڑا۔ اسے نبٹا کر ذرا سانس لیا تھا کہ ای ٹی وی والے اپنا تام جھام لے کر آن پہنچے۔ ان سے نبٹتے نبٹتے کہ ایک ہندی اخبار کے نمائندے نے آن پکڑا۔ وہی چبا چبایا سوال کہ پاکستان میں آزادیٔ اظہار کتنی میسر ہے۔ اے صاحبو، پاکستان کے لیے کتنی آزادیٔ اظہار چاہتے ہو۔ وہاں کے اخباروں، ٹی وی چینلوں کو دیکھتے نہیں کہ صدر پرویز مشرف پر کس طرح بے بھاؤ کی پڑ رہی ہے۔ اس سادہ لوح ڈکٹیٹر نے ٹی وی چینلوں کو کھلا چھوڑ کر ہیرو بننے کی کوشش کی تھی۔ وظیفہ الٹ گیا۔ اب اسے ٹی وی اینکروں، بمصروں سے جان چھڑانی مشکل ہو رہی ہے۔

ارے چھوڑیں اس قصے کو۔ چلتے ہیں ڈاکٹر نیر مسعود کی طرف۔ اب اس شہر میں ایک ہی تو ڈیوڑھی رہ گئی ہے۔ اس سے کترا کر چلیں تو پھر کونسی ڈیوڑھی ہے جس پر دستک دیں اور انیس اشفاق کس بیچارگی سے کہہ رہے تھے کہ ان کے بعد لکھنؤ میں بس خاک اڑے گی۔

ڈاکٹر نیر مسعود کی کمر بستر سے لگ گئی ہے۔ معذرت کی کہ بیٹھ نہیں سکتا۔ پھر بھی کتنی بار اٹھ کر بیٹھے مگر ہر بار جلدی ہی ہمت چھوڑ دی۔ کہتے تھے کہ اب لکھ نہیں سکتا۔ ان دنوں ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ'' پر بحث گرم تھی اور دونوں طرف سے کڑوی کسیلی باتیں ہو رہی تھیں۔ نیر مسعود کا کہنا تھا کہ جس انداز سے یہ بحث شروع ہو رہی ہے اور چل رہی ہے وہ ناروا ہے۔ صحیح کہا مگر ہم تو اپنے ادبی تنازعوں اور بحثوں میں ناروا ہی کو روا جانتے چلے آئے ہیں۔

اچھا لو بھئی لکھنؤ کی چوکھٹ کو ہاتھ لگا لیا۔ اب چلتے ہیں۔ آگے پٹنہ کا سفر درپیش ہے۔ یہاں تک

ریل گاڑی میں آئے تھے۔ راوی آگے کے لیے ہوائی سفر لکھتا ہے مگر لکھنؤ سے پٹنہ ایسی کونسی لمبی اڑان ہے۔ جلدی پٹنہ میں جا اترے۔ عبدالصمد صاحب کو پہلے میں نے کب دیکھا تھا اور انہوں نے بھی مجھے کہاں دیکھا ہوگا مگر دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو جلد پہچان لیا۔

پٹنہ کو آپ کیا سمجھتے ہیں۔ اردو افسانہ نگاروں کا گڑھ ہے۔ کیسا کیسا افسانہ نگار اس خاک سے اٹھا۔ کتنے گزر گئے۔ کتنے موجود ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ خود عبدالصمد صاحب کیا کسی سے کم ہیں۔ ان کے ایک ناول ''دوگز زمین'' نے بہت نام پایا۔ ساہتیہ اکیڈمی کے انعام سے نوازا گیا۔ اب ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے اس شہر میں وہ میرے میزبان ہیں۔

پٹنہ کو ایک اور شرف حاصل ہے اور کتنا بڑا شرف ہے کہ مشرقی علوم کی حد تک برصغیر کی سب سے بڑی لائبریری اس شہر میں ہے۔ خدا بخش لائبریری۔ آج کل اس کے ڈائریکٹر امتیاز احمد صاحب ہیں۔ انہوں نے مخطوطوں کے بیچ لا کھڑا کیا۔ پرانی کتابیں، پرانے مخطوطات۔ وقت مختصر۔ آنکھیں صرف دو، کیا دیکھیں، کیا نہ دیکھیں۔ دیوان حافظ کے ایک مخطوطہ پر نظریں جم گئیں۔ حاشیے پر شہنشاہ ہمایوں کی ایک تحریر نظر آئی۔ قیام ایران کے دوران شاید یہاں اس حسین وجمیل مخطوطہ سے اس نے فال نکالی تھی۔ اس تحریر میں اس فال کا حوالہ تھا۔ پھر شاہنامہ کا ایک مخطوطہ نظر آیا با تصویر۔

امتیاز صاحب بتانے لگے کہ یہاں اکیس ہزار ایک سو پچیس مخطوطے ہیں۔ کسی ایک زبان میں نہیں مختلف زبانوں میں۔ عربی، فارسی، اردو، ترکی، پشتو، سنسکرت، ہندی۔ سنسکرت کے مخطوطے پتروں پر لکھے ہوئے چالیس کی تعداد میں ہیں۔ باقی مطبوعہ کتابیں ڈھائی لاکھ کی تعداد میں ہیں اور بھلا کونسی کونسی زبانوں میں ہیں۔ عربی، فارسی، ہندی، اردو، پنجابی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی، جاپانی۔

مگر مطبوعات و مخطوطات کا یہ اتنا بڑا ذخیرہ کیسے جمع ہوا۔ کیا یہ کوئی سرکاری کتب خانہ ہے یا کسی علمی ادارے کی طرف سے ہے یا کسی صاحب ذوق حاکم نے کسی بادشاہ، کسی نواب، کسی مہاراجہ نے اپنے سرکاری یا نجی وسائل سے یہ اہتمام کیا ہے۔ نہیں، صاحب نہیں۔ بس کتابوں مخطوطوں کے ایک رسیا نے اپنے شوق میں یہ کام کر ڈالا ہے۔ اب تو نام خدا بخش کا ہے مگر اصل میں ان کے والد محمد بخش قادر مخطوطوں اور کتابوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ بس یہی ان کا شوق تھا۔ زندگی کے آخر تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے چودہ ہزار مخطوطے جمع کر لیے تھے۔ مرتے وقت بیٹے کو وصیت کی کہ فرزند اس قیمتی ذخیرے کی قدر کرنا اور حفاظت سے رکھنا۔ یوں کرنا کہ ایک لائبریری قائم کر کے اس میں اس دولت کو سنگھوانا۔ یہ انیسویں صدی کا ذکر ہے۔ 1876ء میں اس بزرگ کا انتقال ہوا تھا۔

بیٹے نے باپ کی وصیت پر اس سے بڑھ کر عمل کیا۔ مخطوطوں اور کتابوں کے ساتھ اس شوق کو بھی ورثے میں اپنایا۔ گھر ہی میں کتب خانہ محمدیہ کے نام سے لائبریری قائم کر لی۔ کچھ باپ کا ذخیرہ، کچھ خود اپنے

شوق سے اضافہ کیا۔ ہوتے ہوتے کتب خانہ کچھ زیادہ ہی پھیل گیا۔ تب خدا بخش نے اورینٹل لائبریری کے نام سے ایک پبلک لائبریری قائم کی۔ آگے چل کر 1891ء میں اس لائبریری کا نام بدل کر بانکی پور اورینٹل لائبریری اس کا نام رکھا گیا اور گورنر بنگال سر چارلس ایلیٹ نے اس کا افتتاح کیا لیکن پھر ہوا یوں کہ خدا بخش نے اتنا ذوق وشوق دکھایا کہ یہ نام لائبریری کے ساتھ جڑ گیا۔ بانکی پور کا نام بیچ میں سے نکل گیا۔ بانکی پور اصل میں اس محلّہ کا نام تھا جہاں یہ لائبریری تھی۔ 1969ء میں حکومت ہند نے ایک ایکٹ کے ذریعہ خدا بخش اورینٹل لائبریری کے نام پر مہر تصدیق ثبت کی اور اس کے فروغ وبقاء کے اخراجات کا ذمہ لیا۔

برصغیر میں نوابوں، راجاؤں نے جو کتب خانے قائم کیے تھے، پھر برطانوی دور حکومت میں جو لائبریریاں وجود میں آئیں، ان سب سے بڑھ کر اب یہ لائبریری ہے۔ پورے برصغیر اور اس سے باہر بھی علماء وفضلاء کے حلقوں میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ تو میں کتنا خوش ہوا، جب امتیاز احمد صاحب نے اس لائبریری کی طرف سے مجھے مدعو کیا اور ایک تقریب کا اہتمام کیا۔

ایسے ادارے میں آراستہ ہونے والی محفل بہت متانت اور ثقاہت کا تقاضا کرتی ہے مگر ایک افسانہ نگار نے اپنے احتجاج سے ہنگامہ بپا کر دیا۔ کہا کہ ڈائریکٹر صاحب نے سوالات کے لیے کتنوں کو دعوت دی مگر پھوٹے منہ سے میرا نام نہیں لیا۔ یہ تھے ممتاز افسانہ نگار شوکت حیات۔ تقریب ختم ہوگئی۔ افسانہ نگار کا غصہ تھمنے میں نہیں آیا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ شاعر افسانہ نگار بھی خوب لوگ ہیں۔ بڑی سے بڑی بات کو یوں پی جاتے ہیں کہ سانس ڈکار نہیں لیتے اور کسی چھوٹی سی بات پر آسمان سر پہ اٹھا لیتے ہیں۔

ارے بھئی یہاں پٹنہ یونیورسٹی بھی تو ہے۔ وہاں بھی جھانکنا ضرور ہے۔ وہاں کے شعبۂ اردو میں قدم رکھا تو اساتذہ ایک مرحوم شخصیت کا کلمہ پڑھتے نظر آئے۔ اس شعبہ کو ایک بامعنی علمی اور تعلیمی ادارے کے طور پر انہوں نے بنایا سنوارا۔ یہ تھے ڈاکٹر عظیم الدین احمد۔ شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام ''گل نغمہ'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ نام سن کر میں چونکا۔ اچھا اچھا کلیم الدین احمد والے عظیم الدین احمد۔ جی جی، ڈاکٹر عظیم الدین ان کے والد تھے۔ خوب، بیٹے کی سعادت مندی باپ کو لے ڈوبی۔ ارے باپ تو اردو ادب کی تاریخ میں اور بھی گزرے ہیں۔ میر تقی چھوٹے موٹے باپ تو نہیں تھے۔ صاحب نظر بزرگ تھے۔ بیٹے کو نصیحت کی۔ فرزند عشق کیا کر۔ بیٹے نے یہ نصیحت دل پر نقش کر لی اور اتنا ڈوب کر عشق کیا کہ چاند میں پری کی صورت نظر آنے لگی۔

کی آئی جس سے خور و خواب میں

ہمارے ہی زمانے میں، نہیں ہم سے ذرا پہلے کے زمانے میں ایک باپ گزرے تھے۔ عبرت گورکھپوری، شاعر بھی تھے نہ اتنے کہ بیٹا باپ کی شاعری کو سر پہ اٹھائے اٹھائے پھرے۔ بس فراق گورکھپوری سے یہی چوک ہوئی۔ مگر کلیم الدین احمد تو ساری حدیں پھلانگ گئے۔ اردو شاعری پر ایسی کتاب لکھی کہ اردو کا

جو شاعر زیر بحث آیا، شاعری سے بے بہرہ نظر آیا۔ جب سب شاعر مردود و مقہور ہو چکے تو والد گرامی کی باری آئی۔ بس پھر وہی شاعر ٹھہرے۔ دنیائے ادب میں شور مچ گیا کہ یہ کیسا منہ چڑھا نقاد آیا ہے کہ پدر بزرگوار کے سوا کسی کی شاعری کو گردانتا ہی نہیں۔

مجھے یاد آیا کہ پچھلے پھیرے میں میں نے اس منہ چڑھے نقاد سے نیاز حاصل کیا تھا۔ ڈرتے ڈرتے ملا۔ مگر مجھے تو وہ بہت نرم مزاج نظر آئے۔ جس ادارے کی تقریب میں شرکت کی غرض سے آیا تھا اس کے صدر وہی تھے۔ ادارہ بہار اردو اکیڈمی۔ تقریب طنز و مزاح کانفرنس۔ خیال یہ تھا کہ میں نے جو ہلکے پھلکے رنگ میں کچھ مضامین لکھ رکھے ہیں، ان میں سے کچھ سنا دوں گا۔ مگر یہاں آ کر پتہ چلا کہ وہ نشست تو آخر میں ہوگی۔ مجھے اول دن کے اجلاس میں شرکت کرنی ہے۔ میں سٹپٹایا کہ اس اجلاس میں میری شرکت کس طرح ہوگی۔ عابد رضا بیدار سے میں نے اپنی مشکل بیان کی۔ ان دنوں خدا بخش لائبریری کے ڈائریکٹر وہی تھے۔ انہوں نے کہا کہ کلیم الدین احمد سے بات کرلو۔ اکیڈمی کے چیئرمین وہی ہیں۔ کلیم الدین احمد۔ میں اور بھی سٹپٹایا۔ ارے اس جلالی نقاد سے بات کرنی ہے۔ مگر بیدار صاحب نے مجھے اطمینان دلایا۔ وہ ویسے نہیں جو آپ کے تصور میں ہیں اور انہوں نے ترت کے ترت فون ملایا اور ریسیور میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنی مشکل بیان کی کہ مقالہ تو میرے پاس نہیں ہے اور جس نشست میں مجھے شامل ہونا ہے، وہ تو مقالوں کی نشست ہے۔ میں اس میں شرکت کا حق کس طرح ادا کروں گا۔

بہت نرمی سے جواب دیا کہ "آپ اس اجلاس میں وہی پیش کریں گے جو آپ کا فن ہے۔ آپ اپنا افسانہ پیش کریں گے۔"

"مقالوں کے بیچ افسانہ۔ یہ تو اَنمل بے جوڑ بات ہوگی۔"

بولے "کوئی اَنمل بے جوڑ بات نہیں ہوگی۔ کل کا پروگرام اس طرح ہوگا کہ وزیر اعلیٰ جناب جگن ناتھ سیمینار کا افتتاح کریں گے۔ اس افتتاحی اجلاس کی آپ صدارت کریں گے۔ دوسری نشست مقالوں کی ہوگی۔ اس کے بعد کی نشست میں آپ افسانہ سنائیں گے۔"

پھر جب ملاقات ہوئی تو چال ڈھال سے بولنے، بات کرنے کے انداز سے بھی بہت نرم آدمی دکھائی دیئے۔ اپنی گوری رنگت اور سفید پائجامے سفید شیروانی کے ساتھ بالکل میدے کی لوئی لگ رہے تھے۔ افتتاحی تقریب، پھر نرم گرم مقالوں کی نشست مگر کلیم الدین احمد چپ۔ بیچ میں بولنا پڑا تو بہت مختصر اور بہت نرم لہجہ میں۔ بعد میں چائے کے وقفہ میں ان کی خدمت میں آداب کا موقع ملا۔ کہنے لگے "تمہاری کہانیاں پڑھتا رہا ہوں۔ اب تم نے کوئی ناول لکھا ہے، بستی۔ اس کا ذکر رسالوں میں دیکھا ہے۔ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ہے کہ پڑھ سکوں۔"

میرے بیگ میں ایک کاپی موجود تھی۔ فوراً نکال کر بصد ادب ان کی خدمت میں پیش کی۔ بس

رواروی میں ان سے اتنی ہی ملاقات ہو سکی۔

ہاں اس شہر میں قاضی عبدالودود بھی تو بیٹھے تھے۔ نارنگ صاحب اس سفر میں ساتھ تھے۔ ان کے ہمراہ ان کے دولت کدے پر دستک دی۔ لیجیے اس نامور محقق سے بھی نیاز حاصل ہو گئے۔

کتنے سالوں بعد اب اس شہر میں آیا ہوں تو وہ شخصیتیں نظروں سے اوجھل ہیں۔ دونوں بزرگ دنیا سے سدھار چکے ہیں۔ مگر اس پھیرے میں جن نوجوانوں سے ملاقات ہوئی تھی وہ بھی نظر نہیں آ رہے۔ ہاں ان میں مشہدی بھائیوں کی ایک جوڑی بھی تو تھی۔ یونس مشہدی اور شفیع مشہدی۔ سب کتنے چہک مہک رہے تھے اور پھر ان کی گرمیِ گفتار۔ بہار کے نام پر کٹ مرنے کے لیے تیار۔ اپنی دھرتی پر کتنا فخر تھا اور بہاری ہونے پر کتنے نازاں تھے۔ میں نے ان کے دل جیت لیے۔ خوش ہو کر انہوں نے مجھے بہاری برادری میں شامل کر لیا مگر اس کے لیے مجھے اپنی مرحوم بیگم کا بھی تو ممنون ہونا چاہیے۔ اس سفر میں وہ ساتھ تھیں۔ پٹنہ پہنچ کر انہیں یکا یک گیا کی یاد ستانے لگی۔ میں نے حیران ہو کر کہا کہ "گیا تو مہاتما بدھ کا نگر ہے۔ تمہارا اس نگر سے کونسا رشتہ ہے کہ اسے یاد کر رہی ہو۔"

"ارے واہ، میں وہاں پیدا ہوئی تھی۔ میری تو وہاں نال گڑی ہے۔"

میں اور حیران ہوا۔ "تم گیا میں پیدا ہوئی تھیں۔ وہ کس خوشی میں۔ بنارس بھی کوئی معمولی شہر تو نہیں ہے۔ اسے چھوڑ کر تم پیدا ہونے کے لیے گیا کیوں گئی تھیں؟"

"ہمارے ماموں ابا جو وہاں رہتے تھے۔"

میں نے انہیں سمجھایا کہ دلی میں تم یاد دلاتیں تو شاید نارنگ صاحب کی کوشش سے گیا کے ویزے کا بندوبست ہو جاتا۔ یہاں آ کر تمہیں اپنی جنم بھومی یاد آئی ہے۔ یہاں تو ایسا کوئی بندوبست نہیں ہو سکتا۔ مگر گیا کی طرف سے مایوس ہو کر انہیں بکنا پہاڑی یاد آ گئی۔ کہنے لگیں کہ "یہاں پٹنہ میں بکنا پہاڑی ہے۔ وہاں میری ننھیال کے لوگ رہتے ہیں۔ یہاں آئی ہوں تو ان سے ملے بغیر کیسے چلی جاؤں۔" مگر خیر اس موقع پر یونس مشہدی نے ہماری مدد کی۔ پتہ نہیں کن کن رستوں سے ہمیں بکنا پہاڑی نام کے کوچہ میں لے گئے۔ عالیہ اپنی ننھیال والوں سے مل کر خورسند ہو گئیں مگر اس کے بعد مجھے یونس مشہدی کے سامنے اپنی حیثیت کی وضاحت میں بہت دقت پیش آئی۔ بولے "آپ تو کہتے تھے کہ میرا بہار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"ہاں میرا تو بہار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میری بیگم کا ہے۔"

"چلیے صرف بیگم ہی کا سہی۔ اس واسطے سے آپ آدھے بہاری تو ہو گئے۔"

"ہاں اس نسبت سے تو میں بہاری ہوں، مگر آدھا۔"

ہاں لیجیے خوب یاد آیا۔ یہ خبر کہیں ارتضٰی کریم تک پہنچ گئی۔ انہیں یہ سوچ کر کتنا اطمینان ہوا کہ جس شخص پر انہوں نے تحقیقی کام کر رکھا ہے اور اس کے بارے میں اگلے پچھلے تنقیدی مضامین اکٹھے کر کے ایک ضخیم

مجموعہ مرتب کر ڈالا، کم از کم اس کی بیگم تو بہارن ہے۔ ان کی تحقیق کا وار میرے حسب نسب پر تو نہ چل سکا مگر میری بیگم اس زد میں آ گئیں اور وہ ذکر اس مجموعہ کے دیباچہ کی زینت بن گیا مگر اس بی بی نے یہ تحقیق پڑھ کر سر پیٹ لیا۔ ارے یہ کونسے خاندان کا ذکر ہے۔ ہمارا خاندان تو یہ نہیں ہے۔ بھلا میرے باپ نے کونسی دوسری شادی کی تھی۔ ہم سب بہن بھائی ایک ماں کی اولاد ہیں۔ ہماری کوئی سوتیلی ماں نہیں تھی۔

میں نے انہیں سمجھایا کہ غم مت کرو۔ محققین ہم غریب لکھنے والوں کے ساتھ بالعموم ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔

خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ پچھلے پھیرے میں کیا کیا خوب لوگ تھے جن سے میں ملا۔ اب ادھر کا پھیرا لگا ہے تو نقشہ بدلا ہوا ہے۔ وہ لوگ کہاں گئے۔ اب دوسرے چہرے ہیں۔ خیر یہ بھی اپنی جگہ خوب ہیں۔ اس وقت میرے سامنے سہیل عظیم آبادی کے فرزند دلبند شان الرحمٰن بیٹھے ہیں۔ بتا رہے ہیں کہ میں نے ایک نظم لکھی ہے۔ بین الاقوامی معیار کی ہے۔ تعریف میں خطوط آئے چلے جا رہے ہیں۔ میں ان کی صورت تک رہا ہوں اور سہیل عظیم آبادی کو یاد کر رہا ہوں۔ 48ء میں جب میں نے نیا نیا ادب میں قدم رکھا تھا اور ہفتہ وار ''نظام'' کی ادارت سنبھالی تھی تو میں نے خط لکھ کر ان سے التجا کی کہ ''نظام'' کے لیے کچھ عنایت کیجیے۔ خط کا جواب آیا مگر اتنا تند و تیز کہ مت پوچھو۔ یہ تند و تیز تبصرہ تھا تقسیم اور قیام پاکستان پر آخر میں لکھا تھا ہمت ہے تو اس خط کو ''نظام'' میں چھاپو۔ میں پس و پیش میں پڑ گیا مگر پھر ہمت کی اور خط چھاپ دیا۔ لیجیے حمایت اور مخالفت میں خط آنے لگے مگر خط سہیل صاحب کی حمایت میں زیادہ تھے۔

اس بحث میں کہیں عسکری صاحب کود پڑے۔ ادھر سے ترقی پسندوں نے پھریری لی۔ بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ ایک بحث چل پڑی جو ''نظام'' سے نکل کر دوسرے رسالوں میں پھیل گئی۔

لو میں کدھر بہہ گیا۔ یونیورسٹی کی طرف سے جو ایک تقریب ہوئی تھی اسے بھی تو بیان کرنا لازم ہے۔ شعبۂ اردو کے تحت صحافت اور ابلاغ عامہ کا شعبہ قائم ہوا ہے۔ فیتہ کاٹ کر اس کا افتتاح ہوا۔ پھر تقریب میں مہمان خصوصی بن کر بیٹھ گیا۔ وائس چانسلر وانی سی سمواری جی نے صدارت کی۔ ان کا جنوبی ہند سے تعلق ہے اور جنوبی ہند والے بالعموم شمال کی زبانوں سے خواہ وہ ہندی ہو یا اردو ہو، بہت بدکتے ہیں مگر وائس چانسلر صاحب مزاج کے مختلف نکلے۔ ایک تو شعبۂ اردو میں آ کر اردو والوں کی تقریب میں شریک ہوئے۔ جب صدارتی کلمات کی باری آئی تو فرمایا کہ پاکستانی مہمان کی خاطر میں اردو میں بولوں گا۔

اس ایک ادا سے انہوں نے شعبۂ اردو والوں کی عزت رکھ لی اور پاکستان سے آئے مہمان کا دل جیت لیا۔ ہمارے بڑے کہہ گئے تھے کہ ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است

مگر ہمارا کمبخت زمانہ یہ سبق بھول گیا۔ نفرت کی آگ میں جلتا ہے اور فتنہ و فساد میں مبتلا رہتا ہے۔

اے لو، اس جلیل القدر نقاد وہاب اشرفی کی تقریر دلپذیر کو تو بھول ہی چلا تھا۔ ایسے نقاد سے اپنے افسانوں پر داد پا کر خوش تو ہونا ہی تھا اور پھر ان کے دستر خوان کا کھانا کھاؤ اور ہونٹ چاٹو۔

بس اب یہاں کرنے کو کچھ نہیں رہ گیا۔ یہاں سے نکلو اور بنارس چلو مگر ٹھہرو، تم نے خدا بخش لائبریری میں قدم رکھا۔ امتیاز احمد صاحب تمہیں خالی ہاتھ تو نہیں جانے دیں گے۔ کتابوں کا ایسا تحفہ دیں گے کہ تم نہال ہو جاؤ گے۔ خدا بخش لائبریری ایسی ویسی کتاب تو نہیں چھاپے گی۔ سو جو کتاب ہے اپنی جگہ منتخب ہے مگر ایک کتاب نے مجھے اس طرح پکڑا کہ پھر پٹنہ سے دلی تک اور دلی سے لاہور تک اسی کا وظیفہ پڑھتا چلا گیا۔ عنوان دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا" جوگ بسشٹ ...... تقدیم شہزادہ محمد دارا شکوہ"

الٹ پلٹ کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ یہ قدیم سنسکرت کے ان جواہر ریزوں میں سے ہے جنہیں دارا شکوہ نے اپنے ذوق وشوق میں چنا تھا۔ انہیں سنسکرت سے فارسی میں منتقل کرنے کا اہتمام کیا۔ یہ کتاب اس وقت سے پہلے بھی فارسی میں ترجمہ ہو چکی تھی۔ دارا شکوہ اس ترجمہ سے مطمئن نہیں تھا۔ دوبارہ ترجمہ کا بندوبست کیا۔ اسی ترجمہ کو انیسویں صدی کے اواخر میں منشی نولکشور کے ایما پر مولوی ابوالحسن نے "منہاج السالکین" کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس کا آخری ایڈیشن 1898ء میں چھپا تھا۔ اب اسے خدا بخش لائبریری نے چھاپ ڈالا ہے اور اب پیش لفظ میں دارا شکوہ کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔

"اس کتاب کے انتخاب کا ترجمہ جو شیخ صوفی کے ساتھ منسوب ہے، ہم نے مطالعہ کیا تو رات کو خواب میں دیکھا کہ دو بزرگ قبول صورت ایک اونچے پر دوسرے کسی قدر ان سے نیچے کھڑے معلوم ہوئے۔ جو اونچے پر کھڑے تھے بسشٹ تھے اور دوسرے رام چند۔ اور ان دونوں بزرگ کی صورت میں جو تفاوت دیکھا گیا تھا کہ بسشٹ کی داڑھی میں تھوڑے سفید بال تھے اور رام چند کی داڑھی میں سیاہ بال تھے۔ چونکہ اس کتاب کے دیکھنے سے مجھے فائدہ حاصل ہوا تھا، بے اختیار بسشٹ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آداب تسلیمات بجا لایا۔ بسشٹ نے نہایت مہربانی سے ہاتھ میری پیٹھ پر رکھا اور فرمایا کہ اے رام چند، یہ سچا طالب ہے اور یہی طلب میں تیرا بھائی ہے۔ اس سے بغل گیر ہو۔ رام چند کمال محبت کے ساتھ مجھ سے ملے۔ اس کے بعد بسشٹ نے رام چند کے ہاتھ میں مٹھائی دی تاکہ مجھے کھلا دے۔ میں نے وہ شیرینی کھائی۔"

اور اس کتاب میں ہے کیا، وہ بھی سن لیجیے:

"بالمیک کا ایک شاگرد تھا بھردواج نام۔ اس نے ایک دن اکیلے گزگڑا کر استاد سے پوچھا کہ اے حضور علامہ رام چندر معرفت اور آزادی میں کہ جیون مکت

ہے۔ کامل ہو کر راج کاج میں کس طرح جی لگاتے تھے۔ بالمیک بولے بچا رام چندر
کی حکایت جو پوچھی تجھ سے میں بیان کروں گا۔"

اور پھر یہ بیان شروع ہو جاتا ہے۔ رامائن کو بھول جایئے۔ اس کتاب میں بیان اور طرح کا ہے۔
یہاں رام چندر جی دنیا زمانے سے بیزار بیراگی کے روپ میں نظر آئیں گے۔ وشوامتر رشی، راجہ دسرتھ کے
دربار میں اس گزارش کے ساتھ پہنچے تھے کہ اپنے بیٹوں رام لچھمن کو میرے ساتھ جنگل میں بھیجو کہ وہاں
راکھشس ہماری عبادت میں خلل ڈالتے ہیں۔ تیرے بیٹے ان سے نبیٹں گے۔

راجہ دسرتھ نے جواب دیا کہ میرے بڑے بیٹے کا یہ عالم ہے کہ دنیا سے جی اس کا اٹھ گیا ہے۔
بیراگ اس پر طاری ہے۔ اس سے تم کیا توقع رکھ سکتے ہو۔ اس کے ساتھ ہی رام چندر کو دربار میں طلب کیا۔
رام چندر جی اسی بیراگ کے عالم میں دربار میں حاضر ہوئے اور دنیا کی بے ثباتی اور انسانی زندگی کی بے وقعتی
پر ایک پوری تقریر کر ڈالی۔ کہا کہ "موت ایک بادشاہ قہار ہے۔ جس وقت جی چاہا شہر وجود پر چڑھ دوڑتا ہے۔
دنیا میں خوشی اور آرام کا وجود نظر نہیں آتا۔ زمانہ بزرگ اور دانا اور حسینوں میں سے کسی کے ساتھ مروت
نہیں برتتا۔ جس طرح مور سانپ کو نگل جاتا ہے زمانہ سب کو کھا جاتا ہے۔ کال یعنی کہ زمانہ سب کو فنا کے گھاٹ
اتار دیتا ہے۔"

نوجوان کا یہ حال دیکھ کر وشوامتر نے اپنی طرف سے کچھ اسے سمجھایا۔ پھر بسشٹ رشی سے رجوع
کیا کہ رام چندر ایسے طالب کو جو دنیا و مافیہا سے بے تعلق ہو گیا ہے، اس کو ارشاد اور تربیت کیجیے۔
"بالمیک روایت کرتا ہے کہ بعد ازاں بسشٹ نے رام چندر کی تعلیم اور تلقین اپنے ذمے لی۔
خلاصہ اس کا انتخاب کے طور پر اس کتاب میں لکھا جاتا ہے۔"

اور اس رشی نے تعلیم اور تلقین نے کیا خوب کی کہ رام چندر جی نے جو سوال کیا، اس کے جواب میں
کوئی حکایت سنا دی۔ ہر بات پر ایک کتھا۔ ہر سوال پر ایک کہانی۔

آخر میں کہا، اے رام چند اب تو ہمہ تن خاموش ہو جا۔ کچھ نہ پوچھ اور نہ کچھ کہہ۔ اپنے ظاہر سے گونگا
بہرا اور اندھا ہو کر اپنے باطن کی طرف متوجہ ہو اور عالم کے تفرقہ سے خلاص پا کر عین حق ہو جا۔

رام چندر کامل استاد کی باتیں سن کر حالت عالی کو پہنچا کہ وہ مقام معرفت ہے اور خوشی کے مارے
آنسو اس کے نکلنے لگے اور وہ چپ ہو بیٹھا۔

اس وقت بھردواج نے بالمیک سے پوچھا کہ رام چند بسشٹ کے ارشاد کے بعد اور کمال آزادی
کے حصول اور بے تعلقی کے پیچھے کس طرح اپنے مقام سے اتر کر عالم کے کاروبار میں مشغول ہوا۔

بالمیک نے جواب دیا کہ جب رام چندر کاروبار سے باز رہ کر آسودہ ہوا اور خلائق کی صحبت سے
کنارہ کیا تو بشوامتر نے بسشٹ سے کہا کہ آپ نے اسے تو مقام معرفت پہ پہنچا دیا۔ اب میرے کام کی فکر

کرو۔ میرا یہ مطلب تھا کہ رام چندکو اپنے ساتھ لے جاؤں تا کہ عمدہ کام جو بمقتضائے حکمت الٰہی پردہ غیب سے ظاہر ہونے والے ہیں، اس کے ہاتھ سے ظاہر ہوں۔

بسشٹ یہ بات سن کر رام چند کے پاس گیا۔ دیکھا کہ مراقبہ میں بیٹھا ہے اور بیدار نہیں ہوتا۔ ایک تصرف اس کے باطن میں کرا کے بیدار کیا اور کہا کہ حق تعالیٰ نے معرفت کے مرتبے پر تم کو پہنچایا اور تمہارے دل کو آرام اور اطمینان بخشا۔ اب وقت اس کا آ گیا کہ تم فراغت سے بیٹھو اور اس نعمت الٰہی کے شکرادا کرنے کو اٹھو جو تمہیں نصیب ہوئی ہے اور خلق اللہ کے کام میں مشغول ہو۔

رام چندر نے کہا کہ استاد کا حکم سروچشم پر۔ آپ کے حکم سے چارہ نہیں ہے۔ اس سبب سے خلائق کی کارسازی کو قبول کیا۔

دیوتا لوگ بھی مجلس میں حاضر تھے۔ سب نے مبارک باد دی اور بسشٹ کی تعریف وتحسین کی۔ بعد اس کے رام چند باپ کی اجازت سے بشوامتر کے ساتھ ہوا اور راستہ طے کر کے اس کے عبادت خانے میں جو ملک بہار میں تھا، پہنچا۔"

آگے جو کچھ ہوا، اسے رامائن میں ملاحظہ کیجیے۔

ھ........ ☙........ ☙

بنارس، برہمن اور حسینی برہمن

بنارس کا یہ میرا دوسرا پھیرا ہے۔ پہلے پھیرے کو یاد کرتا ہوں تو نقشہ اس وقت کا کچھ اور نظر آتا ہے۔ اس وقت ہندوستان کے سفر میں عالیہ ساتھ تھیں۔ دلی سے آگے بھی کچھ شہروں کے سفر کی صورت نکل آئی تھی مگر عالیہ نے ابھی دلی میں تھے کہ اور ہی سوال کھڑا کر دیا۔ اتنے دنوں بعد یہاں آنا ہوا ہے۔ بنارس کو دیکھے بغیر کیسے واپس چلی جاؤں۔ میں نے کہا کہ بنارس کس خوشی میں؟ اب وہاں تمہارا کون بیٹھا ہے۔ اے ہے وہاں مغل باجی ہیں۔ الٰہ آباد میں پھوپھی اماں ہیں۔ انہیں سلام کرنے نہ گئی تو وہ کیا کہیں گی۔ میں نے کہا کہ یک نہ شد دو شد۔ خالی بنارس نہیں، ساتھ میں الٰہ آباد بھی۔ ویزا کے سلسلہ میں اس زمانے میں خاصی مشکلات تھیں۔ میں نے نارنگ صاحب سے اپنی مشکل کا ذکر کیا۔ انہوں نے بھاگ دوڑ کر کے دونوں شہروں کے ویزا کا بندوبست تو کر دیا مگر ویزا والوں نے ویزا جاری کرتے کرتے ایک پخ لگا دی۔ الٰہ آباد ایک دن، بنارس دو دن۔ تیسرے دن واپسی۔ یوں ہی سہی۔ بنارس کی ڈیوڑھی کو ہاتھ تو لگا آئیں گے اور اب مجھے اپنے حساب سے بنارس یاد آنے لگا۔ صبح بنارس، مہاتما بدھ، سارناتھ۔

بنارس...... نوابوں والی ڈیوڑھی۔ پھوپھی اماں کی حویلی۔ اب یہاں اکیلی مغل باجی ٹخ ٹخ کرتی ہیں۔ عالیہ کہہ رہی ہیں، ارے یہاں تو باغیچہ تھا، وہ کہاں گیا؟ کٹ گیا۔ وقت نے اسے چاٹ لیا اور عزاخانہ...... مولا کے عزاخانے سے وقت کنی کاٹ کے نکل گیا۔ بقول عالیہ بالکل ویسا کا ویسا ہی ہے۔ مغل باجی نے بھی گویا طے کیا تھا۔ باقی باتیں بعد میں۔ پہلے علموں کی زیارت کرو۔ لیجیے کر لی۔ عالیہ نے کان میں کہا۔ دعا مانگو۔ دعا مانگ لی۔ پھر مغل باجی نے پچھلے محرم کے ذکر اذکار کیے۔ ان موقعوں پر پاکستان جانے والے عزیزوں کو کس کس طرح یاد کیا۔ پھر اداس ہو گئیں۔ کہنے لگیں ''اس برس سواری نہیں آئی۔ استاد بسم اللہ خاں نے عاشور کی ساری رات آنکھوں میں کاٹی۔ جلوس کا وقت آ گیا۔ شہنائی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اب کے ذوالجناح کی سواری شہنائی کے بغیر نکلی۔'' میں نے بہت دھیان سے یہ داستان سنی۔ پتہ چلا کہ برس کے برس شب عاشور استاد بسم اللہ خاں آتے تھے۔ شب یہیں گزارتے تھے اور کسی کو پتہ چلے نہ چلے، انہیں آہٹ ہو جاتی تھی کہ سواری آن پہنچی۔ پھر وہ شہنائی بجاتے۔ اس پر شور گریہ ہوتا۔ اس کے

ساتھ ذوالجناح سج بن کر برآمد ہوتا۔

پھر غل مچا کہ جلدی کرو۔ چھوٹی کربلا چلنا ہے تو چھوٹی کربلا بھی دیکھی۔ عقبی حصہ میں ایک اچھا بھلا قبرستان نظر آ رہا تھا۔ عالیہ کے خاندان کے کتنے عزیز یہاں دفن ہیں۔ ان کی قبروں پر فاتحہ۔ ایک سنگ مرمر کے مزار نے خود بخود مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ کتبہ پڑھا۔ ارے یہ تو شیخ علی حزیں ہیں۔ بنارس میں آ کر ایسے بسے کہ پھر اس نگر کو نہیں چھوڑا ؂

از بنارس نہ روم معبدِ عام است ایں جا
ہر برہمن بچۂ لچھمن و رام است ایں جا

اور یہ اتنی لمبی چوڑی قبر کس کی ہے۔ شیخ کے خادم کی۔ میں حیران کہ شیخ کی قبر اتنی چھوٹی سی اور خادم کی قبر اتنی لمبی چوڑی اور اتنی بلند۔ ایک بزرگ نے بتایا کہ اصل میں شیخ کا خادم ایک جن تھا۔ بے ساختہ منہ سے نکلا۔ وہ پھر زعفر جن کا کوئی پوتا پڑپوتا ہوگا۔ کیا مجھے یہاں وضاحت کرنی چاہیے کہ زعفر جن کون تھا۔ ارے وہی جو بندۂ علی تھا اور اس نے تو کربلا میں اتر کر امام مظلوم کی طرف سے اعدا سے نبٹنے کی اجازت چاہی تھی مگر امام نے جنات کو بیچ میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ خیر اب کے پھیرے میں میں اکیلا آیا ہوں۔ عالیہ دنیا سے سدھار چکی ہیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ چھوٹی کربلا کدھر ہے۔ نوابوں کی ڈیوڑھی کس سمت میں ہے اور وہ حویلی اور وہ عزاخانہ۔ مگر اب وہاں کون ہوگا۔ مغل باجی تو سدھار چکی ہیں۔ میں ادھر بنارس ہندو یونیورسٹی کا مہمان ہوں۔ ان کے گیسٹ ہاؤس میں قیام ہے۔ جگہ خوب اور مرغوب ہے۔ ویسے لازم نہیں کہ یہاں ہر یونیورسٹی کا گیسٹ ہاؤس اس یونیورسٹی کے شایانِ شان ہو۔ میں اس سفر میں کتنی یونیورسٹیوں کے مہمان خانوں میں بسر کر چکا ہوں۔ کوئی خوب و مرغوب، کوئی خراب و خستہ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے چلا تھا۔ شہر شہر سفر کرتا بنارس ہندو یونیورسٹی میں پہنچا ہوں۔ اس یونیورسٹی پر سر سید کا سایہ تھا۔ یہ یونیورسٹی مدن موہن مالویہ کی مالا جپتی ہے۔ جابجا ان کے مجسمے کھڑے نظر آتے ہیں۔ یونیورسٹی کی جس تقریب میں جاؤ وہاں مالویہ جی کی تصویر نظر آئے گی۔ تصویر پر گیندے کا ہار پڑا ہوا۔ اکبرالٰہ آبادی کی حسِ ظرافت نے مدن موہن مالویہ کو مولوی مدن بنا دیا ؂

ہزار شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

کہیں یہ سر سید کی داڑھی کی طرف تو اشارہ نہیں ہے۔

یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو میرا میزبان جانیے۔ ڈاکٹر نسیم احمد اس کے صدر ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالسلیم جو ریڈر ہیں اور ڈاکٹر آفاق احمد آفاقی۔ سب ہی تواضع میں بچھے جا رہے ہیں۔ ارے ہاں یہ اردو کے شعبہ کے پہلو بہ پہلو فارسی اور عربی کے شعبے بھی ہیں۔ خیر یہ تو میزبان ہوئے۔ ویسے یونیورسٹی میں جس نے سب سے بڑھ کر ہماری آؤ بھگت کی وہ مہیلا مہاودیالے تھا۔ موٹے لفظوں میں وہاں کا لڑکیوں کا کالج۔ سب

سے پہلے اچھی سی تقریب اسی کالج کی طرف سے ہوئی۔ صدارت یونیورسٹی کے ریکٹر صاحب نے کی۔ اس کی پرنسپل ڈاکٹر سوشیلا سنگھ انگریزی کی پروفیسر ہیں۔ مہمان نوازی کے نام پچھی جارہی تھیں۔ مسلمان طالبات پیش پیش تھیں۔ طالبات کی طرف سے پھول ایک لڑکی نے پیش کیے۔ پیش کرتے کرتے بولی "میرا نام شبنم ہے۔ جب آپ سفر نامہ لکھیں تو میرا ذکر ضرور کریں۔" اچھا تم شبنم ہو۔ نام ذہن نشین کر لیا۔ ضرور ذکر کروں گا۔ سو دیکھو ذکر کر رہا ہوں، وعدہ پورا کیا۔

رمضان کا موسم تھا۔ مسلمان طالبات روزے سے تھیں۔ دعوت ملی کہ آپ آج ہمارے ساتھ افطار کریں گے۔ ارے واہ کیا خوب افطار پارٹی تھی۔ قسم قسم کے پکوان۔ پرنسپل صاحبہ یہاں بھی موجود تھیں۔ ان کے ساتھ یونیورسٹی کی مختلف لیڈی لیکچرار۔ کوئی مسلمان، کوئی ہندو۔ ہاں مسٹر بنرجی اور مسز بنرجی بطور خاص۔ اے لو، یہاں تو میڈیا والے بھی آن دھمکے۔ تقریب افطاری کیا سے کیا بن گئی۔

ہاں اسی سہ پہر کو ایک تقریب شعبۂ اردو کی طرف سے بھی ہوئی تھی۔ یہ سمجھو کہ یہ آٹوگراف کی تقریب تھی۔ طالبات آٹوگراف کے لیے ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔

یار کہیں گے کہ خیر یہ تو ہوا۔ تم نے وہاں کیا تیس مار خانی کی۔ ارے بھائی ہمیں کیا تیس مار خانی کرنی تھی۔ دو میٹھے بول میزبانوں نے کہے۔ محبت بھرے دو بول جواب میں ہم نے بھی کہہ دیئے۔ کسی کسی کے کلمات میں یہ تجسس دیکھا کہ یہ لکھک پاکستان میں بیٹھ کر بدھ جی کی جاتکوں سے نکال نکال کے کیا کلی پھندنے اپنی کہانیوں میں ٹانکتا رہتا ہے۔ سو میں نے ان جاتکوں کے بارے میں اپنے حساب سے ڈھائی تین باتیں کر دیں۔

اگلے دن کرشنا مورتی فاؤنڈیشن گئے تو وہاں میبلا دیالیہ میں ہمارا سواگت ہوا۔ طالبات قطار اندر قطار۔ یا پھر ان کی استانیاں۔ مرد کی صورت کسی طرف نظر نہ آئی۔ اصل میں یہ پورا ادارہ ہی ایک میبلا کا مرہون منت تھا۔ کرشنا مورتی کو مسز اینی بیسنٹ نے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کرشنا مورتی نے ذرا قد نکالا تو اینی بیسنٹ سے باغی ہو گئے مگر اس میبلا کی جائیداد کا جتنا حصہ کرشنا مورتی کے نام لکھا گیا تھا، وہ انہیں ملا۔ اسی کا ظہور ہوا تھا کہ یہ فاؤنڈیشن قائم ہوئی اور اس کے سائے میں لڑکیوں کا یہ کالج کھلا۔

وہاں سے نکلے تو میزبانوں نے ایک اور میبلا سے ملاقات کرائی جو بنارس یونیورسٹی میں تاریخ اور آثار قدیمہ کی پروفیسر ہیں۔ وہ سارناتھ میں میری رہنما بنیں۔ پہلے عجائب گھر میں جا کر وہاں بجی مورتیوں سے مجھے روشناس کرایا، ان کے اندر چھپے معنی کو اجاگر کیا۔ پھر سارناتھ میں لے جا کر ایک بڑے سے چبوترے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ بتایا کہ یہ وہ استھان ہے جہاں بدھ جی مہاراج نے گیان کی روشنی پانے کے بعد اپنا پہلا اپدیش دیا تھا۔ وہ استھان دیکھا، گھوم پھر کر اس جگہ کو دیکھا۔ اس سے تو یہاں ہرن بن تھا مگر اب وہاں نہ ہرن ہیں، نہ ہرن بن ہے، نہ وہ جوگی ہیں جنہیں بدھ جی نے اپنے گیان بھرے اپدیش سے رام کیا تھا۔

تو لیجیے ورناسی یاترا اتمام ہوئی۔ ورناسی کو اگر میں بنارس کہے چلے جارہا ہوں تو کوئی ایسی غلط بات نہیں کر رہا۔ یہ نگر اب بس سرکاری طور پر ورناسی ہے۔ باقی بنارس والوں کے لیے اب بھی وہ بنارس ہی ہے۔ بنارسی ساڑھی اب بھی اسی رنگ سے بنارسی ساڑھی ہے اور بنارس ہندو یونیورسٹی بھی بنارس ہندو یونیورسٹی ہی ہے۔ یونیورسٹی نے شہر کے نئے نام کو قبول نہیں کیا۔

تو بنارس یاترا اتمام ہوئی۔ بنارس کو رام رام۔ گھوم پھر کر پھر دلی میں۔ اگلے دن جامعہ ملیہ سے عبید صدیقی نے پیغام بھیجا کہ ہماری محنت مکمل ہوئی۔ آپ پر جو دستاویزی فلم بنا رہے تھے، وہ مکمل ہو گئی۔ آج دوستوں کے لیے اس کا شو رکھا ہے۔ آئیے اور دیکھیے۔ گیا اور وہ فلم دیکھی۔ اس کا عنوان لکھا ہے" سفرِ شوق" کیونکہ فلم میں ڈبائی ہی ڈبائی ہے۔ ڈبائی کی کربلا سے فلم شروع ہوتی ہے۔ ختم بھی اسی پر ہوتی ہے۔ کربلا سے کربلا تک۔

سریش شرما نے رات کو کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ آئی آئی سی کے ڈنر ہال میں۔ سریش، ان کی بیگم۔ اور ہاں گیتانجلی، سدھیر، میں۔ باتیں کرتے کرتے اچانک مجھے خیال آیا" ارے وہ حسینی برہمن زادی کہاں ہے۔ اس سے تو مجھے ملنا ہے۔"

"آپ نونیکا کی بات کر رہے ہیں؟"

"ہاں ہاں وہی۔ اس سے کیسے ملاقات ہو؟"

"شاید یہیں لائبریری میں ہو۔" یہ کہتے کہتے گیتانجلی نے موبائل پہ نمبر ملایا۔" نونیکا تم اس وقت کہاں ہو۔ اچھا یہیں ہو۔ ارے یہ انتظار جی تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ کھانے پر Join کر سکتی ہو۔ ہم یہاں ڈائننگ ہال میں بیٹھے ہیں۔"

لو پلک جھپکتے آن پہنچی اور آتے ہی رواں ہو گئی۔" میں نے جب ماں جی کو انتظار جی کے لیکچر کی بات بتائی اور بتایا کہ میں نے کیا کہا تو بولیں کہ ہم عام ہندوؤں سے الگ ہیں۔ ہم مندر میں بھی نہیں جاتے۔ تم نے انہیں بتایا۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ بولیں کیوں نہیں بتایا۔" پھر کہنے لگی" پتہ ہے حسینی برہمن کی کیا نشانی ہے؟"

"اچھا وہ کیا نشانی ہے؟"

بولی" حسینی برہمن کے گلے پر ایک نشان پڑا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بڑوں نے کربلا میں امام حسین کے نام پہ گلا کٹایا تھا۔"

جب ہم اٹھنے لگے تو میں نے کہا کہ" میری ابھی تشفی نہیں ہوئی۔ تم سے الگ کوئی ملاقات ہونی چاہیے۔"

"بس میں آپ کو فون کروں گی اور آ جاؤں گی۔ اپنے کمرے کا نمبر بتا دیجیے۔"

کمرے کا نمبر تو میں نے نوٹ کرا دیا تھا مگر اس کا کوئی فون نہیں آیا۔ میں نے سوچا یہ تو پھر بات اگلے پھیرے پہ گئی کیونکہ کل تو میں چلا ہی جاؤں گا۔ تو اگلی صبح سب کچھ بھول کر میں نے اپنا سامان باندھنا

شروع کر دیا۔ روانگی کا کوئی بھی وقت ہو، مجھ پر سفر صبح ہی سے سوار ہو جاتا ہے۔ تو میں سامان باندھ رہا تھا کہ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔ ادھر سے آواز آئی "میں نونیکا بول رہی ہوں۔"

"نونیکا۔" میں نے جواب دیا۔ "تم اب مجھے فون کر رہی ہو۔ میں تو آج جا رہا ہوں۔ آج ملاقات کیسے ہو سکتی ہے۔"

"دیکھیے، میں لاؤنج سے بول رہی ہوں۔ میں تھوڑی دیر کے لیے آجاؤں نا۔"

"پھر جلدی آؤ۔"

وہ آئی تو میں نے معذرت کی کہ دیکھیں، میں تو سامان باندھ کے تیار بیٹھا ہوں۔ ساہتیہ اکیڈمی کے میرے دوست آئیں گے اور میں اٹھ کھڑا ہوں گا مگر مجھے اگلے مہینے پھر آنا ہے۔ اس پھیرے میں ہماری تمہاری مفصل ملاقات ہونی چاہیے۔

بولی "آپ اگلے مہینے جب آئیں گے تو میں جرمنی میں ہوں گی۔ مجھے اگلے چار مہینے ہمبولٹ یونیورسٹی میں گزارنے ہیں۔"

اصل میں نونیکا دلی یونیورسٹی میں تاریخ پڑھاتی ہے۔ انہیں دنوں ہمبولٹ یونیورسٹی سے اسے کوئی فیلوشپ مل گئی تو وہ تو اب پا برکاب تھی۔ میں نے کہا "اچھا جتنا ہمارے پاس وقت ہے، اسے ضائع کیوں کریں۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارا پریوار کیا ہے۔ تم کس حساب سے اپنے آپ کو حسینی برہمن کہتی ہو۔"

نونیکا کتابوں سے لدی پھندی آئی تھی۔ دو موٹی موٹی کتابیں بغل میں تھیں۔ انگریزی کی مگر تھیں بہت پرانی۔ ورق پیلے پڑ گئے تھے۔ کہنے لگی "ان کتابوں میں ہماری ساری تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ میں کچھ زبانی بتاؤں گی، کچھ پڑھ کر سناؤں گی۔ میرے پتا ہیں پروفیسر وی این دت۔"

اور مجھے یاد آیا' گیتانجلی کہتی تھی کہ نونیکا کے پتا سدھیر کے استاد رہ چکے ہیں۔ ہم انہیں گھر پہ بلائیں گے اور آپ سے ملوائیں گے۔

آگے نونیکا نے یوں بیان کیا "وہ دس برہمن تھے جو کربلا میں امام حسین کے لشکر میں شامل تھے۔ ان میں ایک کا نام تھا راہب دت۔ وہ اور اس کے سات بیٹے بہت بہادری سے لڑے۔ ساتوں بیٹے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ وہ بچ گیا۔ کربلا سے کوفہ کی طرف نکل گیا۔ وہاں سے افغانستان آیا۔ افغانستان سے ہوتا ہوا وہ ہندوستان آیا۔ یہاں پہلے وہ ننکانہ میں آ کر ٹھہرا۔ کربلا سے نکل کر وہ امام حسین کے خاندان کے لوگوں سے بھی ملا تھا۔ انہیں بتایا کہ میں اصل میں برہمن ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تم اب حسینی برہمن ہو اور ہم تمہیں یاد رکھیں گے۔"

نونیکا نے کتاب کھول رکھی تھی۔ اسے الٹ پلٹ کر کے خاص خاص واقعات مجھے سنا رہی تھی۔ اس نے سنایا کہ ننکانہ میں ایک پیر سے راہب دت کی بحث چل پڑی۔ پیر نے شطرنج کی بساط پر مقابلہ کا چیلنج دیا۔

راہب نے چیلنج قبول کرلیا۔ مقابلہ میں پیر ہار گیا۔ راہب نے شرط کے مطابق اس سے تین سر مانگے مگر پھر معاف کردیا۔ اس پر اس کی بہت واہ واہ ہوئی۔ کسی نے کہا کہ واہ ہندو کا دھرم، مسلمان کا ایمان، دوسروں نے کہا کہ دس سلطان، نہ ہندو نہ مسلمان۔''

نونیکا نے پھر بتایا کہ سیالکوٹ ضلع میں ایک بستی ہے۔ ویرن وتن۔ یہ ہماری جدی بستی ہے۔ ہم راہب دت کے خاندان سے ہیں۔ راہب اپنے ساتھ امام حسین کا ایک بال لے کر آیا تھا جو کشمیر میں حضرت بل کی عبادت گاہ میں محفوظ ہے۔ ہمارے خاندان میں یہ ریت چلی آتی تھی کہ بچے کا مونڈن امام حسین کا نام لے کر کیا جاتا تھا۔''

پھر اس نے کتاب سے پڑھ کر کچھ شعر سنائے جو اس کے گھرانے والوں کی زبان پر تھے ۔

بجے بھیر کو چوٹ، فتح میدان جو پائی
بدلہ لیا حسین دھن دھن کرے لکائی
راہب کی جو جد نسل حسین جوائی
دیئے سات فرزند بھئی کبول کمائی
سب کائر گئے بھاگ، جاندے نظر نہ آوے
مدد دی حسین، کدم پیچھے نہ پاوے

ان شعروں میں کبول کو قبول اور کدم کو قدم پڑھیے۔ بھیر یعنی نقارہ۔

پھر نونیکا بتانے لگی کہ ''ہم لوگ ہندوؤں سے الگ ہیں۔ برہمنوں والے رسم و رواج بھی ہمارے یہاں نہیں ہیں۔ ہم لوگ مندر بھی نہیں جاتے۔''

''تو پھر کیا تم لوگ مسلمان ہو؟''

بولی ''نہیں، ہم مسلمان نہیں ہیں۔''

''تو پھر کیا ہو۔'' میں نے پوچھا۔

بولی ''ہم حسینی برہمن ہیں۔''

پھر مجھے دوسرے حسینی برہمنوں کے نام اس نے بتائے۔ کہنے لگی کہ ''سنیل دت بھی حسینی برہمن تھے اور نرگس کے جو پتا تھے، وہ بھی حسینی برہمن تھے۔''

یہ کہتے کہتے وہ اٹھی ''اچھا تو میں اب چل رہی ہوں۔ آپ اپنے سفر کی تیاری کریں۔''

ٹھیک ہے۔ ادھر میں بھی تو عجلت میں تھا۔ اکیڈمی کی طرف سے مشتاق صدف آن پہنچے تھے۔ مگر چلتے چلتے مجھے ایک خیال آیا کہ ارے کہیں روپ کنوار کماری بھی تو حسینی برہمن نہیں تھی۔ خاندان تو اس کا بھی کشمیری پنڈتوں والا تھا۔ اگرچہ پلی بڑھی تھی وہ آگرہ میں اور مجھے اس کے مرثیے کیوں بھائے۔ ویسے تو

کتنے ہندو مرثیہ گو گزرے ہیں، لکھنؤ میں بھی اور لکھنؤ سے باہر بھی۔ مگر وہ بالعموم اپنی مذہبی روایت کو الگ رکھ کر مرثیے کی اقلیم میں قدم رکھتے ہیں۔ روپ کماری کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی مذہبی روایت کو ساتھ لے کر مرثیے کی دنیا میں داخل ہوئی ہے۔ سو حضرت علی اس کے لیے کبھی رشی بن جاتے ہیں، کبھی وہ انہیں اوتار مانتی ہے۔ کبھی دیوتا کہتی ہے۔

میں ہندو مرثیہ گویوں کی مذمت نہیں کر رہا۔ اپنی جگہ وہ سچے ہیں۔ آپ جس شعری یا ادبی صنف میں قدم رکھتے ہیں، اس کے جو تہذیبی ادب آداب ہیں، انہیں دل سے اپنا لیجیے۔ پھر آپ اس صنف میں کچھ کر پائیں گے۔ ہمارے دوست مظفر علی سید نے ایک وقت میں کچھ بھجن لکھے تھے۔ ان میں سے چند ایک ہمارے رسالہ ''خیال'' میں چھپے بھی تھے۔ انہیں پڑھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ لکھنے والا بھجن کی مذہبی روایت سے تعلق نہیں رکھتا۔ اصل میں تو بھجن کا جادو اسے لے اڑا تھا۔ تو ہندو مرثیہ نگار اپنے موقف میں سچے ہیں۔ مرثیے کی جو اپنی تہذیبی روایت ہے جس میں مذہب کا بہت دخل ہے، اسے اپنائیں گے تب مرثیہ کہیں گے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ مجھے روپ کماری کی اس روش سے بغاوت بھی اچھی لگتی ہے۔ وہ اپنی مذہبی روایت میں اتنی رچی بسی ہے کہ اسی کی اصطلاحوں میں حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کو سمجھ سکتی ہے۔ سو اس سے اس کے مرثیے میں ایک الگ ذائقہ پیدا ہو گیا ہے۔ گنگا جمنی ذائقہ۔ یعنی روپ کماری نے جو مرثیہ لکھا ہے، اسے ہم گنگا جمنی مرثیہ کہیں تو بجا ہے۔

خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ میرے سر پہ سفر سوار ہے۔ باہر ہوائی اڈے کے لیے سواری تیار کھڑی ہے۔ بنارس سے واپسی کے بعد دلی میں یہ تین دن کیسے گزر گئے۔ بس آئے اور گئے۔ بھاگم بھاگ دوستوں سے ملا۔ لنچ کہیں، ڈنر کہیں۔ پتہ چلا کہ شمس الرحمٰن فاروقی آئے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم یعنی ہماری بھابھی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ شمیم حنفی کو ساتھ لے کر ان کی طرف گیا۔ عیادت کی۔ تھوڑی دیر بیٹھا۔ باتیں کیں۔ واپس اپنے ٹھکانے پر۔ رات ساڑھے گیارہ بجے سویا تھا۔ ڈھائی بجے آنکھ کھل گئی۔ پھر نیند نہیں آئی۔ صبح منہ اندھیرے اٹھا اور لودی گارڈنز کی طرف ہو لیا۔ ایک چڑیا کو میں علی گڑھ سے دیکھتا آ رہا ہوں۔ وہ یہاں لودی گارڈنز میں بھی پھدکتی پھر رہی ہے۔ یہ چڑیا ڈبائی میں ہوا کرتی تھی۔ ہم اسے ڈومنی کہتے تھے مگر وہاں تو ڈومنیاں مل جل کر بہت شور کرتی تھیں۔ علی گڑھ میں میں نے اسے خاموش دیکھا۔ یہاں بھی وہ خاموش نظر آ رہی ہے اور اکیلی ہے۔ اس بورڈ پر جہاں اس سبزہ زار میں چہکنے والے پرندوں کے نام لکھے ہیں، اس چڑیا کا نام تلاش کیا۔ یہاں اس کا نام ست بھئی یا ست بھائی لکھا ہوا ہے۔ تو دن نکلنے کے ساتھ پہلے ست بھئی سے ملا۔ پھر نو نیکا دت سے ملا۔ اب میں بھی اڑتا ہوں۔

☙........❧........❧

دِلّی میں اور دِلّی سے آگے

لاہور کو چھوکر پھر دلی آ گیا ہوں۔ ارے چھوکر کہاں۔ لاہور کی زمین نے کہا کہ اب آ گئے ہو تو ایسے تو نہیں جا سکتے۔ ڈینگو مچھر کو پیچھے لگا دیا۔ گرچہ چھوٹی ہے ذات مچھر کی مگر جسے اس نے کاٹ لیا، پھر اس کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ خیر بلا آئی تھی مگر بخیر گزشت۔ بس اتنا ہوا کہ ماندگی کا وقفہ لمبا ہو گیا۔ میں ماندا پڑ گیا۔ ماندگی کا وقفہ ایک مہینے سے تجاوز کر کے دو مہینے میں پھیل گیا۔ اس سے ایسا فرق تو نہیں پڑنا چاہیے تھا مگر فرق پڑا اور اچھا خاصا پڑا۔ مہینے بھر کے سیر و سفر کا جو پروگرام طے ہوا تھا اور قریب و دور کے شہروں میں خبر بھجوادی گئی کہ فلاں فلاں تاریخوں میں فلاں فلاں نگر میں پہنچنا ہے۔ ہر قیام کی تفصیلات بھی طے ہو گئی تھیں۔ اس سارے پروگرام پر پانی پھر گیا۔ نئے سرے سے پروگرام طے ہوا۔

مگر میرے حساب سے تو دلی میں قدم رکھتے ہی فرق پڑ گیا۔ ہوائی اڈے پر بخیریت اترا اور بخیریت صدف کی معیت میں اپنے ٹھکانے کی طرف چلا۔ گاڑی ایک بڑے سے ہوٹل میں داخل ہوتی نظر آئی تو میں چونکا ''ارے یہ ہم کہاں آ گئے ہیں۔''

''انتظار صاحب، یہ اشوک ہوٹل ہے۔ آپ کا قیام یہاں رہے گا۔''

''مگر طے تو یہ ہوا تھا کہ میں آئی آئی سی میں ٹھہروں گا۔''

''آپ کی آمد میں تاخیر ہوئی تو وہاں کی بکنگ منسوخ ہو گئی۔ فی الحال وہاں کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ پھر اکیڈمی نے اشوک ہوٹل میں بکنگ کرائی۔ کوئی بات نہیں۔ آپ آرام سے رہیں گے۔ یہ فائیو سٹار ہوٹل ہے۔''

فائیو سٹار ہوٹل۔ اس کی آب و تاب ہی تو مجھ پر بھاری پڑتی ہے۔ بس ایک قیام آسان اور خوشگوار گزرا تھا۔ میکس ملر سنٹر کی طرف سے حیدرآباد میں ایک سیمینار کا اہتمام تھا۔ انہوں نے اپنے مندوبین کو ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہرایا تھا۔ ساتھ اس کارواں کے ہم بھی تھے یعنی پاکستان سے میں اور آصف فرخی۔ ایک سہانی صبح ہم دونوں اپنے کمروں سے نکل لفٹ کی طرف چلے۔ لفٹ خالی رکی کھڑی تھی۔ میں اور آصف دونوں اطمینان سے جا داخل ہوئے۔ دوسرے ہی لمحے کیا دیکھتے ہیں کہ بس جیسے بجلی کا ایک ٹکڑا لپکتا ہوا آیا اور

لفٹ میں کوند کر ہمارے بیچ ساکت ہو گیا مگر ساکت وہ کب تھا۔ سارے بدن میں جیسے پارہ بھرا ہوا اور بوٹی بوٹی میں لہریں لے رہا ہو۔ لفٹ چلی اور مختلف فلور سے گزرتی ہوئی۔ گراؤنڈ فلور پر آ کر تھمی۔ در کے کھلتے ہی وہ جس تیزی سے لفٹ میں داخل ہوئی تھی۔ اسی تیزی سے نکلی اور گیٹ کی طرف لپک کر چلی۔

ہم کاؤنٹر پر پہنچے تو ریسپشنسٹ مسکرایا اور بولا کہ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ نے یہ چھوٹا سا سفر مادھوری ڈکشت کی ہمراہی میں کیا ہے۔ ہم دونوں ایک دم سے چونکے۔ ارے یہ مادھوری ڈکشت تھی۔ ہماری نظروں نے تیزی سے اس کا تعاقب کیا مگر وہ سیڑھیوں سے اتر دم کے دم میں کار میں بیٹھی اور کار یہ جا وہ جا اور معاً مجھے غالب کا ایک شعر یاد آیا ؎

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

اشوک ہوٹل میں خالی بجلی کی روشنی تھی اور وہ بہت تھی۔ اس میں کچھ اپنی کوتاہی بھی ہو گی۔ اصل میں پچھلے تھوڑے دنوں میں آئی آئی سی میں بار بار بسیرا کرنا پڑا کہ وہاں کی گہما گہمی اس طرح نظروں میں سما گئی کہ اب دلی شہر میں بسیرے کے لیے اور کوئی گوشہ نظروں میں سماتا ہی نہیں۔ آئی آئی سی کیا خوب جگہ ہے۔ یہاں نیا ہندوستان سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔ ذرا قدم نکالو اور متصل والی سیرگاہ میں قدم رکھو تو بلند و بالا مقبرے، بلند و بالا درخت جن کے بیچ ہندوستان کی پرانی صدیوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔

خیر مجھے اشوک ہوٹل میں کونسے ایسے زیادہ دن گزارنے ہیں۔ یہی کوئی ڈھائی تین دن۔ آگے لمبا سفر ہے۔ دوسرے دن صبح کو اٹھا تو سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ وہ جو صبح کی سیر کا لپکا ہے اس کی اشوک ہوٹل میں گنجائش نظر نہیں آ رہی۔ مگر یہ صبح ہی صبح کس نے مجھے پکارا۔ ارے یہ تو گیتا نجلی کی آواز ہے۔ کیا اچھی خبر سنائی کہ الوک بھلہ دلی آئے ہوئے ہیں۔ بہن کے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں یعنی سریش جی کے یہاں۔ ان کی بیگم دیپا الوک بھلہ کی بہن ہیں۔ تو جلدی ہی رابطہ ہو گیا اور ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد وہ آن موجود ہوئے۔ ''انتظار صاحب دس سال بعد یہ ملاقات ہو رہی ہے۔ دس سال پہلے برلن میں ملے تھے۔''

اچھا یاد دلایا۔ وہ برلن کا میرا دوسرا پھیرا تھا۔ برلن میں ایک ادارہ ہے، ہاؤس آف ورلڈ کلچرز۔ عالمی تہذیبوں کا ایوان۔ 91ء میں اس ادارے نے جشنِ اردو منایا تھا۔ اس جشن میں ہندوستان سے قرۃ العین حیدر، سریندر پرکاش اور بلراج کومل آئے ہوئے تھے۔ پاکستان سے جمیل الدین عالی، افتخار عارف اور میں۔ ہماری منتخب تحریریں جرمن زبان میں ترجمہ کر کے سنائی گئیں۔ یوں ہم اہل المانیہ سے متعارف ہوئے۔ اس کے بعد 97ء میں اسی ادارے نے برصغیر پاک و ہند کی گولڈن جوبلی کی تقریب سے ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ پاکستان سے احمد فراز، خالدہ حسین، فہمیدہ ریاض، آصف فرخی، عطیہ داؤد اور میں۔ ہندوستان سے آنے والے دوسری زبانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں اب کے کوئی اردو والا نہیں تھا۔ ان میں سے صرف پروفیسر

اہت موروتی ایسے تھے جن سے میں پہلے سے متعارف تھا۔ پتہ چلا کہ کسی پروگرام کے سلسلہ میں الوک بھلہ بھی یہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ ان سے ملاقات کی صورت نکل آئی۔ اس ملاقات سے ایک انٹرویو یادگار ہے وہ ان افسانوں کے ساتھ شائع ہوا ہے جو انہوں نے انگریزی میں ترجمہ کیے تھے اور جو "Chronicals of Peacacks" کے عنوان سے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس (دلی) سے شائع ہوئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ "فی الحال میں نے ترجمے کے کام سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"میں فی الحال شاعری کر رہا ہوں مگر میرے دوست میری شاعری کو خاطر ہی میں نہیں لا رہے۔"

میں ان کی اس شکایت پر محظوظ ہوا۔ کہا کہ "بھلہ صاحب، یہ سلوک کچھ آپ ہی سے نہیں ہو رہا۔ آپ سے پہلے ان محققوں، مترجموں، نقادوں سے ہوتا چلا آیا ہے جو اپنے میدانوں میں نامور ہونے کے بعد شاعری اور افسانہ نگاری سے شوق فرماتے ہیں۔"

ہوتا یہی رہا ہے کہ تنقید، تحقیق، ترجمہ کے شعبوں میں اپنا ہنر دکھانے کے بعد ان کے یہاں یہ بابلہ اٹھتا ہے کہ دوسروں کے شعر و افسانے کو بہت جانچ پرکھ لیا۔ کیسے کیسے معنی ان کی تہہ سے برآمد کیے۔ اب ذرا خود بھی تو لکھ کر بتائیں کہ شاعری ایسے ہوتی ہے۔ افسانہ ایسے لکھا جاتا ہے مگر ان کے مداح اور قدردان ان کے اس نئے شوق کو در خور اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔

اصل میں پتھر اپنی جگہ بھاری ہوتا ہے۔ علما، فضلا، نقاد، محققین، مترجمین اپنی ٹھیک پر بیٹھے کتنے بھاری بھرکم نظر آتے ہیں مگر جب اپنی ٹھیک چھوڑ کر شعر و افسانے کی اقلیم میں قدم رکھتے ہیں تو اچانک ان کا پلہ سبک ہوتا نظر آتا ہے ؎

جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

عزت اسی میں ہے کہ جس چراگاہ کے جانور ہو، وہیں جتنا چر چگ سکتے ہو، چر چگ لو۔ جو چراگاہ تمہاری نہیں ہے اسے ندیدی نظروں سے مت دیکھو۔ شاعروں کی اپنی ٹنک ہے۔ افسانہ نگاروں کے اپنے پھسن ہیں۔ نقادوں محققوں کا اپنا رعب داب ہے۔ کر خنداری لہجہ میں یوں سمجھیے کہ اپنا رعاب شعاب ہے مگر یہ سب ٹھاٹ اپنے کھونٹے تک ہیں۔ اپنا کھونٹا چھوڑو گے تو جانے کیا کیا چھوڑنا پڑ جائے۔

لو میں کدھر نکل گیا۔ الوک بھلہ سے برسوں بعد ملاقات ہوئی تھی اور میں اتنا ممنون ہوں کہ میرے افسانوں کو انہوں نے کتنا دل لگا کر انگریزی میں ترجمہ کیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس (دلی) سے اسے شائع کرایا اور داد کمائی۔ ادھر میں کتاب دیکھ کر خوش ہو، مگر یہ نہ ہوا کہ دو حرف شکریے کے لکھ بھیجتا۔ ادھر بھلہ صاحب بھی ان رسمیات سے بے نیاز ہیں ورنہ ایسے بھی تو ہوتے ہیں جو ایسی باتوں کو گرہ میں باندھ لیتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی اپنے کسی مہربان نقاد کا شکریہ ادا کیا ہو مگر کسی نے اس کا برا بھی نہیں مانا۔ بھئی ہم

کیوں شکریہ ادا کریں اور وہ کیوں برا مانیں۔ میں نے افسانے لکھے۔ ناشر نے مجموعہ چھاپا اور معزز نقاد کو بھجوایا۔ نقاد سے میرا کوئی ذاتی تعلق ہوا تو میں نے اسے خود اسے نذر کیا۔ اب نقاد جانے اور افسانے جانیں۔ نقاد نے افسانوں کو سراہا ہے تو اسے ان میں کوئی خوبی نظر آئی ہوگی۔ اس صورت میں اسے افسانہ نگار پر احسان جتانا زیب نہیں دیتا۔ عیب جوئی کی ہے تو افسانہ نگار کی طرف سے برہمی کا اظہار ناواجب ہوگا۔

مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب میرا پہلا مجموعہ شائع ہوا تو میں نے بڑے شوق سے عسکری صاحب کو پیش کیا۔ انہوں نے خاموشی سے کتاب لی اور رکھ لی۔ کئی مہینے تک کروٹ ہی نہیں لی۔ میں نے بھی انہیں ٹوہنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک شام ٹہلتے ٹہلتے اپنی ''جھلکیاں'' کا کسی تقریب سے ذکر کرتے کرتے سرسری انداز میں کہا۔ اس دفعہ میں نے ''گلی کوچے'' پر لکھ دیا ہے۔

''اچھا۔'' میں نے کسی قدر خوشی کے لہجہ میں کہا۔

اس پر انہوں نے فوراً ہی ٹکڑا لگایا ''ویسے میں نے خلاف ہی لکھا ہے۔'' پھر کوئی اور ذکر شروع کر دیا۔

ہاں خلاف ہی لکھا تھا بلکہ بہت خلاف مگر میرے لیے وہ تبصرہ آج بھی بہت قیمت رکھتا ہے۔ انہوں نے کوئی بات چھپا کر ہی نہیں رکھی تھی۔ جو عیب نظر آئے سب بکھان ڈالے۔ اگر لکھنے والے کو نقاد کی نظر پر اعتبار ہے تو وہ خلاف یا حق میں جو کہہ رہا ہے، اسے دھیان سے سنے۔ اگر اس کی نظر پر اعتبار نہیں ہے پھر بے شک ایک کان سنو، دوسرے کان اڑا دو۔ برہمی کا پھر بھی کوئی جواز نہیں ہے۔

اچھا خیر۔ ذکر تو الوک بھلہ کا تھا۔ زمانے بعد ملے تھے۔ دو گھنٹے تک اچھی بری باتیں ہوئیں، کوئی ایران کی کوئی توران کی۔ بہت دیر ہوگئی۔ وہ بھی عجلت میں تھے۔ مجھے بھی ساہتیہ اکیڈمی جا کر نارنگ صاحب سے ملنا تھا۔ ساہتیہ اکیڈمی میں ان کا دور اب پورا ہو چلا تھا۔ بتاتے تھے کہ دوسری باری کے لیے الیکشن لڑنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ 2 فروری کو چارج آنے والے کو دے کر سبکدوش ہو جاؤں گا۔ ان کے دور میں اکیڈمی کچھ زیادہ ہی متحرک نظر آئی۔ اردو بھی جو اکیڈمی کی سکھوائی ہوئی زبانوں میں کہیں کسی پچھلی صف میں منہ چھپائے بیٹھی تھی، تیزی سے سرک کر آگے آ گئی۔ سو اردو کو بھی یہ دور بہت راس آیا۔

اے لو نارنگ صاحب کی رخصتی کا دن قریب آ گیا ہے۔ مجھے بھی چاہیے کہ اپنی ہند یاترا کی منزلیں جلدی جلدی طے کروں۔ آخر یہ میری پریم یاترا ابے انت تو نہیں ہے۔ تو لیجیے میں چل کھڑا ہوا۔ پہلے اورنگ آباد یعنی شمال سے جنوب کی طرف لمبی زقند۔ مگر ہوائی جہاز نے تو شمال جنوب کی طنابوں کو اس طرح کھینچا ہے کہ لمبے فاصلے اب لمبے فاصلے نہیں رہے مگر شرط یہ ہے کہ فلائٹ میں تاخیر نہ ہو۔ جہاز اپنے وقت پہ اڑے۔ مگر ایسے نصیبوں والی فلائٹ تو اس سفر میں مجھے کم کم ہی ملی۔ کس تیزی سے میں ایئرپورٹ پہنچا۔ سیکورٹی کے مرحلہ کو عبور کر کے اندر پہنچا تو پتہ چلا کہ فلائٹ تاخیر کی زد میں آ گئی اور تاخیر بھی ڈھائی گھنٹے کی۔ گویا اڑنے سے پہلے ہی ہمارے منہ پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ عین اسی گھڑی مضطرب مجمع کے بیچ ایک آشنا چہرہ نظر آیا، خضر کی

صورت۔ ارے یہ تو اصغر علی انجینئر ہیں۔ ارے کیسے مشکل وقت میں وہ پردۂ غیب سے نمودار ہوئے ہیں۔ انہوں نے بشرے سے بھانپا کہ فلائٹ میں لمبی تاخیر کی خبر سے میں پریشان ہوں۔ فوراً ہی مجھے دلاسہ دیا کہ "میری فلائٹ بھی تاخیر کا شکار ہے۔ آؤ چلیں۔ پہلے کھانے کی فکر کریں۔" فوراً متعلقہ کاؤنٹر سے اپنے نام کی اور میرے نام کی پرچیاں لیں۔

"پرچیاں برحق۔" میں نے حیران ہو کر کہا "مگر کھانا کہاں ہے۔"

"وہ تو بالائی فلور پہ ملے گا۔" یہ کہتے کہتے میرا ہاتھ تھاما اور بالائی فلور پہ لے جا کر کھانے سے آراستہ میز کے سامنے لے جا کر کھڑا دیا۔

انجینئر صاحب کی اسی ادا نے تو مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ سفر حضر میں وہ ساتھ ہوں تو اپنے آپ کو ان کی سپردگی میں دے دو اور بے فکر ہو جاؤ۔ اب سے پہلے میں کھٹمنڈو کے ایک سیمینار کی تقریب سے ان کے ساتھ تھوڑا وقت گزار چکا ہوں۔ ویسے تو ہندوستانی، بنگلہ دیشی اور سری لنکن مندوبین کی اس بھیڑ میں کچھ اور بھی بہت اچھے دوست میسر آ گئے تھے۔ گیتا نگلی، سدھیر، بڑودے کے آئے ہوئے مصور غلام شیخ مگر انجینئر صاحب کی رفاقت کی شان ہی اور تھی۔ انہوں نے اس خلوص سے میری دیکھ بھال کی کہ میں سچ مچ انہیں اپنا بزرگ سمجھنے لگا اور ہم دم دیرینہ کہ اس سے ملاقات بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے۔ سو یہاں جب ان سے ملاقات ہو گئی تو میں اس سے بے پرواہ ہو گیا کہ فلائٹ کب تک ملتوی ہوتی رہے گی اور کب جائے گی۔ پریشانی اس وقت لاحق ہوئی جب ان کے جہاز کی روانگی کا اعلان ہو گیا مگر خیر ان کی ڈیڑھ دو گھنٹے کی رفاقت نے مجھ میں اس لمبی تاخیر کو سہارنے کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ سو چپ لیا اور صبر کر کے بیٹھ گئے کہ زود یا بدیر جہاز کو بہر حال اڑنا ہے اور کتنی ہی دیر سے سہی مجھے اورنگ آباد پہنچنا ہے۔

ಣ .... ଔ .... ଔ

صنم کدے یا حیرت کدے

اب میں اورنگ آباد میں ہوں اور اجنتا کی طرف دوڑا چلا جا رہا ہوں۔ میری میزبانی تین دوست کر رہے ہیں۔ اول پروفیسر حمید۔ ان کے ساتھ ان کے دو سنگھی ساتھی اختر خاں اور بیگ اختر مرزا۔ تو اس وقت اختر خاں ہیں اور میں ہوں۔ اختر خاں کی موٹر فراٹے بھرتی چلی جا رہی ہے اور رفیع کے گانوں کا تار بندھا ہوا ہے۔ ایک ختم ہوتا ہے تو دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ جب یہ سلسلہ بہت لمبا کھنچ گیا تو میں پھوٹ پڑا ''اختر صاحب، رفیع کتنا خوش نصیب ہے کہ اسے آپ جیسا مداح میسر آیا ہے۔''

اختر خاں نے خوب بھانپا کہ شاید مہمان کا جی رفیع کے گانوں سے بھر گیا ہے۔ انہوں نے فوراً رفیع کو موقوف کیا اور لتا کے گانوں کی بوچھار کر دی۔ پھر باقی سفر میں یہی بوچھار ہوتی رہی۔ راہ میں جو ایک دو بستیاں آئی تھیں، ان سے ہم بہت آگے نکل آئے تھے۔ اب ہم جلی چٹکی پہاڑیوں کے بیچ دوڑ رہے تھے۔ عجب پہاڑیاں ہیں۔ لگتا ہے کہ کبھی صدیوں پہلے یہاں کوئی بڑی آگ بھڑکی تھی۔ اس آگ میں یہ پہاڑیاں جل کر کوئلہ ہو گئیں۔ آگ بجھی تو دھوپ، ہوا اور بارش نے عمل شروع کیا۔ اس عمل میں کوئلے پتھر بن گئے مگر کوئلوں والی سیاہی نہ گئی۔ یہ جلی چٹکی کالی کوئلہ پہاڑیاں بل کھاتی دور تک پھیلی نظر آ رہی تھیں۔ ان کے بیچ ہماری موٹر لتا کے آواز کے جادو میں دوڑی چلی جا رہی تھی۔

اے لو ہم اجنتا میں آن پہنچے ہیں۔ سامنے پھیلے بلند ہوتے پہاڑی رستے پر چڑھو اور اجنتا کی گپھاؤں میں داخل ہو جاؤ۔ مگر میں دبدا میں ہوں۔ اس پہاڑی پہ چڑھ پاؤں گا۔ اختر صاحب نے کہا، ارے آپ خواہ مخواہ فکر مند ہو رہے ہیں۔ یہ جو کہار یہاں ڈولیاں لیے کھڑے ہیں، یہ کس مرض کی دوا ہیں۔ جو چڑھ نہیں پا رہے، وہ ڈولیوں میں سوار ہو رہے ہیں۔ ایک ڈولی میں آپ بھی بیٹھ جائیے۔ باقی ڈولی جانے اور کہاروں کے کاندھے جانیں۔ میں سوار ہونے کو تو ہو گیا۔ اب ڈر رہا ہوں، ارے یہ کہار مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے لیے جا رہے ہیں۔ اگر ان کا پاؤں پھسل گیا تو کیا ہوگا۔ پھر سیدھا کھائی میں جاؤں گا۔ میں نے کہاروں کو روکا۔ ڈولی میں جتنا سفر کر لیا، اب بس اپنی ٹانگوں پر بھروسہ کروں گا۔ ان اونچی

نچی پہاڑیوں پر جہاں تک میری ٹانگیں مجھے لے جائیں گی وہاں تک جاؤں گا۔ گپھاؤں میں تاک جھانک کرتا چلوں گا اور لڑھکتا ہوا واپس ہولوں گا۔ ویسے یہ کیا دیکھنا ہوا کہ لپک جھپک پہاڑیوں میں کودتے پھاندتے ایک ایک گپھا میں تنک تنک جھانکا۔ کچھ دیکھا کچھ نہ دیکھا اور آگے بڑھ گئے اور واپس آ کے شیخی بگھاری کہ ہم نے اجنتا کی سیر کی۔

بہرحال جیسے بھی دیکھا جتنا بھی دیکھا، یہ کہنے کے قابل تو ہو گئے کہ ہم نے اجنتا دیکھا ہے اور آخر میں پہلے بھی تو اس دیار میں آیا تھا۔ اس وقت ٹانگوں میں اچھا خاصا دم تھا، اس لیے پہاڑی رستے کے نشیب و فراز کو ہمت سے طے کیا اور کسی قدر زیادہ سکون سے گپھاؤں میں جھانکا اور حیرت کی آنکھ سے دیکھا۔ یا مولا، یہ میں کس جہان میں ہوں۔ عقل انگشت بدنداں ہے' اسے کیا کہیے۔ وہ کون جنات تھے جنہوں نے ان اندھیرے غاروں میں گھس کر یہ جادو جگایا۔ ان کے پاس کونسا منتر تھا کہ اسے پھونک کر انہوں نے پتھروں کو موم کیا۔ ان کے بطن سے مورتیاں برآمد کیں۔ ستون کھڑے کیے، چھتیں پاٹیں اور خشت و سنگ کا ایک جہان آباد کیا۔ مہاتما بدھ کا جلوۂ صدرنگ دیکھنا ہو تو اس جہان حیرت میں جا کر دیکھو۔ نم تاریک گپھاؤں میں کس کس رنگ سے درشن دیتے ہیں اور ایک گپھا میں تو واقعی اس شان سے باس کرتے ہیں کہ ایک زاویے سے دیکھو تو اداس نظر آئیں گے، دوسرے زاویے سے دیکھو تو ہشاش بشاش دکھائی دیں گے۔ ذرا زاویہ بدل کر دیکھو تو گریاں اور پھر زاویہ بدلو تو پتہ چلے گا کہ وہ تو مسکرا رہے ہیں۔ گائیڈ زاویہ بدل بدل کر بیٹری سے مورتی پر روشنی بکھیرتا ہے اور درشن کرنے والوں کو حیران کرتا ہے۔

اجنتا کی بلندیوں سے اتر کر نیچے آئے تو سامنے نوادرات کی ایک دوکان نظر آئی۔ سوچا کہ یہاں بھی جھانکتے چلو۔ ارے اس کے مالک تو اختر صاحب کے واقف کار نکلے۔ مجھ سے تعارف ہوا تو انہوں نے اپنی ادبی انجمن کی خبر سنائی کہ اجنتا کی بستی میں مشاعرے کرتی ہے اور خوب پھل پھول رہی ہے۔ لو اردو کی گونج مجھے کہاں جا کر سنائی دی ہے۔ اجنتا کی پہاڑیوں میں۔ انہوں نے چلتے چلتے ایک پتھر ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے کہا کہ یہ کیا۔ کہا کہ بس پتھر ہے۔ اجنتا کی یادگار جان کر رکھ لیجیے۔ میں نے رکھ لیا۔ پتھر کی قدر پتھر شناس جانیں۔ لاہور میں مبارک احمد کے صاحبزادے ہیں ایرج مبارک۔ شاعری کرتے ہیں۔ افسانہ لکھتے ہیں اور پتھروں میں کھیلتے ہیں۔ مبارک احمد کو بھی پتھر کو پارس بنانے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ جس شاعرہ کا مصرعہ دل کو چھو گیا اسے بام ثریا تک پہنچا دیا۔ پتھر کی پرکھ ایرج مبارک کو بھی بہت ہے۔ اس پتھر کو بھی اسی نے پرکھا اور میں نے بھی سوچا کہ یہ میرے لیے تو محض اور صرف پتھر ہے جس نے اس کی قدر کو جانا وہی اس کا حقدار ہے۔

اورنگ آباد میں ایک یونیورسٹی ہے کہ ڈاکٹر امبید کر سے منسوب ہے۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبید کر مراٹھ واڑا یونیورسٹی۔ یہاں تو خیر میں نے بے تکلفی سے ڈاکٹر امبید کر لکھ دیا ہے مگر جب میں نے

اس یونیورسٹی کا رخ کیا تو میرے میزبان پروفیسر حمید نے مجھے خبردار کیا کہ خالی ڈاکٹر امبید کر مت کہنا۔ ان کے چاہنے والے برا مان جائیں گے۔ میں نے پوچھا، پھر کیا کہوں۔ بولے ''نام سے پہلے بابا کا سابقہ لگا دینا۔'' میں نے یہی کیا۔ بابا صاحب کے چاہنے والے خوش ہو گئے۔ پھر انہوں نے مجھے آنکھوں پہ بٹھایا۔

اور ایلورا...... وہاں بھی جھانکنا ضرور تھا۔ بس کیلاش مندر تک گئے۔ سمجھ لو کہ وہیں ٹھٹھک کر رہ گئے مگر یہاں بیگ اختر مرزا میرے ساتھ تھے۔ اختر مرزا صاحب چشتیہ کالج خلد آباد میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ اردو تو خیر ان کا مضمون ہوا مگر ایلورا کی فنی باریکیوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ انہوں نے ان باریکیوں کو سمجھایا تو اس حیرت کدے کے رموز کچھ کچھ مجھ پر آشکار ہوئے۔ حیرت کدہ ہی تو تھا۔ اندر قدم رکھا تھا کہ ایک کیم شحیم ہاتھی نظر آیا جس کی سونڈھ نے زمانے کے نشیب و فراز اتنے دیکھے تھے کہ اب وہ ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ آگے ایک بلند و بالا بھاری بھرکم عمارت نظر آئی کہ ہماری فہم کے لیے ایک معمہ بن گئی۔ اختر مرزا صاحب نے گرہ کشائی اس طرح کی کہ اصل میں یہ ارجن کا رتھ ہے۔ کوروکشیتر کے بیچ کھڑا ہے۔ غور سے عمارت میں نفاست سے کھدی تفصیلات کو دیکھو۔ کوروکشیتر کی لڑائی کا سارا نقشہ بچھا نظر آئے گا۔ ویسے ایک پٹی میں رامائن کی بھی لڑائی کا منظر نظر آ رہا ہے اور رتھ کو ہاتھیوں نے اٹھا رکھا ہے۔ بائیں سمت میں نظر ڈالی تو دیوار پر دور تک شو پاربتی پتی پتنی کے روپ میں نظر آ رہے تھے۔ کسی منظر میں چوسر کی بساط بچھی ہے اور چوسر کی بازی چل رہی ہے۔ کہیں پتنی جی روٹھ گئی ہیں۔ پتی جی انہیں منا رہے ہیں۔ برابر میں ایک زینہ۔ چلو اوپر چل کر دیکھتے ہیں کہ وہاں کیا بھید بھاؤ ہے۔ وہاں اور ہی منظر کھلا۔ شولنگ ہے۔ اس کے برابر چراغ جل رہا ہے۔ عقیدت مند آتے ہیں۔ شردھا سے سر جھکاتے ہیں۔ پرنام کرتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ آگے چند ایک آسن۔ عقلمندوں کے لیے اشارہ کافی ہے۔

بس دیکھ لیا، دل شاد کیا۔ آگے جانے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ ایک دوشالا اور ایک گجرا دور ایک تقریب میں مہمان کی راہ تک رہا تھا۔ وہاں بھی تو پہنچنا تھا مگر ایلورا سے اک ذرا آگے بڑھے تھے کہ ایک مسجد کے مینار نمودار ہو گئے۔ ارے یہ تو زمانہ ہی بدل گیا۔ ابھی تو ہم قدیم ہندوستان میں سانس لے رہے تھے اور اب یہ مسجد کسی دوسرے ہی زمانے کا اعلان کر رہی ہے۔ اختر مرزا صاحب نے بتایا کہ یہاں سے خلد آباد شروع ہوتا ہے۔ یہاں اورنگزیب عالمگیر آسودۂ خاک ہیں۔ اچھا مگر عجب رنگ سے آسودۂ خاک ہیں۔ شاہی مقبرے کے اثر آثار کہیں نظر نہیں آ رہے۔ اختر مرزا صاحب نے ایک احاطہ میں لے جا کر مجھے ایک سیدھی نیچی قبر کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا جس کے کچے تعویذ میں ایک پودا لہلہا رہا تھا۔ بتانے لگے کہ حضرت عالمگیر نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ اگر میں یہاں ہوتے دنیا سے گزر جاؤں تو دلی کو دھیان میں مت لانا اور کوئی مقبرہ کھڑا کرنے کا بھی خیال دل میں مت لانا۔ بس مجھے مرشد کی پائینتی کچی قبر

میں سلا دینا۔ اس قبر کو چھت سے بے نیاز ہونا چاہیے۔ سو قبر وصیت کے مطابق بنائی گئی اور یہ پودا، میں نے پوچھا۔ کہا کہ یہ تخم بالنگے کا پودا ہے۔ پتہ نہیں یہ بھی عالمگیر کی وصیت کے مطابق ہے یا مجاوروں کی خوش مذاقی کا شگوفہ ہے۔ بہرحال فاتحہ پڑھی اور آگے بڑھے۔

موٹر فراٹے بھرتی جارہی تھی کہ اختر مرزا صاحب نے کھنڈروں کے ایک سلسلہ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ دولت آباد ہے۔ محمد تغلق کو ہلہلا اٹھا کہ دارالسلطنت بدلو۔ سو اس نے دلی کو اجاڑا۔ خلقت کو وہاں سے اکھاڑا، ٹانڈا باندا لے کر اور اجڑے ہوؤں کو ہانک کر یہاں آیا اور یہ نگر آباد کیا۔ یہ نگر اب کھنڈر ہے اور یہاں الو بولتا ہے یعنی میں چلتے چلتے تاریخ کے ایک اور دور میں بھولے سے اتر آیا ہوں مگر جلدی ہی آگے بڑھ لیا۔ تقریب کا وقت آن پہنچا ہے۔ وقت پہ وہاں پہنچنا ہے۔

کیسی تقریب۔ مراٹھی ادیبوں کی ایک انجمن ہے۔ مراٹھواڑا ساہتیہ پریشد۔ انہوں نے ایک کتاب کی افتتاحی تقریب کا اہتمام کیا ہے۔ کتاب ہے میرے منتخب افسانوں کے مراٹھی ترجموں کا مجموعہ جسے ساہتیہ اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔ حسن اتفاق سے ابھی انہیں دنوں یہ کتاب چھپ کر آئی اور مراٹھی قارئین کے ہاتھوں میں پہنچی۔ اب مراٹھواڑا ساہتیہ پریشد نے جلسہ سجایا ہے۔ میرے گلے میں گیندے کا ہار ڈالا، اورنگ آبادی دوشالا اڑھایا اور کہا کہ کروا پنی کتاب کا افتتاح۔ ہر چند کہ مراٹھی کی الف، ب، ت بھی نہیں پڑھی مگر خوش ہوں کہ میرے افسانے مراٹھی میں چھپ کر شمال سے چل کر جنوب تک پہنچ گئے۔

اصل میں ساہتیہ اکیڈمی میں ہندوستان کی ہر زبان والوں کی ایک کمیٹی قائم ہے۔ مراٹھی کمیٹی کو میری کہانیاں بھا گئیں۔ اب سے چند سال پہلے اکیڈمی کے سیکرٹری کرشنا مورتی جی نے مجھے مطلع کیا تھا کہ مراٹھی کمیٹی نے یہ طے کیا ہے کہ آپ کی بارہ منتخب کہانیاں مراٹھی میں ترجمہ کر کے شائع کی جائیں۔ کہو منظور ہے۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ منظور، منظور، منظور۔

یاد آیا کہ اب سے دو ڈھائی سال پہلے سلام بن رزاق نے کہ بمبئی میں رہتے ہیں، مجھے افسانوں کا ایک مجموعہ بھیجا۔ یہ ان کے اپنے افسانوں کا مجموعہ نہیں تھا۔ یہ مراٹھی کے نامور افسانہ نگار جی اے کلکرنی کے افسانوں کے اردو ترجمے تھے۔ اس عزیز نے جیسا کہ اس کتاب کے انتساب میں بتایا ہے میرے اور اس افسانہ نگار کے درمیان کوئی مشابہت دریافت کی۔ کہاں اور کیسے دریافت کی۔ یہ اس نے نہیں بتایا۔ مجھے بھی پوچھنے کی توفیق نہیں ہوئی مگر ایک عمومی بات کہتا ہوں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو لکھنے والے ایک دوسرے سے یکسر ناآشنا اور ایک دوسرے سے دور بیٹھے ہیں اور ایک ہی طرح سوچ اور محسوس کر رہے ہیں مگر یار کتنی جلدی اور کتنی آسانی سے تہمت جڑ دیتے ہیں کہ اس لکھنے والے نے فلاں فلاں سے خیال مستعار لیا ہے، موٹے لفظوں میں آئیڈیا چرایا ہے۔ ارے یارو، تخلیقی عمل کے بھید بھاؤ کو سمجھنے کی کچھ تو کوشش کرو۔

اورنگ آباد میں وہ میری کونسی صبح تھی۔ یاد نہیں آ رہا۔ بہرحال اس اطمینان سے اخبار پڑھ

رہا تھا جیسے یہ میرا اپنا نگر ہو۔ ایک خبر پڑھتے ہوئے چونکا۔ ذکر تھا کسی لائبریری کے نئے بندوبست کا اور بتایا جا رہا تھا اسے پن چکی کی لائبریری۔ پن چکی اور لائبریری، یہ تو انمل ہوئی۔ میں چکنم میں پڑ گیا۔ حمید صاحب سے پوچھا کہ یہ کیسی لائبریری ہے۔ وہ بھی بے خبر نکلے۔ میں نے کہا کہ کیوں نہ چل کر اس گتھی کو سلجھائیں۔ بس ہم چل پڑے۔ پوچھتے پچھتے ایک درگاہ میں جا نکلے۔ اس میں جو کتب خانہ ہے، اس میں جھانکا۔ وہاں لائبریرین صاحب سے ملا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ سو کتب خانے کی تفصیل تو انہوں نے بتادی مگر پن چکی کے متعلق اس کے سوا کچھ نہ بتا سکے کہ یہاں ایک پن چکی بھی ہے جو آٹا پیستی ہے۔ ارے بابا پن چکی ہوگی تو وہ آٹا بھی پیسے گی مگر کتابوں سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ پن چکی کی تفصیل ہمیں حافظ عقیل صاحب نے بتائی جو اس درگاہ کے منتظم ہیں اور یہاں کی مسجد میں امامت بھی کرتے ہیں۔

اس درگاہ میں جو بزرگ آرام کرتے ہیں وہ ہیں حضرت بابا شاہ پلنگ پوش اور ایک تھے بابا شاہ مسافر۔ بابا شاہ پلنگ پوش پیر و مرشد، بابا شاہ مسافران کے مرید۔ مرید بھی تھے اور بھانجے بھی تھے اور ساتھ میں ان کے خلیفہ بھی۔ انجینئرنگ کے ہنر میں درک رکھتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ روز یہاں لنگر لگتا ہے اور آٹے کا مسئلہ پیدا ہوتا رہتا ہے۔ کیوں نہ ایک پن چکی لگائی جائے۔ اس میں جتنا چاہو آٹا پیس لو۔ تو وہ جو آئے دن آٹے کی بلوں بلوں پڑی رہتی ہے، اس سے جان چھوٹے گی۔ بابا پلنگ پوش نے تجویز پر صاد کیا۔ مرید بھانجے نے اپنی انجینئرنگ کی کارستانی سے ایسی پن چکی قائم کی کہ تب سے اب تک اسی ایک رفتار سے چل رہی ہے اور آٹا پیس رہی ہے۔ وہ زمانہ اورنگزیب عالمگیر کا تھا۔ اب اکیسویں صدی ہے مگر پن چکی ہے کہ چلے جا رہی ہے۔ کیا اسماعیل میرٹھی کو اس پن چکی کی اطلاع تھی کہ اس نے لکھا ؎

نہر پہ چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے کام کی پکی

اجنتا، ایلورا، خلد آباد، دولت آباد کے کھنڈر، سب کچھ تو اڑتی اڑتی نظر سے دیکھ لیا۔ اب دیکھنے کے لیے کیا رہ گیا اور اچانک مجھے یاد آیا اور وہ جو اس نگر میں سراج اورنگ آبادی آسودۂ خاک ہیں، ان کی قبر پہ چھایا ہوا وہ املی کا گھنا پیڑ اور اس پیڑ کی شاخوں کے بیچ کوکتی کوئلیں۔ یا اللہ ایک دم سے اتنی کوئلیں۔ پچھلے پھیرے کا وہ سارا منظر آنکھوں میں پھر گیا اور وہ غزل دل و دماغ میں گونجنے لگی ؎

خبر تحیر عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی
شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی

کبھی سمت غیب میں کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہو سو ہری رہی
وہ عجب گھڑی تھی میں جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق میں جوں دھری تھی تیوں ہی دھری رہی
کیا خاک آتش عشق نے دل بے نوائے سراج کوں
نہ خطر رہا، نہ حذر رہا، مگر ایک بے خبری رہی

اس غزل کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں سب کچھ بھول بھال سراج اورنگ آبادی کے مقبرے کی سمت میں چل پڑتا مگر میزبان بار بار یاد دلا رہے تھے کہ حیدرآباد جانے والی گاڑی اب آئی کہ آئی۔ سو میں نے تحیر عشق میں اس گم شاعر کو چلتے چلتے دور سے سلام کیا اور سٹیشن کی طرف ہولیا۔

●........●........●

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں

اورنگ آباد سے ریل گاڑی میں بیٹھے اور جلدی ہی حیدرآباد آن پہنچے۔ ارے ان دو شہروں میں فاصلہ اب پیدا ہوا ہے۔ پہلے ایسا فاصلہ کہاں تھا۔ یادش بخیر ریاست حیدرآباد، جب یہ ریاست شاد آباد تھی تو لگتا تھا کہ اورنگ آباد وہیں کہیں حیدرآباد کے بغل میں آباد ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ اس نگر سے اُس نگر تک پہنچتے پہنچتے صوبہ ہی بدل جاتا ہے۔

تو میں پھر حیدرآباد آن پہنچا ہوں۔ یہ اس نگر میں میرا تیسرا پھیرا ہے۔ یہ سب مکہ مسجد کی کرامات ہے۔ اس مبارک مسجد میں سنگ موسیٰ کی ایک چوکی بچھی ہے۔ اس مسجد کا پھیرا لگا کر واپس ہونے لگے تو ایک دوست نے کہا کہ "انتظار صاحب، آپ دوبارہ حیدرآباد آنا چاہیں گے۔" میں نے کہا کہ واہ واہ یہ کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ موقع ملا تو مقرر آؤں گا۔ بولے کہ اگر ایسا ہے تو یہ جو چوکی ہے، اس پر بیٹھ جایئے۔ اس پتھر کی نشست کی تاثیر یہ ہے کہ جو مہمان اس پر بیٹھتا ہے، وہ دوبارہ بھی اس شہر میں آتا ہے۔ مگر میں تو اس نشست کے فیض سے تیسری بار یہاں آن پہنچا ہوں۔ ہر مرتبہ کسی نئی تقریب سے۔ اس مرتبہ پریم چند فیلوشپ کی تقریب سے ہندوستان کی یاترا پر نکلا ہوا ہوں اور گھومتا پھرتا حیدرآباد میں آن پہنچا ہوں۔ ویسے تو ہوٹل میں بسیرا ہے لیکن اصل میں ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے میرے میزبان ہیں احساس بیگ صاحب۔ میزبان بھی ہیں اور نگہبان بھی۔ انہیں کی نگہبانی میں تو حیدرآباد میں گھومنا پھرنا ہے۔ سٹیشن پر مع بیگم صاحب کے موجود تھے۔ پہلے میں نے انہیں کب دیکھا تھا اور انہوں نے کہاں مجھے دیکھا ہوگا۔ مگر کیا خوب ہوا کہ گاڑی سے اترتے ہی انہوں نے مجھے اور میں نے انہیں پہچان لیا۔ پہلے انہوں نے مجھے ہوٹل میں اتارا کہ تھوڑا آرام کرو، دن ڈھلے یہاں سے نکلیں گے۔ ادارۂ ادبیات اردو میں دوستوں سے ملنے کی تقریب پیدا کی ہے۔ وہاں چلیں گے۔ سو ایسا ہی کیا۔ ادارۂ ادبیات میں قدم رکھا تو باقی یار احباب کرم فرما بعد میں۔ پہلے مغنی تبسم کا مانوس چہرہ نظر آیا۔ ارے واہ کب کے بچھڑے کب ملے ہیں۔ حیدرآباد کا پہلا سفر سارا کا سارا آنکھوں میں پھر گیا مگر یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ چپ چپ ہیں۔ مشکل سے چل رہے ہیں۔ ارے کیا بڑھاپے نے قبل از وقت حملہ کر دیا۔ نہیں یہ بڑھاپا نہیں، کوئی روگ ہے کہ ستا رہا ہے۔ میرے پہلے پھیرے میں کتنے تازہ دم تھے۔ کس طرح مجھے

شہر میں لیے لیے پھرے۔ حیدرآباد کے سارے کونے جھنکا دیے۔ یہ قلعہ گولکنڈہ ہے۔ یہ قطب شاہیوں کے مزار ہیں۔ یہ چار مینار ہے۔ اس سے پرے جو مسجد نظر آ رہی ہے، وہ مکہ مسجد ہے اور ہاں سالار جنگ میوزیم ہے۔ یہ رونقیں دیکھ کر ہی تو شاعر نے کہا تھا ؂

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں
پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں

لیجیے دکھن کی شان میں دکھنی شاعروں نے جو کہا ہے اسے تھوڑا اور سن لیجیے ؂

دکھن ملک کھن دھن عجب ساج ہے
کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے

ایک شعر اور ؂

دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ
انگوٹھی کی حرمت نگینہ ہی لگ

یہاں کے قلعے بھی نرالے، مزار بھی نرالے۔ لاہور کا شاہی قلعہ، دلی کا لال قلعہ، فتح پور سیکری کا قلعہ، یہ تو جانے بوجھے قلعے ہیں۔ سب ایک سانچہ میں ڈھلے ہیں۔ ان پر مغلیہ مہر لگی ہے۔ راجستھان میں جا بجا کھڑے راجپوتی قلعے بھی تھوڑا گھوم پھر کر دیکھے۔ انہیں دیکھنے کے لیے اچھا خاصا کشٹ کھینچنا پڑتا ہے۔ پہاڑیوں پر بنائے ہیں۔ پہلے پہاڑیوں پر چڑھو۔ پھر قلعوں کی اپنی چڑھائی۔ قلعوں کی فصیلیں اس طرح کھڑی کی ہیں جیسے وہ پہاڑیوں کے بیچ سے اُگی ہوں۔ حملہ آور بھی تو پیش نظر تھے۔ پہلے حملہ آور ان پہاڑیوں سے نمٹیں۔ کتنا کچھ تو ان پہاڑیوں سے نبٹنے ہی میں صرف ہو جائیں گے۔ گولکنڈہ کا قلعہ ان سب سے نرالا ہے۔ بلندیوں میں پھیلا ہوا ہے۔ کتنا اوپر جاتا۔ جتنا جا سکا، گیا پھر ٹھٹھک گیا۔ ایوان بالا اب بھی بہت بلندی پر کسی چوٹی پر ٹکا نظر آ رہا تھا۔ مطلب یہ کہ حملہ آور قلعہ کے اندر آ بھی جائے تو قلعہ پر قبضہ اس کے لیے ایسا آسان نہیں ہوگا اور پھر کیا خوب انتظام کیا تھا کہ نیچے ایک خاص مقام پر کھڑے ہو کر تالی بجاؤ تو ایوان بالا تک پہنچے گی۔ اس تالی کو خطرے کی گھنٹی سمجھو۔

اور قطب شاہیوں کے مزار۔ میر نے کیا انہیں مزاروں کے بارے میں کہا تھا کہ ؂

روضے سب گلستاں ہوتے ہیں

تو ہر مزار اپنی جگہ ایک گلستان۔ سب سے بڑھ کر قلی قطب شاہ کا مقبرہ کہ گلستانوں سے بڑھ کر گلستان نظر آ رہا تھا۔ مغنی صاحب ہر مزار، ہر مقبرے کی تعمیری خوبیاں گنواتے جاتے۔ قصہ مختصر انہوں نے اس طرح کیا کہ قطب شاہی سلسلہ کے سارے سلاطین یہاں آسودۂ خاک ہیں ماسوا ایک کے۔ وہ ایک تھا ابوالحسن تانا شاہ۔

ابوالحسن تانا شاہ کو جیسا مغنی صاحب نے بیان کیا ویسا بیان کرتا ہوں۔ کیا آن بان تھی۔ کیا رکھ رکھاؤ تھا، کتنا شائستہ اور ٹھسا ایسا کہ ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ سچ مچ تانا شاہ۔ کھانا تناول کرنے کے لیے دستر خوان پر بیٹھا ہی تھا کہ اطلاع ملی کہ کسی موذی نے دغا کی۔ قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ اورنگزیب کا لشکر قلعہ میں گھس آیا ہے۔ خبر سنی۔ کیا مجال کہ چہرہ پر پریشانی کی چغلی کھائے۔ کہا آنے دو، اطمینان سے ماحضر تناول کیا۔ جب اورنگزیب سر پر آن پہنچا تو کھڑے ہو کر استقبال کیا۔

''آگے کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

جواب دیا ''وہی جو ہونا چاہیے تھا۔ گرفتاری۔ پھر قیدی کی صورت فاتح لشکر کے ساتھ روانگی۔ رستے میں پیاس لگی۔ ایک پنہارن نے پانی پلایا۔ تانا شاہ نے انگلی سے انگوٹھی کہ ہیرا جڑی تھی، اتاری۔ پنہارن کو دیتے ہوئے کہا کہ اے نیک بخت، اس وقت تو ہمارے پاس دینے کے لیے بس یہی ایک انگوٹھی ہے۔''

ارے ہاں ایک تانا شاہ تو وہاں آج بھی موجود تھے۔ بزرگ صورت، گوری رنگت، سر چاندی۔ یہ تھے اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی وا ڑیسہ۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ اصل میں جامعہ ملیہ کے سیمینار میں شرکت کی غرض سے آیا تھا۔ کسی نہ کسی طور حیدرآباد آنے کی تقریب بھی پیدا ہو گئی۔ جامعہ ملیہ کے حوالے نے ان کی یادداشت کے لیے کنجی کا کام کیا۔ حافظہ نے جو زقند لگائی تو سیدھے اس مبارک وقت میں پہنچ گئے جب جامعہ قائم ہوا تھا ''عزیز میں جامعہ کی پہلی کھیپ میں سے ہوں۔ مولانا محمود الحسن کا اصرار تھا کہ مہاتما گاندھی جامعہ کا افتتاح کریں۔ مہاتما گاندھی بضد تھے کہ میں نہیں، مولانا اس کا افتتاح کریں گے۔'' ٹھنڈا سانس بھرا ''کیا وضعداریاں تھیں اس زمانے کی۔'' ایک دوست نے چپکے چپکے بتایا کہ بڑے تانا شاہ قسم کے بزرگ ہیں۔ ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ ذرا ٹوک دو، ہتھے سے اکھڑ جاتے ہیں۔ زمانہ گورنری میں جے پرکاش نرائن کو کھانے پر بلایا۔ وہ تھے اپوزیشن کے لیڈر۔ اندرا گاندھی کے مخالف۔ بس پھر کیا تھا، دلی کو تار برقی دوڑ گیا۔ ادھر سے استفسار کیا گیا کہ آپ نے جے پرکاش نرائن کو کھانے پر بلایا ہے۔ جی ہاں بلایا ہے۔ سرکاری حیثیت میں نہیں، نجی حیثیت میں۔ وہ میرے دوست ہیں۔ پھر بھی اگر یہ دعوت منسوخ ہو جائے تو مناسب ہوگا۔ حضرت والا، دعوت تو منسوخ نہیں ہوگی البتہ میرا استعفیٰ کل خدمت بابرکت میں پہنچ جائے گا۔ سو اگلی صبح استعفیٰ داغا اور گورنری کی مسند سے دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہاں سے فارغ ہو کر اب ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ چلا رہے ہیں۔ ہاں یاد آیا کہ حیدرآباد سے فراغت پا کر جب میں لاہور آ گیا تو ان کا ایک گرامی نامہ بھی موصول ہوا تھا۔ سبحان اللہ کیا وضعدار قسم کے بزرگ تھے۔

ہاں ایک بزرگ اور تھے۔ ان سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ سر ادھر بھی چاندی ہو چکا تھا مگر اس سر پر لمبوتری ترکی ٹوپی بجی ہوئی تھی۔ مغنی صاحب نے بتایا کہ زوال حیدرآباد کے بعد جب انجمن ترقی اردو پر زوال آیا تو انہوں نے اپنی جائیداد کا اچھا خاصا بڑا حصہ انجمن کے نام لکھ دیا۔ سو اس طرح انجمن مرتے مرتے بچی۔

یہاں اس محفل میں مہر بلب بیٹھے تھے مگر جب بولنے پر اصرار کیا گیا تو بس جیسے بھرے بیٹھے تھے، ابل پڑے۔ مصلحتوں کو بالائے طاق رکھا اور حیدرآباد کے ماضی وحال پر رواں ہو گئے۔

مغنی صاحب نے میرا ان سے تعارف کرایا۔ شفقت سے ملے۔ بولے ''بس ہم یہاں بیٹھے پاکستان کے لیے دعا کرتے ہیں۔''

اور اب یہ احوال لکھتے ہوئے میں سوچ رہا ہوں کہ اُدھر بیٹھے ہوئے کیسے کیسے بزرگوں نے پاکستان کے حق میں دعا کی مگر پاکستان کو کسی کی دعا نہیں لگی۔ اصل میں دعا کرنی چاہیے تھی اس مخلوق کی قلب ماہیت کے لیے جو پاکستان کے سیاہ وسفید کی مالک ومختار ہے۔

لو حیدرآباد کی اصلی تے وڈی شخصیت کو تو بھولا ہی جا رہا ہوں۔ ارے اسی کے دم کا تو یہ سارا ظہورا ہے۔ سلطان قلی قطب شاہ اور کون۔ اور اس کے دل کی رانی حیدرآباد محل جس کے نام کی برکت سے حیدرآباد شاد آباد چلا آتا ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ کے حوالے سے اس کے نام نامی سے تو واقف چلا آتا تھا مگر اصل تعارف تو حیدرآباد جا کر ہوا اور جو کسر رہ گئی تھی، وہ نریندلوتھر جی نے پوری کر دی۔ انگریزی میں کتاب لکھی ہے "Prince, Poet, Builder, Lover" ان سے یہ قیمتی تحفہ ملا۔ اسے پڑھا اور اب پورا تعارف ہوا۔ موصوف ساتوں گنوں میں پورے تھے اور سلطان تو بعد میں بنے۔ پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آ گئے تھے۔ عشق کا گل تو شہزادگی کے سامنے ہی میں کھل گیا تھا اور عشق سا عشق۔ جاڑا گرمی برسات کوئی موسم ہو نمازی کی نماز قضا ہو جائے۔ قلی قطب کی بھاگ متی سے رات کے پردے میں ملاقات قضا نہیں ہو سکتی تھی۔ سوچنے کی جائے ہے۔ بھری برسات کی رات۔ موسی ندی چڑھی ہوئی ہے مگر عاشق کہاں باز آنے والا تھا۔ ندی میں چھلانگ لگائی اور ڈوبتا ترتا ندی کے پار جا اترا جہاں بھاگ متی اس کی راہ تک رہی تھی۔ باپ کو پتہ لگا تو سرزنش کی کہ فرزند آگے ایسی حرکت نہ کرنا کہ چڑھی ندی میں رات کے اندھیرے میں چھلانگ لگا دی۔ جب دیکھا کہ بیٹا باپ کی سننے کے لیے تیار نہیں ہے اور عشق کا منہ زور گھوڑا بے قابو ہو چکا ہے۔ تب سوچا کہ موسی ندی پر ایک پل بنوا دو۔ عاشق کو ملن کے لیے ندی پار کرنی ہی ہے تو ندی میں ڈبکیاں کیوں کھائے۔ اطمینان سے پل سے گزر کر جس سے ملنا ہے اس سے جا کر ملے۔

باپ کے گزرنے کے بعد شہزادہ تخت پر بیٹھا اور شہزادے سے سلطان بن گیا۔ تخت پر بیٹھ کر کاروبار سلطنت بحسن وخوبی سنبھالا اور کار عشق کو بحسن وخوبی انجام تک پہنچایا۔ وہ اس طرح کہ بھاگ متی سے بیاہ رچا کر اسے رانی بنا کر محل میں بٹھایا۔ اس بھاگوں بھری نے بھی حق عشق ادا کیا اور کلمہ پڑھ کر مسلمان بن گئی۔ اب بھاگ متی رانی حیدر محل تھی اور اس کے بھاگ کیسے کھلے کہ قلی قطب نے گولکنڈے کو سلام کر کے اس کے نواح ہی میں ایک نئے شہر کا نقشہ بچھایا۔ یہ جو شہر کے بیچوں بیچ چہار مینار کھڑا ہے اور جسے دیکھ کے یوں ہی سادگی سے میں نے کہا تھا کہ یہ شہر کے بیچ تعزیہ سا کیا کھڑا کیا ہے تو وہ تو سچ مچ تعزیہ نکلا۔ شہر کا نقشہ بچھا کر پہلے ہی طے کر لیا

گیا تھا کہ اس کا وسط کونسا مقام ہوگا۔ اس کا تعین کر کے وہاں امام حسین کے روضے کی شبیہ کھڑی کی گئی یعنی اینٹ پتھر گارے چونے سے بنا ہوا تعزیہ۔ پھر اس کے گرداگرد شہر آباد ہوا اور شہر آباد ہونے کے ساتھ قلی قطب نے دعا کی کہ ؎

مرا شہر لوگاں سے معمور کر
رکھیا جوں دریا میں مَن یا سمیع

کس نیک ساعت میں یہ دعا مانگی گئی تھی کہ بخیر و خوبی قبول ہوئی۔ سو دیکھ لو کہ جسے ہم زوال حیدرآباد کہتے ہیں اس واقعہ کے بعد بھی شہر بے آباد نہیں ہوا۔ ہر چند کہ شہر کی رونق دلی لوٹ کر لے گئی اور شہر کا کتنا پانی کراچی بہہ گیا۔ تو بے شک کراچی کے بیچ اب ایک چھوٹا سا حیدرآباد بھی آباد نظر آتا ہے مگر حیدرآباد پھر بھی لوگوں سے معمور ہے۔ ہاتھی مر کر بھی لاکھ کا بلکہ لاکھ سے بڑھ کر سوالاکھ کا بن جاتا ہے۔ آصف جاہی رونق کا ورق پلٹا گیا مگر قلی قطب شاہ کا سکہ اب بھی چلتا ہے۔ حیدرآباد لٹریری فورم کی نشست جب بھی تو اس کا آغاز ہی اس اعلان سے ہوا کہ ؎

یہ شہر آرزو ہے محمد قلی کا شہر
نغمے کا علم و فضل کا زندہ دلی کا شہر

شاعرہ تھیں بانو طاہرہ سعید۔ کہہ رہی تھیں کہ ؎

ہم لوگ وہ ہیں جو غمِ دوراں میں ہیں مگن
ہم لوگ وہ ہیں چاک گریباں میں ہیں مگن
اے دوست درمیانِ محباں خوش آمدی
در حلقۂ خلوصِ فقیراں خوش آمدی
آمد ہے ارضِ پاک کے اہلِ قلم کی عید
اے کاش یوں ہی ہوتی رہے دید و بازدید

دید تو ہو گئی اور بازدید بھی ہونی ہی تھی۔ آخر سنگ سیاہ کی چوکی پر بلا وجہ تو میں نہیں بیٹھا تھا۔ تو اب حیدرآباد سے رخصتی کا وقت آن پہنچا تھا۔ جیلانی بانو اور انور معظم کے در دولت پہ دستک دی تھی، وہ بھی دے چکا تھا۔

پھر دوسرا پھیرا۔ وہ کس خوشی میں۔ وہ میں کیا جانوں۔ وہ بندوبست تو مکہ مسجد کی سنگ سیاہ کی چوکی کو کرنا تھا۔ وہ اس نے کیا۔ ایک دعوت نامہ چھپر پھاڑ کر گود میں آن پڑا۔ میکس مولر بھون نے حیدرآباد میں ایک سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ موضوع تھا ''برصغیر کے نئے شہر اور ان کے مسائل'' مگر میں برصغیر کی روایتی بستیوں کے زوال پر ماتم کر رہا تھا۔ کیا بستیاں تھیں کہ نئے زمانے میں آ کر اپنی قدر کھو بیٹھیں۔ اب کیسے ان نئے شہروں

کے گن گانے والوں کو سمجھایا جائے کہ کنواں کنویں سے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہوتا تھا اور پنہار نیں۔ اور وہ ہر کوچے میں گھنا اونچا درخت کہ اس شان سے کھڑا ہوتا تھا جیسے سارا کوچہ، پوری گلی اس کی چھاؤں میں مگن ہے۔ وہ کیا محض اور خالی درخت ہوتا تھا یا اس سے بڑھ کر اس کی حیثیت و معنویت تھی۔

خیر یہ تو ہوا مگر مجھے بے کلی ہو رہی تھی۔ میں نے آصف فرخی سے کہا۔ ہاں آصف فرخی بھی تو اس سیمینار میں شریک تھے بلکہ سرگرمی سے شریک تو وہی تھے۔ ہاں تو میں نے آصف سے کہا کہ یہ بھی عجب بات ہے کہ ہم حیدرآباد میں ہیں اور حیدرآباد سے دور ہیں۔ پھر میں نے اس عزیز کو سمجھایا کہ یہ مصفا کوچہ، یہ عالیشان ہوٹل جس میں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں، یہ سیمینار میں رونق افروز انگریزی داں دانشور، ارے یہ کوئی حیدرآباد ہے۔ یہاں سے نکلو۔ چار مینار چلو۔ وہاں کا بھیڑ بھڑ کا دیکھیں۔ چوڑیوں کے بازار میں چوڑیوں کی بہار دیکھیں۔ مکہ مسجد میں چل کر سنگ سیاہ کی چوکی پر بیٹھیں۔ پھر ہم جانیں گے کہ حیدرآباد میں ہیں۔ سو ہم نے ایسا ہی کیا اور پھر اطمینان کا سانس لیا کہ آخر کے تئیں حیدرآباد کے درشن ہو گئے۔ بات یہ ہے کہ ہر شہر، ہر نگر کی اپنی بو باس ہوتی ہے۔ عالیشان ہوٹلوں اور سیمیناروں کو رونق بخشنے والے ایوانوں میں اس کا تھوڑا ہی پتہ چلتا ہے۔ جب اس نگر کے گلیوں بازاروں میں تھوڑی خاک پھانکتے ہیں اور وہاں کے چائے خانوں میں بیٹھ کر کڑک چائے پیتے ہیں تب اس بو باس کا تھوڑا پتہ چلتا ہے۔

باقی رہی عالیشان ہوٹلوں کی بات تو ہمارے ہوٹل نے اپنی شان اس آخری وقت میں دکھائی جب ہم اس ہوٹل سے رخصت ہو رہے تھے۔ صبح ہی صبح ہم رختِ سفر باندھ کر اپنے اپنے کمرے سے نکلے۔ یہاں سے نکل کر ہمیں جیلانی بانو کی طرف جانا تھا۔ ناشتہ تو وہیں جا کر کرنا تھا۔ سامنے لفٹ کا دروازہ کھلا تھا۔ ہم دو جنوں نے اس خالی لفٹ میں قدم رکھا ہی تھا کہ کیا دیکھتے ہیں جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ایک آفت کی پرکالہ لپک جھپک آئی اور ہمارے بیچ آ کر کھڑی ہو گئی۔ بس جیسے کوئی بجلی کوند کے ہمارے بیچ ٹھٹک گئی ہو۔ ہم دم بخود۔ ادھر وہ ہوش ربا ارد گرد سے بے پروا۔ گراؤنڈ فلور پر جا کر جیسے لفٹ کا در کھلا وہ تڑپ کر باہر نکلی۔ دم کے دم میں یہ جا وہ جا اور کاؤنٹر پر کھڑے ریسپشنسٹ کو دیکھو۔ ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ کاؤنٹر پر پہنچے تو بولا ''آپ لوگ خوش قسمت ہیں۔ لفٹ میں یہ چھوٹا سا سفر آپ نے مادھوری ڈکشت کی سنگت میں کیا ہے۔'' میں چونکا۔ ارے یہ مادھوری ڈکشت تھی۔ فوراً گیٹ کی سمت میں نظر دوڑائی مگر وہ اب وہاں کہاں۔ جھونکا ہوا کا تھا۔ ادھر آیا ادھر گیا۔ بجلی کوندی اور دم کے دم میں غائب۔

واضح ہو کہ بمبئی کی فلمی دنیا میں مادھوریاں دو گزری ہیں۔ ایک مادھوری کی نمود سنٹ فلموں کے زمانے میں ہوئی تھی۔ وہ اسی بلموریا ڈی بلموریا کا زمانہ تھا اور نازیا کی چھلانگوں پر تماشائیوں کے دل بلیوں اچھلتے تھے۔ بس اسی بیچ مادھوری نے بھی خوب دھوم مچائی۔ اب ہمارے آپ کے زمانے میں اس دوسری مادھوری نے ظہور کیا اور اس کے جلوہ آرا ہونے پر پتہ چلا کہ وہ مادھوری ادھوری تھی۔ جب دوسری مادھوری

ظاہر ہوئی تب معلوم ہوا کہ ادھوری کی تکمیل اب ہوئی ہے۔ باقی احوال ایم ایف حسین سے پوچھیے۔

تو حیدرآباد کے اس پھیرے میں میرا وہ آخری دن کتنا مبارک دن تھا۔ سویرے سویرے ادھوری وکشت کے درشن ہوئے۔ پھر جیلانی بانو کے یہاں جا کر ناشتہ کیا۔ جیلانی بانو اور انور معظم۔ چڑی اور دودو۔ بیوی میاں دونوں مہذب۔ جیلانی بانو افسانہ نگار، انور معظم جانے مانے محقق۔ جمال الدین افغانی پرست۔ ان سے ایک دفعہ کی ہمسفری کا شرف بھی حاصل ہو چکا ہے۔ کراچی سے دوحہ تک کے سفر میں انہوں نے پورا جمال الدین افغانی میرے اندر اتار دیا تھا۔ میں واقعی اس کے بعد اس بزرگ شخصیت کا قائل ہو گیا تھا مگر آگے چل کر جب اسامہ بن لادن کا ہمارے بیچ چرچا ہوا تو میں ان سے بدک گیا۔ اگر مولانا افغانی کے مشن کا یہی حاصل ہے تو استغفار ابا حسرت و یاس۔

اب یہاں سے نکل کر ہمیں یعنی مجھے اور آصف کو الوک بھلہ صاحب کی طرف جانا تھا۔ کیا مبارک سفر تھا کہ اب اس شہر میں بھلہ صاحب بھی موجود تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے انگریزی کے شعبہ سے وابستہ تھے۔ وہ جو انہوں نے میری چند کہانیوں کو انگریزی کا جامہ پہنا کر "Leaves" کے عنوان سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جسے انہیں دنوں ہارپر کولنز نے دلی سے شائع کیا تھا۔ اس کی افتتاحی تقریب یہاں کی ایک بک شاپ پر ہونی قرار پائی تھی تو ان کے گھر جانے سے پہلے اس تقریب میں گئے۔ کتنی مختصر تقریب تھی اور کتنی سادگی سے منعقد ہوئی۔ ایک تو ہم دو، ایک بھلہ صاحب، مٹھی بھر اس بک شاپ کے منتخب خریدار اور ادب کے رسیا۔ مختصر گفتگو کچھ میری کچھ بھلہ صاحب کی۔ لیجیے تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ جسے کتاب خریدنی ہوئی اس نے خریدی۔ مجھ سے دستخط کرائے اور گھر کی راہ لی۔ کتاب کی تقریب ایسی ہی ہونی چاہیے۔ یہ کیا کہ کتاب پر مقالہ لکھنے کی فرمائش کر کر کے یاروں کو بے آرام کیا جا رہا ہے۔ صدر کون ہو، اس پر سر کھپایا جا رہا ہے۔ کوئی وزیر آ کر افتتاح کرے تو چشم ما روشن دل ماشاد ورنہ کوئی جانی مانی شخصیت کہ انہیں جا کر سلام کرو۔ وہ تمہیں از راہ مروت صدارت سے نوازیں گے۔ میں نے اپنے زمانے میں لاہور شہر میں دو مقبول صدر دیکھے۔ اول جسٹس رحمٰن صاحب، دوم اپنے احمد ندیم قاسمی صاحب۔ دونوں ہی گوناگوں خوبیوں کے مالک۔ ان خوبیوں کے بل پر انہیں کرسیٔ صدارت پر رونق افروز ہونا زیب دیتا تھا۔ قاسمی صاحب اس سے بڑھ کر اپنے ہمعصروں اور خوردوں کو نوازتے تھے۔ کسی کی کتاب کے لیے فلیپ لکھا۔ کسی کو دیباچہ سے نوازا۔ مختصر یہ کہ کوئی سائل ان کے در سے محروم نہیں پھرا۔ ان کے آخری ایام میں ان کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے سب سے بڑھ کر میں نے دعائیں کیں۔ بات یہ ہے کہ یہ وقت آتے آتے ہمارے سب ہی بزرگ ایک ایک کر کے سدھار گئے تھے۔ وہ بھی جنہوں نے میرے ساتھ ادب کی دنیا میں ہوش سنبھالا تھا۔ اب نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ میں یہ سوچ سوچ کر ڈرتا تھا کہ میرے ساتھ کہیں وہ مضمون نہ ہو جائے کہ ؎

یادگار بزم دلی ایک حالی رہ گیا

مگر خیران کی آنکھیں بند ہو جانے کے بعد میں نے ارد گرد نظر ڈالی تو ایک دانہ اور بمشکل حمید اختر نظر آیا۔ میں نے سوچا کوئی بات نہیں ہے۔ ذمہ داریوں کا جو بوجھ جانے والوں نے ہمارے کمزور کاندھوں پر ڈال دیا ہے، ہم دونوں مل کر اسے انجام دیں گے۔ آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں بلکہ زیادہ بوجھ تو انہوں نے ہی اٹھا رکھا ہے۔ یہ دیکھ کر میری کتنی ڈھارس بندھتی ہے کہ ادب کے اس عالم رنگ و بو میں کم از کم لاہور کے بیچ ابھی میرا ایک سینئر موجود ہے۔ اللہ انہیں برس برس سلامت رکھے۔ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار۔

ہاں تو اس تقریب سے نبٹ کر ہم نے الوک بھلہ کے گھر جا کر لنچ کیا اور کھانا کھایا۔ یہ اس شہر میں ہمارا آخری کھانا تھا۔ اس کے بعد آصف اپنی راہ، میں اور عالیہ اپنی راہ۔ ان کا رخ دلی کی طرف، ہمارا رخ براستہ بنگلور سری رنگا پٹم کی طرف۔

اور اب راوی میرے نام حیدرآباد کا تیسرا پھیرا لکھتا ہے۔ یہ پھیرا پریم چند کے نام لکھا جانا چاہیے۔ انہیں کے نام کی فیلوشپ کے فیض سے یہاں پہنچا ہوں۔ جتنی بھی تواضع ہوئی جتنے گلے میں گجرے پڑے سب اسی نام کی برکت سے ہیں۔ تواضع میں تین تقریبوں کا ذکر مقرر ہونا چاہیے۔ اول ادارہ ادبیات اردو کی تقریب۔ دوم عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی تقریب۔ وہ تو سمجھئے کہ احساس بیگ صاحب کی اپنی تقریب تھی۔ مگر اس تیسرے پھیرے کے آتے آتے اس نگر میں ایک اور یونیورسٹی بہت شان کے ساتھ وجود میں آ چکی تھی۔ ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی۔ اس کے آڈیٹوریم میں تیسری تقریب۔ شعبۂ انگریزی کی پروفیسر صاحب کہ بھلا سا ان کا نام تھا، صدارت کر رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں ترجموں کا کام باقاعدگی سے شروع ہے اور سرگرمی سے جاری ہے۔ استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے ایک سوال یہ بھی داغ دیا کہ یہ اہتمام آپ نے کس طرح کیا کہ سیاست سے آپ کا دامن بچا رہا ورنہ یہ زمانہ تو وہ ہے کہ ادیب ادب میں قدم رکھتے کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی چل پڑتے ہیں۔

سوال بجا تھا اور یہ بھی صحیح کہ اس زمانے میں تو ادیب کو سیاست کا ایسا لپکا پڑا ہے کہ اس حوالے کے بغیر نوالہ نہیں توڑتا مگر میرا معاملہ جدا ہے۔ یہ تو ادب ہے کہ اس کا سیاست سے تعلق جتنا بھی ہونا جائز ہی نظر آتا ہے مگر صحافت تو ہے ہی سیاست کے ساتھ جڑی ہوئی۔ میں نے پیشہ صحافت کا اختیار کیا اور اس قسم کے ساتھ اختیار کیا کہ سب گھونٹ جاؤں گا سیاست گھونٹ نہیں جاؤں گا مگر اس الزام سے پھر بھی نہیں بچا۔ میرے عزیز دشمن اور عزیز دوست صفدر میر نے ایک دفعہ جھلا کر کہا تھا کہ ترقی پسند ادیبوں کو سیاست زدہ ہونے کا طعنہ دیتا ہے، خود اس کے افسانے چغلی کھاتے ہیں کہ یہ ترقی پسندوں سے بڑھ کر سیاست زدہ ہے۔ پتہ نہیں اس عزیز نے میرے افسانوں میں کیا دیکھا کہ ایسا کہا۔ اگر ایسا ہے بھی تو پھر میں یہی کہوں گا کہ میں نے تو کمبل کو چھوڑ دیا تھا، کمبل نے مجھے نہیں چھوڑا تو اس میں میری کیا خطا ہے لیکن اگر یہ واقعہ گزرا ہے تو یہ زمانے کی کارستانی ہے۔ ہمارے زمانے کو سیاست نے خراب کیا۔ زمانے نے ہمارے ادب کو خراب کیا۔ جو ادیب اپنے زمانے سے

غرض رکھنے کا دعویدار ہے، وہ اپنے ادب کو سیاست سے کتنے دن محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اگر زمانے کی ہوا میں سیاست کا زہر گھلا ہوا ہے تو ادیب فراریت پسند بھی بن جائے تو بھاگ کر کہاں جائے گا۔

خیر یہ لمبا مضمون ہے۔ میں نے تھوڑی وضاحت کی۔ باقی وضاحت اس دانشور خاتون کے فہم کے لیے چھوڑ دی۔

مطلب تو یہ بتانا تھا کہ میں اب کے حیدرآباد گیا تو ابوالکلام آزاد یونیورسٹی میں بھی جھانک آیا۔ جیلانی بانو شہر میں تھیں ہی نہیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ بس اب کے ان کے گھر کا نمک چکھے بغیر اس شہر سے گزر جاؤں گا۔ مجتبیٰ حسین سے مل لیے۔ بس اسے کافی سمجھو۔ مگر ادھر اس گھر کا نمک مجھے اپنا مزہ چکھائے بغیر بھلا کیسے جانے دیتا۔ لیجیے دن ڈھلتے ڈھلتے خبر آن پہنچی کہ جیلانی بانو گھوم پھر کر گھر واپس آ گئی ہیں۔ تمہارے لیے بلاوا ہے۔ کھانا رات کا اس گھر جا کر کھانا ہے۔ تو لیجیے ادھر سے وضعداری برقرار رہی۔ شام پڑے اس در پہ دستک دی۔ وہاں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس گھر کے حیدرآبادی دسترخوان کا ذائقہ اپنا ہے۔ زبان نے وہ ذائقہ چکھا اور صبح کو حیدرآباد سے نکل لیا۔

۞........۞........۞

پھر سلطان ٹیپو کے حضور

میں سری رنگا پٹن میں ہوں اور سری رنگا پٹن کو یاد کر رہا ہوں۔ چاروں طرف بانس کے درخت۔ اوپر ان کی لمبی لمبی شاخیں اس طرح پھیلی ہوئی کہ ایک ہری بھری چھت تن گئی تھی۔ ہری دیواروں اور چھت میں کتنی چڑیاں سمائی ہوئی تھیں کہ ان کی چہکار سے فضا گونج رہی تھی۔ باہر جھانک کے دیکھا تو پانی کی سفید چاندی جیسی دھار بہہ رہی تھی۔ ارے یہ تو ندی ہے کتنا اجلا۔ گنگا جمنا کتنی پوتر تھیں۔ اب کتنی میلی ہو گئی ہیں۔ اور یہ ندی اتنی اجلی اتنی پاکیزہ۔ اچھا تو یہ ہے کاویری ندی۔ تو میں اصل میں کاویری ندی کے کنارے کھڑا ہوں۔ پانی کی اجلی جھلمل کرتی چادر دور تک پھیلی ہوئی ہے اور اس سے پرے ایک وسیع و عریض خرابہ۔ اب خرابہ ہے، آگے ایک شاد آباد نگر تھا۔ نگر کے والی نے جامِ شہادت نوش کیا اور نگر دیکھتے دیکھتے ویران ہو گیا۔ وہ قلعہ وہ محلات کیا ہوئے۔ جہاں تہاں آثار باقی ہیں، عقب میں بہتی کاویری، سناتی ہے کوئی بھولی کہانی۔ بہت رن پڑا تھا، کوئی کہہ رہا تھا۔ میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ سامنے چھوٹا سا گھاس کا تختہ ہے۔ بیچوں بیچ ایک تختی نصب ہے۔ لکھا ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں سلطان شہید کی لاش پڑی ملی تھی۔ کہنے والا پھر شروع ہو گیا۔ تین دن موسلا دھار بارش ہوئی۔ چوتھے دن بارش تھمی تو لاش نظر آئی۔ مگر لگتا تھا کہ لاش نہیں ہے۔ سلطان شہید آرام کر رہے ہیں اور ایسا جلال کہ کسی کی ہمت نہ پڑے کہ قریب جائے۔ تلوار ابھی تک ہاتھ میں تھی اور مٹھی بھنچی ہوئی۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ دور ایک صندلی گنبد۔ جنگلی کبوتر گنبد پر بیٹھے ہوئے۔ وہ کیا ہے۔ بتانے والے نے بتایا کہ وہ سلطان شہید کا مقبرہ ہے اور اب میں مقبرے میں ہوں۔ برابر برابر تین قبریں ہیں۔ ایک بزرگ جو یہاں مجاور ہیں، بتا رہے ہیں کہ یہ قبر جس پر نیلی چادر پھیلی ہوئی ہے، حیدر علی کی قبر ہے۔ بغل میں جو قبر ہے سرخ چادر والی، وہ ان کی بیگم سلطان شہید کی والدہ سیدانی فاطمہ کی قبر ہے اور یہ تیسری قبر جس پر ہلکے زرد رنگ کی سیاہ دھاریوں والی چادر پڑی ہے اس کے بیچ سلطان شہید آرام فرما رہے ہیں۔ میرے ساتھ عالیہ ہیں، ان پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں۔ عقیدت مجھے اس خرابے میں کھینچ کر لائی ہے اور رقت اس بی بی پر طاری ہوئی۔

یہ سارا منظر خواب کی طرح مجھے یاد آتا ہے۔ اب کے جو میں یہاں آیا ہوں تو اپنی ذات میں اکیلا ہوں۔ عالیہ ساتھ نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے دن پورے کیے۔ اب آسودہ خاک ہیں۔ میرے ساتھ میرے

میزبان ہیں۔ میری میزبان اصل میں پروفیسر مہ جبین ہیں کہ یہاں میسور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے کرشن چندر پر تحقیقی کام کیا ہے۔ اب یہ کام کرشن چندر، ناول نگاری اور نسائی کردار کے عنوان سے شائع ہوا ہے اور مجھے اس کے افتتاح کا فریضہ انجام دینا ہے۔ اس زیارت گاہ کے سفر میں وہ، ان کے شوہر ناصرالدین اور ان کے صاحبزادے ساحل ساتھ ہیں۔ اب کے ہم سیدھوں سیدھ مزار پر آئے ہیں۔ شہادت گاہ پر حاضری بعد میں۔ فاتحہ پڑھتا ہوں اور جلدی ہی باہر جاتا ہوں۔ باہر صحن میں ٹیپو کی اہلیہ رقیہ بیگم اور ٹیپو کے بہنوئی برہان الدین کی قبریں ہیں۔ یہ قبریں سنگ سیاہ میں ہیں۔ سنگ سیاہ اس مقبرے سے خاص ہے۔ گنبد بلاشبہ صندلی رنگ کا ہے۔ باقی جب نظریں گنبد سے نیچے کی طرف سفر کرتی ہیں تو سب سنگ سیاہ کا کرشمہ نظر آتا ہے۔ جالیاں، در، ستون سب سنگ سیاہ کے۔

مزار پر نہیں' مزاروں پر فاتحہ پڑھ لی۔ اب خرابے کی طرف چلتے ہیں کہ شہادت گاہ اسی خرابے کے بیچ تو ہے مگر میں حیران ہوتا ہوں کہ وہ خرابہ کہاں گیا۔ وہ پکی شہادت گاہ غائب۔ کچھ سنگ مرمر سے بنا نشان نظر آ رہا ہے۔ اس کے اردگرد شاندار چہاردیواری اور ایک بھاری آہنی دروازہ جس میں تالا پڑا ہوا ہے۔ اردگرد رہائشی عمارات نظر آ رہی ہیں۔ میں پہلے حیران ہوتا ہوں۔ پھر اداس ہو جاتا ہوں۔ مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں ہے کہ تالا نہیں کھلا اور میں نے اندر جا کر شہادت گاہ پر حاضری نہیں دی۔ شہادت گاہ کی اس بے حرمتی نے مجھے اداس کر دیا ہے۔ ہر خرابے کی اپنی ایک مہک ہوتی ہے، اسی مہک کی برکت سے وہ خرابہ، وہ ویرانہ شاد آباد شہروں سے زیادہ باوقار نظر آتا ہے اور یہاں تو خرابے کی مہک کے ساتھ شہادت کی خوشبو بھی فضا میں بسی ہوئی تھی۔

مگر ابھی مجھے ایک اور ذہنی صدمے سے دوچار ہونا تھا۔ ارے وہ جو یہاں بانسوں کا ایک چھوٹا سا جنگل آباد تھا، وہ کہاں گیا اور وہ چڑیاں جو بانسوں کے جھنڈ کے بیچ چہک مہک رہی تھیں، کہاں اڑ گئیں اور یہ کاویری کو کیا ہو گیا۔ وہ اجلے پانی کی جھلمل چادر جو یہاں سے دور تک پھیلی ہوئی تھی اسے زمین کھا گئی یا ہوا اڑا لے گئی۔ چڑھی ندی اب اتری ہوئی تھی یا شاید نئے زمانے کی کوئی اور افتاد آ پڑی ہو۔ آخر یہ کمرشلائزیشن کا زمانہ ہے جو پرندوں، درختوں اور دریاؤں کو راس نہیں آ رہا۔ جہاں بانسوں کے جھنڈ کے جھنڈ کھڑے تھے، ان کا صفایا کر کے یہاں کوئی کلب یا ہوٹل قسم کی چیز سجا دی گئی ہے۔ مہ جبیں کا اصرار تھا کہ لنچ یہیں کاویری کے کنارے کیا جائے۔ وہ تو خیر کیا مگر کاویری تو کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ سارس اور بگلے وہ کدھر گئے۔ بس ایک ننھی کھسٹی کالی چڑیا نظر آ رہی تھی جو بے دلی سے سبزی مائل پانی میں غوطہ لگاتی، تھوڑی دیر کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جاتی اور پھر سر نکال کر اپنے وجود کا اعلان کرتی۔

اب دیکھنے کو یہاں کیا رہ گیا تھا۔ پہلے آیا تھا تو کتنا کچھ دیکھنے کو ملا تھا۔ سو جلدی ہی ہم کاویری کنارے سے اٹھے اور واپس ہو لیے۔ واپس ہوتے ہوئے ایک دفعہ پھر میں ایک صدمے کی زد میں تھا۔ ارے

یہ سڑک تو اب وہ سڑک ہی نہیں ہے جس سے میں اپنے پہلے سفر میں گزرا تھا۔ املی کے وہ گھنے پیڑ کہاں گئے اور وہ سانولیاں جوان پیڑوں کی چھاؤں میں بیٹھی مسافروں کو ناریل پلا رہی تھیں، کہاں رفو چکر ہو گئیں۔ یہ جواب نئی دو رویہ سڑک نظر آ رہی تھی ایسے ہی تھوڑا ہی بن گئی تھی۔ کتنی املیوں اور کتنی سانولیوں کو یہاں سے اجاڑا گیا تب یہ سڑک بن کر تیار ہوئی۔ مسافر اب اس راہ سے زیادہ گزرتے ہیں مگر مسافر نواز نظر نہیں آتے۔

یہ سب وقت کی کارستانیاں ہیں۔ یہ بھی تو وقت ہی کی کارستانی ہے کہ اب سری رنگا پٹن بستی کم ہے، ویرانہ زیادہ ہے اور میسور صندل کی خوشبو میں بسا ایک شاد آباد نگر ہے۔ آگے سری رنگا پٹن سلطنت خداداد کا دارالسلطنت تھا۔ حیدر علی کے ہاتھوں اس کی قسمت سنوری۔ ٹیپو کے زمانے میں آ کر اسے چار چاند لگے۔ ان دنوں میسور کی کیا بساط تھی۔ بس بھینسا گاؤں تھا۔ بھینسا گاؤں کیوں اور کس تقریب سے۔ مت کریدو دیومالائی دنیا میں چلے جاؤ گے۔ کہتے ہیں کہ کسی بہت پہلے کے زمانے میں یاں ایک راکشش دندناتا پھرتا تھا۔ اس کی شکل وصورت بھینسے کی سی تھی مگر اس کی کمبختی آئی تھی کہ قریب ہی کی ایک پہاڑی پر شیو جی کی جیون ساتھی چامنڈیشوری دیوی کا ٹھکانا تھا۔ انہیں بھی اس نے پریشان کیا ہوگا۔ تب ہی تو انہیں غصہ آیا۔ انہوں نے اس راکشس کو ٹھکانے لگایا اور پھر اس بستی نے سکھ کا سانس لیا۔ پھر مہیشور سے منسوب ہو کر یہ نگر پہلے میسورا پھر رفتہ رفتہ میسور بن گیا۔ چامنڈیشوری دیوی کی نشانی تو بس اتنی ہے کہ میسور شہر میں ایک ریسٹ ہاؤس ہے کہ چامنڈی ریسٹ ہاؤس کہلاتا ہے۔ اب تو خیر میں یونیورسٹی کے مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ پہلے آیا تھا تو اسی چامنڈی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا اور اکرام کاوش کو دعا دی کہ اس کی تحقیق سے مجھے پتہ چلا کہ چامنڈیشوری کون تھی اور اس سے میں نے جانا کہ وہ جو میرے نگر ذبائی میں ایک اجڑا اجڑا امندر تھا، جس کے بیچ کھڑے پیپل پہ بندر جھولتے رہتے تھے، اسے ہم چامنڈا کیوں کہتے تھے۔ کیا خبر ہے کہ گزرے کسی دیومالائی زمانے میں چامنڈیشوری دیوی نے یہاں بھی باس کیا ہو۔

اکرام کاوش میسوری محقق ہیں۔ اپنے علاقہ پر انہوں نے خوب تحقیق کر رکھی ہے۔ انہیں کا تذکرہ پڑھ کر میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جب ٹیپو سلطان کی شہادت ہوئی اور سلطنت خداداد کا چراغ گل ہو گیا تو انگریزوں نے یہاں وڈیرا راجاؤں کو یہ علاقہ بخش کر وڈیرا راج قائم کیا۔ میسور شہر اس کی راجدھانی بنی۔ پھر یہ پورا راجواڑہ ہی میسور کہلانے لگا اور اب میسور کیا خوب نگر ہے۔ صندل کی خوشبو میں بسا ہوا۔ سلک کی ساڑھیوں میں لپٹا ہوا۔ یہاں جابجا صندل کی لکڑی کے کاریگر بیٹھے ہیں۔ صندل کی لکڑی کی بنی اشیا خریدو اور ان کی کاریگری کو ملاحظہ کرو۔ یہاں کی دوسری مشہور چیز سلک کا کپڑا ہے۔ اس سے سلک کی ساڑھیوں کو شہرت ملی۔

مگر اس سلک اور صندل کے شہر میں تو میں الل ٹپ آ نکلا تھا۔ میری بے خبری ملاحظہ کرو۔ سمجھ رہا تھا کہ سری رنگا پٹن بنگلور شہر کے نواح میں ہے۔ وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ تو صوبہ ہی دوسرا ہے۔ میسور کا ویزا تمہارے پاس ہے تو پھر سری رنگا پٹن پہنچ پاؤ گے۔ خیر اب تو میرے ویزے میں کسی شہر کی قید نہیں ہے۔ اسی

کے بل پر تو میں شہر شہر نگر نگر گھوم رہا ہوں مگر اس وقت ویزا میرے پاؤں کی زنجیر بنا ہوا تھا مگر خیر کوئی بات نہیں۔ میسور کی انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری صاحب منصور کی کمک مجھے حاصل تھی اور بنگلو میں ابھی محمود ایاز موجود تھے اور ان کے دوستوں میں خلیل مامون تھے جو ایس پی انٹیلی جنس لگے ہوئے تھے۔ دوسرے دوست عزیز اللہ بیگ کہ گورنر کے پی آر او لگے ہوئے تھے۔ ویسے یہ تو پتہ چل گیا کہ ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں جانے کے لیے ویزا کے حصول میں کتنے اینچ پیچ ہیں یا پیدا کیے جاتے ہیں مگر خلیل مامون کے ہوتے ہوئے کتنی پھرتی سے یہ سارے مراحل طے ہوئے مگر اب جب میں اس دیار میں گیا تو محمود ایاز خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ خلیل مامون سے البتہ ملاقات ہوئی بلکہ ساہتیہ اکیڈمی نے جو اس موقع پر ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا، اس میں وہ مہمان خصوصی تھے۔ ان کی نظموں، غزلوں کا مجموعہ ''آفاق کی طرف'' انہیں دنوں میں شائع ہوا تھا۔ شمیم حنفی کے بقول ''یہ بہت ٹھہر ٹھہر کے یکسوئی کے ساتھ پڑھی جانے والی شاعری ہے۔'' کہتے ہیں کہ ''میں نے اس کے ساتھ جو وقت گزارا، وہ شب و روز کی ہاؤ ہو سے الگ طرح کا وقت تھا۔''

ارے ہاں میسور کا احوال تو بیچ ہی میں رہ گیا مگر میسور میں نے اب کے کہاں دیکھا۔ یونیورسٹی کے مہمان خانے میں قیام تھا۔ وہاں سے نکلے تو سیدھے سری رنگا پٹن اور سری رنگا پٹن سے واپس ہوئے تو پھر یونیورسٹی کے مہمان خانے میں۔ وہ تو یہ کہیے کہ یہاں پروفیسر محمد زماں آزردہ کہ کشمیر سے آئے تھے، یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کیا شگفتہ آدمی ہیں اور کیا خوب چہکتے ہیں۔ ان کے وسیلہ سے میتھلی کے ایک شاعر سے بھی ملاقات ہوگئی۔ یہ اودے نرائن سنگھ تھے۔ اسی یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ شاعر ہیں اور ہندوستانی زبانوں کے سمندر کے تیراک ہیں۔ یہیں گیسٹ ہاؤس کے برابر ایک شاندار عمارت ہے۔ یہاں ایک ادارہ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگو یجز کے نام سے قائم ہے۔ اودے نرائن جی اس کے ڈائریکٹر ہیں۔ اپنے ادارے کی بڑی تفصیل سے سیر کرائی۔ سمجھایا کہ یہاں ہندوستانی زبانوں کے متعلق کام کس انداز سے ہو رہا ہے۔ اس کی تفصیلات کیا ہیں۔ میں تو زبانوں کے اس کارخانے میں پہنچ کر الف لیلہ کا ابوالحسن بن گیا۔

ایک میری حیرانی اور تھی۔ آخر میں نے پوچھ ہی لیا کہ ''اودے نرائن جی، آپ تو زبانوں کے شناور ہیں۔ دوسرے لفظوں میں لسانیاتی محقق۔ ساتھ میں آپ نے شاعری کو بھی اپنا شعار ٹھہرا لیا۔ آخر زبانوں کی شناوری کے بیچ شاعری کے لیے آپ وقت کیسے نکالتے ہیں۔ یہ کمبخت فن تو پوری توجہ مانگتا ہے۔'' کہنے لگے کہ ''مجھے سفر بہت کرنے پڑتے ہیں اور یہاں ہندوستان میں فلائٹس لمبی تاخیر سے چلتی ہیں۔ بس ان اوقات میں کہ وقت ہی وقت ہوتا ہے، فکر سخن ہوتی ہے اور کویتائیں لکھی جاتی ہیں۔'' یہ کہتے کہتے انہوں نے اپنی میتھلی شاعری کا ایک مجموعہ جو ترجمہ کی صورت میں تھا، مجھے تھما دیا۔ مجموعہ کا نام بھی خوب ہے ''سکنڈ پرسن سنگولر''

یہاں جو تقریب منعقد ہوئی اس کی صدارت آزردہ صاحب کر رہے تھے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر سید

اخیل احمد تھے جو یہاں یونیورسٹی میں تجزیاتی کیمسٹری کے استاد ہیں۔ وائس چانسلری کے سلسلہ میں بھی ان کا نام لیا جارہا ہے۔ انہوں نے میرے افسانے "مانوس اجنبی" کی تجزیاتی کیمسٹری خوب کی۔ تجزیہ کر کے اس کے بیچ سے Plusralism کا نکتہ برآمد کیا۔

تو اب کے تو میں میسور یونیورسٹی کے حلقوں ہی میں گھومتا پھرتا رہا تھا۔ آگے آیا تھا تو میسور کے خوشبو شہر کو بھی اچھا خاصا سونگھا تھا۔ صندل کی خوشبو میں رچا بسا یہ نگر خالی دیکھنے کی چیز نہیں سونگھنے کی بھی چیز ہے۔ میں نے بساط بھر سونگھا بھی اور دیکھا بھی۔ میسور کے بازار میں دونوں اہتمام ہیں۔ دیکھو بھی اور سونگھو بھی۔ صندل کی لکڑی سے یہاں کے کاریگروں نے جو گل کھلائے ہیں، ان کے متعلق یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اسے دیکھیں یا سونگھیں۔ بھائی دیکھو بھی اور سونگھو بھی۔ سلک کی ساڑھیوں کو خالی دیکھو اور خوش ہو جاؤ مگر دیکھنے کے لیے یہاں بہت کچھ ہے۔ راجہ کا محل دیکھو۔ ورنداون گارڈن دیکھو۔ راجہ کا محل سبحان اللہ، اسے اس زاویے سے مت دیکھو کہ کتنا قدیم ہے۔ کیسی قدامت، لگتا ہے کہ کل بن کر تیار ہوا ہے۔ سونے میں پیلا ہو رہا ہے۔ مغرب کے ایک ماہر ہنری اروِن نے اس کا ڈول ڈالا تھا۔ جب ہی تو وہ ہندوستان کے قدیم محلات سے کم اور مغرب کے محلات سے زیادہ مشابہ نظر آتا ہے۔ مشرقی رنگ تو بس جھومتے ہاتھیوں کی حد تک ہے۔ اصل میں محل سے نکلتے ہی یہاں ایک مندر کھڑا نظر آتا ہے جس کے آس پاس ہاتھی جھوم جھوم کر پھر رہے تھے اور عقب میں بندروں نے چھاؤنی چھائی تھی۔

اور وندراون گارڈن۔ اس باغ میں بعد میں جھانکنا۔ پہلے کاویری ندی کا زور شور دیکھو۔ یہاں ایک بند باندھا گیا ہے۔ داخل ہوتے ہوتے دیکھا کہ ٹیپو سلطان کی تصویر آویزاں ہے اور اس کے ساتھ فارسی کا ایک کتبہ۔ یہ کس تقریب سے۔ اصل میں یہاں بند باندھنے کا خیال تو ٹیپو سلطان کو سوجھا تھا لیکن تقدیر بیچ میں اور کھیل کھیل گئی۔ سلطنت خداداد ہی تتر بتر ہو گئی۔ پھر ایک زمانے کے بعد جب وڈیر راج کے چوتھے راجہ کرشن راج وڈیر نے 1893ء میں راج سنبھالا تو اس نے اس منصوبے پر توجہ کی اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا مگر راجہ نے ضروری سمجھا کہ جس نے اس منصوبے کی داغ بیل ڈالی تھی، اسے فراموش نہ کیا جائے۔ سو بند کے صدر دروازے میں قدم رکھتے ہوئے پہلے ہم سلطان ٹیپو سے ملتے ہیں۔ آگے ورنداون گارڈن۔ ارے سبحان اللہ کیا باغ سجایا ہے۔ سبزے کا فرش کتنی دور تک بچھا ہوا ہے۔ شام ہوئی تو اور ہی منظر کھلا۔ کیاری کیاری چراغ جل اٹھے۔ رنگ برنگے قمقمے کیسے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ خوب باغ ہے۔ دن میں دیکھو تو الگ بہار ہے۔ رات کو دیکھو اور ہی بہار نظر آئے گی۔

میسور سے بس اتنا ہی تعارف ہوا مگر یہ دیکھیے کہ حیدر علی اور ٹیپو دونوں میں سے کسی نے اس علاقہ کی روایت کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ سری رنگا پٹن، سری رنگا پٹن ہی رہا اور میسور میسور ہی رہا۔ حیدرستان نہیں بنا۔ جس نگر جس شہر کا جو تہذیبی پس منظر تھا، اسے برقرار رکھا۔

میسور کا سفر تمام ہوا۔اب میں بنگلور کی طرف دوڑا جا رہا ہوں۔ پروفیسر مہ جبیں ساتھ ہیں۔ان کا اصرار تھا کہ بنگلور میں آ کر آپ کا استقبال کیا تھا،اب بنگلور تک ساتھ چلوں گی اور وہاں سے آپ کو رخصت کروں گی۔ بنگلور اکیڈمی کے سیکرٹری صاحب بھی رخصت کرنے کے لیے آن پہنچے تھے اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ فلائٹ میں صرف پچیس منٹ کی تاخیر ہوئی۔ارے پچیس منٹ کی کیا اوقات ہے۔وہ تو پلک جھپکتے گزر گئے۔

مگر بنگلور سے گزرتے گزرتے ایک گھڑی ایسی آئی کہ بس سمجھو ہمارے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔سکیورٹی چیک والے دروازے سے گزر رہے تھے کہ سکیورٹی گارڈ نے مجھے سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ پوچھا،کہاں سے آ رہے ہو۔ہم نے دل میں کہا کہ الٰہی خیر۔سکیورٹی گارڈ نے کیا دیکھ کر مجھ پر شک کیا ہے۔زمانہ خراب ہے۔ہم مسافرت میں ہیں۔بری گھڑی آتے دیر نہیں لگتی۔جل تو جلال تو۔آئی گھڑی کو ٹال تو۔اور پھر ہمت کر کے جواب دیا کہ اب تو میسور سے آ رہا ہوں۔ویسے میں پاکستان سے آیا ہوں۔ پاکستان سے،وہ بڑبڑایا اور پھر بولا

کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

بس اتنا کہہ کر مجھ سے بالکل فارغ ہو گیا۔پھر وہی سکیورٹی والی مستعدی۔مجھ سے یکسر تجاہل۔میں نے بھی تیزی سے گزر جانے ہی میں خیریت جانی۔

※ .... ※ .... ※

کلکتہ میں لکھنؤ کی تلاش

سلطان ٹیپو شہید کے مزار پر حاضری دے لی۔ میسور کے سفر کا مقصد پورا ہو گیا۔ بس فوراً ہی بنگلور کی طرف چل پڑا۔ پروفیسر مہ جبیں جنہوں نے کرشن چندر کے افسانوں پر قابل قدر تحقیق کی ہے، مجھے رخصت کرنے بنگلور تک ساتھ آئیں اور بنگلور سے تو وہاں کی ساہتیہ اکیڈمی کے سیکرٹری صاحب بھی ساتھ ہو لیے تھے۔ دونوں کی معیت میں ایئرپورٹ پہنچا۔ لیجیے میسور بنگلور دونوں سے رخصتی۔ چلو اب کلکتہ چلتے ہیں۔

تو اب میں اس نگر میں ہوں جسے کتنے زمانے سے ہم کلکتہ کہتے چلے آئے تھے اور اب میں اسے کولکتہ کہنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر یہ کمبخت زبان سدا سے سہل پسند چلی آتی ہے۔ جو لفظ، جو اصطلاح، جو نام زبان پر چڑھ جائے اسے ترک کرنے پر بہت مشکل سے آمادہ ہوتی ہے۔ اب میں اپنی زبان کو لاکھ سمجھا رہا ہوں کہ کلکتہ کا نام اب بدل گیا ہے یا یہ کہ اس کے تلفظ میں تھوڑی سی ترمیم کر لی گئی ہے مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کلکتہ کہنے پر بضد ہے۔ میں ابھی بنارس میں زبان کی یہ ہٹ دھرمی دیکھ کر آ رہا ہوں۔ سرکاری اعلانات میں کس اہتمام سے ورناسی کہا جا رہا تھا مگر بنارس کے بازار ہاٹ میں جا کر دیکھا تو خلقت نے وہی بنارس بنارس کی رٹ لگا رکھی تھی۔ جو لالہ بنارسی داس تھے، وہ اب بھی بنارسی داس ہی ہیں اور بنارسی ساڑھی بھی ابھی تک بنارسی ساڑھی ہی تھی۔ کوئی اسے ورناسی ساڑھی کہنے کا روادار نہیں تھا اور تو اور بنارس ہندو یونیورسٹی بھی بنارس ہندو یونیورسٹی رہنے پر بضد تھی۔ اس نے اپنے نام میں اس حوالے سے کوئی ترمیم نہیں کی تھی۔ اب کلکتہ میں چل پھر کے دیکھوں گا کہ کلکتہ کی خلقت نے کولکتہ کو سند قبولیت بخشی ہے یا نہیں۔ اگر بازار ہاٹ کی مخلوق اب بھی کلکتہ بول رہی ہے پھر تو کولکتہ کو شرف قبولیت حاصل کرنے کے لیے لمبا ہی انتظار کرنا پڑے گا۔ خیر مجھے کیا۔ میں تو ڈھائی تین دن کے لیے اس نگر میں آیا ہوں، ڈھائی دن کے لیے کیوں اپنی زبان کو کانوں میں گھسیٹوں۔ کلکتہ کہتا آیا ہوں، کلکتہ کہتا چلا جاؤں گا۔ باقی کلکتہ والے جانے۔ کلکتہ کہیں، کولکتہ کہیں۔ میں روکنے ٹوکنے والا کون ہوتا ہوں اور یہی بات ہے ہمیں تو ہمارے شاعروں نے لاچار کر دیا ہے۔ غالب نے کہا

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اور داغ نے یوں کہا کہ۔

عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں
ذرا چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ نکل جائیں

تو عزیزو اب میں کلکتہ میں ہوں۔ ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے ف۔س۔ اعجاز میری میزبانی بلکہ نگہبانی کر رہے ہیں۔ نارنگ صاحب نے چھانٹ کر انہیں میرا میزبان بنایا ہے۔ میزبان اور میزبان سے بڑھ کر نگہبان۔ کتنا دھیان رکھتے ہیں کہ کلکتہ میں جہاں گلی بازار میں چلتے ہوئے بیچ بیچ کندھے سے کندھا رگڑ کھاتا ہے، کہیں کھو نہ جاؤں۔

کلکتہ کا یہ میرا دوسرا پھیرا ہے۔ اب سے تھوڑے برس پہلے میں یہاں ایک انعام وصول کرنے کے لیے آیا تھا۔ اس وقت نرمل ورما اور الوک بھلہ کا ساتھ تھا۔ اے لو، دو یار یتا کو تو بھولا ہی جا رہا ہوں۔ لو بھلا وہ کوئی بھولنے والی چیز ہیں۔ آگے دور درشن پر وقتاً فوقتاً ان کے دور سے درشن ہوتے تھے۔ اب یاترا ایوارڈ کے طفیل قریب سے ان کے درشن ہو گئے۔ ہارپر کولنز کی طرف سے وہی تو ہمیں کلکتہ لے کر چلی تھیں مگر میری اس کلکتہ یاترا کا سہرا تو الوک بھلہ صاحب کے سر بندھنا چاہیے۔ انہوں نے وشوامتر عادل کو ساتھ ملا کر میری چند کہانیوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور ہارپر کولنز کی طرف سے نکلنے والے رسالہ ''یاترا'' میں چھاپ دیا۔ اسی پبلشر کی طرف سے ان دنوں ایک ادبی ایوارڈ کا بھی ''یاترا ایوارڈ'' کے نام سے ڈول ڈالا گیا تھا اور لیجیے پہلا ہی ایوارڈ میری گود میں آن پڑا۔ آگے چل کر بھلہ صاحب نے میری چند مزید کہانیوں کا ترجمہ کر کے ایک مجموعہ بھی "Leaves" کے نام سے اسی پبلشنگ ہاؤس کی طرف سے چھاپ ڈالا۔ یاترا ایوارڈ کی تقریب کلکتہ میں ہوئی تھی تو اسی خوشی میں اس وقت یہ خاکسار کلکتہ پہنچا تھا۔

ارے وہ کلکتہ کا کونسا ایسا سفر تھا کہ اس کا ذکر کیا جائے۔ بارش نے اس سفر ہی کو کھوٹا کر دیا۔ ڈیڑھ دن ہم وہاں رہے۔ صبح بارش شام بارش۔ آندھی دھاندی گئے۔ آندھی دھاندی ایوارڈ لے کر واپس آ گئے مگر بارش نے تو اب کی بار بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔ خیر اب کی بات اور تھی۔ اب کے تو یہاں تین چار دن قیام بھی کرنا تھا۔ ساہتیہ اکیڈمی میزبان تھی اور ف۔س۔ اعجاز جیسا نگہبان میسر آیا تھا۔ ف۔س اعجاز کو آپ کیا سمجھتے ہیں۔ کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں۔ ف۔س اعجاز کلکتہ کی جانی مانی ادبی شخصیت ہیں۔ ان کا رسالہ ''انشاء'' کلکتہ سے نکل کر لاہور اور کراچی تک مار کرتا ہے۔ کلکتہ میں تو اصل میں فورٹ ولیم سکول کے وقتوں سے اردو کا سکہ چل رہا ہے۔ پھر بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں یہاں اردو صحافت نے کتنا زور باندھا تھا۔ کیسی کیسی شخصیت یہاں آ کر رہی اور اردو کے اخبار، رسالے نکالے۔ اب یہاں کی اردو دنیا میں سب سے بڑھ کر ف۔س اعجاز دندناتے ہیں اور صحافت کا حوالہ آیا ہے تو مت بھولو کہ فارسی صحافت نے بھی اسی شہر میں آنکھ کھولی تھی۔ فارسی کا پہلا اخبار اسی شہر سے نکلا تھا۔

یہ سب کچھ برحق ہے مگر ہے تو یہ بنگلہ نگر۔ اس شہر میں قدم رکھنے کے بعد میری پہلی ملاقات بنگلہ بھاشا کے لکھکوں سے ہوئی۔ ساہتیہ اکیڈمی نے اپنے دفتر میں ایک ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ ان گنے چنے ملاقاتیوں میں فکشن کے کچھ چوٹی کے لیکھک شامل ہیں۔ میری کہانیوں میں جو ہندو دیو مالا نے راہ پائی ہے اور ساتھ میں بدھ جاتکوں نے، ان کے بارے میں انہیں کرید تھی۔ اسی واسطے سے کتنے سوال ہوئے۔ بساط بھر میں نے جواب دیئے مگر میں کیا، میرے جواب کیا۔ ہندو دیو مالا تو علم دریاؤ ہے۔ اس کے تو اور چھور ہی کا پتہ نہیں چلتا۔ اب میں کیا جانوں، اس کی لہریں کیسے میری کہانیوں میں در آئیں اور مجھے شرابور کر گئیں۔

پھر آگے چل کر بنگلہ ادیبوں سے ایک ملاقات پرگتی شیل لیکھک سنگھ کی سبھا میں ہوئی۔ یہاں سبھا پتی تھے، گنیش شرما۔ نرے ناستک۔ باپ مندر کا پجاری۔ بیٹے کو بھی اسی راہ پر چلانا چاہا۔ پوجا پاٹ کا سبق پڑھایا مگر بیٹے کے لچھن اور تھے۔ ادھرمیوں کی سی باتیں کرنے لگا اور آخر کو ایک دن گھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ کلکتہ میں آ کر پناہ لی اور ادھرمیوں سے ناتا جوڑا۔ مجھے اپنی ایک تصنیف "Whither Secularism" عنایت کی۔ اسے پڑھ کے دیکھا تو شرما جی ادھرمیوں سے بڑھ کر ادھری نکلے۔ دیوی دیوتاؤں کا جی بھر کے اپمان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ لکشمی دولت کی دیوی ہے مگر اچھی دولت کی دیوی ہے کہ ہندوستان کی خلقت اس کی پوجا کرتی ہے اور خلقت کوڑی کوڑی کو محتاج ہے۔ انا پورن اناج کی دیوی بنی بیٹھی ہے مگر ہندوستان کے آدھے سے زیادہ لوگ دانے دانے کو محتاج ہیں۔ اپنے دیوی دیوتاؤں اور اوتاروں کو رد کرنے کے بعد انہوں نے دوسرے مذاہب کی شخصیتوں کو اسی انداز سے رد کرنے کا حق حاصل کر لیا۔

تو یہ تھے گنیش شرما جو اس جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ جانے کیسے بنگلہ دیش کی معتوب ناول نگار تسلیمہ نسرین کا ذکر نکل آیا۔ وہ نکلنا ہی تھا۔ اس بی بی نے ہندوستان پہنچ کر لوگوں کی ہمدردیاں جیتیں۔ پھر اپنی باتوں سے سب کو اپنا مخالف بنا لیا۔ خاص طور پر بنگلہ کے ادیبوں کو۔ تو یار لوگ پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے، بی بی کا کسی نے حوالہ دیا تو انہوں نے اسے برملا سنانی شروع کر دیں مگر سیکولرازم کے صدقے میں اسے شرما جی کی حمایت حاصل ہوگئی۔ ان کی دیکھا دیکھی حاضرین میں سے کچھ اور بھی اس کی حمایت پر کمربستہ ہو گئے۔ لیجیے وہاں تو اچھا خاصا رن پڑ گیا۔ ف۔س اعجاز بھلا کیوں چپ رہتے۔ ایسی بے دین لکھنے والی کو کیسے معاف کر دیتے۔ شرما جی سیر تو وہ سوا سیر۔ اپنا یہ حال کہ تک تک دیدم، دم نہ کشیدم۔ کتنی دیر بعد کسی بھلے مانس کو خیال آیا کہ اپنے مہمان کو فراموش کر کے یاروں نے اپنی لڑائیاں شروع کر دیں۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔

تب کچھ یاروں نے تو تھمبو کی اور شمع مہمان کے سامنے آئی مگر مہمان تو بنگلہ والوں کا پارہ چڑھا دیکھ کر پہلے ہی سہم گیا تھا۔ بہرحال پارہ جتنی تیزی سے چڑھا تھا اتنی ہی تیزی سے اتر گیا اور جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

اور اب صبح ہو رہی تھی۔ کلکتہ میں میری پہلی صبح۔ ف۔س اعجاز تھے اور دوسرے دوست صدیق عالم

ساتھ تھے۔ نیت یہ تھی کہ ذرا دیکھیں تو سہی کہ شہر کلکتہ کا رنگ کیا ہے اور میری سادگی دیکھو کہ میں کلکتہ میں گھوم رہا تھا اور لکھنؤ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ بالی گنج سے گزرے۔ ہاوڑہ پل پر پہنچے۔ ارے یہ کتنا لمبا پل ہے۔ ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا۔ ادھر مجھے ہاوڑہ پل سے اُدھر کی دنیا میں پہنچنے کی جلدی تھی۔ خدا خدا کر کے ہاوڑہ پل عبور کیا اور صدیق عالم نے خوشخبری سنائی کہ اب ہم مٹیا برج میں داخل ہونے لگے ہیں۔ اچھا تو یہ ہے مٹیا برج۔ جیسے کلکتہ سے الگ کوئی بستی ہو لیکن اگر یہ کلکتہ نہیں ہے تو لکھنؤ بھی تو نہیں ہے۔ اوہ مقام جو میری منزل مقصود ہے، وہ کہاں ہے۔ صدیق عالم ہمارے رہنما اور گائیڈ بنے ہوئے ہیں۔ ایک امام باڑے کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ امام باڑہ سبطین آباد۔ میں حیران ہوتا ہوں "مگر یہ تو امام باڑہ ہے۔"

"ہاں، یہ امام باڑہ ہے۔ واجد علی شاہ کی آرام گاہ اسی امام باڑے میں ہے۔"

تو واجد علی شاہ یہاں لکھنؤ سے دور کلکتہ میں مٹیا برج کے امام باڑہ سبطین آباد میں آسودۂ خاک ہیں۔ قبر کے برابر امام عالی مقام کی ضریح بجی ہے۔ ہاں مزار ہی کے برابر واجد علی شاہ کی اسی زمانے کی بنائی ہوئی ایک تصویر بھی نظر آ رہی ہے۔ جو عجب زاویے سے بنائی گئی ہے کہ جس طرف کھڑے ہو کر دیکھو واجد علی شاہ کا رخ دیکھنے والے کی طرف ہوگا۔ جے گوپال ثاقب لکھنوی کا ایک شعر کتبہ کی زینت ہے جس سے تاریخ وفات نکلتی ہے 1887ء۔

واجد علی شاہ لکھنؤ سے دور ہیں مگر اکیلے نہیں ہیں۔ قریب ہی ان کے فرزند برجیس قدر اور ان کی بہو مہتاب آرا جو بہادر شاہ ظفر کی نواسی تھیں، آسودہ خاک ہیں۔ تصور کیجیے اس بی بی کا جو لکھنؤ سے دور مٹیا برج سے پرے اللہ میاں کے پچھواڑے کھٹمنڈو کے ایک اجاڑ احاطے میں اکیلی سو رہی ہے۔

اسی خاک پر میرا مدفن بنے گا
پہاڑوں میں ہم نے ہے بستی بسائی
لکھا ہوگا حضرت محل کی لحد پر
نصیبوں جلی تھی فلک کی ستائی

مگر اس قبر پر ایسا کچھ لکھا ہوا نہیں ہے۔ میں اپنے سفر نیپال کو یاد کرتا ہوں اور اس اجڑے بچڑے چوک کو تصور میں لاتا ہوں جہاں اردگرد شہتیر پڑے تھے۔ بیچ میں ویرانی کی تصویر ایک مزار۔ ایک زنگ آلود جنگلا۔ جنگلے کے بیچ ایک قبر۔ قبر کے کچے تعویذ میں گرد میں اٹے ہوئے دو پستہ قد درخت جیسے جھاڑیاں ہوں۔ اسی طرح گرد میں اٹا ہوا ایک کتبہ "مقبرہ حضرت محل مرحوم بیگم نواب واجد علی شاہ مرحوم۔ 1293ھ مطابق 1873ء لکھنؤ" کلکتہ، کھٹمنڈو۔

بکھرے گل ریاض پیمبر کہاں کہاں

جب میں امام باڑے سے نکلنے لگا تو منتظمین نے ایک عجب تحفہ مجھے عنایت کیا۔ ایک کتاب "اقلیم

سخن کے تاجدار" مصنفہ کوکب قدر سجاد علی میرزا۔ اشاعت، نوروز پبلی کیشنز، 11 پی مینٹل سٹریٹ، کلکتہ۔ اب جو اس کتاب کو کھول کر دیکھا تو کتنے حقائق جو مجھ ایسے بے خبروں ہی کی نظروں سے نہیں محققوں اور ان باخبروں کی نظروں سے بھی پوشیدہ تھے، جو کچھ اصلی کچھ فرضی افسانوں پر ایمان لا کر واجد علی شاہ کے بارے میں آنکھیں بند کر کے لکھے چلے جا رہے تھے۔

بھلا یہ کوکب قدر سجاد علی میرزا کون ہیں۔ یہ برجیس قدر کے پوتے یعنی واجد علی شاہ کے پڑپوتے ہیں۔ دادا پردادا کے متعلق مشہور افسانوں کو سن سن کر جانے کب سے کڑھ رہے ہوں گے جب انہیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بیٹھ کر کام کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے کمر ہمت باندھی اور اس باب میں تحقیق شروع کر دی۔ ان کی تحقیق کے سرچشموں میں ایک سرچشمہ "اخبارات ڈیوڑھی" ہیں۔ یہ کیسے اخبارات ہیں، مت پوچھو۔ یہ انوکھے اخبارات ہیں۔ بتاتے ہیں کہ حقائق و واقعات کی تحقیق کے سفر میں وہ کہیں اندھرا پردیش کے سٹیٹ ارکاؤز میں جا نکلے۔ وہاں "اخبارات ڈیوڑھی" کی گٹھیاں رکھی تھیں جنہیں سلجھایا جا رہا تھا۔ یہاں پتہ چلا کہ پچھلے وقتوں میں ہر بڑی ریاست میں ریاست حیدرآباد کی طرف سے ایک گوئندہ مامور تھا جو وہاں کا سارا کچا چٹھا نامہ بر کبوتروں کے ذریعے حیدرآباد بھیجتا رہتا۔ یہ روئیداد" سگریٹ کے کاغذوں جیسی مہین جھلی پر درباری فارسی اور خط شکست کی مخصوص طرز میں جسے جناتی کہنا موزوں ہوگا" لکھی جاتی تھی۔ تب نامہ بر کبوتروں کے ذریعہ حیدرآباد بھیجی جاتی تھی۔ "اخبارات ڈیوڑھی" کا وہ سلسلہ جو اودھ سے متعلق تھا، آصف الدولہ کے زمانے سے شروع ہوا اور واجد علی شاہ کی معزولی تک جاری رہا۔

بس ایسے مختلف سرچشموں سے استفادہ کر کے ڈاکٹر کوکب قدر نے یہ تذکرہ مرتب کیا ہے۔ اس تذکرے میں تو بہت کچھ ہے۔ میں اسے اپنے اس تذکرے میں کیسے سموؤں۔ بس اس تذکرے کے مطابق نواب حضرت محل نے جو کھٹمنڈو میں بیٹھ کر اپنی روئداد غم لکھی تھی، اس کے کچھ شعر سن لیجیے۔

حکومت جو اپنی تھی اب ہے پرائی
اجل کی طلب تھی اجل بھی نہ آئی
نہ تخت اور تختہ، اسیری نہ شاہی
مقدر ہوئی ہے جہاں کی گدائی
گھڑی دو گھڑی کے یہ جھگڑے ہیں سارے
ابھی ہوگی قید الم سے رہائی
زمانہ رکھے گا پر اپنی نظر میں
مری سرفروشی مری نارسائی
اسی خاک پر میرا مدفن بنے گا

پہاڑوں میں ہم نے ہے بستی بسائی
لکھا ہوگا حضرت محل کی لحد پر
نصیبوں جلی تھی، فلک کی ستائی

لو میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ وہ کلکتہ تھا، یہ کھٹمنڈو ہے مگر جب مٹیا برج میں جاؤ گے تو دیکھو گے کہ پورا خاندان یہاں کلکتہ کی خاک تلے آرام کر رہا ہے۔ بس ایک بی بی نہیں ہے۔ وہ نصیبوں جلی فلک کی ستائی یہاں سے دور نیپال میں آسودۂ خاک ہے۔

واجد علی شاہ نے تو لکھنؤ سے اجڑنے کے بعد اس دیار میں ایک لکھنؤ بسانے کی کوشش کی تھی۔ خیر لکھنؤ کا پودا کلکتہ کی آب و ہوا میں کیسے بارآور ہوتا اور پھر ایسے شخص کے ہاتھوں جو خود اجڑ چکا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مٹیا برج لگتا ہے کہ بس مسلمانوں کی بستی ہے۔ لکھنؤ اگر یہاں ہے تو بس امام باڑہ سبطین آباد کے اندر اندر ہے۔

تو میں اس اجڑے پجڑے لکھنؤ سے نکلا اور پھر کلکتہ میں۔ وہی سماں کہ ایک تقریب یہاں دوسری تقریب وہاں۔ ف س اعجاز صاحب نے اپنے رسالہ ''انشاء'' کی طرف سے ایک تقریب کا اہتمام کر ڈالا۔ اب میں اس تقریب کا احوال کیا بیان کروں۔ میں ہی تو اس تقریب میں مہمان خصوصی بنا بیٹھا تھا۔

****

سنہری نگری، گلابی نگری، جھیل نگری

اب میں راجستھان میں ہوں۔ صبح کلکتہ میں کی تھی۔ دوپہر بیچ جودھپور میں آن اترا ہوں۔ میں بیچ بیچ ہوا کے گھوڑے پہ سوار ہوں۔ اڑا اڑا پھر رہا ہوں۔ آج اس نگر میں، کل اگلی بستی میں۔ مجھے تو پر لگ گئے ہیں۔ غلط۔ جمع کا صیغہ غلط استعمال کیا۔ ایک پر۔ اسے کہتے ہیں سرخاب کا پر۔ بس یہ سمجھو کہ پریم چند فیلوشپ سرخاب کا پر ہے۔ اس زور پر کل کے گھوڑے پر سوار ہوں۔ اتر سے اڑے دکھن میں جا اترے۔ پورب سے چلے پچھم میں آن پسارے۔ کلکتہ سے زقند بھری، دلی کو چھوتے ہوئے جودھپور میں آن اترے۔ اے لو یہ تو دنیا ہی بدل گئی۔ وہ سرزمین بنگلہ تھی۔ یہ راجستھان کی دھرتی ہے۔ کیا جغرافیائی کیا تہذیبی ہر سطح پر نقشہ بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔

ویسے یہ میری پریم یاترا کا آخری مرحلہ ہے۔ ذرا راجستھان کی خاک پھانک لوں اور ریگ زاروں اور بستیوں میں گھوم پھر لوں۔ پھر راوی اس یاترا کا انت لکھتا ہے مگر یہ تو کل کی بات ہے۔ آج یہ ذکر کیوں لے بیٹھے۔ آج کے دن آج کی بات کرو۔ ابھی کچھ گھڑیوں کے بعد ش، کاف نظام آئیں گے۔ پھر ہم ہوٹل سے باہر نکل کر جودھپور کی کھلی فضا میں سانس لیں گے۔ دیکھیں گے کہ اس ریگستانی علاقہ کے اس نگر میں شام کیسے پڑتی ہے اور رات کیسے بھیگتی ہے۔ ش، کاف نظام ساہتیہ اکیڈی کی طرف سے میرے میزبان ہیں۔ ان سے یہ میری پہلی ملاقات ہے مگر پہلی ہی ملاقات میں دم کے دم میں غیریت کے پردے اٹھ گئے اور اجنبیت کے فاصلے سمٹ گئے۔ مجھے یاد دلایا کہ جس نگر میں آپ نے قدم رکھا ہے اسے مرزا عظیم بیگ چغتائی کا نگر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہیں ان کی آرام گاہ ہے۔ پھر بتانے لگے کہ پچھلے برسوں میں کسی نے یہ شوشہ چھوڑا کہ وہ تو جودھپور میں دفن نہیں ہیں۔ جودھپور کی آندھیوں، بارشوں کی زد میں آ کر کتبہ مٹ منا گیا تھا۔ اب قبر کا تعین کیسے ہو اور کون اس کی تصدیق کرے۔ وہ پورا خاندان ہی جو یہاں شاد آباد تھا، اس نگر کو چھوڑ گیا اور پاکستان کی طرف نکل گیا۔ شاہد احمد دہلوی کے مضمون سے یہ پتہ ملا کہ وہ یہیں دفن ہیں۔ پھر بمبئی جا کر عصمت چغتائی سے رجوع کیا گیا۔ انہوں نے دوٹوک جواب دیا کہ "ارے اور کہاں دفن ہوتے۔ باپ کے برابر پڑے سو رہے ہیں۔" باپ کی قبر کا کتبہ برقرار ہے۔ سو اس طرح قبر کا تعین ہوا اور اب قبر کو درست کر کے نئے سرے سے کتبہ نصب کر دیا گیا ہے۔

13 فروری

صبح کا نکلا اب دن ڈھلے اپنے ٹھکانے پہ واپس آیا ہوں۔ مت پوچھو کہاں کہاں کی خاک چھان کر پلٹا ہوں۔ راہ میں شاد آباد نگر بھی آئے اور اجڑے بے آباد قریئے بھی۔ بار بار ش، کاف سے پوچھتا ہوں کہ ریگستان کہاں ہے۔ یہ تو ہم پھولی سرسوں کے کھیتوں کے بیچ چل رہے ہیں۔ وہ بتا رہے ہیں کہ یہ سب اس نہر کا ظہورہ ہے جو اندرا گاندھی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس نہر کا جاری ہونا تھا کہ ریگستان کی پسپائی شروع ہو گئی مگر پھر انہوں نے مجھے دلاسہ دیا کہ ایسا نہیں ہے کہ ریگستان بالکل ہی پسپا ہو گیا ہو۔ یہ سبزہ زار آخر کتنی دور ہمارے ساتھ چلیں گے۔ ریگ زار سے بھی بہر حال ملاقات ہونی ہے۔

چلتے چلتے ایک بستی سے گزر ہوا۔ تنگ تنگ گلیاں، اونچی اونچی حویلیاں۔ ان حویلیوں کو دیکھو اور راجپوتوں کے ذوق لطیف کی داد دو۔ ہر حویلی کتنی نازک اور نفیس نظر آتی ہے اور جالیاں نزاکت ونفاست کا نمونہ۔ مگر ذرا چھو کر دیکھو، خالص پتھر کا کام ہے اور پتھر کی رنگت کو ذرا ملاحظہ کرو۔ زردی مائل، یہاں سے برآمد ہونے والے پتھر کی رنگت یہی ہے۔ یہ زمین لال پتھروں سے نا آشنا ہے۔ بس زرد پتھر اگلتی ہے۔

ش، کاف بتا رہے تھے کہ ان حویلیوں کا تو سودا ہو گیا تھا اور کیسے غضب کا سودا ہوا تھا کہ یہاں سے ان حویلیوں کو اکھاڑو اور امریکہ میں لے جا کر سجا دو۔ میں حیران ہوتا ہوں اور پوچھتا ہوں مگر کیسے؟ آخر یہ کاغذی تو نہیں ہیں، پتھر کی عمارتیں ہیں۔ زمین کی تہہ میں اتری ہوئی ہیں۔ کاریگری سے پتھر پہ پتھر جمائے گئے ہیں۔ تب سنگ وخشت نے اپنا جلوہ دکھایا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ سارے پتھروں پہ نمبر لگا دیئے گئے تھے۔ انہیں پتھروں کو وہاں اسی حساب سے جوڑ کر دیوار و در کھڑے کرتے۔ چھتیں پاٹتے اور امریکہ کی زمین پر ایک جیسلمیر نام کا نگر کھڑا کر دیتے مگر اندرا گاندھی کو بروقت پتہ چل گیا۔ اس نے اس سارے سودے پہ خط تنسیخ پھیر دیا۔ یوں جیسلمیر کی دولت لٹنے سے بچ گئی۔

قلعہ کو باہر سے دیکھا۔ اندر جانے کا نہ وقت تھا نہ ہمت تھی۔ اہل ہمت نے اونچی پہاڑیوں پر تعمیر کیا ہے اور اس طرح کھڑا کیا ہے کہ دیواروں سے سر پھوڑ کر مر جاؤ، اندر قدم نہیں رکھ سکتے۔ تب ہی تو فاتحین آئے اور ہمت ہار کر چلے گئے۔ شہر پر آنچ نہیں آئی کہ پورا شہر قلعہ کے اندر تھا۔

حویلیاں دیکھیں، گلیوں میں گھومے پھرے۔ گلیوں سے نکل کر اس جھیل کو دیکھا جس کے ارد گرد خوبصورت چبوترے، سائبان اور مندر نظر آ رہے تھے۔

جیسلمیر کیا شاد آباد بستی ہے مگر اس سے نکل کر جب اگلی بستی میں قدم رکھا تو اسے ویران پایا۔ مکان موجود، مکین غائب اور مکان اس طرح موجود کہ در و دیوار سلامت ہیں مگر چھتیں غائب ہیں۔ گلیاں سنسان، کوچے ویران، نہ آدمی نہ آدم زاد۔ نہ ڈھور ڈنگر نہ چرند پرند۔ ساری بستی خالی ڈھنڈار۔

میں نے پوچھا ش کاف صاحب یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ بستی خرابہ کیسے بنی۔ باسی کدھر کوچ کر گئے۔

اس عزیز نے اس بستی کی کہانی یوں سنائی کہ کہتے ہیں کہ اب سے تین سو ساڑھے تین سو برس پہلے یہ ایک بھری پری بستی تھی۔ علاقہ کے راجہ نے اس بستی کی ایک سندر کنیا کو تاڑا اور اسے اٹھوا لیا۔ بستی کے باسیوں نے عجب رنگ سے احتجاج کیا کہ راتوں رات وہ بستی سے نکل کر جانے کدھر نکل گئے۔ چلتے وقت بددعا دی کہ اب یہ بستی کبھی آباد نہ ہو۔ تب سے یہ بستی اس بددعا کے اثر میں ہے۔ خالی ڈھنڈار پڑی ہے اور ہوحق کرتی ہے۔

اس ڈھنڈار نگر سے آگے ریگ زار کے اثر آثار نمایاں ہونے لگے اور اسی کے ساتھ موٹریں دوڑتی نظر آئیں۔ یہ سیاح تھے۔ سفید فام سیاح۔ ریگ زاروں کی طرف دوڑے چلے جا رہے تھے مگر ریگ زار کے کنارے پہنچ کر رک جاتے تھے۔ موٹر کا سفر تمام ہوا۔ آگے اونٹ کی سواری۔ اونٹ پر بیٹھو اور ریگستان کی سیر کرو مگر سیر کرنے کے لیے وہاں تھا کیا۔ ریت کے سمندر کو دیکھتے چلے جاؤ اور ریگستان کی سیاحت کا تمغہ لے کر واپس آؤ۔

میں نے دور سے ریگ زار کو دیکھا اور مطمئن ہو گیا۔ یاروں نے کہا کہ اونٹ پہ بیٹھو۔ ارے یارو اونٹ پہ بیٹھ تو جائیں مگر کوہان کا ڈر ہے۔ ہم نے کہا کہ پھر اونٹ کی سواری کو دور سے سلام ہے اور واپس ہو لیے۔

14 فروری

صبح ہوتے پر اٹھا۔ نہایا دھویا۔ کل کی تھکن اتر چکی تھی۔ اب میں تازہ دم تھا۔ نیچے ریستوران میں جا کر آلو پوری کا ناشتہ کیا۔ واپس آ کر سوچا کہ اب کیا کریں۔ ش، کاف تو دیر سے آئیں گے۔ دریچہ کھول کر دیکھا تو کیا خوشگوار منظر آیا۔ وسیع و عریض سبزہ زار میں فاختائیں اتری ہوئی ہیں۔ ان سے ہٹ کر جنگلی کبوتروں نے اپنی سبھا جمائی ہوئی ہے۔ کس انہماک سے گھاس کو کرید کرید کر دانہ دنکا چگ رہی ہیں مگر مجھے فاختائیں حیران کر رہی ہیں۔ فاختائیں اتنی تعداد میں اور اتنی بڑی بڑی۔ اے جودھپور کی فاختاؤ تم ریگستان کے بیچ اس سبزہ زار میں شاد آباد رہو۔ ارے یہ زمین کا ٹکڑا تو اب نام ہی کا ریگستان ہے۔ بھلا جہاں سرسوں پھول رہی ہو وہاں ریگستانوں کا کیا کام۔ وہ تو جیسے منہ چھپاتا پھر رہا ہو۔ بس کبھی کبھی جھلک دکھاتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔

اے لو وہ شین کاف آ گئے۔ ہوٹل سے نکلتے ہیں۔ شہر دیکھیں۔ شہر کے قلعہ کو دیکھیں۔

اب میں قلعہ میں ہوں۔ منڈیر سے نیچے گہرائی میں اس نامبارک گلی کو دیکھ رہا ہوں جہاں سے گزرے سے میں ستی ہونے والی رانیاں گزرا کراتی تھیں۔ راجہ جی گزر گئے۔ رانیوں نے رنڈاپے کی کفنیاں اوڑھیں اور چلیں ستی ہونے۔ مجال ہے کہ رکھ رکھاؤ میں فرق آئے اور چال موت کے ڈر کی چغلی کھائے۔ اسی رانیوں والے وقار کے ساتھ چلی جا رہی ہیں۔ ادھر الاؤ بھڑک رہا ہے۔ قدم بڑھاتی ہیں اور الاؤ میں اتر جاتی ہیں۔ موت کو کس وقار کے ساتھ گلے لگایا ہے۔

15 فروری

صبح منہ اندھیرے اٹھا۔ آج تو جے پور جانا ہے۔ سامان باندھا۔ پھر نہایا دھویا۔ ناشتہ کے نام

وہی آلو پوری۔

ارے ہاں کل شام جو تقریب ہوئی تھی اس کا ذکر بھی ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔دم کے دم میں اتنے گجرے گلے میں پڑے کہ میں پھولوں میں دب کر رہ گیا۔شال اڑھائی گئی۔سر پر جودھپوری پگڑی سجائی گئی۔علی گڑھ سے یہاں جودھپور تک کتنی شالیں اوڑھ چکا ہوں۔اب ان میں جودھپوری پگڑی کا اضافہ ہو گیا۔

میں اپنی دانست میں اپنی ساہتیہ یاترا کے آخری مرحلہ میں ہوں مگر بلاوے چلے آرہے ہیں۔جب میں ریگستان کی سمت رواں تھا تو موبائل نے کہ دلی سے چلتے وقت نارنگ صاحب نے ہاتھ میں پکڑا دیا تھا، پکارنا شروع کر دیا۔یہ وارث علوی کی آواز تھی۔ارے کہاں سے بول رہے ہو۔احمد آباد سے۔سبحان اللہ، تری آواز مکے اور مدینے۔ڈاکٹر شریف وجلی والا کی طرف سے بلاوا پہنچا رہے ہیں کہ احمد آباد آؤ اور مقرر آؤ۔ڈاکٹر وجلی والا گجراتی کی لیکھکہ ہیں۔میرے افسانوں پر تحقیق کر رہی تھیں۔وہ کام مکمل ہوا۔میرے چند افسانوں کے گجراتی میں ترجمے بھی کر ڈالے ہیں۔وہ مجموعہ چھپنے کو ہے۔اب انہیں حق پہنچتا ہے کہ مجھے اپنے نگر میں آنے کا بلاوا بھیجیں مگر نارنگ صاحب نے کچھ سوچا ہی ہوگا کہ میرے پروگرام میں احمد آباد کو شامل نہیں کیا۔اے وارث علوی اور اے بی بی شریفہ وجلی والا تم اس دیس میں رہتے ہو، کمال کرتے ہو۔میں اپنے تلوے کو دیکھتا ہوں۔اس میں احمد آباد کے نام کی کوئی لکیر، کوئی تل ہے کہ نہیں۔نہیں ہے۔بہت مایوسی کی بات ہے۔سو اب دور ہی سے علیک سلیک کر لو۔

16 فروری

جودھپور پیچھے رہ گیا۔آگے جے پور ہے۔موٹر میں بیٹھا اس طرف دوڑا چلا جا رہا ہوں۔شین کاف ہمراہ ہیں۔وہ بتاتے ہیں اور مجھے دھیان آتا ہے کہ ارے اس راستے میں تو اجمیر کی نگری بھی آتی ہے۔خواجہ غریب نواز سے کنی کاٹ کر کیسے نکل جاؤں۔اس درگاہ پر بھی سر نیاز خم کرنا ضرور ہے اور اب اس خیال سے خوشی ہو رہی ہے کہ اس مبارک قریئے کو بھی ایک نظر دیکھ لوں گا مگر اس مبارک قریئے میں جا کر اور ہی نقشہ سامنے آیا۔

آج جمعہ کا دن تھا۔عقیدت مندوں کا ہجوم تو اور دنوں میں بھی ہوتا ہوگا۔آج جمعہ کی تقریب سے زیادہ تھا۔درگاہ کے باہر درگاہ کے اندر سروں کا سمندر امنڈا ہوا کہ اوپر سے تھالی پھینکو تو زمین پر گرنے کی بجائے سروں پر تیرتی چلی جائے۔مزار کے گرد مجمع ٹھسا ٹھس۔مشہد مقدس میں ایسے مجمع کا تجربہ کر چکا ہوں۔جوشِ عقیدت جس تیزی سے امنڈتا ہے اسی تیزی سے ہوا ہو جاتا ہے۔فکر یہ دامن گیر ہو جاتی ہے کہ عقیدت مندوں کے درمیان پس کر نہ رہ جائیں۔سو وہ جو آرزو تھی کہ گھڑی بھر کے لیے مزار کے سامنے عقیدت سے سر جھکا کر اپنے آپ کو خواجہ غریب نواز کے حضور سپرد کر دیں، وہ تو پوری نہ ہوئی۔بس رسمی سلام اور رخصت۔

بہر حال اجمیر میں دوسرے حوالوں سے چند گھنٹے ضرور گزارے۔شین کاف نے کچھ ہندی اور

راجستھانی کے لکھنے والوں کو اطلاع دے دی تھی۔ ان کے ساتھ اچھا وقت گزرا۔ کچھ کھانا دانہ۔ کچھ ان سے بات چیت۔ پھر لپک جھپک ان سے رخصت ہو کر چلے جے پور کی طرف۔ بس سمجھ لو کہ سارا دن سفر میں گزر گیا۔ دن ڈھلا شام پڑی، رات آئی اور ہم جے پور میں جا اترے۔

17 فروری

جے پور میں رات کے سمے پہنچے تھے۔ رات کے سمے میں جے پور کا کیا پتہ چلتا تھا۔ وہ تو جب میں صبح کو جاگا اور پھر ہوٹل سے باہر قدم نکالا تب میں حیران ہوا کہ یہ میں کس نگر میں آ گیا ہوں۔ گلابی نگری کہاں ہے۔ مور کہاں ہیں۔ مستطیل کی شکل میں وہ جو صاف شفاف سڑکیں کہاں گئیں اور بیچ بیچ میں آنے والی چوپڑ۔ پھر میں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر سمجھایا کہ ارے اب تو تم گھنی آبادی کے بیچ آ کر اترے ہو۔ یہاں مور کیوں اپنے درشن دینے لگے ہیں۔ تب تم گھنی آبادی سے فاصلہ پر ریسٹ ہاؤس میں آ کر اترے تھے۔ پہاڑیوں کے بیچ سے گزرے تھے۔ موروں نے پہاڑیوں کی بلندیوں سے میاؤں کی جھنکار سے تمہارا استقبال کیا تھا اور وہ ریسٹ ہاؤس اپنی جگہ کتنا پرفضا استھان تھا۔ مور بلا تکلف اس کے صحن میں آن اترے تھے۔ اردگرد جو سڑکیں اور گلیاں پھیلی ہوئی تھیں، ایک دوسرے کے متوازی اور اس طرح جیسے پیمانے سے ناپ کر سیدھوں سیدھ رستہ بچھایا گیا ہو۔ اس کے متوازی دوسرا رستہ۔ آگے چل کر چوپڑ اور ہاں وہ گلابی ہوا محل بس جیسے ایک گلابی دیوار جالی دار کھڑی ہو۔ اس کے پیچھے سے رانیاں، راجکماریاں راجپوت سورماؤں کے جلوس کا نظارہ کرتی تھیں۔ گلابی نگری کا یہ سارا نقشہ سر اسماعیل نے کہ یہاں وہ اس کام پر مامور تھے، بچھایا تھا۔ یہاں ایک سڑک بھی ان کے نام کی پھیلی ہوئی ہے۔ تو جس اپنے پھیرے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت یہاں گلی کوچوں میں راہگیر کم اور مور زیادہ تھے۔

اب شہر میں گھومتے پھرتے میں نے اس کوچے میں آ کر دیکھا تو گلابی رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ ٹریفک بہت تھا۔ ہوا محل بھی جیسے اس ٹریفک سے پریشان کھڑا ہو۔

سو اچھا ہی ہوا۔ اس شہر میں قیام لمبا نہیں کھنچا۔ ایک دن کا قیام تھا۔ اسی شام ایک تقریب ہوئی۔ گلے میں گجرا پڑ گیا۔ سر پہ شال اوڑھائی گئی۔ لیجیے جے پور کی آمد سپھل ہو گئی یا کہیے کہ رسم پوری ہو گئی۔ اب اس نگر کو سلام کرو اور اس نگری کی طرف چلو جس کے اشتیاق میں یہاں تک آئے ہو۔ میرا بائی کی نگری اودے پور۔

18 فروری

جودھپور سوریہ نگری۔ جیسلمیر سنہری نگری۔ جے پور گلابی نگری۔ اودے پور جھیل نگری۔ ج، ج، ج۔ میں گلابی نگری سے اڑا اور جھیل نگری میں آن اترا۔ نگری میں قدم رکھتے ہی کیا خوب منظر آنکھوں کے سامنے ابھرا۔ بلند و بالا پہاڑیاں قطار اندر قطار۔ ان کے بیچ سڑکیں صاف شفاف، چکنی ہموار ایسی کہ ان پر موٹر چل نہیں رہی ہو، بہتی چلی جا رہی ہو۔

مگر جب یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں جا کر اترا تو سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ کمرے کا جائزہ لیا اور پریشان ہوا کہ اچھا مجھے یہاں بسیرا کرنا ہے۔ باتھ روم میں جھانکا تو اس کا حال اس سے بڑھ کر ابتر نظر آیا۔ میزبان تو مجھے یہاں دھکیل کر چلے گئے جہاں پہلے سے کوئی ٹھہرا ہوا ہے۔ اب میں کیا کروں۔ بس حیران و پریشان کھڑا تھا کہ ایک نوجوان وارد ہوا۔

''آپ انتظار حسین ہے نا؟''

''جی۔''

''مجھے وائس چانسلر صاحب نے بھیجا ہے۔ میں ان کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ یہ جگہ آپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے آپ کے قیام کا انتظام سرکٹ ہاؤس میں کیا ہے۔''

میں نے سوچا کہ یہ نوجوان تو واقعی فرشتۂ رحمت نکلا۔

وائس چانسلر صاحب کے لیے کہ شہر کے کمشنر بھی ہیں، دل سے دعا نکلی۔ سامان ابھی کھولا کہاں تھا۔ بس اسے اٹھوا فوراً ہی کمرے سے بلکہ گیسٹ ہاؤس سے نکل کھڑا ہوا اور باہر نکل کر اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

سو اب میں سرکٹ ہاؤس میں ہوں۔ کھڑکی سے باہر جھانکا تو ایک موتی ایسی جھیل لہریں لیتی نظر آئی۔ جھیل نگری کا اب درشن ہوا۔

جھیل کے نظارے سے فارغ ہوا تو ثروت خاں نمودار ہوئیں۔ لڑکیوں کے کالج میں اردو کی استاد ہیں۔ افسانے اور ناول لکھتی ہیں اور یہ رضوانہ ہیں۔ خوب بی بی ہیں۔ سائنس کی طالب علم تھیں۔ ایم ایس سی کر کے فارغ ہوئیں۔ اس کے بعد شادی۔ مگر پھر یکایک ادب کی بڑک اٹھی۔ ایم اے اردو میں داخلہ لے لیا۔ راجندر سنگھ بیدی پر تحقیقی مقالہ باندھا۔ اب پی ایچ ڈی کی دھن سوار ہے۔ میرے افسانوں پر بھی نظر ہے۔ کل اپنا مقالہ پیش کریں گی۔ دیکھیے کیا برآمد ہوتا ہے۔

19 فروری

صبح سویرے یونیورسٹی کا رخ کیا۔ وہاں ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام ہے۔ میرے افسانوں کے حوالے سے دو مقالے ایک رضوانہ کا، ایک اسماء مسعود کا۔ اس کے بعد اس تقریب میں ایک اور تقریب آن ملی۔ اصل میں یہاں دو تقریبوں کے گھال میل سے ایک مرکب تیار کیا گیا ہے۔ دوسری تقریب حافظ محمود شیرانی توسیعی خطبہ۔ یہ خطبہ پروفیسر فیروز احمد نے پیش کیا۔ پھر مجھے کیا کرنا تھا۔ خطبہ کے حوالے سے اختتامی کلمات ادا کیے اور فارغ ہوگیا۔

شام پڑے ثروت خاں نے اپنی انجمن کی محفل سجائی جہاں اردو اور ہندی کے ادیب جمع تھے۔ لیجیے ایک اور شال اور ایک اور پگڑی۔ ارے پچھلی پگڑی تو جودھپور پگڑی تھی، اودے پور پگڑی کی اپنی شان تھی۔ اور ہاں اودے پور عجب نگر ہے۔ لکھنے والے نظر نہیں آئے۔ لکھنے والیوں کی ریل پیل ہے۔ ثروت

خاں بھی تو افسانے ناول لکھتی ہیں۔ راجستھان کا کلچر اپنی اچھی اور بری رسموں ریتوں کے ساتھ ان کا موضوع ہے۔ راجستھانی لہجہ کو اپنا رکھا ہے۔ میں نے انہیں داد دی کہ یہ اچھا کیا۔ ہمیں کچھ راجستھانی اردو کا بھی تو پتہ چلنا چاہیے۔ عصمت چغتائی نے تو اس پر توجہ نہیں کی۔ دیکھنا چاہیے کہ تمہارے یہاں اس کا کیا رنگ نکلتا ہے۔

ویسے تو میرے میزبان شعبہ اردو کے صدر پروفیسر رئیس احمد ہیں مگر میری خبر گیری اصل میں یہ دو بیبیاں کر رہی ہیں۔ ثروت خاں اور رضوانہ۔ اور رضوانہ کچھ زیادہ ہی پر جوش نظر آ رہی ہیں۔

20 فروری

تقریبوں سے فراغت ہوئی۔ اب گھومیں پھریں گے اور جھیل نگری کی سیر کریں گے۔ دیکھنے کو یہاں کیا ہے۔ سہیلیوں کی باڑی جہاں آ کر راجکماریاں سیر و تفریح کرتی تھیں، اشنان کرتی تھیں۔ چلیے اسے دیکھ لیا۔ آگے؟ آگے موتی مگری نام کی ایک پہاڑی ہے۔ یہاں رانا پرتاپ سنگھ کے گھوڑے کا مجسمہ کھڑا ہے۔ کیا وفادار گھوڑا تھا۔ جب میدان جنگ میں رانا پرتاپ زخمی ہو گیا تو یہ گھوڑا اُس حفاظت کے ساتھ اسے ایک محفوظ مقام پر لے گیا جہاں پہنچ کر رانا نے دم توڑ دیا مگر بابا میں یہاں رانا پرتاپ کی خاطر نہیں آیا ہوں۔ اس کے گھوڑے کے مجسمہ کو دیکھ کر میں کیا کروں گا۔ میں میرا بائی کا نام لیوا ہوں۔ مگر یہاں میرا بائی کے آثار کہیں نظر نہیں آ رہے۔ شہر رانا پرتاپ سنگھ کے رعب میں سانس لے رہا ہے۔ یاروں نے کہا تم نے ٹھیک قیاس کیا۔ اصل میں یہاں راناؤں کے کنبہ نے میرا بائی کے اس قصور کو اب تک معاف نہیں کیا کہ اس نے محل دو منوں کو سلام کیا اور کرشن بھگتی میں سرشار ہوں بستیوں میں ماری ماری پھرنے لگی۔ کرشن بھگتی اپنی جگہ مگر راجپوتی آن والے سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کی آن پر حرف آیا۔

پھر بھی میں ٹوہ لیتا پھرتا ہوں کہ میرا بائی کے کچھ آثار تو ہوں گے۔ وہ کہاں ہیں۔ مشکل سے پتہ چلا کہ یہاں ایک میرا بائی میوزیم ہے۔ اس سے متصل میرا بائی مندر۔ اچھا اس میوزیم میں چل کر جھانکتے ہیں۔

مگر میرا بائی میوزیم بند ہے۔ بھائی کیوں بند ہے۔ جواب ملتا ہے کہ آج یہاں تعطیل کا دن ہے۔ میں دہائی دیتا ہوں کہ یارو، میں تو پاکستان سے میرا بائی کے نام کی مالا جپتا یہاں پہنچا ہوں۔ یہ حوالہ درمیان میں نہ ہوتا تو میں بھلا راجستھان کی نگریوں بستیوں کو الانگتا پھلانگتا یہاں کیوں آتا۔ اس کلام نے میوزیم کے کارکنوں کو تھوڑا موم کیا۔ میوزیم کے دروازے کھل گئے۔ میوزیم کے منتظم کو بھی یہ پیغام مل گیا تھا۔ وہ بھی آن پہنچے۔ میوزیم کو دیکھا بھالا۔ کوئی بڑے پیمانے پر یہ ادارہ قائم نہیں ہے۔ پھر بھی اس میں گھوم پھر کر میرا بائی کی تصویروں اور اس سے متعلق دوسری یادگاری اشیا کو دیکھ کر تھوڑی تسکین ہوگئی۔

مگر میں میرا کو اودے پور میں کیوں ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ داسی جنم جنم کی۔ وہ تو یہاں سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ متھرا میں جا کر ٹوہ لو۔ شاید وہاں کچھ اتا پتا ملے۔

ଛ ....ଓ ....ଓ

ذاکر حسین کالج میں

ہر پھر کر پھر دلی میں۔ ہندوستان کی وشال دھرتی کے چاروں کونوں کو چھو کر واپس دلی آ گیا ہوں۔ دلی سے آگے روانہ ہوتے وقت میں نے نارنگ صاحب سے گزارش کی تھی کہ واپس جب دلی آؤں تو اشوک ہوٹل کے سوا کہیں انتظام کیجیے۔ اصل میں ڈینگی بخار کی وجہ سے جو میرا سفر ملتوی ہوا تھا تو اس کے ساتھ ہی آئی آئی سی میں میرے نام کی بکنگ منسوخ ہو گئی۔ پھر دوبارہ وہاں بکنگ ممکن نہیں ہوی۔ تب اشوک ہوٹل میں قیام میرے نام لکھا گیا۔ بہرحال اب واپسی پر یہ صورت ہوئی تو آئی آئی سی میں آ کر دو دن یہاں پڑاؤ کرنا پڑا۔ اس کے بعد جامعہ ملیہ کے مہمان خانے میں منتقل ہو جاؤں گا۔ اس انتظام پر میں خوش ہوں۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ یونیورسٹیوں کے مہمان خانوں میں قیام یوں بھی مجھے بھلا لگتا ہے اور اگر وہ مہمان خانہ علی گڑھ یونیورسٹی کا یا جامعہ ملیہ کا ہو تو یہ قیام اور بھی بھلا لگتا ہے۔

تو میں لبے آڑے ترچھے سفر کے بعد آئی آئی سی میں آ کر اترا اور اطمینان کا لمبا سانس لیا مگر دوسرے ہی لمحہ نئی فکر سر پہ سوار ہو گئی۔ ارے کل تو نہیں پرسوں مجھے ذاکر حسین کالج میں جا کر ذاکر حسین توسیعی خطبہ عرض کرنا ہے۔ وہ کب اور کیسے لکھا جائے گا۔ لے دے کے ایک ہی دن میرے پاس ہے۔ کچھ ملنے جلنے کے لیے بھی وقت نکالنا ہے اور جو خطبہ میں نے عرض کرنا ہے اسے قلمبند کرنا ہے۔ یہی تو میں نے مدعوعین سے معذرت کی تھی کہ پہلے سے تو مجھے یہ اطلاع ہی نہیں تھی کہ مجھے اس تاریخی کالج سے یہ عزت بخشی جا رہی ہے۔ سفر میں مجھے سوچنے اور لکھنے کا کہاں وقت ملے گا اور ویسے بھی توسیعی خطبہ تو ایک عالمانہ تحریر ہوتی ہے۔ میں نہ عالم نہ محقق، خالی خولی افسانہ نگار ہوں۔ افسانے سے ہٹ کر بولنے کا موقع آئے تو غیر عالمانہ قسم کی باتیں کر کے سر سے بوجھ اتارتا ہوں۔ ادھر سے جواب آیا کہ جو بھی اور جس رنگ میں بھی آپ بولیں گے، ہمیں منظور ہے۔ میں نے بھی دل میں سوچا کہ عزیز جس کالج میں تمہیں مدعو کیا جا رہا ہے، تم اسے معمولی درسگاہ سمجھ رہے ہو۔ ارے اس کا رشتہ تو اس نامی گرامی دلی کالج سے ملتا ہے جس نے انیسویں صدی میں دلی میں نئی علمی روایت کی داغ بیل ڈالی تھی اور دلی کالج کے ڈانڈے اس مدرسہ غازی الدین سے ملتے ہیں جس نے آخری دور مغلیہ میں کہہ لیجیے کہ اورنگزیب عالمگیر کے زمانے میں ظہور کیا تھا۔ دلی کالج 1857ء کی رستخیز بے جا میں تباہ

و برباد ہوا۔ جب دوبارہ دھیرے دھیرے کر کے اس کی تجدید ہوئی اور پھر سے اس نے رونق پکڑی تو ڈاکٹر لائٹنر اس کی جان کو آ گئے۔ موصوف نے دلی کالج کے خلاف ایک اچھی خاصی مہم کا آغاز کر دیا اور تجویز یہ پیش کی کہ اس کالج کا بستر لپیٹو اور اس کے عملہ کا تبادلہ لاہور کر دو۔ مگر جب دلی کے شہریوں کا ردعمل سامنے آیا تو اس تجویز کو رد کر دیا گیا۔ تجویز بے شک رد ہو گئی مگر ہنڈیا اس کے بعد بھی پکتی رہی۔ لائٹنر نے اپنی مہم جاری رکھی۔ آخر اس نے اپنی تجویز منظور کرا ہی لی۔ سو دلی کالج بند ہو گیا۔

کہیں میں نے یہ احوال اپنی کتاب ''دلی تھا جس کا نام'' میں درج کر دیا تھا۔ لاہور میں لائٹنر کے ایک عاشق صادق بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر اکرام چغتائی۔ ان کی نظر سے یہ بیان گزرا تو فوراً اس کی تردید پر آمادہ ہو گئے۔ اس مرد محقق کا تردیدی بیان میں نے سنا اور عرض کیا کہ آپ کا محققانہ مرتبہ برحق مگر میں نے بھی جو احوال رقم کیا ہے، وہ ایک ایسی مورخ کے حوالے سے درج کیا ہے جو دلی کے اس دور پر سند ہیں۔ وہ نرائنی گپتا ہیں جن کا تحقیقی کام "Delhi Between Two Empires" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ دلی پر آپ کا کوئی تحقیقی کام میری نظر سے گزرا ہوتا تو میں آپ کے اس بیان کو مستند مان کر اپنی تحریر پر نظر ثانی کرتا۔ اب تو ایک یہی صورت میری سمجھ میں آتی ہے کہ آپ زبانی کلام سے گزر کر اپنی تحقیق کو ضابطۂ تحریر میں لائیں۔ پھر میں سوچوں گا کہ اس کتاب سے دوبارہ رجوع کرنا چاہیے اور اگر ضرورت پیش آئی تو میں نرائنی گپتا سے کہ دلی میں رہتی ہیں، رجوع کروں گا۔ اس پر وہ چپ ہو گئے۔

اب ڈاکٹر نرائنی گپتا کا حوالہ آ ہی گیا ہے تو کیا مضائقہ ہے کہ چلتے چلتے ان سے اپنے تعارف کا ذکر کرتا چلوں۔ میرا بھی چلتے چلتے ہی ان سے تعارف ہوا تھا۔ حیدرآباد میکس ملر بھون میں ہونے والے جس سیمینار کا ذکر پچھلے صفحوں میں ہوا، اس کی تقریب سے میں حیدرآباد جا رہا تھا۔ دلی سے وہاں جانے والی فلائٹ پکڑی۔ بس جہاز میں چڑھنے لگا تھا کہ ایک بی بی، سفید ساڑھی، سانولی رنگت، ماتھے پہ بندی، قریب آئیں اور بولیں ''آپ انتظار حسین تو نہیں ہیں۔''

''جی وہی ہوں۔''

''آپ شاید میکس ملر بھون والے سیمینار میں جا رہے ہیں۔''

''جی نیت تو یہی ہے۔''

''میں بھی وہیں جا رہی ہوں۔ میرا نام نرائنی گپتا ہے۔''

بس جہاز پہ چڑھتے چڑھتے تھوڑی باتیں ہوئیں۔ پتہ چلا کہ انہوں نے دلی کے 1803ء سے 1931ء کے زمانے پر تحقیق کر رکھی ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ ارے میں نے جو اپنے مضمون میں روایتی شہروں کے ذیل میں حوالہ دیا ہے، وہ تو اسی دور سے متعلق ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیق کے زور پر میرے کسی بیان پر سوال کھڑا کر دیا تو میں کیسے نبٹوں گا۔ خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ جو ہو سو ہو مگر خیریت گزری۔ انہوں نے

میرے کسی بیان پر پکڑ نہیں کی۔ اگر کہا تو وہ بھی نشست کے بعد اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہ "آپ نے دینا اولڈنبرگ کا حوالہ تو دے دیا جس کا کام لکھنؤ پر ہے۔ دلی پر تو میں نے کام کیا ہے، اس حوالے کی آپ نے ضرورت نہیں سمجھی۔"

اس پر میں تھوڑا اگڑ بڑایا۔ پھر صفائی پیش کی کہ "اس بی بی کی کتاب تو میری دسترس میں تھی۔ میں جاہل ان پڑھ آپ کے کام سے بے خبر تھا۔ پتہ ہی نہیں تھا کہ یہ کتاب کب چھپی اور کہاں سے ملے گی۔"

میرے اس بیان صفائی نے فرمائش کا اثر دکھایا۔ ہنسیں۔ کہا کہ "آپ واپس دلی ہی جائیں گے نا۔ وہاں جا کر آپ کو یہ کتاب پیش کروں گی۔"

وعدے کے مطابق واپسی پر وہ انڈیا انٹرنیشنل میں دوستوں سے جو میری ملاقات ہوئی تھی اس میں پہنچیں اور اپنی کتاب سے نوازا۔ یہ کتاب ایک دوسرے سلسلہ میں بہت کام آئی۔ آخر میں نے حکیم اجمل خاں پر بھی تو ایک کتاب مرتب کی تھی۔ تحریک خلافت اسی زمانے میں پروان چڑھی تھی۔ اس تحریک کے ذیل میں حکیم اجمل خاں نے دلی کے مسلمانوں سے اپیل کی کہ ہندو ہم وطنوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے ہمیں گائے کے ذبیحہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ مولانا محمد علی کی بی اماں تو اس حد تک گئیں کہ انہوں نے گھر میں گوشت کی ہنڈیا ہی پکانی ترک کر دی تھی۔ ماں بیٹوں نے سوچا کہ اس گھر میں تو وقتاً فوقتاً گاندھی جی قدم رنجہ کرتے ہیں، گوشت کی ہانڈی کی خوشبو سے کیا ان کی طبیعت منغض نہیں ہوگی۔ یہ تحقیق نرائنی گپتا نے کر رکھی ہے کہ اس اپیل سے پہلے دلی میں کتنی گائیں ذبح ہوتی تھیں۔ اس اپیل کے بعد ان کی تعداد گھٹ کر کتنی رہ گئی تھی۔ ان کی تحقیق کہتی ہے کہ 1919ء میں شہر میں صرف 250 گائیں ذبح ہوئیں۔ 1920ء میں تو بس برائے نام ہی گائیں ذبح ہوئیں۔ کل ملا کر صرف 29 گائیں۔

بھلا ذبح ہونے والی گایوں کے یہ اعداد و شمار مجھے اور کہاں سے دستیاب ہوتے۔ تحریک خلافت پر لکھنے والوں نے اس ذیل میں بس اتنا ہی لکھا ہے کہ ان دنوں علی برادران خالی دال بھات ساگ پات۔ کھا کر پیٹ بھرتے تھے۔ بی اماں کے باورچی خانے میں کب سے چولہے پر گوشت کی ہنڈیا نہیں چڑھی تھی اور ہاں جب اسی گھر میں گاندھی جی نے ہندو مسلم فساد کی خبریں سن کر مرن برت رکھا تھا تو مولانا شوکت علی بازار سے ایک خوبصورت گائے خرید کر لائے اور گاندھی جی کے روبرو اسے کھڑا کر دیا۔ مطلب یہ کہ گئو ماتا کا واسطہ اپنی جان پر یہ ستم مت ڈھاؤ اور برت توڑ دو مگر اس کے بعد کیا ہوا، مت پوچھو۔

ارے یہ میں کدھر نکل گیا۔ ذکر تھا دلی کالج کا اور میں ذکر لے بیٹھا تحریک خلافت کا۔ ہاں تو اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ یہی کہ بہت تگ و دو کے بعد کہیں 1924ء کے لگ بھگ کالج دوبارہ کھل تو گیا مگر اب وہ دلی کالج نہیں تھا۔ اینگلو عربک کالج بن چکا تھا۔ ہاں کہیں آزادی کے بعد 1948ء میں دلی کالج کی تجدید ہوئی۔ اینگلو عربک کالج موقوف۔ اب وہ دلی کالج تھا۔ پھر 1975ء میں اس کا

نیا نام رکھا گیا۔ اب دلی کالج ذاکر حسین کالج بن گیا۔ کالج والے صحیح دعوے کرتے ہیں کہ ذاکر حسین کالج تین سو سال میں پھیلی ہوئی ایک شاندار تعلیمی روایت کا وارث ہے۔

تو اے مردونادان، اس تاریخی درسگاہ میں تجھے خطبہ پیش کرنے کا شرف بخشا جا رہا ہے اور خطبہ بھی کونسا جو ڈاکٹر ذاکر حسین سے منسوب ہے۔ یہی کچھ سوچ کر ہاں کر دی تھی۔ اب ٹپٹایا ہوا ہوں کہ وقت کم ہے، ذمہ داری بھاری ہے۔ بہر حال قلم لے کر اپنے کام پہ جت گیا۔ اپنی فکشن کی روایت کو موضوع ٹھہرایا۔ اس روایت کے اور چھور کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ ویسے کسی بھی روایت کے اور چھور کی کیا پوچھتے ہو۔ یہ تو اپنی اپنی وسعت نظر اور کم نگاہی پہ موقوف ہے۔ اس حساب سے چاہو تو اسے مختصر کر لو جیسے ہم نے کر لیا ہے کہ ناول اور افسانے کی ابتداء سے پہلے کے زمانے کو کسی شمار قطار ہی میں نہیں گردانتے۔ ارے اس سے پہلے جو داستانی دور ہے، اسے کہاں اور کیسے گم کرو گے اور مجھے تو یہ روایت داستانی دور سے گزر کر قدیم ہندوستان میں کتھا کہانی کی پرمپرا سے جڑی نظر آتی ہے۔ کوئی نہیں مانتا ہے تو نہ مانے۔ میں جب کہانی لکھنے بیٹھتا ہوں تو اسی روایت سے اشارہ لیتا ہوں۔ جب ہی تو مجھے کبھی یہ سوال پریشان نہیں کرتا کہ اردو میں پہلا افسانہ کس نے لکھا تھا۔ منشی پریم چند نے یا علامہ راشد الخیری نے یا سجاد حیدر یلدرم نے۔ یہ تو کل کی بات ہے۔ میرے تحیر اور تجسس کا مرکز کہیں اور ہے۔ وہاں تو کتھا کہانی کا ساگر امنڈا ہوا ہے۔ نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔

خیر یہ ذکر تو ہوتا ہی رہے گا۔ مطلب یہ کہ بھاگ دوڑ میں مضمون لکھا گیا۔ کچھ دن میں کچھ رات میں۔ اب صبح ہوتی ہے۔ آئی آئی سی میں یہ میری آخری صبح ہے۔ مجھے ان در و دیوار ہی سے نہیں بلکہ متقی در سے نکل کر وہ جو پچھواڑے لودی گارڈنز ہے، وہاں اس وسیع و عریض سبزہ زار سے، ان او نچے درختوں سے اور درختوں کے بیچ کھڑے بلند و بالا مقبروں سے الوداعی ملاقات کرنی ہے۔ آئی آئی سی میں قیام کا سب سے روشن پہلو تو یہی ہے کہ یہاں دلی کی نئی تہذیب کے بھی درشن ہو جاتے ہیں اور اس شہر میں جو تاریخ بکھری پڑی ہے اس کے ایک دور سے بھی ان مقبروں کے واسطے سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

دشت کے پھوٹے مقبروں پہ نہ جا
روضے سب گلستاں ہوتے ہیں

جب بھی دلی کے پھیرے میں آئی آئی سی میں بسیرے کا موقع میسر آتا ہے۔ روز صبح منہ اندھیرے ادھر جا نکلتا ہوں اور ان پھوٹے مقبروں کو دیکھ کر حیران ہوتا ہوں۔ تھوڑی حیرت، تھوڑی عبرت، تھوڑا تجسس۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان بلند و بالا گنبدوں تلے نیم تاریک ایوانوں میں کون کون سو رہا ہے۔ قبروں پہ کتبے کس اہتمام سے کھڑے کیے ہوں گے مگر اب کسی قبر پر کوئی کتبہ، کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ آگے ان گنبدوں پہ گدھ بیٹھے نظر آتے تھے، وہ گویا ان مقبروں کی ویرانی کی پاسبانی کر رہے تھے۔ اب کوئی گدھ یہاں نظر نہیں آتا۔ ویرانی کے وہ پاسبان رخصت ہوئے تو اب ویرانی اور بڑھ گئی ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ گدھ جو یہاں جانے

کب سے جمے بیٹھے تھے، کیوں اکتا گئے اور کس سمت پرواز کر گئے مگر آج ہی صبح کے اخبار میں میں نے ایک پورے صفحہ کا اشتہار دیکھا ہے۔ ایک دوا کا نام لکھا ہے اور خبردار کیا گیا ہے کہ اس کے استعمال سے اجتناب کیجیے۔ اس کے اثرات گِدھوں کے لیے زہر ہیں۔ سنا ہے کہ دلی میں گِدھوں میں کچھ ایسی وبا پھیلی ہے کہ وہ مر رہے ہیں اور دلی شہر کے چھوٹے مقبروں کے گنبد اب گِدھوں کا مسکن نہیں رہے ہیں تو کتنے ویران نظر آتے ہیں۔ ویران پہلے بھی تھے، اب مزید ویران ہیں۔

مگر یہ بھی خوب اٹکل ہے کہ مقبرے ویران ہیں اور ان کے اردگرد نئی زندگی اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ صبح کی سیر کے رسیا منہ اندھیرے اس باغ کا رخ کرتے ہیں۔ کتنے ہیں کہ روش روش تیز قدم اٹھاتے چلے جا رہے ہیں۔ کتنے ہیں کہ سبزہ زاروں میں چہل قدمی کر رہے ہیں۔ کچھ دوڑ لگا رہے ہیں اور وہ ٹولیاں بھی ہیں جو یہاں یوگ کے عمل میں مصروف ہیں۔ ہاں دور سے قہقہوں کی آواز بھی آ رہی ہے۔ یہ ہے ورزش بصورت قہقہہ۔ مطلب یہ کہ ویرانی اور گہما گہمی پہلو بہ پہلو اپنا اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔

واپس آکر جلدی جلدی نہایا دھویا۔ ناشتہ کیا۔ اب ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے صدف صاحب آتے ہوں گے۔ یہاں سے سامان سمیٹ کر رخصت ہونا ہے۔ پہلے ذاکر حسین کالج۔ وہاں سے نبٹ کر جامعہ ملیہ کا رخ کروں گا۔ جامعہ کے گیسٹ ہاؤس میں ڈیرا کروں گا۔ اے لو وہ صدف صاحب آ گئے۔

ذاکر حسین کالج کے اندر قدم رکھا تو عجب رنگ سے استقبال ہوا۔ دیکھا کہ نوجوان طلباء فوجی وردی زیب تن کیے کھڑے ہیں۔ مہمان نے اندر قدم رکھا اور انہوں نے لیفٹ رائٹ کر کے سلامی دی۔ واہ واہ ایسا استقبال بھی ہمارے نصیبے میں لکھا تھا۔

اندر محفل آراستہ تھی۔ بس مہمان خصوصی کا انتظار تھا۔ وہ آن حاضر ہوا۔ ڈاکٹر پرویز اسلم یہاں پرنسپل ہیں۔ باقی اساتذہ بھی صف بہ صف بیٹھے تھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی بھی آئے ہوئے تھے۔ انہیں ہی تو اس تقریب کی صدارت سونپی گئی تھی۔ سب سے ملاقات ہوئی۔ جلسہ شروع ہوا۔ بخیر و خوبی ختم ہوا۔ اس کے بعد کھانا پینا، پھر چھٹی۔

اب اپنا رخ جامعہ ملیہ کے گیسٹ ہاؤس کی طرف ہے۔ اے لو یہ تو وہی کمرہ ہے جس میں میں نے پچھلے کسی پھیرے میں یہاں قیام کیا تھا۔ پھر یہ تو اس مہمان خانے میں میرا اپنا گوشہ ہوا۔ آئی سی سی کی چہل پہل پیچھے رہ گئی۔ اس کے ساتھ لودی گارڈنز کے درخت اور درختوں کے بیچ کھڑے بُلند و بالا گنبد بھی اپنے مقبروں کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ یہ جامعہ ملیہ کا کیمپس ہے۔ اس کی اپنی چہل پہل ہے۔ مگر اس چہل پہل کے بیچ بیچ شہر کا شور بھی سنائی دیتا ہے۔ اصل میں جامعہ کا کیمپس اس طرز کا نہیں کہ کیمپس میں قدم رکھا اور شہر کے شور سے بے نیاز ہو گئے۔ پھر جو چہل پہل نظر آئے گی وہ یونیورسٹی کی صرف اپنی چہل پہل ہو گی۔ کیمپس یہاں لخت لخت ہے۔ ایک قطعہ اس طرف۔ دوسرا قطعہ سڑک کے دوسری طرف۔ یوں چلتی

سڑک بھی جامعہ کے کیمپس میں تھوڑی حد تک شامل نظر آتی ہے۔ چلو اس میں بھی کیا مضائقہ ہے۔ شہر سے الگ بھی ہیں اور شہر کی گہما گہمی میں شامل بھی ہیں۔ سو یہ جو میرے دو ڈھائی دن دلی کے حساب میں لکھے گئے ہیں۔ ان کے دوران اب میں اس فضا میں سانس لوں گا۔

یہ جو میں نے پچھلے مہینوں میں ہندوستان کے نگر نگر کا سفر کیا ہے، اس میں کتنی یونیورسٹیوں کے کیمپوں میں صبح و شام بسر کیے ہیں اور راتیں گزاری ہیں۔ اب اس کیمپس میں دیکھوں گا کہ یہاں صبح کس رنگ سے نمود کرتی ہے، دن کیسے چڑھتا ہے، شام کس طور پڑتی ہے۔

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ بیچ میں ایک شب تھی۔ وہ گزر گئی۔ میں منہ اندھیرے اٹھا اور نکل کھڑا ہوا کہ دیکھوں تو سہی جامعہ کی صبح کیسی ہوتی ہے۔ پہلی کرن کس رنگ سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ دن کے پہر کس طرح گزرتے ہیں۔ یہاں سے تھوڑے فاصلہ پر وہ کوچہ ہے جسے ذاکر باغ کہتے ہیں۔ وہاں شمیم حنفی کا ڈیرا ہے۔ آگے تو قرۃ العین حیدر کا ڈیرا بھی یہیں تھا۔ اس وقت کتنا آسان تھا ان کے در پر دستک دینا۔ پھر جانے جی میں کیا سمائی کہ یہاں سے ڈیرا اٹھایا اور اللہ میاں کے پچھواڑے نائیڈو میں جا بسیں۔ بس پھر وہیں سے اللہ میاں کے گھر چلی گئیں۔ اب جامعہ کے قبرستان میں آرام کرتی ہیں۔ یہاں انہیں اچھے ہمسائے میسر ہیں۔ سب سے بڑھ کر ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر ذاکر حسین تو خیر ہیں ہی اور کس کس کے نام گنواؤں۔

لو ایک اور قبرستان کی طرف میرا دھیان جانے لگا ہے۔ قرۃ العین سیمینار ہی کی تقریب سے علی گڑھ جانا ہوا تو ایک صبح شمیم حنفی اور میں ٹہلتے ٹہلتے یونیورسٹی کے قبرستان کی طرف جا نکلے۔ کم از کم یہاں کے چار مکینوں کو تو میں نے فوراً ہی پہچان لیا۔ پروفیسر آل احمد سرور، معین احسن جذبی، خلیق احمد نظامی۔ خلیق احمد نظامی کو یہاں آسودۂ خاک دیکھ کر مجھے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آ گیا۔ میرٹھ کالج میں بی اے تک ہم دونوں ہم جماعت تھے۔ اس وقت تو یہی دھیان پڑتا ہے کہ انٹر سے گزر کر بی اے تک وہ میرٹھ کالج میں رہے تھے۔ دھان پان تھے مگر بغل میں کتابیں بہت موٹی موٹی دبی ہوئی تھیں۔ لائبریری سے نکلتے تو ڈھیروں کتابوں سے لدے پھندے ہوتے تھے۔ میں انہیں یہاں سوتا دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔ ان کا آبائی گھر تو میرٹھ میں تھا، بیچ خیر نگر میں۔ کیا وہ پھر علی گڑھ آ کر علی گڑھ ہی کے ہو رہے تھے۔ علی گڑھ میں میری ان سے ملاقات بس ایک مرتبہ ہوئی تھی۔ ابوالکلام قاسمی کے توسط سے گھڑی دو گھڑی کی ملاقات کوئی ملاقات ہوتی ہے۔ طے یہی ہوا تھا کہ اگلا پھیرا جب ہوگا تو مفصل ملاقات کروں گا مگر اگلا پھیرا آتے آتے وہ دنیا سے سدھار چکے تھے اور ہاں چوتھی قبر۔ نعیم الثقلین کا نام پڑھ کر میں چونکا۔ ارے یہ تو ڈبائی کی مٹی ہے۔ ہمارے ساتھ کا کھیلا ہوا۔ ڈبائی کی مٹی علی گڑھ کی مٹی میں مل کر آسودہ ہوئی۔

اچھا لو شہرِ خموشاں سے نکلتا ہوں۔ واپس کیمپس کی چہل پہل میں آتا ہوں۔ اب میری دلی میں اور کوئی مصروفیت نہیں ہے۔ جامعہ ہی میں دوستوں سے ملوں جلوں گا۔ کل رات کھانے میں رخشندہ جلیل کی

طرف سے مدعو ہوں مگر لیجیے پچھلی دعوت کی طرح پھر یہ دعوت مشیر الحسن صاحب کے دولت کدے میں منتقل ہو گئی۔ رخشندہ کو جس بی بی سے میری ملاقات کرائی تھی، وہ ان کے ساتھ یہیں آ گئی ہیں۔ یہ ہیں رینکا نرائن۔ میرے لیے ایک تحفہ لے کر آئی ہیں۔ یہ ایک کتاب ہے "دی سپرٹ آف انڈیا" ایک ایرانی دانشور کی لکھی ہوئی کتاب۔ جانے فارسی میں اس نام کا تلفظ کیا ہوگا۔ انگریزی میں لکھا ہے Romin Jahan Begloo تو کیا وہ رامن جہاں بیگ لو ہیں۔ اپنے وطن میں جیل بھگت چکے ہیں۔ اب ٹورنٹو یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کے ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت میں کام کر رہے ہیں۔

یہاں پوری کتاب پر بحث مقصود نہیں لیکن دہشت گردی بحوالہ اسلام پر جو انہوں نے باتیں کی ہیں، اس کا تھوڑا ذکر ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ جہاں بیگ اس پر بہت جز بز ہیں کہ اہل مغرب نے دہشت گردی کو صرف اور محض مسلمانوں سے منسوب کر دیا ہے اور صرف مسلمانوں سے نہیں بلکہ اسلام کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑ دیا ہے۔ انہوں نے بجا کہا کہ تشدد کی لعنت سے تو دنیا کے سب ہی مذہبوں کو اپنی تاریخ کے بیچ سابقہ پڑا ہے۔ سو یہ تقسیم غلط ہے کہ فلاں مذہب تشدد پسند ہے اور فلاں مذہب امن پسند ہے۔ ہاں اہل مذہب کو دو خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ہر مذہب میں متشدد لوگ بھی ہوتے ہیں اور غیر متشدد بھی۔ یہ دونوں گروہ اپنی اپنی طبع کے حساب سے اپنے مذہبی صحیفوں کو پڑھتے ہیں اور اس سے اسی حساب سے معنی نکال لیتے ہیں۔

اس دانشور کو برصغیر کے عصر حاضر کے مسلمانوں میں دو مسلمان غیر متشدد اسلام کے نمائندے نظر آئے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور عبدالغفار خاں۔ ہاں اس سلسلہ میں اس صاحب دانش نے ایک اور نکتہ نکالا ہے۔ کہتا ہے کہ آخر یہی کیوں سمجھا جائے کہ گاندھی جی کے عدم تشدد کے فلسفہ نے ان دونوں شخصیتوں کو متاثر کیا۔ یوں بھی تو سمجھا جا سکتا ہے کہ ان دونوں نے خاص طور پر مولانا ابوالکلام آزاد نے اسلام کی جو غیر متشددانہ تعبیر کی ہے، اس سے گاندھی جی متاثر ہوئے۔ بس اسی بحث میں جہاں بیگ صاحب نے گاندھی جی کا ایک بیان نقل کیا ہے۔ آدمی کو اپنے غصے پر قابو پانا چاہیے اور ضبط و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ اس خیال کا پرچار کرتے کرتے گاندھی جی نے حضرت علی کا حوالہ دیا، اس واقعہ کا کہ ایک دشمن اسلام کو حضرت علی نے زیر کر لیا۔ اس شخص نے غصے میں آ کر حضرت علی کے منہ پر تھوک دیا۔ حضرت علی اسے چھوڑ کر فوراً ہی الگ کھڑے ہو گئے۔ فرمایا کہ میں تو دین کے دفاع میں اس سے لڑ رہا تھا، اب یہ لڑائی ذاتی بن گئی۔ اب میں اس لڑائی سے پناہ مانگتا ہوں۔ گاندھی جی نے اس پر ٹکڑا لگایا کہ اگر علی نے اس وقت اپنے غصے پر قابو نہ پایا ہوتا اور تحمل سے کام نہ لیا ہوتا تو اسلام کو جو آگے چل کر تاریخ میں اتنا فروغ حاصل ہوا، وہ نہ ہوتا۔

کتاب کو میں نے پڑھا بعد میں مگر رینکا نرائن کا شکریہ تو میں نے اسی وقت ادا کر دیا تھا۔ کتاب کو پڑھ کر سوچا کہ لو اس بی بی نے مجھے اتنا اچھا تحفہ دیا تھا۔ میں ان سے خواہ مخواہ الجھ رہا تھا۔ خیر خواہ مخواہ تو نہیں، الجھنے کی ایک وجہ تو تھی۔ اس بی بی نے بھی ستم کیا۔ مہاتما بدھ پر تعصب کی تہمت لگائی اور بھلا کس کے خلاف

تعصب سری رام چندر جی کے خلاف۔ میں نے کہا کہ بی بی کیسی باتیں کرتی ہو۔ مہاتما بدھ اور تعصب۔ توبہ کرو۔ جس جاتک سے بی جے پی والوں نے یہ نتیجہ نکالا، وہ میں نے پڑھی ہے، وہاں کوئی ایسا پہلو نہیں ہے۔

کیا مضائقہ ہے کہ دلی میں جو یہ قضیہ کھڑا ہوا تھا، اس کا بھی تھوڑا بیان ہو جائے۔ مطلب یہ کہ بابری مسجد تو بعد میں ڈھائی گئی اس سے پہلے بھی سری رام چندر جی کے نام پر ایک فتنہ بپا ہوا تھا۔ اس نیک آتما اور بھلے اوتار کو بی جے پی نے کہاں کہاں کانوں میں گھسیٹا ہے۔ ایک تھیٹر گروپ تھا جس سے صفدر ہاشمی وابستہ تھے۔ اس گروپ نے روایتی طور پر رامائن سٹیج کرنے سے انحراف کر کے کیا خوب سوچا کہ تلسی داس جی کی رام چرت مانس تو رامائن کا ایک ورشن ہے۔ ہر چند کہ اسی ورشن کو قبول عام کی سند ملی ہوئی ہے مگر پرانی پستکوں کو ٹٹولو تو اس میں اس واقعہ کے اور ورشن بھی ملیں گے۔ کیوں نہ ان مختلف روایتوں کو جو اپنا اپنا رنگ رکھتی ہیں، کسی طور یکجا کر کے سٹیج پہ پیش کیا جائے۔ کیا تھا بھلے کو مگر وہ گروپ یہ کام کر کے برا بن گیا۔ جاتک والے ورشن پر بی جے پی والوں نے انگشت نمائی کی کہ سیتا جی کو رام چندر جی کی بہن بنا دیا۔ یہ تو شری رام چندر کا اپمان کیا ہے۔ ان کے ڈنڈا بردار گروپ نے سٹیج پر بلہ بول دیا۔ صفدر ہاشمی ان کی زد میں آ گئے اور اپنی جان کھو بیٹھے۔

میں نے یہ واقعہ سنا اور حیران ہوا۔ جب میں نے یہ جاتک پڑھی تھی۔ مجھے تو اس میں ایسا پہلو نظر نہیں آیا تھا۔ البتہ مجھے یہ جاتک بہت دلچسپ نظر آئی کہ اس میں رام سیتا کا قصہ معروف قصے سے اچھا خاصا مختلف ہے۔ اسی لیے جاتکیں پڑھتے ہوئے اس جاتک کو میں نے خاص طور پر جاتکوں کے نوٹس لیتے ہوئے قلمبند کر لیا تھا۔ وہ جاتک کتھا اس طور پر ہے۔

بنارس میں ان دنوں راجہ دسرتھ راج کرتے تھے۔ ان کے محل میں سولہ ہزار رانیاں تھیں۔ مہارانی کے تین بچے پیدا ہوئے۔ رام، لچھمن، سیتا۔ مہارانی جی کا دیہانت ہو گیا تو ان کی جگہ دوسری رانی مہارانی بن گئی۔ اس کے پیٹ سے ایک پوت پیدا ہوا۔ بھرت اس کا نام رکھا گیا۔

دسرتھ جی نے ایک روز مہارانی جی سے خوش ہو کے پوچھا کہ بول کیا مانگتی ہے۔ جو مانگے گی اس مانگ کو پورا کروں گا۔ اس نے عجب مانگ کی۔ کہا کہ وعدہ کرو کہ تمہارے بعد راج سنگھاسن پہ بھرت بیٹھے گا۔ دسرتھ جی اس مانگ پہ بھوچک رہ گئے۔ ان کے تخت کے وارث تو بڑے پتر ہونے کے ناتے رام چندر جی تھے۔ بھرت تو چھوٹا تھا۔ انہوں نے مہارانی کو بہلانے کی بہت کوشش کی کہ وہ اس مانگ سے باز آئے۔ کچھ اور مانگ لے مگر تریا ہٹ تو مشہور ہے۔ وہ اپنی ہٹ پر اڑی رہی۔

تب دسرتھ جی نے رام جی کو اپنے پاس بٹھا کر بہت دکھ سے یہ بپتا سنائی۔ پھر کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ تم یہاں رہے تو یہ کٹھور رانی تمہیں کہیں مروانہ ڈالے۔ جوتشیوں کا حساب بتاتا ہے کہ بارہ برس اور جیوں گا۔ ایسا کرو کہ تم بارہ برس کے نے یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ۔ جب میری مرتیو ہو جائے تو یہاں آ کر راج پاٹ سنبھالنا۔

تب رام جی نے بارہ برس کے لیے بن باس کی ٹھانی۔ ان کے ساتھ ان کے بھائی نے بھی بن باس

لے لی۔ سیتا نے کہا کہ جہاں بھائی جائیں گے، وہیں ان کے سنگ بن بھی جائے گی۔ سوتینوں راج محل سے نکلے اور ہمالہ کی طرف نکل گئے۔

ادھر کی سنو۔ دسرتھ جی تو اس غم میں گھل گھل کے نو برس کے پورے ہوتے ہوتے ہی سورگ کو سدھار گئے۔ مہارانی نے اطمینان کا سانس لیا اور بھرت کو سنگھاسن پہ بٹھانے کا انتظام کرنے لگی۔ مگر بھرت نے سنگھاسن پہ بیٹھنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ روتا ہوا راج محل سے نکلا اور ڈھونڈتا ڈھونڈتا وہاں پہنچا جہاں رام جی باس کرتے تھے۔ ان کے چرن چھوئے۔ پتا کے مرنے کی خبر سنائی اور ہاتھ جوڑ کر درخواست کی کہ چل کر سنگھاسن پہ بیٹھو اور راج پاٹ سنبھالو۔

مگر رام جی نے صاف کہہ دیا کہ میں باپ کی اچھا پوری کروں گا۔ بارہ برس بن باس کے پورے کروں گا۔ پھر واپس آؤں گا۔ جب بھرت نے بہت منت کی تو کہا کہ میرے کھڑاؤں لے جاؤ۔ یہ کھڑاؤں میری نمائندگی کریں گے۔

سو بھرت نے واپس آ کر تین برس تک اس طرح راج کیا کہ سنگھاسن پہ کھڑاؤں رکھے رہتے تھے۔ وہ ان کھڑاؤں کے نام پر راج کاج کرتا تھا۔ کوئی فیصلہ غلط ہوتا تو کھڑاؤں ایک دوسرے سے ٹکراتے۔ بھرت کھڑاؤں سے یہ اشارہ لے کر اپنے فیصلہ کو بدلتا اور سوچ سمجھ کر دوسرا فیصلہ سناتا۔

بارہ برس بعد رام چندر جی بھائی بہن کی سنگت میں آئے۔ اب وہ راجہ تھے اور سیتا جی مہارانی تھیں۔ رام جی نے سنگھاسن پہ بیٹھ کر سولہ ہزار برس تک راج کیا اس طرح کہ راجہ خوش پر جا پرسن۔

تو بدھ جی مہاراج نے رام کتھا اپنے بھکشوؤں کو اس طرح سنائی تھی۔ یہ ورشن مقبول ورشن سے مختلف ہے۔ مگر اس میں نہ تعصب کا رنگ جھلکتا ہے نہ رام جی کے اپمان کا کوئی پہلو نکلتا ہے۔

ارے ہاں ذکر تو دعوت کا ہو رہا تھا اور یہاں مشیر الحسن صاحب نے کیسے کیسے مہمان بلا رکھے ہیں۔ رخشندہ کے ساتھ ان کی والدہ بھی ہیں یعنی پروفیسر آل احمد سرور کی صاحبزادی اور سعدیہ دہلوی ہیں۔ ابھی کل ہی یہاں کے کسی اخبار میں میں نے پڑھا تھا کہ آج کل وہ درگاہوں کے بہت چکر لگا رہی ہیں۔ کریدا تو پتہ چلا کہ درگاہوں کے یہ پھیرے عقیدت مندوں والے روایتی پھیرے نہیں ہیں۔ تصوف پہ کتاب لکھ رہی ہیں۔ درگاہوں میں تاک جھانک کر رہی ہیں کہ درگاہ کلچر کو جانا سمجھا جائے۔ ساتھ میں چلو عقیدت سے سر بھی جھکا لیا اور دعا بھی مانگ لی بلکہ منت بھی مان لی اور ہاں شمیم حنفی۔ انہیں کے ساتھ تو میں یہاں پہنچا ہوں۔

تو دیکھیے چلتے چلتے دلی کے کتنے اچھے لوگوں سے ملاقات ہوگئی۔ صبح کو مجھے یہاں سے لاہور سدھار جانا ہے۔

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

☙ .... ❧ .... ❧

گھاٹ گھاٹ اور اس کے بعد

لو صاحبو، پریم یاترا اتمام ہوئی۔ پورب، پچھم، اتر، دکھن، ہندوستان کی ساری دشاؤں کو چھو آیا۔ آج یہاں کل وہاں۔ کلکتہ سے زقند بھری اور راجستھان میں جا اترا۔ جمنا ندی کو پار کر کے چلا اور کاویری کنارے پر جا کر دم لیا اور ذرا ان پوتر استھانوں کو دھیان میں لاؤ۔ کاشی، متھرا، ورنداون، سو کتنے گھاٹوں کا پانی پیا اور کس کس نگر کی خاک پھانکی۔ کالے کوسوں کا سفر گھنٹوں میں، اس وشال دھرتی کا سفر اور اتنی تیزی سے۔ یہ سب نئے زمانے کی کرامات ہے مگر یہ کوئی سفر ہوا۔ بس ایک گھاٹ کو ہاتھ لگایا اور دوسرے گھاٹ کی طرف۔ دوسرے گھاٹ سے گھونٹ پانی پیا اور تیسرے گھاٹ کی طرف۔ منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں۔ وہ سب منزلیں طے کر کے واپس اپنے ٹھکانے پر آ گیا ہوں۔ حیران ہو رہا ہوں کہ یہی کوئی دو سوا دو مہینوں میں میں نے اتنی منزلیں طے کر لیں اور اتنی بستیوں کی خاک چھان لی۔ ارے خاک ہی تو نہیں چھان پایا۔ بس ہاتھ لگایا اور آگے بڑھ گیا۔

تو پھر پھرا کر پھر لاہور میں۔ پھر وہی زندگی ہماری ہے۔ پھر وہی مال روڈ، ہال روڈ، جیل روڈ اور وہی ہم اور وہی ہمارا ٹھیا۔ ٹھیئے کے نام اپنا اکیلا گھر۔ پہلے اس گھر میں دو دم سانس لیتے تھے۔ ان دو دموں ہی سے یہ گھر شاد آباد نظر آتا تھا۔ ایک دم اللہ میاں کے گھر سدھار گیا۔ اب یہاں اکیلا ایک دم ہے۔ دوسرے کے نام ایک ملازم ہے کہ اس کی وجہ سے کبھی باورچی خانے سے برتنوں کے کھنکنے کی آواز آتی ہے۔ کبھی ٹی وی بولنے لگتا ہے۔ میں بے شک اپنے گوشے میں اکیلا بیٹھا رہوں مگر ان آوازوں سے یہ احساس رہتا ہے کہ میں اکیلا نہیں ہوں مگر جوں غنچہ میرا اتنے نہ بیٹھے رہا کرو۔ ارے کہاں ہاتھ پیر توڑ کے بیٹھتا ہوں۔ پرانا طور اب بھی جاری ہے۔ صبح منہ اندھیرے اٹھنا، ہاتھ منہ دھو کے باغ جناح کی طرف نکل جانا۔ چھڑی ہاتھ میں لیے روش روش پھر رہا ہوں۔ گل پھول دیکھ رہا ہوں۔ پرندوں کی چہکار سن رہا ہوں۔ بہت گھوم لیے۔ ٹانگوں کی ورزش ہو گئی۔ واپس اپنے کلبۂ احزاں میں۔ نہاؤں دھوؤں گا۔ ناشتہ کروں گا۔ اخبار پڑھوں گا۔ پھر اپنی پڑھائی لکھائی جس حد تک بھی ممکن ہو۔ اے لو، پڑھنے لکھنے میں پتہ ہی نہ چلا۔ یہ تو دوپہر ہو گئی۔ بارون نے میز پہ کھانا لگا دیا۔ کھایا، قیلولہ کیا مگر مختصر۔ اٹھ کر پھر ہاتھ میں قلم یا کوئی کتاب۔ کتنی جلدی دن ڈھل گیا۔ دوستوں کے نام سب سے

پہلے زاہد ڈار نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ٹی ہاؤس تو بند ہو گیا۔ سو اب اور کہاں جائے گا۔ ادھر ہی آئے گا۔ اسی بہانے دوست کچھ آن جمع ہوتے ہیں۔ زاہد ڈار، اکرام اللہ، ایرج مبارک، کتنے یہ اک جوان ہوتے ہیں، وہ گئے۔ کھانے کا وقت ہو گیا۔ ہارون نے پھر میز پہ کھانا چن دیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں کسی کتاب کے ورق الٹوں پلٹوں گا۔ ہارون ٹی وی دیکھے گا۔ یہ میرا روز مرہ ہے۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے.. عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے۔ اب تو تمام ہو چکی ہے۔ تھوڑی سی رہ گئی ہے، اسے بھی گزار دے۔ ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے۔ مگر ہنسنے رونے کے سوا بھی تو گزارنے کے طریقے ہیں۔ شریفانہ بھی غیر شریفانہ بھی۔ جو بھی طریقہ جسے وارا کھائے، وارا کھائے یا راس آ جائے۔ میں نے اپنا طریقہ بتا دیا۔

اپنے اس طریقے کے ساتھ میں تو اب مطمئن ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ سوچا کہ آخر اتنی سرگرمی کب تک۔ خواہشوں کا تو کوئی انت نہیں ہے۔ مگر آدمی کو ہوس سے بچنا چاہیے۔ خواہ وہ پیسے کی ہو یا ادبی مقبولیت کی۔ جتنی مل گئی ہے کیا وہ کم ہے۔ ارے جتنی کے تم مستحق تھے اس سے بڑھ کر ملی۔ مگر یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ ابھی ایک اور پگڑی تمہارے سر پر منڈلا رہی ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے الحمرا آرٹ کونسل کا چیئرمین بن کر صرف بین الاقوامی کانفرنسیں کرنے پر قناعت نہیں کی۔ اس عزیز کے سر میں عجب سمائی کہ کوئی بھلا سا سر ڈھونڈو جس پر پگڑی باندھی جا سکے۔ قرعہ میرے سر کے نام نکلا۔ سو اس عزیز نے ایک تقریب کا اہتمام کر کے اس سر پر ایک خوب سی پگڑی باندھ دی۔ مگر پگڑی بندھوانا آسان ہے۔ اسے سنبھالے رکھنا مشکل ہے۔ سو اے سر پھرے اپنے سر کو دیکھ اور پگڑی کو سنبھالنے کی فکر کر بہت داد بیداد سمیٹ لی اور بہت گرد اڑالی۔ بہت گھوم پھر لیا۔ اب سفر کا سودا سر سے نکال اور ٹکا گھر بیٹھ۔ یورپ، امریکہ، کینیڈا، دیار مغرب کو بہت ٹٹولا ہو گا ہر گوشے میں جھانک آیا۔ تیرے لیے بس اتنا کافی ہے۔ سو یہی کرنے کی سوچی۔ سو جب برلن سے پھر ایک بلاوا آ گیا۔ سوچا کہ دو پھیرے کر چکا ہوں۔ اب تیسرا پھیرا کیا ضرور ہے۔ معذرت کر لی۔ جاپان سے ایک بلاوا آیا۔ جاپان، ارے اس ان دیکھی راہ پر اکیلا جاؤں۔ نا بھائی نا۔ لیکن اگر دلی علی گڑھ سے بلاوا آ جائے تو پھر کیسے اپنے آپ کو روکوں۔ قدم خود بخود اس طرف اٹھنے لگتے ہیں۔ سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں۔ کتنے پھیرے تو لگا لیے۔ بار بار وہاں کیا لینے جاتے ہو یا کیا ڈھونڈنے۔ بس کرو، کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے۔

اے لو، یہ تو پھر دلی سے ایک بلاوا آ گیا اور بلاوا دینے والے آن موجود ہوئے۔ ہمارے صدیق الرحمن قدوائی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے کرتا دھرتا۔ کہہ رہے ہیں کہ اس برس نظیر اکبر آبادی پر سیمینار کا اہتمام ہے۔ اشارہ ملنے کی دیر تھی۔ میرے تلوے میں کھجلی ہونے لگی۔ کراچی آرٹ کونسل کی تقریب سے کتنے ادھر کے یار ادھر کراچی میں آئے بیٹھے تھے۔ گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، صدیق الرحمن قدوائی۔ ان کے ساتھ شاہد ماہلی صاحب۔ ادھر الہ آباد سے علی فاطمی بھی آئے ہوئے تھے۔ اچھا بھلا سیمینار جاری تھا۔ مگر سیمینار کے عین بیچ کریال میں خلل لگا۔ بمبئی میں دہشت گردی کی ایک بڑی واردات گزر گئی اور ہم آپ جانتے ہی ہیں کہ

ہندوستان میں کہیں کوئی دھماکہ ہو، دھمک پاکستان میں سنائی دے گی بلکہ اب تو عالم یہ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں دہشت گردی ہو، انگلیاں پاکستان کی طرف اٹھتی ہیں۔ کاتب تقدیر نے پاکستان کے نوشتۂ تقدیر میں یہ کیا لکھ دیا ہے۔ میں تو بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں، چھاننے کا نہ تو فن جانتا ہوں نہ اس کی ہمت رکھتا ہوں۔ مگر خیر سیمینار میں کوئی درہمی پیدا نہ ہوئی۔ میں حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا مگر لاہور پہنچتے پہنچتے فضا میں واقعی درہمی پیدا ہوگئی۔ قدوائی صاحب سخت گھبرائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ اس خیال سے گھبرائے ہوئے تھے کہ اس غلط وقت میں پاکستانی مہمانوں کی یہ جو پوری پلٹن غالب انسٹی ٹیوٹ میں پہنچے گی تو اس سے کوئی نیا گل تو نہیں کھلے گا۔ سو جب میزبان ہی ست پڑ جائے تو مہمان کیسے چست رہ سکتے ہیں۔ سو ہمارے بندھے بستر کھل گئے۔

مگر پھر کیا ہوا۔ چند مہینے گزرے تھے کہ علی گڑھ سے ایک دعوت نامہ آن ٹپکا۔ قرۃ العین حیدر سیمینار منعقد ہوا چاہتا ہے۔ تشریف لائیے۔ ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا۔ قرۃ العین حیدر کو اسی غیر وقت میں یاد کرنا تھا۔ ہندوستان کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ غصے کی لہر روز افزوں تھی۔ اسی ہنگام کراچی سے کسی آرٹسٹ نے بمبئی کی راہ لی۔ ارے مورکھ، تجھے بمبئی جانے کے لیے یہی وقت رہ گیا تھا۔ جس تقریب میں شرکت کے لیے گیا تھا، وہاں لوگ پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ وہ زد میں آ گیا تو پھر سارا نزلہ اسی پر گرا۔ اس کی کہانی نے اشتہار کا کام کیا۔ ہوشیار خبردار، ان دنوں ہندوستان کا رخ مت کرنا، مارے جاؤ گے۔ کراچی سے مجھے بھی ایک بہی خواہ کا فون آیا۔ انتظار صاحب، سنا ہے کہ آپ علی گڑھ جا رہے ہیں۔ مت جائیے۔ حالات بہت خراب ہیں۔

میں دبدا میں پڑ گیا۔ جاؤں نہ جاؤں۔ اچھا نہیں جاؤں گا مگر ادھر سے ابوالکلام قاسمی کا فون آ گیا۔ انتظار صاحب پاکستان سے جنھیں مدعو کیا گیا تھا، ان میں سے کسی کو ویزا نہیں ملا مگر آپ کو تو پہلے سے ہندوستان کا ویزا ملا ہوا ہے اور یہ قرۃ العین حیدر کا معاملہ ہے۔ آپ پاس ادب نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔ تو آپ تو آ جائیں۔ بس اس فون کے بعد میں نے ایک دم جھرجھری لی اور نکل کھڑا ہوا۔ ایئرپورٹ لاؤنج میں قدم رکھا تو ڈاکٹر مبشر حسن نظر آئے۔ سارے وسوسے اور اندیشے ایک دم سے رفو چکر ہو گئے۔ اب میں پاک ہند امن کے سب سے معتبر پرچارک کی پناہ میں تھا۔ ادھر شمیم حنفی کو پہلے ہی اطلاع کر چکا تھا کہ ایک ڈرا سہما مسافر دلی پہنچ رہا ہے۔ ایئرپورٹ آ کر اسے سنبھالو، سو وہ آن پہنچے۔ پھر انہیں کی حفاظت میں علی گڑھ پہنچا۔ یونیورسٹی کیمپس میں جب قدم رکھا تو اپنے آپ میں آیا اور نچنت ہو گیا۔ ہندوستان کا سفر عجب ہے۔ رجھاتا بھی ہے، ڈراتا بھی ہے۔ اندیشہائے دور دراز ساتھ لے کر آتا ہے۔ پہلے ہندوستان میں پھونک پھونک کر قدم رکھو۔ جب واپس آ جاؤ تو ہم چشموں کو اپنی نیک چلنی کا یقین دلاؤ۔

خیر قرۃ العین حیدر کا سیمینار بہت کامیاب رہا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ چلی گئی ہیں تو مجھے زیادہ یاد آتی ہیں۔ خوب لکھا۔ اپنی ذات میں بھی خوب تھیں۔ کیا عجب مزاج پایا تھا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ جب پاکستان میں تھیں تو بس ایک ہی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی، وہ بھی کھڑے کھڑے۔ کراچی میں جب

رائٹرز کنونشن ہوا تھا تب کی بات ہے۔ میں اور ناصر کاظمی وقت سے پہلے ہی وہاں جا پہنچے تھے۔ ہال خالی تھا۔ ہم ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ چند منٹ گزرے ہوں گے کہ جمیل الدین عالی ایک چہکتی مہکتی خاتون کے ساتھ ہال کے دوسرے گوشے سے ہم سے خاصی دور داخل ہوئے۔ بس وہیں کھڑے کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ دونوں کی نظریں ہم پر پڑیں۔ آپس میں جانے انہوں نے کیا کہا کہ فوراً ہی عالی کی آواز آئی "ماموں" میرے ایک بھانجے سے عالی کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اس لحاظ سے مجھے ماموں کہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ "ماموں، یہ قرۃ العین حیدر تمہیں بلا رہی ہیں۔ ذرا ادھر آؤ۔" میں لپک کر وہاں گیا۔ گھڑی دو گھڑی کھڑے کھڑے ڈیڑھ دو بات ہوئی۔ لوگ آنا شروع ہو گئے تھے۔ میں اپنے ایک افسانے پر جو انہیں دنوں "نیا دور" میں "گھوڑے کی ندا" کے عنوان سے چھپا تھا، داد لے کر شتابی سے واپس آ گیا۔

پھر اس کے بعد جو ملاقاتیں ہوئیں ہندوستان میں ہوئیں۔ پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ اردو اکیڈمی کی تقریب میں جہاں مجھے کہانی سنانی تھی، صدارت وہی کر رہی تھیں۔ پہلی کہانی تو میں نے خود سنائی۔ جب دوسری کے لیے اصرار کیا گیا تو میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کونسی سناؤں۔ انہوں نے کتاب میرے ہاتھ سے لی۔ عنوانات کی فہرست پر نظر ڈالی۔ انگلی رکھ کر کہا، یہ کہانی سناؤ۔ پھر تیسری کہانی کی باری آئی تو پھر انہوں نے ایک عنوان پر انگلی رکھ دی کہ یہ کہانی سناؤ۔ وہ سنا دی۔

اگلی شام میں ان کے یہاں چائے پی رہا تھا۔ یار جمع تھے، جنس بول رہے تھے۔ اتنے میں کالی داس گپتا رضا نمودار ہوئے۔ کھانے پر مجھے ان کے ساتھ جانا تھا۔ چپکے سے بولے "یہ محفل تو شاید دیر تک چلے۔ ہم قرۃ العین سے اجازت لے کر کھسک نہ لیں۔" میں نے کہا "مگر ان کی چائے کا حق نمک تو تھوڑا ادا کر دیں۔" مجھے کیا پتہ تھا کہ باتیں کسی اور سے کر رہی تھیں، کان ہماری طرف تھے۔ بکھر گئیں۔ ہماری طرف مخاطب ہوئیں۔ "ہاں ہاں جائیے جائیے۔ میں نے تو آپ کو نہیں روکا ہے۔" ہم دونوں کتنے خفیف ہوئے۔ خیر جلدی ہی ہم نے انہیں منا بھی لیا۔

دوسری ملاقات دلی میں ہوئی جب ابھی وہ ذاکر باغ میں تھیں۔ شمیم حنفی کے پڑوس میں۔ مجھے کھانے پر بلایا۔ اردو کا کوئی ادیب وہاں نہیں تھا۔ میں اور شمیم حنفی۔ تین مہمان باہر کے تینوں ہندی کے ادیب کملیشور، نرمل ورما، بھیشم ساہنی۔ شاید مقصود ہی یہ تھا کہ اس بھلے مانس کو ہندی کے کہانی کاروں سے ملایا جائے۔ بہت اچھی ملاقات رہی۔ نرمل ورما گم سم بیٹھے رہے۔ کملیشور مستقل چہکتے رہے۔

اگلی ایک ملاقات کا احوال سنیے۔ دلی میں پہلے دو تین دن ادھر ادھر گھومتا رہا۔ پھر جب رسالہ "آجکل" کی طرف سے تقریب کا بلاوا ملا اور بتایا کہ اس کی صدارت قرۃ العین حیدر کریں گی تو مجھے ہوش آیا۔ میں نے پھر فون کیا کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں۔ آپ سے ملنے کا خواہاں ہوں۔ بگڑے لہجہ میں بولیں "ہاں مجھے پتہ ہے۔ تم تین دن سے دلی میں گھوم رہے ہو۔ آجکل والوں کا فون آیا تھا۔ تمہارے لیے انہوں نے کسی

تقریب کا اہتمام کیا ہے۔ مجھ سے صدارت کو کہا تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔'' پھر رک کر بولیں۔'' خیر اب میں انہیں فون پر بتا دوں گی کہ میں تقریب میں آ رہی ہوں۔'' وہاں آئیں، صدارت کی۔ میرے حق میں نیک کلمات کہے مگر پھر کیا ہوا۔ ارتضی کریم نے ان کے بارے میں لکھے گئے مضامین کو یکجا کر کے ایک معقول مجموعہ تیار کیا تھا۔ وہ یہاں انہیں نذر کرنا چاہتے تھے۔ بس بگڑ گئیں۔ یہ کیا ہے۔ مجموعہ کی نوعیت انہیں بتائی گئی۔ بالکل ہی بتھے سے اکھڑ گئیں۔ میں یہاں یہ سوغات وصول کرنے کے لیے تو نہیں آئی ہوں۔

ارتضی کریم بہت خفیف ہوئے۔ بعد میں میری طرف آئے۔ ہمدردی کے طالب تھے۔ بولے ''دیکھا آپ نے، یہ کوئی طریقہ ہے۔''

میں نے ان کی اشک شوئی کی۔'' کوئی بات نہیں۔ دودھ دیتی گائے کی دولاتیں بھی سہار لی جاتی ہیں۔''

اس کے بعد وہ دو مرتبہ پاکستان آئیں۔ ایک مرتبہ تو لاہور کا بھی پھیرا کیا۔ سو ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اگلی مرتبہ آئیں تو اسلام آباد ہی میں رہیں۔ لاہور نہیں آئیں۔ میری ملاقات نہیں ہو سکی۔ بعد میں ان کا ایک انٹرویو نظر سے گزرا۔ مجھ سے بہت برہم نظر آ رہی تھیں۔ کسی سوال کے جواب میں کہہ رہی تھیں کہ میں نے جرمنی کے فنکشن میں کتنے اچھے لفظوں میں ان کا تعارف کرایا تھا اور وہ میرے خلاف باتیں کرتے پھرتے ہیں۔ پتہ نہیں پاکستان میں کس نے ان کے کان میں میرے خلاف کیا پڑھ دیا تھا کہ اسے گرہ میں باندھ لیا اور موقع آنے پر کھری کھری سنا دیں۔ خیر میں نے جو نسخہ ارتضی کریم کو بتایا تھا اسی پر عمل کیا۔ نہ تردید نہ بیان صفائی، بس خاموشی۔ پھر جب دلی گیا اور ان سے ملاقات ہوئی تو شاید وہ اس قصے کو بھول چکی تھیں۔ میں نے بھی سوچا کہ گڑے مردے کو کیوں اکھاڑا جائے۔

ہاں آخری ملاقات، وہ کیسے ہوئی۔ نرل ورما کی پہلی برسی کا موقع تھا۔ اس تقریب سے جانا ہوا۔ یہ سوچا ہی نہیں کہ اس کے دوسرے تیسرے دن تو عید ہو گی۔ بس تقریب کے دوسرے ہی دن شام کو چاند کی دید کا اعلان ہو گیا۔ میں نے فوراً قرۃ العین کو فون کیا کہ مجھے تو کل آپ سے ملنا تھا مگر اب تو کل عید ہے۔ آپ کی اس حساب سے اپنی مصروفیات ہوں گی۔ جواب آیا کہ میری کوئی مصروفیت نہیں ہے۔ آئیے اور عید ملیے۔ میں شمیم حنفی کی ہمراہی میں وہاں پہنچ گیا۔ پھر عید کا پورا دن وہیں گزرا۔ بہت چہک رہی تھیں مگر بار بار تقاضا کہ کوئی سکینڈل سناؤ اور میں سکینڈل یاد رکھنے اور سنانے کے معاملہ میں بہت کچا ہوں۔

عسکری صاحب کا ذکر نکل آیا۔ چونک کر بولیں'' اچھا ان کا انتقال ہو گیا، ارے یہ کب ہوا؟''

میں نے حیران ہو کر کہا کہ'' آپ کو پتہ نہیں۔ اس واقعہ کو کتنے سال گزر گئے۔''

بعد میں شمیم حنفی نے مجھے بتایا کہ اب انہیں باتیں یاد نہیں رہتیں۔ پرانی باتیں اب بھی یاد ہیں۔ حالیہ واقعات بھول جاتی ہیں۔

اگلے برس پھر عید ہی کے آس پاس کے دنوں میں دلی جانے کی سبیل پیدا ہوئی۔ تب مجھے یاد آیا کہ پچھلے

برس میں یہاں آیا تھا تو عید کا دن قرۃ العین کے ساتھ گزارا تھا۔ پھر وہ گزری عید مجھے مستقل یاد آتی رہی۔

تو لیجیے اس بہانے میں نے قرۃ العین حیدر کو یاد کرلیا۔ ذکر تو یہ تھا کہ ہندوستان پاکستان کے تعلقات بھی عجب ہیں۔ اس مثل کے عین مطابق کہ گھڑی میں رن میں گھڑی میں بن میں۔ کس طرح اچانک بدتر ہوتے ہوتے کشیدہ ہوگئے اور استنے کہ دلی کے لیے ہمارے بستر بندھتے بندھتے کھل گئے۔ پھر ہندوستان کتنے غصے میں تھا جب میں نے قرۃ العین حیدر کا حوالہ درمیان میں آ جانے پر اللہ کا نام لیا اور علی گڑھ کی طرف چل پڑا اور پھر یوں ہوا کہ مہینوں کے اندر اندر تعلقات میں پھر ایک پلٹا آیا۔ بھلا کیسے۔ دو اخباروں نے مل کر یعنی پاکستان کے جنگ نے اور ہندوستان کے ٹائمز آف انڈیا نے مل کر امن آشا کی تحریک شروع کر دی۔ اس سے اتنا تو فرق پڑا کہ وہ جو سخت تناتنی تھی، اس میں کمی آ گئی اور حکومتوں کے درمیان افہام وتفہیم کی فضا بے شک پیدا نہ ہوئی ہو مگر لوگوں کے درمیان تو وہ پچھلی فضا کم وبیش واپس آ گئی۔ ارے جب ہی تو امن آشا کے نام پر ہم ایسوں کا پھر سے آنا جانا شروع ہوگیا۔ اسی تقریب سے بمبئی سے ایک بلاوا میرے لیے بھی آ گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ ایک محفل ایسی آراستہ ہو کہ گلزار صاحب اپنی شاعری سنائیں۔ میں اپنی کہانیاں سناؤں۔ گلزار صاحب نے خالی فلم کی اقلیم ہی میں تو نام پیدا نہیں کیا ہے۔ اردو افسانے اور شاعری میں بھی تو اپنا سکہ منوایا ہے۔ سو گلزار صاحب کا حوالہ درمیان میں آ جانے سے یہ پروگرام مجھے قابل اعتبار نظر آیا۔ بس میں اڑ کر بمبئی جا پہنچا۔

گلزار صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اب تک ملاقات جتنی بھی تھی ان کے فن سے تھی۔ کچھ کہانیاں پڑھی تھیں۔ کچھ نظمیں ادھر ادھر سے ۔

مجھ کو بھی ترکیب سکھا کوئی یار جلاہے
اکثر تجھ کو دیکھا ہے کہ تانا بنتے
جب کوئی تاگا ٹوٹ گیا یا ختم ہوا
پھر سے باندھ کے
اور سرا کوئی جوڑ کے اس میں
آگے بننے لگتے ہو
تیرے اس تانے میں لیکن
ایک بھی گانٹھ گرہ بنتر کی
دیکھ نہیں سکتا ہے کوئی

میں نے تو ایک بار بنا تھا ایک ہی رشتہ
لیکن اس کی ساری گرہیں

صاف نظر آتی ہیں مرے یار جلا ہے

اور ہاں ان کی فلمیں۔ کوئی کوئی تو سچ مچ اندر اتر گئی اور اب میں ان سے مل رہا تھا۔ سمجھ لو کہ ایک دن ان کے ساتھ ہی گزرا۔ نام فلم کے حوالے سے چڑکا مگر آدمی فلمی نہیں ہیں۔

بمبئی فلمی ستاروں کا شہر پہلے بھی تھا، اب بھی ہے۔ مگر ایک زمانے میں یہ اردو ادب کے ستاروں کا شہر بھی تو تھا۔ کتنے ترقی پسند تحریک کے ستارے ان کے آس پاس چند ایک رجعت پسند ادبی ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ عجب ہوا کہ ایک ایک کر کے وہ سب ہی ستارے غروب ہو گئے۔ ان کے بعد کی نسل کے کچھ ہونہار یہاں موجود تو ہیں مگر افسوس کہ اس وقت کسی کا فون نمبر میرے پاس نہیں ہے۔ پھر یہاں کس سے ملوں۔ مجھے یاد آیا کہ ارے پچھلے پھیرے میں یوں ہوا کہ کرشن چندر تو دنیا سے سدھار چکے تھے مگر سلمیٰ صدیقی سے ملاقات ہو گئی تھی۔ میں نے ان کا نام لیا اور گلزار صاحب نے ترنت انہیں پیغام بھجوایا اور لیجیے وہ آن پہنچیں مگر اب کتنی بدل گئی ہیں۔ زمانہ بھی تو بہت گزر گیا ہے۔

ایک ملاقات غیر متوقع طور پر ہوئی۔ سان نہ گمان یہ چہرہ کدھر سے نمودار ہوا۔ بس جب طالبات کی آٹوگراف کاپیاں آگے بڑھی ہوئی تھیں، ان کے بیچ سے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ ''مجھے آپ سے الگ وقت چاہیے۔'' الگ وقت، مگر میرے پاس تو اب ایک ہی دن رہ گیا ہے۔ پتہ نہیں اس دن کونسی مصروفیت نکل آئے۔ ''مگر میں آپ کی کہانی ''نرناری'' پر کام کر رہی ہوں۔ مجھے بات کرنے کے لیے تھوڑا وقت چاہیے۔ ''نرناری'' پر یعنی خالی ایک کہانی موضوع تحقیق بن گئی۔ میں چکرایا۔ اچھا کل صبح تاج ہوٹل میں جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں، آجائیے۔ لیجیے وہ بی بی وقت مقررہ پر آن پہنچی۔

میرے تجسس پر بتایا کہ اصل میں تو میں جرمنی میں اپنے تعلیمی پروگرام کے تحت گئی ہوئی تھی۔ اب یہاں آ کر بمبئی یونیورسٹی میں جرمن زبان کے شعبہ کی صدر کے طور پر کام کر رہی ہوں۔ وہاں جرمنی میں میری یونیورسٹی میں یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ سنسکرت کی کوئی پرانی کہانی ہے جسے موضوع بنا کر ہمارے جرمن ناول نگار ٹامس مان نے اچھا خاصا ایک مختصر ناول (انگریزی ترجمہ میں اس کا عنوان ہے "Transposed Heads") لکھ ڈالا۔ پھر اب پتہ چلا کہ اسی کہانی کے حوالے سے ہندوستان میں گریش کرناڈ نے ایک ڈرامہ "Hayavadana" لکھا ہے اور اب پتہ چلا کہ پاکستان میں ایک افسانہ نگار نے اسی کہانی کو بنیاد بنا کر ایک کہانی لکھ ڈالی ہے۔ تو یہ تو تحقیق کا موضوع ہے کہ سنسکرت کی کسی بہت پرانی کہانی نے تین ملکوں میں الگ الگ بیٹھے تین لکھنے والوں کو متاثر کیا اور ان تینوں نے اپنے اپنے رنگ سے اس کے حوالے سے ناول، افسانہ اور ڈرامہ لکھ ڈالا تو مجھے ادھر سے یہ پروجیکٹ ملا ہے۔ میں اس پر کام کر رہی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آپ سے کیسے ملاقات کی جائے۔ یہاں آپ کی آمد کا پتہ چلا تو میں نے سوچا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور آپ کو تھوڑا کریدا جائے کہ آپ سے اس کہانی نے کیا کہا کہ آپ نے یہ نرناری نام کی کہانی لکھ ڈالی۔''

یہ سب سن کر میں نے اسے اپنی بپتا سنائی۔ ''بی بی، اس کہانی کی بدولت مجھ پر دو مرتبہ چوری کا الزام لگا ہے۔ جب پاکستان میں یہ کہانی چھپی تو میرے ایک دوست اعجاز بٹالوی نے اس کہانی کی بہت تعریف کی۔ پھر کہا کہ تمہارا ایک بہت عزیز دوست کہتا ہے کہ یہ کہانی تم نے ٹامس مان کے یہاں سے اڑائی ہے۔ میں نے فوراً ہی بھانپ لیا کہ کس دوست کی طرف سے یہ بات آئی ہے۔ تب میں نے اس سے کہا کہ میرے اس دوست سے میری طرف سے کہنا کہ تم نے مغربی ادب تو بہت چاٹ ڈالا، اب ذرا ہندوستان کی یہ جو کتھا کہانی کی قدیم روایت ہے، اسے بھی تھوڑا دیکھ لو کیونکہ مجھے کچھ اگلی چوریاں بھی اسی خزانے سے کرنی ہیں۔''

اب آگے کی سنو۔ جب میں ساہتیہ اکیڈمی کے ایک پروگرام کے سلسلہ میں بنگلور جا رہا تھا تو دلی میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مجھ سے پوچھا کہ تم وہاں فنکشن میں کیا پیش کرو گے۔ میں نے کہا کہ اپنی کوئی کہانی پڑھ دوں گا۔ بولے کہ اردو تو وہ لوگ سمجھتے نہیں۔ میں نے کہا کہ خیر میں نے کچھ کہانیاں ایسی زبان میں بھی لکھی ہیں جس پر اعتراض ہے کہ یہ تو ہندی ہے۔ بولے ہندی کو تو وہ ویسے ہی برداشت نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ پھر؟ بولے ابھی جو ہارپر کولنز نے تمہاری کہانیوں کا انگریزی ترجمہ (Leaves) شائع کیا ہے، اس میں سے کوئی کہانی پڑھ دینا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

فوراً ہی ایک طرف سے اعتراض آیا کہ یہ کہانی تو گریش کرناڈ کے ڈرامے سے مستعار ہے۔

تب میں نے کہا کہ میری اس کہانی کی عجیب قسمت ہے۔ پاکستان میں کسی نے تہمت لگائی کہ یہ کہانی ٹامس مان سے چوری کی ہے۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ کہانی گریش کرناڈ سے چرائی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ٹامس مان، گریش کرناڈ اور میں تینوں ہی چور ہیں۔ تینوں نے بیتال پچیسی پہ ڈاکہ ڈالا ہے۔ وہاں سے یہ کہانی اڑائی ہے۔

اس پر زچ ہو کر ایک نے کہا کہ ایسا کیوں ہے کہ تینوں کی نظر بیتال پچیسی کی ایک ہی کہانی پر جا کر ٹکی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات خود اس کہانی سے پوچھو۔

قصہ مختصر مجھے اس باب میں خوب کرید کرانے لگی تو پوچھا ''شام کا پروگرام آپ کا کیا ہے۔''

''فی الحال گلزار صاحب کی طرف سے مجھے کسی پروگرام کی اطلاع نہیں ملی ہے۔''

''پھر شام کو ہمارے گھر چلیں۔ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔ ویسے میں بال ٹھاکرے کے پڑوس میں رہتی ہوں۔''

''پڑوس تو آپ کو بہت اچھا ملا ہے۔ ویسے کیا میں آپ کے گھر سے سلامت واپس آ جاؤں گا۔''

''میں آپ کو اپنی حفاظت میں واپس یہاں پہنچاؤں گی۔''

لیجیے، اس کھانے کے طفیل ہم نے بال ٹھاکرے کا گھر بھی دیکھ لیا اور ڈاکٹر وبھا سورن سے دوستی بھی اچھی خاصی ہو گئی۔

یاد آیا کہ چوری کی تہمت تو میری کہانی ''آخری آدمی'' پر بھی لگی تھی مگر کسی ہمت والے نے اس حوالے سے اس پر تحقیقی کام کرنے کا بیڑا نہیں اٹھایا۔ یہ شرف ''زناری'' کے حصے میں آیا۔

ارے ذکر قرۃ العین حیدر کا تھا۔ بہہ کر کدھر نکل گیا۔ قرۃ العین اب اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔ آگے صرف افسانہ و ناول کے دلدادگان کو پیاری تھیں۔ میرے دیکھتے دیکھتے ہمارے ادب کے کتنے پیارے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ لو ایک اور عزیز یاد آیا۔ اشفاق احمد۔ ذکر اس عزیز کا کسی اور رنگ سے کرنے لگا تھا کہ بانو قدسیہ کی نئی کتاب ان کی آپ بیتی درمیان میں آ گئی۔ وہاں میرے حوالے سے ایک بیان ہے، اس کی بھی تصحیح کرنی ہے۔ مگر پہلے اس سفر کا احوال جس کا انہوں نے سرسری ذکر کیا اور آگے چل پڑیں مگر میرے لیے وہ سفر عجیب سا تجربہ ہے۔ اس کا بیان میں ویسے کرتا یا نہ کرتا لیکن اب نہیں رک سکتا کہ اس کے بیان کرنے کے لیے اب ایک اچھا بہانہ مل گیا ہے۔ اصل میں اس اکٹھے سفر کے لیے اے آر وائی ایوارڈ نے موقع فراہم کیا۔ اے آر وائی نے اس برس کمال کیا کہ اکٹھے تین ایوارڈ ایک برس میں دے ڈالے۔ انعام یافتگان شوکت صدیقی، بانو قدسیہ اور یہ حقیر فقیر۔ تقریب کراچی میں تھی۔ شوکت صدیقی اسی شہر میں تھے۔ ہمیں لاہور سے وہاں پہنچنا تھا۔

ان دنوں عالیہ کی بیماری اپنے آخری مراحل میں تھی مگر میرے ساتھ کراچی جانے کے لیے وہ بھی مصر تھیں۔ میں نے بہت سوچا، پھر طے کیا کہ کراچی کا اگلا پھیرا کس نے دیکھا ہے۔ اگر ان کی یہ خواہش ہے تو ساتھ لے ہی چلو۔ آگے جو اللہ کی مرضی۔ ایئرپورٹ پر پہنچ کر ویل چیئر پر انہیں بٹھا لاؤنج میں جا پہنچے۔ فلائٹ میں اچھی خاصی تاخیر ہو گئی۔ جب روانگی کا اعلان ہوا تو ویل چیئر والا غائب۔ ہم حیران و پریشان کھڑے تھے کہ اتنے میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نمودار ہوئے۔ ارے تم، مگر پریشان کیوں ہو۔ جب میں نے صورتحال بتائی تو اشفاق نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ جب ویل چیئر والا نظر نہ آیا تو کہا، کوئی بات نہیں۔ ہماری بہن ہمارے ساتھ چلے گی۔ اور عالیہ ترنت اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اشفاق کے ہمراہ آگے چلتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ بانو قدسیہ کی ہمراہی میں آہستہ آہستہ چلی آ رہی ہیں۔ مجھے پہلے کسی قدر تعجب ہوا مگر پھر میں بے فکر ہو گیا۔ جہاز میں بیٹھے اور پھر اطمینان سے کراچی کے اڈے پر جا اترے اور میں نے دیکھا کہ پرل کانٹی نینٹل میں جہاں آتے جاتے خاصا چلنا پڑتا ہے، عالیہ اشفاق اور بانو قدسیہ کی ہمراہی میں اطمینان سے چل پھر رہی ہیں۔ میں واقعی سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں واقعی اشفاق نے یہ کوئی چمتکار تو نہیں دکھایا ہے اور مجھے بتانے کی کوشش کہ مورکھ اب تو قائل ہو جا۔

میں یہاں یہ بتاتا چلوں کہ عالیہ سچ مچ اشفاق کی بہت قائل تھیں بلکہ اچھی خاصی اس کے حلقہ ارادت میں شامل تھیں۔ انہوں نے مجھے بھی قائل کرنے کی کوشش تو کی تھی مگر میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا تھا کہ تمہارا رشتۂ ارادت تمہیں مبارک رہے مگر میرا معاملہ دوسرا ہے۔ میں اپنے کسی ہم عصر کی ارادت گھائیوں میں آ جاؤں، توبہ کرو لیکن اب میں کسی قدر کشمکش و پیچ میں تھا اور لو ہم جب ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے تو ایک اور ہی منظر سامنے آیا۔ ڈائننگ ہال میں جتنے لوگ کھانے میں مشغول تھے، وہ اشفاق کو دیکھ کر

کھانا دانا بھول اٹھ کھڑے ہوئے۔ کوئی موصوف کے ہاتھ چوم رہا ہے، کوئی قدموں کو ہاتھ لگا رہا ہے۔ میں حیران بلکہ حریان کہ یا مولا، یا مظہر العجائب، یہ پرل کانٹی نینٹل ہے یا دشت حیرت ہے۔ یہ کونسا مقام ہے اور یہ اشفاق کیا شے ہے۔

واپس ہوتے ہوئے مجھے ہوٹل وقت مقررہ سے پہلے ہی چھوڑنا تھا۔ میری بھانجی نسیم نے ہمیں وہاں سے اٹھایا۔ ہم نے اشفاق اور بانو قدسیہ کو سلام کیا اور ہوٹل سے نکل گئے۔

لاہور پہنچے تو اشفاق کا ایک مختصر سا خط ملا۔ تمہارے جانے کے بعد ہم دونوں اداس ہو گئے۔ باقی وقت چپ بیٹھے رہے۔ چپ اور اداس۔ اس مختصری تحریر نے عجب اثر کیا۔ عالیہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔ میں پھر حیران کہ یہ چکر کیا ہے۔ کہیں اشفاق احمد سچ مچ...... مگر اس سے آگے میں کچھ نہ سوچ سکا اور عالیہ کی پھر وہی پچھلی حالت اور پھر وہ وقت آ گیا کہ اشفاق کو ادھر آ کر اس کی میت کو کاندھا دینا پڑا۔

اچھا، بانو قدسیہ کا بیان میں نے پڑھا۔ اس بی بی نے جانے اپنے طور پر یہ سوچا یا کسی آفت کے پرکالے نے ان کے کان میں یہ پھونکا کہ یہ شخص انتظار حسین، اشفاق احمد کو بس ''گڈریا'' کی حد تک مانتا ہے۔ اس کی باقی افسانہ نگاری سے منکر ہے۔ مگر میں دوسری ہی بات کہتا ہوں۔ یہ کہ ''گڈریا'' نے اشفاق احمد کی افسانہ نگاری کو بہت نقصان پہنچایا۔ وقت سے پہلے آن ٹپکا اور ایک بڑھتے ہوئے افسانہ نگار کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ غلام عباس نے افسانے کے ساتھ ایک اچھا خاصا دور گزارنے کے بعد ''آنندی'' لکھا تھا۔ اس کے باوجود یہ ہوا کہ غلام عباس آنندی والے غلام عباس کہلائے جانے لگے۔ ان کے کتنے اچھے اچھے افسانے کہیں پیچھے رہ گئے اور ''گڈریا'' تو پہلے ہی ہلے میں وارد ہو گیا۔ کتنے ایسے ہیں کہ بس اشفاق کا ''گڈریا'' انہیں یاد رہ گیا ہے مگر میں نے تو اشفاق کو نمودار ہوتے دیکھا ہے۔ ہم نے ایک ہی وقت میں اس وادی میں قدم رکھا تھا۔ کوئی ڈیڑھ دو دن پہلے آیا، کوئی ڈیڑھ دو دن بعد مگر نقادوں نے سب سے پہلے اس طلوع ہوتے ستارے کا نوٹس لیا تھا۔ جب ''گڈریا'' سرزد ہو گیا تو اشفاق کی افسانہ نگاری پر پکی مہر لگ گئی۔ ادھر اشفاق نے سمجھا کہ یہ اقلیم تو فتح ہو گئی۔ رہوار قلم دوسری طرف مڑ گیا اور نئی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے ریڈیو، پھر ٹی وی اور اس سے آگے ایک اور طرح کا سفر۔ جب اس سفر میں جانے کتنی مسافت طے ہو گئی۔ میں نے تو بس اتنا دیکھا کہ اس پر رونق چہرے پر ایک کھچڑی داڑھی نمودار ہو گئی ہے۔ میں نے یاروں کے کان میں کہا کہ اشفاق کو اب کسی بابے کی تلاش کی حاجت نہیں رہی۔ یہ داڑھی چغلی کھا رہی ہے کہ یہ مقام اب اس نے خود پا لیا ہے۔ بس اعلان ہونے ہی والا ہے مگر موت کا فرشتہ جانے کب سے گھات لگائے بیٹھا تھا، بس آن دھمکا۔ میری پیشگوئی پوری ہونے سے رہ گئی مگر کیا کیا جائے۔ یہ مقام ہی ایسا ہے۔ اس سے کسی کو رستگاری نہیں ؎

آج تم کل ہماری باری ہے

………………

ہائے گل ہائے دل

اے لو یہ تو پھر چراغوں سے دھواں اٹھنے لگا۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہ آزار گیا۔ یادیں نبڑ گئیں۔ فراغت پائی۔ مگر کہاں فراغت پائی۔ وہ تو پھر امنڈ نے لگی ہیں۔ واپسی کے لیے بہانہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ انہیں مل گیا۔ شاہد احمد دہلوی کی یاد میں ایک تقریب کے انعقاد کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ ان کی صاحبزادی صائمہ سکندر خاں اب لاہور ہی میں رہتی ہیں۔ بیٹی کے یہاں باپ کے لیے ہڑک اٹھی ہے۔ اس تقریب کو اسی ہڑک کا کرشمہ جانو۔ مجھے اس میں شریک ہونا ہے۔ ابھی ابھی ان کے مضامین کا ایک مجموعہ مرتب ہو کر شائع ہوا ہے وہ میرے سامنے ہے۔ یہ مجموعہ عقیل جعفری کی تحقیق کا حاصل ہے۔ شاہد صاحب نے موسیقی پر جو مضمون لکھے تھے وہ تو جانے کون کونسے رسالوں میں دفن پڑے تھے۔ اس عزیز نے انہیں ان گڑھوں سے برآمد کیا اور شاہد صاحب نے دلی کی تہذیب کے حوالے سے جو مضمون لکھے تھے ان میں سے چند مضامین چن کر شامل کیے اور یہ مجموعہ پیش کیا۔ میں اس مجموعہ کو پڑھ رہا ہوں اور ان کے اگلے پچھلے مجموعوں پر نظر دوڑا رہا ہوں۔ یہ مضامین میرے حافظہ کے لیے چچی کا حکم رکھتے ہیں۔ چچی کھا کر میرا حافظہ جاگ اٹھا ہے۔ 'ساقی' سے اپنی وابستگی یاد آئی۔ میری پہلی تحریر تو 'ساقی' ہی میں چھپی تھی۔ یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔ مگر وہ تحریر افسانہ نہیں تھی' تنقیدی مضمون تھا۔ افسانے نے تو تقسیم کے ہنگام میرے اندر سے نمود کی تھی۔ 1948ء میں اس کی پہلی اشاعت عمل میں آئی۔

ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ شاہد صاحب کے ان مضامین نے میرے حافظہ کے لیے چچی کا کام کیا ہے۔ وہ گذرے بسرے دن یاد آ رہے ہیں۔ پاکستان کے ابتدائی ایام جب ابھی اجڑنے بکھرنے کا غم تازہ تھا' لکھنے لکھانے کا ہوش ابھی کہاں تھا۔ بس باتیں کرتے کرتے اچانک کوئی دکھ بھری یاد زبان پر آ جاتی اور اردگرد بیٹھے ہوئے اجڑے بچھڑے لوگ ایک دم سے اداس ہو جاتے۔ اور پھر شاہد صاحب اچانک اٹھ کھڑے ہوتے۔ اٹھو بھئی میاں صاحب۔ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ سب اٹھ کھڑے ہوتے۔

شاہد صاحب جب گھر سے قدم نکالتے تو ایک پوری برات ان کے ساتھ ہوتی۔ ساتھیوں براتیوں میں سب سے بڑھ کر اشرف صبوحی اور حکیم حبیب اشعر عسکری صاحب بھی روزانہ نہیں تو دوسرے تیسرے دن جا کر اس برات میں ضرور شامل ہو جاتے۔ میں نے جب لاہور میں قدم رکھا تو عسکری صاحب کی انگلی پکڑ کر

میں بھی وہاں پہنچا۔ شاہد صاحب کو زندہ و تندرست دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی ورنہ ہم تو میرٹھ میں فسادیوں کے ہاتھوں ان کے گذر جانے پر کتنا رو دھو کر فارغ ہو چکے تھے۔ اور اب میں ان کی خدمت میں آداب بجالایا اور فوراً ہی اس برات میں شامل ہو گیا۔ برات بارود خانے کے ایک گھر سے نکلی اور میاں ایم اسلم کی حویلی میں جا براجی جہاں میاں صاحب اپنے تازہ ناول کے ایک منتخب باب اور بارود خانے کے تکّے کباب اور برفی سے آراستہ چائے کی میز پر اپنے عزیز دوست اور اس کے ساتھیوں براتیوں کے منتظر بیٹھے تھے۔

مگر ایک شام میں نے دیکھا کہ برات میاں صاحب کی حویلی کا رستہ چھوڑ کر شاہی قلعہ کی طرف رواں دواں ہے۔ یہ کیوں اور کیسے۔ اصل میں ان دنوں وہاں دلی ہی کے ایک بزرگ شاید ولی اللہ خاں ان کا نام تھا ماہر آثار قدیمہ کی حیثیت میں تعینات تھے۔ انہوں نے یہاں دلی کے کچھ خانہ برباددوں کو بلا رکھا تھا۔ تقریب بس یہی کہ یہاں بیٹھ کر اپنے اجڑے دیار کو یاد کریں گے۔ پھر یہ صحبت ان خانہ برباددوں کے جی کو ایسی لگی کہ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً وہ لوگ یہاں جمع ہوتے رہے اور میں نے ایسی کئی نشستوں کا رنگ دیکھنے کے بعد دل میں سوچا کہ اصل میں اب یہ قلعہ اس اجڑی ہوئی مخلوق کے لیے دیوارِ گریہ کا مقام حاصل کر چکا ہے۔ آخر ہے تو یہ قلعہ مغلیہ قلعوں ہی کی برادری میں سے۔ اس کے بلند بام و در کو دیکھ کر وہ اپنے گمشدہ قلعہ کی یاد کو تازہ کرتے ہیں جو بھلے زمانوں میں قلعۂ معلی کہلاتا تھا مگر آخری مغلیہ شمع کے بجھ جانے کے بعد بس لال قلعہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

مگر ان شاموں کا نقطۂ عروج وہ شام تھی جس کا ذکر میں پہلے بھی ایک تحریر میں کر چکا ہوں۔ مگر کیا کروں وہ شام مجھے بھلائے نہیں بھولتی۔ اس شام کتنے اجڑے بچھڑے دلی والے اس گھر میں جمع تھے جہاں حکیم اجمل خاں کی آل اولاد نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ اجڑے لوگ جوق در جوق آتے چلے جا رہے تھے۔ اصل میں یہاں شاہد صاحب کو اپنا وہ رپورتاژ سنانا تھا جو انہوں نے انہیں دنوں فسادات کے ختم ہو جانے کے بعد دلّی کا ایک اور پھیرا لگانے کے بعد لکھا تھا جو بعد میں 'دلّی کی بپتا' کے عنوان کے ساتھ شائع ہوا۔ تحریر لمبی تھی۔ کتنی دیر تک شاہد صاحب سناتے رہے اور سننے والے دم بخود سنتے رہے۔ پورا پھر بھی نہیں سنا سکے۔ آخری ورق تک پہنچتے پہنچتے ان کی آواز بھرا گئی۔ پھر ان پر رقت طاری ہو گئی۔ اور پھر میں نے اپنے اردگرد دیکھا کہ سب آنکھیں اشکبار ہیں اور جیبوں سے رومال نکلے ہوئے ہیں۔ وہ محفل اب اچھی خاصی مجلس عزا بن چکی تھی۔

پہلے خیال یہ تھا کہ شاہد صاحب لاہور ہی میں رہیں گے۔ یہیں سے 'ساقی' نکلے گا۔ لیکن ڈیکلریشن دینے والے محکمے کو یہ منظور نہیں تھا۔ تب انہوں نے یہاں سے رختِ سفر باندھا اور کراچی چلے گئے۔ وہاں سے جلد 'ساقی' کی اشاعت شروع ہو گئی اور اب شاہد صاحب خالی 'ساقی' کے مدیر نہیں تھے۔ ان کا قلم بھی رواں چلا تھا۔ ان کی تحریریں بتا رہی تھیں کہ اب انہوں نے آنسو پونچھ لیے ہیں اور اطمینان اور سکون کے ساتھ اجڑے

دیار کو یاد کر رہے ہیں۔ اس طرح کہ دنیا کے کام بھی ہو رہے ہیں اور یادوں کی دنیا میں سفر بھی جاری ہے۔ لیجیے اس پر سودا کا ایک شعر سن لیجیے ؎

فکرِ معاش، ذکرِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس مختصر حیات میں کیا کیا کرے کوئی

شاہد صاحب کو اس نئے وطن میں جتنی حیات میسر آئی تھی اس میں انہوں نے فکرِ معاش اور یادِ رفتگاں دونوں کو بڑے سلیقہ سے نبھایا۔ دلّی کی بات اور تھی۔ وہاں تو اپنی جدی پشتی جائیداد کے ساتھ اپنے ٹھٹے پر جمے بیٹھے تھے اور جو طور تھا وہ اس مثال سے سمجھ لیجیے کہ جب کرشن چندر کا ناول 'شکست' شائع ہوا تھا یہ کھلا کہ شاہد صاحب نے انہیں پیشگی رقم دی تھی کہ آپ اطمینان سے اپنے گوشے میں بیٹھئے اور ناول لکھئے۔ یہ سن کر دلّی میں جو اس وقت ادیب جمع تھے ان میں سے کئی ایک نے پھریری لی اور کہا کہ آپ ہمیں پیشگی رائلٹی ادا کریں' ہم بھی ناول لکھیں گے۔ شاہد صاحب نے بلا تکلف ان اہل ہمت کو بھی مطلوبہ رقم ادا کر دی۔ مگر ناول کوئی نہ لکھ پایا۔ رقم صرف ایک نے واپس کی۔ ویسے پاکستان آ کر بھی ایک کام تو انہوں نے جلد ہی کر ڈالا وہ یہ کہ جب انہوں نے یہ طے کر لیا کہ بس 'ساقی' نکالیں گے اور کتابوں کی اشاعت کا کام نہیں کریں گے تو جن جن لکھنے والوں سے ان کی جن تصانیف کے حقوق اشاعت خرید رکھے تھے وہ انہیں واپس کر دیئے۔

خیر یہ بات تو برسبیل تذکرہ آ گئی۔ میں کچھ اور بات کر رہا تھا۔ وہ یہ کہ فکرِ معاش بھی ہے اور یادوں کا سفر بھی جاری ہے۔ جیسے یہ کام بھی ضروری ہے۔ بلکہ مقدم یہی کام ہے۔ جب تہذیبیں اجڑتی ہیں اور ان کی گود میں پلے ہوؤں کے مقدر میں خانہ بربادی لکھی جاتی ہے تو گریہ کا موسم بھی گھر کر آتا ہے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ رفتہ رفتہ خانہ برباد آباد ہونے کی صورتیں پیدا کر لیتے ہیں اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ پھر چھنٹ چھنٹا کر اکا دکا روح بھٹکتی رہ جاتی ہے جو یہ بار امانت ایک ذمہ داری سمجھ کر اٹھاتی ہے۔ آخر خانہ بربادوں میں سے کوئی تو ایسا نکلنا چاہیے جو رفتگاں کی یادوں کو سمیٹے اور دل لخت لخت کو پھر سے جمع کرے۔ پھر اس سب کو تاریخ کے خزانے میں جمع کرا دے۔ باقیوں کا معاملہ تو یہ ہوتا ہے کہ ؎

فرصت ضروری کاموں سے پاؤ تو رو بھی لو
اے اہل دل یہ کارِ عبث بھی کیے چلو

تو ہر پھر کر شاہد صاحب ہی نے اس کارِ عبث کو بار امانت کے طور پر اپنایا۔ یعنی ضروری کام بھی ہو رہے ہیں اور کارِ عبث بھی جاری ہے۔

اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ 1857ء میں جب جہان آباد تاراج ہوا تھا تو اسے رونے والے بہت تھے۔ کتنے اہل دل نے یہ کارِ عبث انجام دیا اور آنسوؤں سے تر بتر اس اجڑے دیار کی یادیں قلمبند کیں۔ غالباً انہیں تحریروں کو پڑھ کر عسکری صاحب نے یہ فقرہ لکھا تھا کہ دلّی والے روتے بہت ہیں مگر میں نے

تذکروں میں پڑھا ہے کہ جب اندلس کے خانہ برباد اندلس سے نکل کر فیض اور ایسے دوسرے قریوں میں جا کر آباد ہوئے تو انہوں نے بھی یہ کارِ عبث بہت کیا تھا۔ شاید بڑی تہذیبوں کے مقدر ہی میں یہ لکھا ہے کہ وہ اجڑتے ہوئے اپنے پیچھے کچھ نوحہ گر چھوڑ جاتی ہیں۔ پھر وہ اس کارِ عبث کو بار امانت جان کر اپنا فریضہ ادا کرتی ہیں۔ تو جیسا میں نے عرض کیا کہ برباد جہان آباد کو نوحہ گر اچھی خاصی تعداد میں میسر آئے تھے۔ مگر جب 1947ء میں جہان آباد کی باقیات کو سنکھوانے والی دلی برباد ہوئی تو کتنے خانہ برباد چار آنسو بہا کر اپنے اپنے کام سے لگ گئے۔ اس کارِ عبث کو امانت جان کر اکیلے شاہد صاحب نے اپنایا اور دل لخت لخت کو جمع کرنا شروع کر دیا۔

کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ بات تھی تو ایک مرتبہ پتا مار کر بیٹھتے اور اس شہر کو یا اس تہذیب کو جس نے ایک شہر کے راستے اپنا پورا جلوہ دکھایا تھا جس طرح دیکھا تھا اور برتا تھا بیان کر ڈالتے کہ یکجا ہو کر ایک جامع نقشہ سامنے آتا۔

بظاہر یہ بات درست نظر آتی ہے۔ مگر اس طرح کا کام تو علماؤ محققین کو زیب دیتا ہے۔ وہ ایک دفعہ ایسا کام انجام دے کر کس خوبصورتی سے فراغت پا لیتے ہیں۔ مگر یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ وہ پورا شہر یا وہ پوری تہذیب اجڑنے کے بعد ایک یاد بن کر اس شخص کے اندر اتر گئی تھی' اور پھر صورت

فرصت ضروری کاموں سے پائیں تو رو بھی لیں

تو ضروری کاموں سے تھوڑا وقت بچا کر تھوڑا رو گا لیے۔ کبھی میلے ٹھیلے کی کوئی یاد آ گئی' کبھی کوئی در و بام تصور میں پھر گئے' کبھی بقول خود کسی وضعدار ہستی کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ لیجیے قلم رواں ہو گیا۔ تھوڑا روئے گائے۔ پھر آنسو پونچھے اور پھر ضروری کاموں میں مصروف ہو گئے۔ یعنی زندگی کا برا بھلا عمل بھی جاری ہے اور یادوں کا سلسلہ بھی چل رہا ہے۔ اس مختصر حیات میں دونوں کاروبار ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ یا کہہ لیجیے کہ زندگی دو سطحوں پر چل رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شاہد احمد دہلوی' مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی نہیں بن سکتے تھے۔ جس طرح اس بزرگ نے گذشتہ لکھنؤ کا ایک جامع تذکرہ لکھ کر فراغت پالی۔ یہاں یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ تہذیب اور وہ شہر ایک تجربہ بن کر یہاں زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ جس طرح زندگی گذر رہی تھی اسی طرح یہ تجربہ بھی قطرہ قطرہ اپنا اظہار پا رہا تھا۔ جس گھڑی جو جو صحبت' جو جو شخصیت یاد آ گئی اسے لکھ ڈالا۔ باقی یہ کہ ے

باقی و ماہتاب باقی۔

شخصیتوں میں سے کم از کم دو شخصیتوں کا حوالہ مجھے یہاں بر محل نظر آ رہا ہے۔ ان کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان میں ایک تو میر باقر علی داستان گو ہیں۔ ان کی داستانِ حیات کچھ اس طرح بیان ہوئی ہے یا شاید وہ زندگی ہی اس طور گذری ہے کہ اس کے درجہ بدرجہ زوال کے ساتھ دلی کا بھی درجہ بدرجہ زوال دیکھتے چلے جائیے۔ آگے رجواڑوں سے بلاوے آتے تھے۔ کس ٹھسے کے ساتھ وہاں جاتے تھے اور راجوں

مہاراجوں کو داستان سناتے تھے۔ وہ دروازہ بند ہوا تو دلّی کے دیوان خانوں میں ساتھ عزت کے بلائے جاتے۔ رفتہ رفتہ وہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ پھر دلّی کے رئیس چھنامل کے یہاں داستان سنانے پر ملازم ہو گئے۔ ماہوار تنخواہ مبلغ چالیس روپے۔ پھر وہ در بھی بند ہو گیا۔ اب ایرا غیرا نتھو خیرا جس کی گرہ میں دو روپے ہیں وہ گھر پر میر صاحب کو بلائے اور داستان سن لے۔ پھر بقول شاہد صاحب "جب لوگوں کو دو روپے بھی اکھرنے لگے تو میر صاحب نے گھر پر داستان کی محفل سجانی شروع کر دی۔" ایک آنے کا ٹکٹ خریدو اور میر باقر علی سے داستان سن لو۔ مگر پھر کیا ہوا۔ دلّی میں بائیسکوپ آ گیا۔ دلّی والوں نے داستان سے منہ موڑا اور بائیسکوپ پر ٹوٹ پڑے۔

تب میر صاحب نے داستانیں طاق میں رکھیں اور چھالیا کتر کتر کے بیچنے لگے۔ پہلے ان کی زبان چلتی تھی۔ اب ان کا سروطہ چلتا تھا۔ کیا گول گول چھالیاں کترتے تھے۔ گلی محلّہ میں انہیں اس حال میں پھیری لگاتے دیکھ کر کوئی پوچھ بیٹھتا کہ میر صاحب یہ چھالیاں اور آپ تو جواب دیتے کہ "دلّی والے پان کھانے کے آداب بھول چکے ہیں انہیں وہ آداب یاد دلا رہا ہوں۔" بس دلّی والوں کو پان کھانے کے آداب سکھاتے سکھاتے ہی دنیا سے گذر گئے۔ داستان گوئی کی روایت نے شاہی درباروں سے آغاز کیا تھا ایک سرد ملے پر جا کر وہ ختم ہوئی۔

مگر جہان آباد کی بچی کھچی یکسر مٹ جانے کے لیے کسی اور گھڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ گھڑی اس صورت وارد ہوئی کہ 1947ء میں شاید 15 اگست کے آس پاس دلّی کے استادان فن موسیقی جمع ہوئے۔ یہ ان کا اس نگر میں آخری اجتماع تھا۔ استاد بندو خاں نے اعلان کیا کہ آج میں اپنی سارنگی پر دیپک راگ سناؤں گا۔ استاد چاند خاں نے بہت منت کی کہ یہ راگ نہ سنایئے۔ اس سے خالی چراغ نہیں جلتے۔ اس سے آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ مگر استاد بندو خاں نے ایک نہ سنی۔ وہ راگ سنا کر دم لیا۔ مگر وہ دیپک راگ تو سچ مچ اس مٹتی ہوئی تہذیب کے لیے سوان سانگ یا کہہ لیجیے کہ بس راگ بن گیا۔ شاہد صاحب کہتے ہیں کہ "ستمبر کے پہلے ہفتے میں آگ واقعی بھڑک اٹھی" اور میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا واقعی 1947ء میں جو دلّی بھسم ہوئی تھی تو وہ بقول چاند خاں صاحب کے راگ کی آگ میں جلی تھی۔ یہ محض سوئے اتفاق تھا یا دلّی کی قسمت ہی میں یہ لکھا ہے کہ جلتی بلتی رہے۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

میں نے اپنے اپنے نگر کے لیے بھری محفل میں گریہ کرتے دو لکھنے والوں کو دیکھا۔ شاہد احمد دہلوی کو اور منیر نیازی کو۔ مگر منیر نیازی تھوڑا بعد میں نمودار ہوا تھا۔ ابھی تو میں پاکستان کے ابتدائی ایام کا ذکر کر رہا ہوں۔ وہ عجب دن تھے۔ یہ شہر لاہور اجڑا اجڑا سا بھی لگتا تھا اور ساتھ ہی ایسا بھی لگتا تھا کہ اجڑ کر پھر سے آباد

ہو رہا ہے۔ کہاں کہاں سے اجڑے پجڑے لوگ آ رہے ہیں اور سر چھپانے کے لیے چھتوں والے کونے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ مال روڈ کا خوب نقشہ تھا۔ لکھنے پڑھنے کا چسکا رکھنے والے یہاں شان آوارگی سے چلتے پھرتے نظر آتے۔ کسی گلی کی اینٹ اور کسی نگر کا روڑا مگر وہ کتنی جلدی ایک دوسرے کے درد کو جان لیتے تھے اور گھل مل جاتے تھے۔ مظفر علی سید کی اور میری مڈھ بھیڑ اسی شاہراہ پر ہوئی تھی۔ اس نے ابھی پچھلے ہفتے حلقہ میں میری کہانی سنی تھی۔ اب جو مال پر چلتے چلتے ہماری مڈھ بھیڑ ہوئی تو اس نے فوراً ہی دعوت دے ڈالی کہ آؤ کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ وہ وائی ایم سی اے کا چائے خانہ تھا۔ ہم وہاں جا بیٹھے۔ ارے یہ تو امرتسر کی اجڑی ہوئی روح ہے۔ جب ہی تو اس نے میرے افسانے کے کہیں اندر چھپے ہوئے درد کو اتنی جلدی پہچان لیا۔

پھر اسی کے واسطے سے امرتسر کے کتنے اجڑے لوگ ملے۔ سب سے پہلے اسی کے واسطے سے اے حمید سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسے تو اپنا اجڑا دیار کچھ زیادہ ہی شدت سے یاد آ رہا تھا اور ہاں عارف عبدالمتین' مظفر کی معرفت کیسا کیسا نگ دریافت ہو رہا تھا۔ ٹی ہاؤس آباد ہوا تو میں نے دیکھا کہ یہ امرتسر کی مخلوق جب کسی میز پر اکٹھی ہوتی ہے تو کتنی جلدی باقی بحثیں پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ بس انہیں امرتسر کی یادیں آ گھیرتی ہیں۔ اور وہ اس شہر کو یاد کرتے ہوئے باقی سارے ذکر اذکار سارے قصے قضیئے بھول جاتے ہیں۔ امرتسر امرتسر امرتسر۔ کن کن حوالوں سے اپنے شہر کو اس کی گلیوں کو ان میں بسنے والی نرالی شخصیتوں کو یاد کر رہے ہیں' خوش ہو رہے ہیں اور بسور رہے ہیں کہ دنیا کے تختے پر بس ایک ہی شہر تھا اور وہ امرتسر تھا۔ اے حمید' شہزاد احمد' مظفر' احمد مشتاق' احمد راہی' حسن طارق' عارف عبدالمتین' ظہیر کاشمیری' ہاں ان سب کے بڑے منٹو صاحب اور وہ شاعر جو یہاں ٹی ہاؤس میں کبھی نظر نہیں آیا مگر اس کا حوالہ بار بار آئے گا' سیف الدین سیف۔ کس کس کا نام گناؤں ایک پوری برادری تھی۔ ان میں سے دو نگ ہی اپنے حصے میں آئے۔ مظفر اور مشتاق۔ ان میں ایک اے حمید ایسا نکلا بلکہ آخر میں وہی ایک ایسا رہ گیا جس کے یہاں یہ داستان کھنچتے کھنچتے محبوب کی زلفِ دراز بن گئی۔ بس یہ داستان کہتے کہتے ہی وہ سو گیا۔ انہیں دنوں تو وہ خاموش ہوا ہے' ہمیشہ کے لیے۔

لو مجھے اس سے ایک اور ٹولی یاد آ گئی۔ اس ٹولی میں بھی دو نگ امرتسر کے جگمگا رہے تھے۔ یہ خاصے بعد کے سالوں کا ذکر ہے۔ میرا ٹھکانا اب جیل روڈ پر تھا۔ صبح کی سیر کا لپکا روز منہ اندھیرے مجھے باغ جناح کی طرف لے جاتا۔ وہاں ایک ٹولی کے ساتھ امجد حسین نظر آتے۔ بس امجد ہی سے علیک سلیک کرتے کرتے میں اس ٹولی میں شامل ہو گیا۔ اس ٹولی میں سب سے بڑھ کر ملک معراج خالد تھے۔ پاکستان ٹائمز کے ایک ریٹائرڈ صحافی۔ بھلا سا ان کا نام تھا اور ہاں ملک غلام نبی اور ایک تھے شاہ صاحب۔ انارکلی بازار میں ان کی دکان تھی۔ نام ان کا جو کچھ بھی ہو۔ یار انہیں شاہ صاحب کہتے تھے۔ شاہ صاحب امرتسر والے اور ملک غلام نبی تو آپ جانتے ہی ہیں کہ امرتسری تھے اور ایسے امرتسری جنہوں نے امرتسر میں رہتے ہوئے سیاست کا گرم و سرد بہت

دیکھا تھا۔ تو جہاں دو امرتسری مل جائیں وہاں اول امرتسر باقی باتیں بعد میں۔ مگر ملک کی سیاست پر تو یاروں کو بات کرنی ہی ہوتی تھی۔ اور شاہ صاحب خود فکر مند رہتے تھے کہ پاکستان میں سیاست کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھ ہی نہیں پا رہا۔ مگر وہ بات کا آغاز اس طرح کرتے کہ ''ملک جی' آپ کو تو یاد ہوگا کہ جب جلیانوالہ باغ میں گولی چلی تھی۔''

''آہو جی۔'' اور ملک صاحب کا طور یہ تھا کہ پہلے موٹی سی گالی' پھر اپنی طرف سے اگلی پچھلی سیاست پر اپنا محاکمہ۔ ادھر شاہ صاحب کو جلیانوالہ باغ کے ذکر کے ساتھ ساتھ کچھ اور یاد آ جاتا۔ مثلاً مولانا ثناء اللہ امرتسری اور اچانک پھر ملک صاحب سے مخاطب ہوتے ''ملک جی' آپ کو یاد ہے جب ڈاکٹر کچلو جیل گئے تھے۔''

اس نام پر میں چونکتا ہوں۔ ارے کتنے زمانے کے بعد میں نے یہ نام سنا ہے۔ مجھے اپنے بچپن کے صبح و شام یاد آ جاتے ہیں۔ مگر برادر' تمہارے بچپن کے صبح و شام کہاں اور ڈاکٹر کچلو کہاں۔ مگر یہی تو میں بتانے لگا ہوں۔ میں نے بچپن میں جو سب سے پہلے کچھ سیاسی نام سنے تھے ان میں ایک نام یہ تھا۔ ارے کانگریس کا جلوس بھی تو ہمارے گھر کے پاس آ کر ہی گلی میں مڑ کر اور سمت چلا جاتا تھا۔ بڑے جلوسوں سے قطع نظر روز صبح سویرے کانگریس کی طرف سے پربھات پھیری ہوتی۔ ایک چھوٹی سی ٹولی ترنگا ہاتھ میں لیے نعرے لگاتی نمودار ہوتی۔ انقلاب زندہ باد' مہاتما گاندھی زندہ باد۔ پنڈت موتی لال نہرو زندہ باد۔ سردار پٹیل زندہ باد۔ ڈاکٹر کچلو زندہ باد۔ اول الذکر تین نام تو کانگریس کی روز افزوں سیاست کے ساتھ مانوس ہوتے چلے گئے۔ مگر ڈاکٹر کچلو کا نام میرے لیے بس ڈبائی کے اس روزانہ کے کانگریسی جلوس سے یادگار ہے۔ کانگریسی اسمائے گرامی کی ریل پیل میں یہ نام ایسا گم ہوا کہ میرے حافظہ سے بھی اتر گیا۔ اب کہیں جا کر باغ جناح کی صبحوں میں شاہ صاحب کے طفیل میرے حافظہ میں اس نام کی تجدید ہوئی۔ اور اب مجھے پتہ چلا کہ وہ مذہباً مسلمان تھے۔ امرتسر کے لعل و گہر میں سے تھے۔ کانگریس کے بڑے رہنماؤں میں گنے جاتے تھے۔ تو شاہ صاحب اور ملک غلام نبی کے طفیل اس زمانے کے امرتسر کی سیاسی چہل پہل سے میرا تعارف ہوا مع اس مبارک موقع کے جب یہاں تحریک خلافت کا زور شور تھا اور مولانا محمد علی جیل سے چھوٹ کر سیدھے امرتسر پہنچے تھے جہاں کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ امرتسر کے ان سیاسی واقعات ہی سے اشارہ لے کر شاہ صاحب اور ملک غلام نبی ہمارے زمانے کی سیاست تک آتے اور اس پر اپنی مخصوص فصاحت و بلاغت کے ساتھ جس میں گالیوں کا ذائقہ بھی شامل ہوتا تبصرہ کرتے۔

اور اب ہمارے دوستوں میں اکرام اللہ ہیں انہیں ٹٹولا تو وہ بھی امرتسر کے نکلے۔ عطاء الحق قاسمی کہتے ہیں کہ میں بھی امرتسر کا ہوں۔ تو یہ خالی اے حمید تک کا معاملہ نہیں ہے۔ اور اس ذکر خیر کے لیے نہ صرف مظفر کا میں مرہون منت ہوں۔ اور کن کن راستوں سے امرتسر کا سلسلہ مجھ تک پہنچ رہا ہے۔

مگر امرتسر اور دلّی کے اجڑے ہوؤں کے سوا بھی تو کتنے خانہ بربادوں سے میرا واسطہ رہا ہے۔ ایک خانہ برباد سے تو دن رات کا ساتھ تھا۔ ایسا ساتھ کہ اس کی یادیں میری یادوں کے لیے چقی کا کام کر رہی تھیں۔ یہ اپنے نگر سے اجڑ کر یہاں آیا تھا کہ یہاں اس شہر میں سب خانہ بربادوں سے بڑھ کر خانہ برباد نظر آتا تھا۔

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی
اے ساکنانِ خطۂ لاہور دیکھنا
لایا ہوں اس خرابے سے میں لعلِ معدنی
جلتا ہوں داغِ بے وطنی سے مگر کبھی
روشنی کرے گی نام مرا سوختہ تنی
خوش رہنے کے ہزار بہانے ہیں دہر میں
میرے خمیر میں ہے مگر غم کی چاشنی

اسی کی یادوں سے لو لے کر تو میری یادوں کے چراغ روشن ہوئے۔

آگے چل کر ایک خانہ برباد اور نمودار ہوا۔ منیر نیازی۔ اس کی شاعری سے تعارف پہلے ہوا۔ شاعر سے بعد میں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی نظموں کو پڑھ کر لگا کہ یہ شاعر تو اپنے ہی قبیلہ کی مخلوق معلوم ہوتی ہے۔ کس جذبے سے اپنے چھوڑے ہوئے نگر کو یاد کرتا ہے اور تھوڑے لفظوں میں کیا جادو جگاتا ہے کہ اس نگر کی وہ ساری فضا جس میں حقیقی زندگی کی فضا اور ماورائے حقیقت کا جادو گھلے ملے نظر آتے ہیں کس طرح ہمارے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ اور ابھی اس سے تھوڑا تعارف ہوا ہی تھا کہ دیکھا کہ حلقۂ ارباب ذوق کی ایک نشست میں اپنی ایک نظم سنا رہا ہے۔ عنوان ''جن گھروں سے ہم نے ہجرت کی''۔

خانپور اے خانپور
تیری گلیوں میں تھیں کیسی پیاری پیاری صورتیں
مسجدوں کے سبز در اور مندروں کی مورتیں
خانپور اے خانپور
آم کے تاریک باغوں میں ہوا چلتی ہوئی
قوس اک رنگوں کی کوہ و دشت پر ڈھلتی ہوئی

پڑھتے پڑھتے آواز میں رقت پیدا ہوئی۔ بیچ بیچ رو پڑا اور چپ ہو گیا۔

منیر نیازی کی زندگی کا طور اور میرے جینے کا رنگ ڈھنگ اور۔ پھر بھی ایک عجب سا رشتہ قائم

ہوگیا۔ بس کچھ اس قسم کا رشتہ جو آتش کے شعر میں بیان ہوا ہے ۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

جب بھی چلتے پھرتے ملے' کبھی ٹی ہاؤس میں' کبھی ٹی ہاؤس سے باہر تو بس اسی قسم کی گفتگو ہوتی۔ اس کی اپنی راگنی میری اپنی راگنی۔ اس رو میں میں نے ان دنوں کچھ اس باہمی رشتہ پر اس کی شاعری کو پیش نظر لکھا تھا۔ کیوں نہ میں ان سطروں کو اس تذکرے میں پرو دوں۔

دراصل میں اور منیر نیازی جنت سے ایک ہی وقت میں نکالے گئے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو اسی حیثیت میں پہچانا ہے۔ چلتے پھرتے کسی موڑ پر ہماری مڈ بھیڑ ہوتی ہے۔ منیر نیازی سنانے لگتا ہے کہ اس کی بستی میں آموں کے کیسے گھنے پیڑ تھے۔ میں بیان کرنے لگتا ہوں کہ اپنی بستی میں شام کیسے پڑتی تھی اور مور کس رنگ سے بولتا تھا۔ منیر نے ہمیشہ اسی طرح سنایا اور سنا جیسے وہ یہ داستان پہلی مرتبہ سنا رہا ہے اور پہلی مرتبہ سن رہا ہے۔ ایک ملال کے ساتھ سناتا ہے اور ایک حیرت کے ساتھ سنتا ہے۔ ہم اپنی اپنی گمشدہ جنت اپنے دھیان میں بسائے پھرتے ہیں۔ اوروں کے تصور میں بھی اسے بسا تو رہنا چاہیے تھا مگر لگتا یوں ہے کہ سب نے کسی نہ کسی رنگ سے اس کی تلافی کر لی ہے یا ضعفِ حافظہ نے ان کی مدد کی ہے۔ مگر ہمارا حافظہ ہمارا دشمن بن گیا۔ حافظے نے بی بی حوا کو بھی بہت ستایا تھا۔ جنت سے نکلنے کے بعد انہیں جنت ایک عمر تک یاد آتی رہی۔ انہوں نے جنت کو بہت یاد کیا اور بہت روئیں۔ جنت کی یاد میں بہنے والے آنسو جو زمین پر گرے ان سے مہندی کے پیڑ اگے' "قصص الانبیاء" میں لکھا ہے کہ روئے ارض پر جتنے مہندی کے پیڑ ہیں وہ سب بی بی حوا کے آنسوؤں کا فیض ہیں۔

مجھے مہندی کے پیڑ اور منیر کے شعر اچھے لگتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ان میں تھوڑی میری آنکھوں کی نمی بھی شامل ہے۔ جب منیر اپنے خانپور کو پکارتا ہے تو میرا بھی ایک بستی کو پکارنے کو جی چاہتا ہے۔ جب وہ اپنے باغوں اور اپنے جنگل کا ذکر کرتا ہے تو میں اسے اسی عالم میں چھوڑ کر اپنے جنگل کی طرف نکل جاتا ہوں۔ ہماری بستی کا جنگل کچھ بہت گھنا نہیں تھا مگر میری یادوں نے اسے گھنا بنا دیا ہے۔ جب میں منیر نیازی کے شعر پڑھتا ہوں تو لگتا ہے کہ یہ جنگل اور زیادہ گھنا ہو گیا ہے اور زیادہ پھیل گیا ہے۔ سو اب اپنا جنگل بہت گھنا اور بہت پھیلا ہوا ہے لیکن بات یہاں آ کر ختم نہیں ہو جاتی۔ لگتا یہ ہے کہ اس سے آگے بھی کوئی جنگل ہے۔ اپنے جنگل میں چلتے چلتے میں اچانک کسی اور ہی جنگل میں جا نکلتا ہوں' زیادہ بڑے اور زیادہ پر ہول جنگل میں۔ مجھے ڈر لگنے لگتا ہے' جیسے میں عہد قدیم میں سانس لے رہا ہوں۔ شاید عہد قدیم بھی ہمارے بچپن کے منطقے کے آس پاس ہی واقع ہے۔ یا پھر منیر نیازی نے اپنے شعروں سے کوئی عجب سی پگڈنڈی بنا دی ہے کہ وہ خانپور سے چل کر میری بستی کو چھوتی ہوئی عہد قدیم میں جا نکلتی ہے۔ تو اب صورت یہ ہے کہ میں منیر کے شعر پڑھتے ہوئے

اپنے بچپن کے راستے عہدِ قدیم میں جا نکلتا ہوں۔ بچپن کے اندیشے اور وسوسے عہدِ قدیم کے آدمی کے وسوسوں اور اندیشوں سے جا ملتے ہیں۔

جنگلوں میں کوئی پیچھے سے بلائے تو منیرؔ
مڑ کے رستے میں کبھی اُس کی طرف مت دیکھو

مگر مجھے لگتا ہے کہ خود منیر نے مڑ کر دیکھ لیا ہے۔

وسوسے اور اندیشے عہدِ قدیم سے آج تک آتے آتے آدمی کے اندر اُتر گئے ہیں۔ اب باہر سے ہم ہمت والے ہیں' اندر سے خوف زدہ ہیں۔ پہلے ہم مڑ کر نہیں دیکھتے تھے اب اندر دیکھنے سے ڈرتے ہیں۔ کیا اندر بھی کوئی جنگل ہے؟ جنگل اصل میں پہلے ہمارے باہر تھا' اب ہمارے اندر ہے۔ ہم تو جنگل سے نکل آئے اور بڑے بڑے شہر تعمیر کر کے اپنے چاروں طرف فصیلیں کھڑی کر لیں' مگر جنگل ہماری بے خبری میں ہمارے اندر اتر گیا اور سات پردوں میں چھپ کر بیٹھ رہا۔ اب وہ ہمارے اندر سو رہا ہے۔ منیر نیازی وہ شخص ہے جس کے اندر جنگل جاگ اٹھا ہے اور سنسنا رہا ہے۔ اس نے مڑ کے جو دیکھ لیا ہے۔ اس کی شاعری کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ ہم جنگل میں چل رہے ہیں اور پاتال میں اتر رہے ہیں۔ عجب عجب تصویریں اُبھرتی ہیں۔

دبی ہوئی ہے زیرِ زمیں اک دہشت گنگ صداؤں کی
بجلی سی کہیں لرز رہی ہے کسی چھپے تہ خانے میں

کرے گا تو پیار مجھے یا
بنے گا نا معلوم کا ڈر
رہے گا دائم گہری تہ میں
جیسے اندھیرے میں کوئی در

پھر میرے تصور میں عجب عجب تصویریں اُبھرنے لگتی ہیں۔ میں اپنے پاتال میں اُترنے لگتا ہوں۔ اگلی پچھلی کہانیاں اور بھولے بسرے قصے یاد آنے لگتے ہیں۔ چمکتی دمکتی اشرفیوں سے بھری زمین دوز دیگیں' راجہ باسٹھ راجہ باسٹھ کے محل کے سنہری برج جو زمین کے اندھیرے میں جگمگ جگمگ کرتے ہیں۔ میری نانی اماں بہت سنایا کرتی تھیں کہ زمین میں یہ دبی دیگیں کس طرح اندر ہی اندر سفر کرتی ہیں اور پکارتی ہیں اور جب کسی کو یہ پکار سنائی دے جاتی ہے تو اس پر کیا بیتی ہے۔ ان کی باتیں اسی پکار کو سننے کی خواہش کی غمازی کرتی تھیں مگر وہ ڈرتی بھی رہتی تھیں' کہیں بیچ بیچ کسی سنسان اندھیری رات میں یہ پکار انہیں سنائی نہ دے جائے۔ سانپ ان دیگوں کی رکھوالی کرتا ہے۔ میری نانی اماں بتاتی تھیں کہ سانپوں کا ایک راجہ ہے' اسے وہ راجہ باسٹھ

کہتی تھیں۔ ہندو دیومالا کے تذکروں میں اس کا نام راجہ باسک لکھا ہے۔ اس کا محل سونے کا بنا ہوا ہے اور پاتال کے اندھیرے میں جگمگاتا ہے۔ میری نانی اماں سانپ کا نام شاذ و نادر ہی لیتی تھیں۔ اشاروں کنایوں میں اس کا ذکر کرتی تھیں۔ منیر نیازی بھی اس کا نام لینے سے ڈرتا ہے مگر اس کا ذکر بہت کرتا ہے۔ اتنا خوف اور اتنی کشش! آخر کیوں؟

نامعلوم کا خوف اور نامعلوم کے لیے کشش! اس خوف اور کشش کی صورت منیر نیازی کی شاعری میں کچھ ایسی ہے جیسے آدم و حوا ابھی ابھی جنت سے نکل کر زمین پر آئے ہیں۔ زمین ڈرا بھی رہی ہے اور اپنی طرف کھینچ بھی رہی ہے۔ پاتال بھی ایک بھید ہے اور وسعت بھی ایک بھید ہے۔ بھید بھری فضا کبھی اس حوالے سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی اُس حوالے سے اور شعر کے ساتھ دیومالائی قصے اور پرانی کہانیاں لپٹی چلی آتی ہیں۔

سفر میں ہے جو ازل سے یہ وہ بلا ہی نہ ہو
کواڑ کھول کے دیکھو کہیں ہوا ہی نہ ہو
نہ جا کہ اس سے پرے دشتِ مرگ ہو شاید
پلٹنا چاہیں وہاں سے تو راستا ہی نہ ہو

منیر نیازی کے لیے زمین اپنے پاتال اور اپنے پھیلاؤ کے ساتھ دہشت و حیرت سے بھرا ایک تجربہ ہے مگر پھر وہی سوال کہ آخر کیوں؟ کیا اس کا تعلق بھی جنت سے نکلنے کے قصے سے ہے؟ کیا یہ ہجرت کا ثمر ہے؟ مہندی کے یہ پیڑ خود بخود تو نہیں اُگ آئے۔ قدیم آدمی کے تجربے تو ہمارے آپ کے اندر اور دیومالاؤں اور داستانوں کے اندر دبے پڑے ہیں۔ آخر کوئی واقعہ تو ہوا ہے کہ یہ تجربے پھر سے زندہ ہوئے اور ایک نئی معنویت اختیار کر گئے۔

ہجرت کا تجربہ لکھنے والوں کی ایک پوری نسل کو اردو ادب کی باقی نسلوں سے الگ کرتا ہے۔ اس نسل کے مختلف لکھنے والوں کے یہاں اس تجربے نے الگ الگ روپ دکھائے ہیں۔ منیر نیازی کے یہاں اس کے فیض سے ایسا روپ ابھرا ہے جو ایک نئی دیومالا کا سا نقشہ پیش کرتا ہے۔

لو ایک اور گرہ مجھے یاد آ گیا۔ اسی واسطے سے مجھے خیال آیا کہ آخر ان مکانوں، گلیوں، بستیوں کو بھی تو کچھ لوگ یاد کرتے ہوں گے جو یہاں سے اجڑ کر اس پار چلے گئے اور وہ مکان بھی اپنے مکینوں کو یاد تو کرتے ہوں گے جو کتنے دنوں تک کسی کو الاٹ نہیں ہوئے اور ان گذر گاہوں کو اپنے سیلانی یاد آتے رہے ہوں گے جو نو واردوں کے قدموں سے کتنے دنوں تک مانوس نہیں ہو پائے۔ خیر تو میں ذکر یہ کر رہا تھا کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جب پہلی بار اپنی بیگم منورما نارنگ کے ہمراہ وارد ہوئے تو اس بی بی نے بتایا کہ ہم یہاں قلعہ گوجر سنگھ میں رہا کرتے تھے۔ آپ مجھے وہاں لے چلیں۔ میں اپنا وہ گھر دیکھنا چاہتی ہوں جہاں میں نے بچپن لڑکپن گذارا ہے۔ میں نے کہا کہ اب تک اس کوچہ کا نقشہ ہی بدل گیا ہوگا۔ اس گھر کا اب کیا پتہ چلے گا۔ مگر انہیں یقین تھا

کہ اس گھر کو وہ پہچان لیں گی۔ سو ریاض انور اور میں انہیں ہمراہ لے کر اس کوچہ کی طرف چلے۔ وہاں پہنچ کر ریاض انور نے اپنی گاڑی ایک گوشے میں کھڑی کی۔ اور پیدل چلنا شروع کیا۔ مکانوں کا جائزہ لیتے لیتے وہ کسی کسی مکان کے سامنے تھوڑا رکتیں' اسے غور سے دیکھتیں اور پھر آگے بڑھ جاتیں۔ کتنی گلیوں سے گذر کر بالآخر وہ ایک مکان کے سامنے جا کر ٹھٹک گئیں۔ کتنی دیر تک وہ اسے غور سے دیکھتی رہیں۔ اور پھر ہم نے دیکھا کہ وہ تو رو رہی ہیں۔ یہ نقشہ دیکھ کر کچھ محلے والے آن جمع ہوئے۔ اہل خانہ بھی گھر سے نکل آئے کہ آخر یہ ہمارے گھر کے سامنے لوگ کیوں اکٹھے ہو گئے ہیں۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ دیکھئے یہ ہماری مہمان ہیں۔ ہندوستان سے آئی ہیں۔ تقسیم سے پہلے ان کا گھرانا اسی کوچے میں آباد تھا۔ ان کی بہت خواہش تھی کہ ایک جھلک اس گھر کی دیکھ لیں جہاں وہ پلی بڑھی ہیں۔ یہ جواب آپ کا گھر ہے تقسیم سے پہلے یہی ان کا مسکن تھا۔ اسے دیکھ کر وہ تھوڑا جذباتی ہوئی ہیں۔ وہ صاحب یہ سن کر بہت متاثر ہوئے۔ کہا کہ پھر آپ لوگ اندر آئیں۔ اب وہ ہماری مہمان ہیں۔ اندر آ کر بیٹھیں۔ شوق سے اپنا گھر دیکھیں۔ کتنی جلدی جلدی انہوں نے مہمان کے لیے چائے کا انتظام کیا۔

اور اب مجھے اس شہر میں افسانہ نگار رام لال کی آمد یاد آ رہی ہے۔ وہ لکھنؤ سے آئے تھے۔ اور پروفیسر آغا سہیل نے کہ لکھنوی تھے سب سے بڑھ کر اپنے لکھنوی مہمان کی آؤ بھگت کی۔ مگر رام لال نے اس شہر میں پہنچتے ہی اعلان کیا کہ میں تو اصل میں میانوالی کی مٹی ہوں۔ مجھے ایک پھیرا اپنے اس نگر کا لگانا ہے۔ اپنی اس جنم بھومی کو دیکھنا ہے اور اس گھر کو جہاں میری نال گڑی ہے۔ سو یار انہیں میانوالی لے گئے۔ وہاں ان کی بہت خاطر تواضع ہوئی۔ وہاں سے واپس آئے تو اس نگر کی تھوڑی مٹی پڑیا میں باندھ کر لائے۔ کہا کہ میں میانوالی کی مٹی لکھنؤ لے جاؤں گا۔ میری مٹی میرے پاس رہنی چاہیے۔

مجھے یہاں پھر ہندی کہانی کار راجی سیٹھ کی کہانی یاد آ گئی جس کا میں پچھلے صفحوں میں ذکر کر چکا ہوں۔ 'انتظار حسین رکو اپنی بستی' میں جس کوچے کا تم نے نقشہ کھینچا ہے اس کا نام غلط بتایا ہے۔ وہ کوچہ شام نگر نہیں سنت نگر ہے۔ وہیں تو ہمارا گھر تھا اور یہ کہتے کہتے انہوں نے سنت نگر کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ ان دنوں کو جب وہ یہاں رہتی تھیں۔

ہاں ایک اور یاد۔ ہم اجنتا کی گپھاؤں میں تھوڑا تھوڑا جھانک کر آئے ہیں اور بھساول سٹیشن پر حیران و پریشان کھڑے ہیں۔ یہاں سے گاڑی پکڑنی ہے۔ دلی ہماری منزل مقصود ہے مگر ہمارے میزبانوں نے بمبئی میں ہمارے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ٹکٹ ہاتھ میں پکڑا دیئے یہ نہیں بتایا کہ تمہاری نشستیں ریزرو نہیں ہیں۔ دلی جانے والے مسافروں کا یہاں ایک ہجوم ہے۔ سٹیشن ماسٹر ٹکا سا جواب دے دیتا ہے کہ گاڑی آنے پر پتہ چلے گا کہ کسی ڈبے میں کوئی جگہ ہے یا نہیں ہے۔ ہم بتاتے ہیں کہ ہم پاکستان کے مسافر ہیں اور اپنے ویزا کے پابند ہیں۔ گاڑی میں جگہ نہ ملی تو مشکل میں گرفتار ہو جائیں گے۔ مگر ہماری اس بات کو وہ ایک کان سنتا ہے

اور دوسرے کان اڑا دیتا ہے۔ ہم پریشان کہ اب کیا کریں۔ اچانک سٹیشن ماسٹر صاحب سوال کرتے ہیں
''آپ میں سے کوئی لاہور کا ہے۔''

''جی میں ہوں۔'' میں جلدی سے جواب دیتا ہوں۔

''گوالمنڈی کا کیا حال ہے۔''

''خوب شاد آباد ہے۔''

''ہم گوالمنڈی میں رہتے تھے۔ ایف سی کالج میں پڑھتا تھا۔ ایف سی کالج کا کیا حال ہے۔''

''بہت اچھا چل رہا ہے۔''

رک کر''آپ نے تلوک چند محروم کا نام سنا ہوگا۔ شاعر تھے نا وہ۔ میں ان کا بھتیجا ہوں۔''

تب میں نے حوصلہ کیا اور کہا کہ ''اب تو آپ پھنس گئے۔ ہمارا آپ سے دوہرا رشتہ نکل آیا۔ لاہور والا رشتہ۔ پھر ہمارے اردو شاعر کے واسطے سے رشتہ۔ اب ہمیں اس گاڑی میں جگہ نہ ملی تو پھر آپ ہی کے مہمان ہوں گے۔ اور اس شہر کا ویزا ہمارے پاس ہے نہیں۔''

''اچھا کچھ کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون کا ڈائل گھمایا۔ اپنے افسرِ اعلیٰ سے کچھ باتیں کیں۔ ان کے نام پر اس گاڑی میں دو کوپے ریزرو تھے۔ ایک کوپہ انہوں نے اپنا ہمیں بخش دیا۔''

اس سب کا کیا مطلب ہے۔ افتخار عارف کا ایک شعر سن لیجیے۔ مطلب سمجھ میں آ جائے گا۔

تمام خانہ بدوشوں میں مشترک ہے یہ بات
سب اپنے اپنے گھروں کو پلٹ کے دیکھتے ہیں

۞........۞........۞

وقت، میرے عزیز، وقت

اے یار کہاں گئے وہ لوگ، دور دور تک نظر دوڑاتا ہوں۔کوئی دکھائی نہیں دیتا۔کہاں اڑنچھو ہو گئے۔ میں میر میر بہت دیر تک اور دور تک پکارا آیا۔ابھی کل تک یہیں تھے۔ادب کی وادی میں سنگت میں آوارہ پھرنا کتنا بھلا لگتا ہے۔لگتا تھا۔اداس اداس پھرنا۔گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں،کڑکڑاتے جاڑوں کی ٹھنڈی یخ راتوں میں۔بے مقصد بے مطلب۔کبھی اس کوچے میں شام کرنا،کبھی اس چائے خانے میں جاکر پسر جانا۔ چائے پینا،پینے سے بڑھ کر چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانا۔نہ ہوا س سرگرمی کا کوئی مفہوم،کوئی معنی و مطلب مگر اس میں ایک شان آوارگی اور رنگ یوانگی تو تھا مگر وہ سودائی تو چلے گئے۔ان کے ساتھ کیا کیا کچھ چلا گیا۔چائے کی پیالی گئی۔چائے کی پیالی میں اٹھتے طوفان گئے۔بحثیں گئیں۔مکالمہ گیا۔ارے وہ ریستورانوں کا سلسلہ ہی مٹ گیا جس کے بیچ مکالمے کی روایت پروان چڑھی تھی۔یہاں سے وہاں تک اس بھری پری شاہراہ پر کتنے ریستوران تھے۔ریستورانوں کی ایک پوری لڑی یہاں سے وہاں تک۔ادیب،دانشور،فنکار،صحافی۔کیا اہلے گہلے پھرتے تھے۔گزرتے گزرتے کہیں بھی ٹھٹک گئے،کسی بھی ریستوراں میں جابراجے۔چائے کی پیالیاں کھنک رہی ہیں۔بحث کا باب کھلا ہوا ہے۔اب اس شاہراہ پر جسے مال کہتے ہیں،کوئی بھی ریستوراں نہیں۔کافی ہاؤس بند،چائنیز ریستوراں مقفل،ڈینز بند،گارڈینیا بند،سٹینڈرڈ بند۔کیفے اورینٹ کا دفتر ہی مٹ گیا۔لارڈز کہاں گیا اور ہاں اس سے پرے جو شیزان کا نئی نینٹل تھا،وہاں اب جوتوں کی دکان کھلی ہوئی ہے۔شیزان اورینٹل کو مظاہرین نے پھونک ڈالا۔بھلا کیوں،یہ سوال اٹھانا بیکار ہے اور وہ جو میٹرو تھا جہاں۔

رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے

لیلیٰ بشمّل اینجلا۔کس دھوم سے فلور پر برآمد ہوتی تھی۔وے صورتیں الٰہی کس دیس سدھار گئیں۔ وہاں تو اب ایک اور ہی رنگ کی بلند بام عمارت کھڑی ہے۔

اور ہاں پاک ٹی ہاؤس۔کیا کہا پاک ٹی ہاؤس۔اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔ ارے سب سے بڑھ کر یہیں تو ہمارا بسیرا ہوا کرتا تھا۔کتنا جمگھٹا رہتا تھا یہاں۔روئیے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجیے۔تصور میں ابھر آئی چہروں کی ایک پوری ندی۔قیوم نظر کا داخل ہونا۔داخل ہوتے ہی کاؤنٹر پہ سراج صاحب

سے کہ مالک و منیجر تھے، بات کرتے کرتے قہقہہ لگاتا۔ پیچھے پیچھے شہرت بخاری کا اس طرح داخل ہونا کہ بغل میں حلقہ ارباب ذوق کا رجسٹر ہے۔ پھر حلقہ والوں کی آمد کا سلسلہ جاری۔ انجم رومانی، اعجاز بٹالوی، یوسف ظفر، مختار صدیقی، ضیا جالندھری، امجد الطاف، شیر محمد اختر۔ بس وہ اپنی زبان کی لکنت کی وجہ سے مار گئے۔ ویسے کیا دراز قد شخصیت تھی اور ہاں سجاد رضوی کہ شیر محمد اختر کے برابر بیٹھ جاتے تو شتر گربہ کی صورت پیدا ہو جاتی۔

مت بھولو کہ حلقہ کی اسی برادری میں ہم بھی تھے۔ پھر راندۂ درگاہ ہوئے۔ اب ہماری منڈلی نے شکل نکالی۔ ناصر کاظمی، مظفر علی سید، احمد مشتاق مگر یہ سلسلہ تو بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ غالب احمد، شاہد حمید، حنیف رامے۔ ذرا ٹھہریئے یہ نو خیز مصور حنیف رامے مظفر علی سید کی انگلی پکڑ کر ٹی ہاؤس میں داخل ہوا تھا مگر پھر یہاں آ کر جلد ہی اس نے ایک نیا مرشد دریافت کر لیا۔ شیخ صلاح الدین۔ اب مرشد اور مرید دونوں اس منڈلی میں شامل ہیں۔ اور لیجیے کافی ہاؤس سے ایک مصور اٹھا اور ہمارے بیچ آن بیٹھا۔ یہ شاکر علی ہیں۔ آپ بولتے رہیں، بحثیں کرتے رہیں۔ وہ گم سم بیٹھے رہیں گے اور لیجیے قیوم نظر کا ایک شاگرد ان سے ٹوٹ کر ہمارے بیچ آن بیٹھا ہے۔ یہ ہے سعید محمود۔ اسی کے ساتھ گورنمنٹ کالج سے نکلا ہوا ایک اور نوجوان نظر آئے گا۔ ظفر صمدانی۔ ایک شے کراچی سے یہاں پہنچی تھی۔ نام سجاد باقر رضوی۔ پہلے اس عزیز نے قیوم نظر کے سامنے زانوئے ادب طے کیا تھا۔ اب ان سے برگشتہ ہو کر ہمارے بیچ براجمان ہے۔ ایک نیا چہرہ پنڈی کی سمت سے نمودار ہوا۔ یہ منیر احمد شیخ ہے مگر یہ جو میں نے نام گنائے ہیں ان کا اس پوری منڈلی سے تعلق کم ہے۔ ناصر کاظمی اور میرے ساتھ ان کی وابستگی زیادہ ہے۔

اور ہاں کچھ بزرگانِ ادب ہیں بلکہ کہیے کہ لاہور کی ناک ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، عابد علی عابد، پروفیسر حمید احمد خاں۔ وہ حلقہ ارباب ذوق کے جلسہ کی صدارت کرنے آئیں گے تو پھر ٹی ہاؤس میں یارانِ حلقہ کے بیچ بیٹھ کر چائے پینا بھی ضرور ہے۔ ہاں اگر ن م راشد شہر میں وارد ہوئے ہیں تو وہ حلقہ میں بھی آئیں گے اور پھر ٹی ہاؤس میں بھی وارد ہوں گے۔ اور الطاف گوہر تو ہیں ہی حلقہ کی پرانی بڈی۔ وہ ادھر کیسے نہیں آئیں گے۔ پرانی بڈی پہ یاد آیا کہ اصلی پرانی بڈی تو مبارک احمد ہیں مگر بدلتے زمانے کے ساتھ اس طرح بدلتے ہیں کہ پرانی بڈی بھی ہیں اور نئی تانتی کے ساتھ بھی ہیں۔ اور حفیظ ہوشیار پوری دو حوالوں سے ٹی ہاؤس میں نظر آئیں گے۔ حلقۂ ارباب ذوق کے حوالے۔ اس سے بڑھ کر ناصر کاظمی کے حوالے سے۔

لیجیے ٹی ہاؤس میں زمانے کا ستایا ہوا ایک قافلہ میکلوڈ روڈ کے چائے خانوں سے اجڑ کر یہاں آن پہنچا ہے۔ ترقی پسند تحریک سرکاری عتاب میں آ گئی۔ کتنے گرفتار ہو گئے۔ اب وہ جیل خانوں میں مقید ہیں۔ باقیات الصالحات نے ٹی ہاؤس کا رخ کیا۔ عارف عبدالمتین، احمد راہی، ظہیر کاشمیری، صفدر میر کیا کیا نابغۂ روزگار اپنے شاد آباد ٹھکانوں کو خیر باد کہہ کر یہاں آن آباد ہوا ہے۔

ایک جانا پہچانا نقاد دلی کو سلام کر کے لاہور پہنچا۔ پہلا قدم اس نے حلقہ ارباب ذوق میں رکھا۔

دوسرا قدم ٹی ہاؤس میں۔ یہ ڈاکٹر عبادت بریلوی تھے۔ میں نے اور ناصر نے بڑھ کر انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پھر باقاعدگی سے شام کو یہاں کا پھیرا لگانے لگے۔ ایک شام محمد طفیل ان کے ہمراہ آئے۔ پھر وہ بھی آتے چلے گئے۔ پھر ایک شام لکھنؤ کا ایک چہرہ محمد طفیل کے ہمراہ تھا۔ یہ کیپٹن احسن کلیم تھے اور پھر چند شاموں کے بعد محمد طفیل کے ہمراہ ایک اور اجلا اجلا چہرہ نمودار ہوا۔ نام فرہاد زیدی۔ یہ حیدرآباد کو سلام کہہ کر یہاں پہنچا تھا۔ یوں ایک اچھی خاصی ٹولی تھی کہ کتنے دنوں تک اپنی شامیں ٹی ہاؤس میں بسر کرتی رہی۔ پھر محمد طفیل نے یہیں کہیں کافی ہاؤس کے آس پاس کے تہہ خانے میں اپنا ذیلی دفتر قائم کرلیا۔ یوں "نقوش" نے ٹی ہاؤس کے پڑوس میں آ کر اپنے قدم جما لیے۔

مطلب یہ کہ لکھنے لکھانے والوں کی مخلوق شہر کے مختلف کوچوں سے کھنچ کر یہاں ڈھیرے ڈھیرے پہنچ رہی تھی۔ ادھر ہندوستان سے اجڑ کر آنے والے جب واہگہ پار کر کے لاہور میں قدم رکھتے تو ان میں جو ادب کی نام لیوا مخلوق تھی وہ بھی کشاں کشاں یہاں پہنچ جاتی۔ اور امرتسر کے اجڑے ہوؤں کو تو بہرحال یہاں پہنچنا ہی تھا۔ انہیں اجڑے ہوؤں میں مظفر علی سید اور احمد مشتاق بھی تو تھے کہ وہ نہ ہوتے تو ہماری منڈلی کیسے وجود میں آتی۔ اور ہاں اسی قافلہ سے ایک رومانی روح برآمد ہوئی...... اے حمید۔ ترقی پسند تحریک نے بھی ایک رومانی روح کو جنم تو دیا تھا۔ کرشن چندر کو جس نے حقیقت نگاری میں رومانیت کا تڑکا لگایا اور ترقی پسند افسانے کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا۔ پھر اس رنگ نے افسانے میں بہت فروغ پایا۔ اے حمید کے یہاں آ کر حقیقت نگاری کی مقدار گھٹ گھٹا کر چٹکی بھر رہ گئی۔ رومانیت نگاری پروان چڑھی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان نظر آیا جس کا ایک قدم کافی ہاؤس میں، دوسرا قدم ٹی ہاؤس میں۔ اسی حساب سے ایک قدم مصوری میں، دوسرا قدم ادب میں اور ادب میں اس شان سے کہ نصف شاعری میں نصف افسانے میں مگر دو کشتیوں میں پاؤں کب تک۔ کوئی دن جاتے ہیں کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ راوی اسے نئے مصوروں میں شمار کرے گا۔ نام شمزا۔

اور یہ جو اک بزرگ آتے ہیں ٹی ہاؤس میں خضر کی صورت۔ دوش پر شاعروں کے نام لکھی گئی دیوانگی کا بار امانت اٹھائے ہوئے۔ ہم جنسوں کی صحبت سے گھبرا گیا ہوں یارب۔ سو رابط و ضبط آدمیوں سے کم چڑیوں سے زیادہ ہے۔ اور یہ حشر کے زمانے کے کتے اب کہاں۔ جو کتے فی زمانہ نظر آتے ہیں انہیں کو غنیمت جانتے ہیں۔ انہیں کے لیے رزق کا سامان کرتے رہتے ہیں۔

لو اب منیر نیازی کی آمد ہے۔ اسے مکروہ آدمیوں سے نفور ہے۔ طیب روحوں کی تلاش ہے مگر کون جانے کون کب اسے مکروہ نظر آنے لگے۔ کب طیب ہونے کی سند مل جائے۔

ادھر گورنمنٹ کالج سے نوخیزوں کی ایک پلٹن چلی اور دندناتی ہوئی یہاں آن پہنچی۔ افتخار جالب اپنی نئی لسانی تشکیلات کے ساتھ بیچ میں براجمان ہیں۔ اردگرد کتنے بچے کچے، کتنے عاقل و بالغ ان کے گرد جمع ہیں۔

وہ مرشد، یہ مرید۔ مریدوں میں اورینٹل کالج سے آئے ہوئے دانے بھی شامل ہیں اور گورنمنٹ کالج والے بھی۔ انیس ناگی، سعادت سعید، تبسم کاشمیری، نعیم جوزی، گوہر نوشاہی اور ہاں انور سجاد۔۔ یہ پلٹن تو فی الحال ادب کے نام پہ ہاؤ ہو کر رہی ہے۔ کچھ ایسے بھی اب یہاں آن داخل ہوئے ہیں جو پیپلز پارٹی کا کلمہ پڑھتے ہیں اور ادب کے ساتھ سیاست کو پیوند کرتے ہیں اور ہاں جنہیں ادب اور پیپلز پارٹی کے دو آتشہ سے بڑھ کر بھی کچھ طلب ہے۔ جاوید شاہین، سلیم شاہد، یوسف کامران، الطاف قریشی، نذیر ناجی، عباس اطہر مگر یہ جو دو موخر الذکر ستارے ہیں۔ ان کا قیام چندروزہ ہے۔ ٹی ہاؤس میں بھی، شعروادب میں بھی۔ انہیں تو صحافت کی چراگاہ میں جا کر شاداب ہونا ہے۔ خیر ایسے چند دانے تو اور بھی تھے۔ عطاء الحق قاسمی یہاں جن کی سنگت پہلے مستنصر تارڑ سے ہوئی مگر جلد ہی کٹ۔ البتہ امجد اسلام امجد کے ساتھ سنگت لمبی کھنچی لیکن جب نزاکت علی سلامت علی کی جوڑی سلامت نہ رہ سکی تو یہ جوڑی بھی کتنے دن سلامت رہ سکتی تھی۔ سو جلد ہی یاری کٹ ہو گئی۔ پھر عطاء الحق قاسمی اپنی راہ امجد اسلام امجد اپنی راہ۔ اور امجد کوٹی ہاؤس میں کون سے زیادہ دن بسر کرنے تھے۔ اسے تو ٹی وی کی چراگاہ پکار رہی تھی۔ پھر ''وارث'' نام کا سیریل اس کے لیے طرۂ امتیاز بن گیا۔ مگر اسی ٹی ہاؤس سے ایک اور جوان اٹھا جو ٹی وی میں جا کر اسی شان سے چمکا۔ یہ یونس جاوید تھا مگر یونس اپنی وضع میں پکا نکلا۔ ٹی ہاؤس سے بدستور پیوست رہا اور حلقہ نے وابستگی کا ثبوت اس طرح پیش کیا کہ اس پر ایک پوری تحقیق کر ڈالی۔

ارے ہاں یہاں ایک ٹکڑی وہ بھی تو آن کر بیٹھی تھی جس کے واسطے سے احسان دانش نے اس چائے خانے میں چندے قدم رنجہ فرمایا۔ اس ٹکڑی کے سرغنہ ہوش ترمذی تھے۔ ان کے ساتھ عمر فیضی گاہے گاہے۔ سجاد رضوی بھی حلقہ کی ٹکڑی سے ٹوٹ کر ان کے بیچ آ کر بیٹھے تھے۔ سجاد رضوی بھی کیا خوب شے تھے۔ فارسی پر قناعت نہیں کی۔ عربی زبان کے بھی شناور بن گئے۔ کسی عربی لفظ کے سلسلہ میں مشکل پیش آتی تو ہم ہر پھر کر اس عزیز سے رجوع کرتے۔ لفظ کے مروج معنی کے ساتھ ساتھ اس کے جنسی معنی بھی ضرور بتاتے۔ اس کی توجیہہ یوں کرتے کہ عربی میں اکثر لفظ اپنے ساتھ ضمنی طور پر ایک جنسی مفہوم بھی لے کر آتے ہی۔ ایک دفعہ بتایا کہ ہم اصلاً ترستارن کے باسی ہیں۔ تقسیم میں اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ آدھا پاکستان میں آدھا ہندوستان میں۔ انجم رومانی نے فی البدیہہ کہا ۔

سجاد رضوی کا نگر آدھا اِدھر آدھا اُدھر

پھر شعر میں فارسی جڑ دی اور شعر یوں ہو گیا ۔

سجاد رضوی رانگر آدھا ادھر، آدھا ادھر

ٹی ہاؤس نشینوں کے نام کہاں تک گناؤں۔ سوچا تھا کہ جن جن کو یہاں اٹھتے بیٹھتے دیکھا ہے سب کے نام قلم بند کر دو مگر کاغذ نبڑنے لگا ہے۔ قلم رک رک کر چل رہا ہے، ہمت جواب دے رہی ہے۔ جن عزیز دوستوں کا ذکر مقصود تھا، وہ تو رہا ہی جا رہا ہے۔ سراج منیر۔

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

شتابی سے آیا، شتابی سے گیا۔ بس اسی عجلت میں وہ یاروں سے اپنی ذہانت اور ادبی سوجھ بوجھ کا لوہا منوا گیا۔ اپنی فراست الیدکا بھی۔ اپنی ہاتھ کی لکیریں بھی دیکھیں اور معلوم کر لیا کہ کوچ کی گھڑی زیادہ دور نہیں اور وہ گھڑی سچ مچ جلد ہی آن پہنچی۔

سہیل احمد خاں سجاد باقر رضوی کے ہمراہ اس قریئے میں پہنچا۔ کتنی جلدی اس کا جو ہر آشکار ہوا۔ ٹی ہاؤس میں کتنے جوش و جذبے کے ساتھ شب و روز گزارے مگر پھر شوق علم نے ٹی ہاؤس سے جلد ہی بے نیاز کر دیا۔ تدریس اور شوق حصول علم۔ زندگی کے سارے شوق سارے مشاغل ان دو سرگرمیوں کی نذر ہو گئے۔

اور میں تو اس مرد اجنبی کا بھی ذکر کرنا چاہتا تھا جو روز صبح ہی صبح یہاں آن وارد ہوتا اور وبسٹر ڈکشنری کھول کر بیٹھ جاتا اور دن ڈھلے تک اس کے مطالعہ میں غرق رہتا۔ میں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا اور متجسس کہ جب یہ ڈکشنری ختم ہو جائے۔ تو پھر وہ کیا کرے گا۔

اور ہاں پٹری سے اترے ہوئے اس شخص کا تذکرہ بھی مجھ پر لازم آتا ہے جو صبح کو سب سے پہلے یہاں وہی وارد ہوتا تھا کہ ٹی ہاؤس کی طرف سے اسے ناشتے کی رعایت ملی ہوئی تھی۔ نیز دوپہر اور رات کے کھانے کی۔ ناشتے کے فوراً بعد وہ صدر امریکہ کے نام مراسلہ لکھنا شروع کر دیتا۔ انگریزی میں لکھتے نامہ لکھے گئے دفتر۔ اللہ ہی جانے اس طرف سے کوئی جواب آیا یا نہیں آیا۔

آخر آخر میں تو ٹی ہاؤس میں یہی گنی چنی روحیں رہ گئی تھیں۔ کوئی گھر کوئی نگر سدا آباد تو نہیں رہتا۔ سو میں نے یہاں یہ نقشہ بھی دیکھا کہ الو کی مثال اکیلا زاہد ڈار بیٹھا ہے۔ سامنے چائے کی پیالی رکھی ہے۔ ایک ہاتھ سے پیالی اٹھائی، چائے کا گھونٹ لیا، دوسرے ہاتھ میں کتاب کہ آنکھ کے قریب کھلی ہے۔ بینائی زوال کر رہی ہے مگر وضعداری عینک کے استعمال کی اجازت نہیں دیتی۔

ادھر آخری کونے میں اسرار زیدی بیٹھے اونگھ رہے ہیں اور اپنے مریدوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے مرید بھی اب چھنٹ چھنا کر گنتی کے رہ گئے ہیں۔ ان کا بھی اب اعتبار نہیں۔ اکا دکا آیا، آیا نہ آیا۔ باقی اپنے گوشے میں پٹری سے اترا ہوا شخص مراسلہ لکھنے میں معروف ہے اور وبسٹر ڈکشنری کا حافظ ڈکشنری میں مستغرق ہے۔

اب یہی بچن کھچن ٹی ہاؤس کا سرمایہ تھی۔ اس بچن کھچن پر کیسے گزارہ کیا جا سکتا تھا سو

آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا

ٹی ہاؤس بند ہو گیا۔ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔

اب میں اس راہ گزرتا ہوں تو نقشہ کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ آج کی مال روڈ خدا کی پناہ گاہ۔ گاڑی سے گاڑی بھڑی نظر آتی ہے۔ بھلے زمانوں میں شاد آباد کوچوں بازاروں میں پیادوں کی ریل پیل ہوتی تھی۔ سو

کندھے سے کندھا چھلتا تھا۔ اب پیادے پٹ گئے۔ سواروں کا بھیڑ بھڑکا ہے۔ سواریوں میں سب سے بڑھ کر موٹر کی سواری۔ سو اس راہ پر جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، موٹر سے موٹر رگڑ کھا کر چلتی ہے۔ میں اپنی پرانی دھرانی موٹریا میں بیٹھ کر ادھر سے گزرتا ہوں تو قدم قدم پر بریک لگاتا ہوں اور مشکل سے راہ پاتا ہوں۔ ٹریفک کی بھیڑ میں پھنس کر رک جاتا ہوں تو نادانستہ اجڑے ہوئے ٹی ہاؤس کی طرف نظر جاتی ہے اور اس گوشہ میں جہاں کافی ہاؤس تھا اور جہاں چینیز تھا، سارا کوچہ کتنا ویران نظر آتا ہے۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ یا الٰہی اتنی سواریاں، اتنا شور، اتنا آدم اور اتنی ویرانی۔ سچ پوچھو تو ویرانی بھی کم ستم ظریف نہیں ہوتی۔ کبھی اس طور پھیلتی ہے کہ ہیں مکان دسرا دجا خالی۔ بارہ بارہ کوس تک چراغ جلتا نظر نہیں آتا۔ کبھی اس رنگ سے آتی ہے کہ روشنی کا وفور ہے، شور ہے اور بھیڑ ہے اور یہاں سے وہاں تک ویرانی کا بسیرا ہے۔

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ارد گرد دیکھتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں، یا مولا یہ کونسی دنیا ہے اور یہ کون لوگ ہیں۔ وہ دنیا جو ابھی کل تک یہاں پھل پھول رہی تھی، وہ کونسی دنیا تھی۔ وہ جانے پہچانے لوگ کہ یہاں البلے گہلے پھرتے نظر آتے تھے کدھر نکل گئے۔ ان میں کتنے میرے یاران عزیز تھے۔ کوئی نظر نہیں آتا اور وہ مقامات آہ و فغاں جو ان کے ہاؤ ہو سے گونجتے رہتے تھے، کبھی نالہ کبھی زاری، کبھی ہاؤ ہو شب بھر۔ وہ مقامات کہاں گئے۔ میں اس شاہراہ پر اس کنارے سے اس کنارے تک دیکھ آیا۔ کوئی ریستوران، کوئی چائے خانہ نظر نہیں آیا۔ اس کی جگہ ایک اور ہی کارخانہ نظر آیا۔ راوی اسے فوڈ سٹریٹ لکھتا ہے۔ ریستوراں غائب۔ جس کوچے میں نکل جاؤ ایک فوڈ سٹریٹ موجود پاؤ گے۔

یا مظہر العجائب، یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ وہ کیا نقشہ تھا، اب کیا نقشہ ہے۔ جیسے وہ ایک تہذیب تھی جس کا بستر لپٹ گیا۔ اب کوئی نئی تہذیب اپنا رنگ جما رہی ہے۔ وہ کیا لوگ تھے کہ گھنٹوں بلکہ پہروں کے حساب سے ریستوراں میں جمے بیٹھے ہیں۔ چائے پی رہے ہیں، سگریٹ پھونک رہے ہیں اور بحثیں کیے چلے جا رہے ہیں۔ جو موضوع زیر بحث آ گیا اس پر رواں ہیں۔ کھانے کا ہوش ہی نہیں ہے۔ پینے پر زور ہے۔ اسی کے زور پر تو بحث چلتی تھی۔ چائے کا آرڈر دیا۔ نئی پیالیوں کی کھنکناہٹ اور بحث میں نئی گرمائی۔ کھانے کا کیا ہے، کھایا کھایا نہ کھایا۔ بہت ہوا تو ایک آملیٹ اور دو توس کا آرڈر دے دیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ چائے کلچر غائب۔ اب زور ماکولات پر ہے۔ ذہنی غذا، یہ تو ماکولاتی تہذیب کے حساب سے عیاشی ہوئی۔ آخر ذہنی عیاشی بھی تو ہوتی ہے۔ ہم اسے ذہنی غذا کہتے ہیں۔ اب ذہنی غذا کی جگہ پیٹ پوجا ہے۔ کھاتا، کھاتا، کھاتا۔

یاران ماکولات بھی اپنی جگہ سچے ہیں۔ پیٹ پوجا اپنی جگہ ایک سچائی ہے۔ دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے اور اب زمانہ کونسا جا رہا ہے۔ آج جتنا کھا لیا وہ اپنا ہے، کل کی کیا خبر ہے۔ یاں چل چلاؤ لگا ہوا ہے۔ دہشت گردی کا موسم ہے۔ خودکش حملوں کی برسات لگی ہوئی ہے۔ کیا اعتبار ہستی ناپائدار کا۔ موت کی ویسے بھی کوئی منطق نہیں ہوتی اور ایسے پر آشوب زمانوں میں تو یوں بھی ملک الموت اپنے سارے ضابطے

بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ جوزد میں آ گیا وہ گیا۔ وہ بازار سے گزرتا بزاری بزاری ہو یا مسجد میں کھڑا نمازی ہو یا گرجا میں وعظ دیتا پادری ہو۔ یا امام بارگاہ میں نوحہ خوانی کرتا عزادار ہو یا درگاہ میں ہوحق کا نعرہ لگاتا قلندر ہو، خودکش حملہ آور کے لیے سب برابر ہیں۔ ہاں کبھی کبھی اتنا تجسس ضرور ہوتا ہے کہ خودکش نونہال تو شتابی سے جنت میں پہنچ جائے گا۔ دنیا سے گزرنا اور جنت میں پہنچنا اس نونہال کے لیے سفر ایسا ہے کہاں کا۔ ادھر بم پھٹا ادھر سیدھے جنت میں۔ مگر مسجد میں جو نمازی کھیت ہوئے ہیں ان کے لیے راوی کونسا مقام لکھتا ہے۔

تو اے عزیز، صورت ہمارے زمانے کی یہ ہے کہ موت کی گرم بازاری ہے۔ آج تم کل ہماری باری ہے۔ دم کا بھروسہ نہیں۔ آج ہیں کل کی خبر نہیں۔ کل کس نے دیکھا ہے۔ اس گھڑی ہیں اگلی گھڑی رہیں رہیں نہ رہیں۔ ہماری بساط ہی کیا ہے۔ ایک خودکش حملہ کی مار ہیں۔ وہ دم بہ دم زور پکڑ رہے ہیں۔

قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ

نقارے کی آواز کیا کہتی ہے کہ دوں دوں است دوں است دنیائے دوں۔ ادھر حال یہ ہے کہ نقارہ کہیں بجے گولہ کہیں گرے، دھمک اس کی اس گوشہ تک پہنچتی ہے اکیلے گھر کے اس گوشے تک جہاں میں بیٹھا کچھ کیلا کانٹی کرتا رہتا ہوں۔ یہ جو نیا آلہ ٹیلی ویژن کے نام کا ہمارے گھروں میں آن گھسا ہے، وہ میری طبع فراریت پسندی کا دشمن ہے۔ ہر دھماکہ کی دھمک مجھ تک پہنچا تا ہے۔ میرا چلتا چلتا قلم رک جاتا ہے مگر یہ دھماکے نقارے کی یہ دوں دوں تو اب ہمارے روزمرہ کا حصہ ہے۔ میں پھر قلم پکڑتا ہوں اور لکھنے کی کوشش کرتا ہوں مگر میرا محتسب اس پر بھی مطمئن نہیں۔ سات سمندر پار امریکہ میں جا بیٹھا ہے۔ وہیں سے فون کرتا ہے۔ انتظار حسین، جو لکھ رہے تھے، کتنا لکھ لیا۔ ارے جو بھی لکھنا ہے جلدی جلدی لکھ لو۔ اب وقت تمہارے پاس زیادہ نہیں ہے۔ میرے یار، جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں مگر اس ظالم کو یقین ہی نہیں آتا۔ وہ بھی اپنے نام کا احمد مشتاق ہے۔ سدا کا بے اعتبارا۔ بار بار فون کرتا ہے۔ ہفتے عشرے میں فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ کون بول رہا ہے، میں مشتاق۔ کتنا لکھ لیا۔ بس لکھ رہا ہوں۔ انتظار، میں نے کہا تا کہ جو لکھنا ہے شتابی سے لکھ لو (ہنستے ہوئے) میں نے کہا تا کہ وقت تمہارے پاس اب زیادہ نہیں ہے۔ ارے بابا، یہ میں بھی جانتا ہوں مگر شتابی سے تو میں کالم لکھتا ہوں۔ یہ جو میں لکھ رہا ہوں، کالم نہیں ہے۔

اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ کیا احمد مشتاق خالی مجھ کو باخبر کر رہا ہے کہ ہشیار باش، آخر تو عمر خضر تو لے کر نہیں آیا ہے یا مجھے سنانے کے بہانے اپنے آپ کو بھی خبردار کر رہا ہے اور شاید اسی احساس کے تحت اس کا قلم تیز چلنے لگا ہے۔ پہلے تو اس کا طور یہ تھا کہ ایک غزل لکھ لی تو جانا کہ فلک پہ تیر مارا۔ اگلی غزل بھی لکھیں گے مگر ذرہ سنبھل کر۔ اب غزل بھی تیزی سے لکھی جا رہی ہے اور نثر میں بھی قلم رواں ہے۔ صحیح کر رہا ہے۔ بڑھتی عمر کے پردے میں جو دشمن چپکے چپکے ہمارے آس پاس آن پہنچا ہے، اس کی طرف سے اب بے شک ہمیں چوکنا ہو جانا چاہیے۔ میں تو خالی اس قزاق کو دیکھ رہا ہوں جو نقارہ بجاتا ہمارے بیچ آن دھمکا ہے۔ اس دشمن سے بے

خبر ہوں جو گھات لگائے بیٹھا ہے۔ وہ نقارہ بجا کر تھوڑا ہی یلغار کرے گا۔ کسی وقت بھی بے خبری میں آن پکڑے گا۔ تو مشتاق نے بجا طور پر مجھے خبردار کیا اور اپنے آپ کو بھی۔

ارے ہاں ہمارے بیچ ایک اور پرانی بڈی بھی تو ہے۔ میں شاہد حمید کو 48ء سے دیکھتا آ رہا ہوں۔ اس وقت سے جب میں ''نظام'' کو سنبھالے بیٹھا تھا اور مظفر ایک صبح اسے ساتھ لے کر میری طرف آیا تھا۔ اس کے قلم نے بھی رفتار اس وقت پکڑی ہے جب اس نے جوانی کے ایام کو درس و تدریس کی نذر کر کے اس طرف سے فراغت پالی ہے۔ بس اس وقت سے اپنے قلم کے ساتھ جتا ہوا ہے۔ کتنا کچھ کر چکا ہے، کتنا کچھ کرنے کے درپے ہے۔

ایک میں ہوں کہ کچھوے کی چال چل رہا ہوں مگر میں خرگوش کی چال کب چلا تھا۔ پھر بھی مڑ کر نظر ڈالتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ اچھا میں نے اتنا لکھ ڈالا۔ اب اس عمر میں آ کر کچھوے سے خرگوش کیسے بن جاؤں جبکہ صورت احوال یہ ہے کہ میرے ساتھ کے اکثر یار مجھے پیچھے چھوڑ کر گزر چکے ہیں۔ میرے سوا سب ہی یار تیز گام نکلے یا کہہ لیجیے کہ سب ہی فارغ ہوئے شتابی سے۔ ابھی اس ایک ڈیڑھ برس کی مدت میں دو ایسے یار گئے کہ مجھ سے کتنی دیر بعد انہوں نے اس وادی میں قدم رکھا تھا اور کتنا پہلے رخصت ہو گئے۔ سعید محمود نے ابھی گورنمنٹ کالج میں قدم رکھا ہی تھا کہ اپنے استاد قیوم نظر کی انگلی پکڑ کر نی ہاؤس آن پہنچا۔ کتنی جلدی جلدی اس نے نظمیں لکھیں۔ نئی انگریزی شاعری سے ترجمے کیے۔ استاد نے اس کے ہنر کی قدر کی اور ''نئی تحریریں'' میں چھاپ کر اس کی حوصلہ افزائی کی مگر اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی۔ جس شاعر پہ بہت فریفتہ تھا، وہی شاعر اسے لے ڈوبا۔ دماغ میں عجب بلبلہ اٹھا کہ جب میں ایذرا پاؤنڈ نہیں بن سکتا تو کیوں شاعری سے زور آزمائی کروں۔ پھر قلم رکھ دیا۔ بس کتابوں سے غرض رکھی۔ تحریر کو سلام۔ خالص قاری۔ شاید کسی کالی زبان والے نے روشنی طبع دیکھ کر کہہ دیا کہ میاں صاحبزادے جوان ہوتے نظر نہیں آتے۔ سو وہی ہوا۔ جلدی آیا، جلدی گیا۔ جھٹ پٹ۔ تھوڑا لکھا اور سدھار گیا۔

ابھی پچھلے برس ہی کی تو بات ہے۔ سہیل احمد خاں پڑھاتے پڑھاتے یونیورسٹی سے نکلا اور ہسپتال پہنچ گیا۔ وہاں گنتی کے دن گزارے اور دیکھتے دیکھتے آنکھیں موند لیں۔ ٹھیک کہا شاعر نے کہ نفس چند کی ہے راہ ۔

دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

کتنا لکھ کر چھوڑ گیا۔ لکھنے کے کتنے منصوبے چھاتی پر رکھ کر لے گیا۔

کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں

سو میرے یار کا تقاضا بجا ہے۔ ہستی ناپائدار کا کیا اعتبار۔ قدرت نے جو ناولے تمہارے سپرد کیے ہیں، انہیں جلدی سر کرو اور فراغت پاؤ۔ جو سر نہ ہو پائے انہیں کیا قبر میں ساتھ لے جاؤ گے۔ مگر پھر خیال آتا

ہے کہ اچھا اگر جو لکھنا ہے وہ لکھ بھی لیا تو پھر۔ ارے ہماری بات چھوڑو۔ ہم سے پہلے جو اس عزم کے ساتھ نمودار ہوئے کہ اپنے قلم سے دنیا کو بدل دیں گے اور خلقت کی بگڑی کل کو سنوار دیں گے ان کے لکھے سے کتنا فرق پڑا۔ کیا کیا، لے سر گئے۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ہم جس اونٹ پر سوار ہیں اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ لو کس طرف دھیان چلا گیا۔ تھوڑے عرصے سے مجھے عسکری صاحب بہت یاد آرہے ہیں۔ کبھی کبھی جھنجلاہٹ ہوتی ہے کہ وہ آج کیوں موجود نہیں ہیں۔ جو سوال مجھے ان سے پوچھنے تھے، وہ پوچھنے سے رہ گئے مگر وہ سوال تو اس وقت پردۂ اخفا میں تھے۔ وہ تو اب نمودار ہوئے ہیں اور اب انہوں نے مجھے پریشان کرنا شروع کیا ہے۔ پتہ نہیں عسکری صاحب اتنے آئیڈیلسٹ کیوں تھے۔ وہ اپنی خوش فہمی میں کس راہ کا تصور کر رہے تھے۔ یاران قافلہ کس راہ مڑ گئے۔

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد

یہ کر کے بھی دیکھ لیا۔ پہلے بھی یہ کر کے دیکھا تھا۔ کیسا کیسا شہر آباد کیا مگر ہر پھر کر پھر کوفہ میں۔ پتہ نہیں مسلمانوں کی تاریخ میں کوفہ کیوں بار بار نمودار ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں خواب دیکھنے والے علامہ اقبال کے بعد بھی آخر پیدا ہوئے ہی تھے۔ جب ہی تو تحریک پاکستان نے زور باندھا۔ میں ان میں سے کسی شخصیت کو نہیں دیکھ پایا۔ میری پہنچ تو بس عسکری صاحب تک تھی۔ تحریک میں ان کی عملی شرکت تو صفر تھی مگر خواب دیکھنے والوں میں وہ سب سے بڑھ کر تھے۔ تو میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا۔ کیا پوچھنا چاہتا تھا۔ ارے مجھ پہ تو خود یہ واضح نہیں کہ میں کیا پوچھنا چاہتا تھا۔ اصل میں میں نے ایسا کوئی خواب دیکھا ہوتا یا ایسے کسی اجتماعی خواب میں جذباتی شرکت کی ہوتی تو میرا ذہن اس وقت واضح طور پر کچھ سوچ سکتا تھا۔ میرے تخیل نے کبھی اونچی اڑان لی ہی نہیں۔ اپنے تخیل کی مار تو بس اپنی بستی کی گرد آلود گلیوں تک تھی۔ یاد آیا کہ میں نے اپنی کہانیوں کے پہلے مجموعہ کا سرنامہ میر کے اس شعر کو بنایا تھا ؎

اڑتی ہے خاک شہر کی گلیوں میں اب جہاں
سونا لیا ہے گود میں بھر کر وہیں سے ہم

مدتوں بعد بھٹکتا بھٹکتا پھر اب وہاں پہنچا تو اس احساس کے ساتھ واپس آیا کہ پھر ان گلیوں سے تھوڑا سونا سمیٹ لایا ہوں۔

اصل میں تو یہ تذکرہ اسی خیال سے شروع کیا تھا کہ جو روکڑ میں ان گلیوں سے سمیٹ کر لایا ہوں اسے اب ذرا اطمینان سے دیکھوں اور یاروں کو دکھاؤں۔ مگر عجب بات ہے بلکہ یوں کہیے کہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ لکھنے والے بسا اوقات اور خاص طور پر مجھ ایسے چھوٹے لکھنے والے بہت شوق سے لکھ کر جو دکھانا چاہتے ہیں، وہی نہیں دکھا پاتے۔ میں گلیوں کے بیان سے شروع ہوا تھا۔ جب قلم نے کوتاہی کی تو اور طرف نکل گیا۔ اب مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں یہ تذکرہ گلی نامہ سے ہٹ کر کہیں اور طرح تو نہیں

پڑھا جائے گا۔

اصل میں ہوا یوں کہ جب میں ڈبائی کی گلیوں سے اپنی شناسائی کو تنک سا بحال کر کے پھرا اور پھر جب برصغیر کے ان شہروں کو تھوڑا دیکھ بھال لیا جنہیں مسلمانوں نے بہت رونق بخشی تھی اور کسی کسی ایسے نگر کو بھی چھو آیا جو اصل میں ہندی دیو مالا میں شاد آباد ہے اور موجودہ ہندوستان میں برائے نام بسا ہوا ہے تو ایک طمانیت کا احساس لے کر پھرا۔ لگا کہ جو ڈھونڈتا ڈھونڈتا گیا تھا وہ ڈھونڈ لایا ہوں۔ یہ سوچ کر کتنا خوش ہوا۔

مگر میں تو پھر اداس ہوں۔ وہ خوشی عارضی نکلی۔ کھوئی ہوئی چیز کہاں ملتی ہے۔ مگر کونسی کھوئی ہوئی چیز۔ یہ بھی تو یاد نہیں ہے کہ وہ شے کیا تھی جو میں وہاں سے نکلتے وقت رواروی میں چھوڑ آیا تھا۔ بہت کچھ یاد آتا ہے بس وہی شے یاد نہیں آتی۔ سو در بجرت برقرار ہے۔ میں نے جب اپنے گم گھر کو ڈھونڈ نکالا اور ان گلیوں کو جن کی خاک پھانک پھانک کر میں پلا بڑھا تھا تو کسی قدر تسکین ہوئی تھی۔ ہر چند کہ وہ گھر نہ اب وہ گھر تھا نہ وہ گلیاں اب وہ گلیاں تھیں مگر پھر بھی جتنا بچا رہ جائے اور آپ کی اس تک رسائی ہو جائے اسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔ آخر وقت کے عمل کو تو ہم نہیں روک سکتے۔ تقسیم کے ہنگام یہ گلیاں سونی نہ ہوئی ہوتیں تو بھی ان گلیوں کو بدلنا ہی تھا۔ وقت بھی تو اپنا کھیل کھیلتا ہے۔ آدمی اپنا کھیل کھیلتے رہتے ہیں، مذہب کے نام پر، نسل کے نام پر، قبیلہ کے نام پر، قوم کے نام پر۔ وقت اپنا کھیل کھیلتا ہے۔ کوئی واقعہ، کوئی انسانی واردات اس کے کھیل کے لیے بہانہ نہ بنے نہ سہی۔ دھوپ، ہوا اور بارشوں ہی کے ذریعہ وہ اپنا عمل کرتا ہے مگر آدمی اپنے اندر کے کھوٹ سے مجبور کچھ نہ کچھ گل کھلاتا ہی رہتا ہے۔ سو وقت کو اپنا کھیل کھیلنے میں سہولت رہتی ہے۔ جب ارجن نے دیاس رشی کے سامنے رو رو کر اپنی ناطاقتی کا احوال بیان کیا تھا اور فریاد کی تھی کہ اس کی گاندیو دھنش نے اس کے ساتھ دغا کی اور خود اس کے بازو جواب دے گئے اور سری کرشن مہاراج نے جنہیں اس کی امانت میں دیا تھا، وہ ان کی رکھشا نہ کر سکا۔ پھر وہ زار زار رویا اور پوچھا کہ اے مہان آتما۔ یہ کیسے ہوا۔ تب اس مہان آتما نے جواب دیا کہ " ہے۔ اے ارجن، یہ سب سمے کی کارستانی ہے۔ جان لے کہ تیرا سمے گزر گیا۔" تو بھائی وقت کی شطرنج پر ہمارے مہرے بڑھتے پٹتے رہتے ہیں اور ہم ابھرتے ڈوبتے رہتے ہیں ۔

ہوا ہی نے کھلائے گل، ہوا ہی پھر گراتی ہے
زمیں جس نے کیا پیدا وہی پھر ان کو کھاتی ہے

ہوا اور زمین دونوں وقت کے تابعدار ہیں۔ سو اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ

سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

ہمارا نہ ہوا پر حکم چلتا ہے نہ زمین ہمارا کہنا مانتی ہے۔ جیسے ارجن کی دھنش آخر میں ارجن کا

ساتھ چھوڑ گئی ویسے ہی ہماری ہر چیز ہمارا ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ آخر میں یہی ہوتا ہے کہ ساتھ مرے رہ گئی ایک مری آرزو۔ اور لازم نہیں کہ وہ کوئی ایسی آرزو ہو جس کے ہاری آپ کی زندگی کے حساب سے بہت معنی ہوں۔ اور یہ بھی کوئی لازم نہیں کہ آدمی نے کوئی بہت معرکہ کا عشق کیا ہو، اس کے حساب سے اس کی ناآسودہ آرزو اس کے دم کے ساتھ لگ کر اسے ستاتی رہے۔ کوئی بھلی سی صورت، کوئی معصوم سی ادا، یا بس کان میں پڑی ہوئی کوئی میٹھی سی آواز آپ کے اندر اتر جائے۔ بے شک ساتھ میں کوئی بڑا درد لے کر نہ آئے۔ بس کبھی کبھی کی ایک کسک۔ آدمی کو خراب کرنے کے لیے یہ ایک کسک بھی بہت ہوتی ہے اور وہ اک تنگ جو بظاہر نگاہ سے کم ہوتی ہے وہ بھی کبھی کبھار کی یاد بن کر بہت ستاتی ہے۔ مگر رکو، ذرا کان لگا کر سنو تو سہی، یہ باہر کیسا شور ہے۔ میرا ذہن پھر بھٹک گیا۔ کس کسک کی بات کر رہا تھا۔ ساری بات ہی ذہن سے اتر گئی۔ اصل میں ایک ایسے وقت میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں جب قریب و دور سے واجب القتل واجب القتل کی خشونت بھری آوازیں آ رہی ہیں۔ ادھر کراچی سے ایک خبر مستقل آئے چلی جا رہی ہے۔ ٹارگٹ کلنگ، ٹارگٹ کلنگ۔ کوئی اور خبر بھی ہے یا میرے عزیز تو یہی خبر دہراتا رہے گا اور یہی خون آلود منظر دکھائے چلا جائے گا۔ میں چینل بدلتا ہوں۔ وہاں ایک چینل بیٹھا ہے اور بحث گرم ہے۔ کس موضوع پر۔ ارے کچھ سنائی دے تو پتہ چلے کہ کیا موضوع زیر بحث ہے مگر وہاں تو سب اکٹھے بول رہے ہیں۔ سنائی کیا خاک دے۔ ایک خاتون جس کے متعلق بتایا گیا کہ صوبائی وزیر ہیں، غصے میں بڑبڑائے چلی جا رہی ہیں۔ دوسروں کی وہ نہیں سن رہیں۔ دوسرے ان کی نہیں سن رہے۔ اینکر کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو وہ چیخنا شروع کر دیتا ہے۔ میں پریشان ہو کر ٹی وی بند کر دیتا ہوں مگر اس سے فرق کیا پڑا۔ باہر بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ سارے ملک میں یہی نقشہ ہے۔ سب اپنی اپنی بولی بول رہے ہیں۔ دوسرے کی سننے کے لیے کسی کے پاس کان نہیں ہیں۔ بس ایک ہی کلمہ صاف سنائی دے رہا ہے۔ واجب القتل، واجب القتل۔

یہ کچھ سن کر میں بوکھلایا ہوا ہوں۔ مجھ سے بڑھ کر میرے دوست بوکھلائے ہوئے ہیں۔ اس بوکھلاہٹ میں ان کا عجب حال ہے۔ آج والوں پر ان کا بس نہیں چل رہا۔ ان کا نزلہ ان بزرگوں پر گر رہا ہے جو دور جا چکے ہیں۔ جواب دینے کے لیے وہ یہاں لوٹ کر تو نہیں آئیں گے مگر اس وقت مجھے ان کی بیچارگی دیکھ کر ان کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ ابھر رہا ہے۔ جس ہجوم کو وہ ایک قوم کہنے پر اصرار کر رہے تھے، ان کے اندرون کا انہیں کیا پتہ تھا کہ وہاں کتنے فتنے سوئے پڑے ہیں اور کتنے تفرقے باہر آنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ اے لو مجھے پھر عسکری صاحب یاد آ گئے۔ ان دنوں کتنے جوش میں تھے، بھجور ہے تھے کہ صدیوں میں پلے ہوئے ارمانوں کے پروان چڑھنے کا مبارک وقت آن پہنچا ہے۔ یہی تو میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر چھوڑیں اس قصے کو۔ پوچھنے کا وقت گزر گیا۔ اب اور وقت ہے۔ ہم نے اس پورے ہجوم سے جسے ہم ایک متحدہ ملت جانتے تھے، کٹ کر ایک دوسرے کے ساتھ کیا کیا اور کیا کر رہے

ہیں۔ ہندوستانی مسلمان الگ کڑھ رہے ہیں۔ بنگالی مسلمان الگ ہمیں کوس رہے ہیں اور ہم اب بچے کھچے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ واجب القتل، واجب القتل۔ ارے ورد کرنے کے لیے اور کوئی وظیفہ تمھیں نہیں ملا تھا۔ ایک یہی وظیفہ ہمارے نصیب میں لکھا تھا۔ انتظار حسین، بس کرو۔ چپ ہو جاؤ۔

کہ یہ زمانہ ہے اک طرح کا زیادہ نہ بول

ഋ........ഋ........ഋ

کہنے والے کا بھلا سننے والا کا بھلا

قصہ تمام ہوا اور قصہ باقی ہے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ زمانے بعد جب میں نے اپنی گمشدہ بستی کو کھوج لیا اور اس کی گلیوں میں تھوڑا گھوم پھر لیا تو دل میں کن من ہونے لگی۔ پھر نوکِ قلم میں بھی کسمساہٹ شروع ہوگئی۔ سو میں شروع ہو گیا۔ پھر بات کہیں سے کہیں پہنچی۔ شوق نے بات کو بڑھایا اور وہ بڑھتی چلی گئی۔ اپنی گلیوں میں سے ہوتا ہوا کہاں سے کہاں نکل گیا۔ بعض لوگوں کو اپنی زبان پر قابو نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ جاری ہو جائیں، پھر مشکل ہی سے رکتے ہیں۔ بعض کے قلم ان کے قابو میں نہیں رہتے۔ مگر میں تو ان میں سے نہیں۔ زبان اور قلم دونوں کم کم ہی بے قابو ہوتے ہیں۔ یہاں شوق شاید زیادہ تھا۔ پھر قلم ایک دفعہ رواں ہوا تو بس پھر روانی زور پکڑ گئی۔

تو میں تو لکھتا چلا گیا یہ سوچے بغیر کہ کونسی فارم یا کونسی صنف ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔ اب جب میں لکھ چکا ہوں تو بھی میں اسے کسی خانے میں مقید کرنے کی کوشش کو روا نہیں سمجھتا۔ اس سے قاری کو شہ ملے گی اور وہ اپنے طور پر طے کرنے کی کوشش کرے گا۔ ممکن ہے وہ اسے خودنوشت جان کر پڑھنے کی کوشش کرے اور پھر سوال اٹھائے کہ یہاں خودنوشت کے تقاضے پورے ہوئے ہیں یا نہیں۔ مگر ممکن ہے کہ کوئی پڑھنے والا اس سے اختلاف کرے اور کہے کہ یہ تو بس سفرنامہ ہے۔

میں قاری کو روکنے ٹوکنے والا کون ہوتا ہوں۔ جب میں نے اپنی طرف سے صنف کا تعین نہیں کیا تو اسے اپنے طور پر یہ تعین کرنے کی آزادی ہے اور انہیں کو پیش نظر رکھ کر میں بھی سوچنے لگوں تو کیا مضائقہ ہے۔ اگر یہ سفرنامہ ہے تو پھر تو یہ بہت ہی کتا چھنا سفرنامہ ہے۔ میرے بڑے بڑے سفر تو اس میں شامل ہی نہیں ہیں۔ کتنے سفر میں نے الف لیلہ کے سوداگر زادوں اور شہزادوں کے ساتھ کیے ہیں۔ حاتم طائی نے جو سفر کیے میں کتنے موقعوں پر اس کے پیچھے گرد سفر بن کر چلتا رہا۔ پانڈو برادران جب اپنی جلاوطنی کے دنوں میں تیرتھ کے بہانے ہندوستان کی وشال دھرتی پر خاک پھانکتے پھر رہے تھے میں نے ان کے ساتھ بھی کچھ سفر کیے ہیں اور کتھا سرت ساگر وہ تو دیسوں اور نگریوں سے بڑھ کر جنموں کے سفر ہیں۔ ایسے سفر اسفار کے ذائقہ سے بھی آشنا ہوں۔ اسی سے مجھے خیال آیا کہ ایک سفر ایسا بھی داستانی مسافروں کو درپیش رہا ہے کہ تین کھونٹ سے نکل کر

چوتھے کھونٹ میں جا نکلے۔ اور چھوٹتے ہی یہ افتاد پڑی کہ جون ہی بدل گئی۔ مگر یہ سفر تو جنوں والے سفر اسفار کی طرح ہمارے اندر کے طاق نسیاں میں دبے پڑے ہیں۔ مگر میں اسے طاق نسیاں نہیں اندھا کنواں کہتا ہوں۔ ہمارے سب کے اندر ایک اندھا کنواں ہے۔ جس میں ہمارے کتنے جوکھم' کتنے تجربے' کتنے سفر غرق پڑے ہیں اور اندھے کنوؤں میں جھانکنے کا مجھے شوق نہیں۔ ہاں بچپن کے دنوں میں تھا۔

اس کا قصہ اس طرح ہے کہ ہماری ڈبائی کے گھروں میں آئے دن سانپ نکلتے رہتے تھے۔ مسلمان گھر میں کوئی سانپ نکل آتا تو گھر کے مرد لاٹھی پونگے لے کر کھڑے ہو جاتے اور سانپ کا سر کچل دیتے۔ مگر ہندو گھر میں سانپ نکل آتا تو وہاں کوئی اس کی جیا کا خیال کبھی دل میں بھی نہیں لاتا تھا۔ سنج کرتا تھا۔ کیا خبر ہے کہ یہ سانپ شیش ناگ کی سنتان ہو۔ وہاں کوئی سانپ پکڑنے والا بلوایا جاتا تھا۔ وہ اس کمال سے سانپ کو پکڑتا تھا کہ سانپ کی دم مٹھی میں دبی ہے اور منہ نیچے اس طرح لٹکا ہوا ہے کہ نہ وہ پھنکار سکتا ہے نہ سانپ والے کو ڈس سکتا ہے۔ وہ اسی طرح اسے دم سے پکڑے پکڑے بستی سے باہر وہاں جا پہنچتا جہاں کب سے ایک گہرا کنواں خشک پڑا تھا۔ اسے ہم اندھا کنواں کہتے تھے۔ سانپ والا اس کنوئیں کی من پر کھڑا ہو کے اپنی مٹھی کھولتا اور سانپ کنوئیں میں جا گرتا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ کنوئیں کی خشک تہہ میں بل کھاتا رینگتا نظر آتا۔ پھر وہیں کسی سوراخ کسی بل میں گھس کر اوجھل ہو جاتا اور میں حیران ہوتا کہ وہ سانپ اس کنوئیں کی کونسی تہہ میں جا کر چھپ گیا۔ اور اس سے پہلے جن سانپوں کو یہاں گرایا گیا تھا وہ کہاں سنک گئے۔ اور اب سوچتا ہوں کہ ہمارے اندر جو اندھا کنواں ہے اس میں بھی کتنے اچھے برے تجربے' کتنی زہر بھری یادیں' کتنے سانپ سنپولئے دبے پڑے ہوں گے۔ اچھا ہی ہے کہ ہماری طرف سے ان میں تاکنے جھانکنے کا کاروبار فرائڈ اور یونگ کے چیلوں نے سنبھال رکھا ہے۔ کم از کم مجھے ایسا شوق کبھی نہیں رہا۔ یہ ان کا شوق رہا ہے کہ اپنی خودنوشت لکھی جائے تو ارد گرد کے علاوہ اپنے اندر بھی جھانک لیا جائے اور اگر اندھے کنوئیں کی تھاہ تک رسائی ہو جائے تو وہاں سے کوئی کوئی گناہ سے آلودہ یاد کوئی نجس تجربہ برآمد کر کے ہتھیلی پر رکھ کر نمائش کی جائے کہ دیکھو یہ ہوں میں' ایک گنہگار روح۔ ارے ہم تو ان میں سے ہیں جو اس حسرت میں تڑپتے رہتے ہیں کہ ؎

اے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا
گناہ ایک بھی اب تک نہ کیوں کیا میں نے

تو ہم ایسے لوگ کس برتے پر خودنوشت لکھیں یا بقول چہار درویش والی شہزادی کے کہ جب شہزادے کو کئی راتیں اس طور گذریں کہ ؎

میں ہاتھ اسے نہیں لگایا
اے بیکسی گواہ رہنا

اور پھر اس نے علی الصبح خادمہ سے کہا کہ غسل کے لیے پانی گرم نہیں کیا تو شہزادی نے مسکرا کر کہا کہ

کس برتے پر تتاپانی۔ ویسے اگر ایسا کوئی نیک و بدنامۂ اعمال میں لکھا بھی جائے تو ہم کاہے کو اسے قلمبند کرنے لگے ہیں۔ جس تہذیب میں آنکھ کھولی ہے' جس کی آغوش میں پلے بڑھے ہیں وہ کب اس کی اجازت دیتی ہے۔ بھلے ہی پڑھ لیا ہو فرائڈ کو۔ عشق پردہ نشیں میں مرتے ہیں پر زباں نہیں کھولتے۔ تہذیب نے ہونٹوں پر تالا ڈال رکھا ہے۔ قلم کیسے چلے۔ ہاں مشتری بائی زہرہ بائی کے مجروں کا ذکر ان سے سن لو۔

تو ایسے تہذیب زدوں کو تو خودنوشت لکھنے کا شوق پالنا ہی نہیں چاہیے۔ اچھا آپ نے اپنی ذات سے چند ایسے جھوٹے سچے پردے اٹھا بھی دیئے تو پھر۔ آپ نے یہ کر کے یاروں سے داد لے لی کہ ہم اپنی ذات کو برہنہ کر کے باہر لے آئے اور اپنے بارے میں سارا سچ اُگل دیا۔ تو پھر۔ ارے بھائی تم اپنے آپ کو کیا سمجھ رہے ہو۔ انسان ضعیف البنیان کی اسی میں عافیت ہے کہ اپنے جامہ میں رہے۔ ہم کیا' ہماری ذات کیا۔ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ۔ میں اپنی پدی ذات کو بانس پر چڑھا کر کیا کمال دکھاؤں گا۔ تو یہاں میں نے کسی ایسے زعم کے ساتھ قلم نہیں اٹھایا تھا۔ بس یہ سمجھو کہ یہ بھی خیال سا اک خاطر میں آ گیا تھا کہ اتنے زمانے بعد تم نے ان گلی محلوں کو دیکھا ہے جہاں تم نے اتنی خاک پھانکی تھی اور وہی خاک پھانک پھانک کر تم نے ہوش سنبھالا اور بچے سے بڑے ہوئے۔ مگر کتنے بڑے ہوئے۔ اتنی عمر کہاں کہاں گذار کر یہاں آئے ہو تو پھر ہر گلی اور ہر گلی کے ہر نکڑ کو دیکھ کر بچوں کی طرح حیران و شادماں ہو رہے ہو۔ گھڑی میں حیران' گھڑی میں خوش' گھڑی میں اداس۔ بس اسی رو میں قلم چل پڑا۔ اپنے اچھے برے دن یاد آتے چلے گئے' کبھی سفر کبھی حضر' کبھی موسم خوشگوار' کبھی ناخوشگوار' اسی حساب سے قلم رواں' کبھی رک گیا' پھر کوئی بھلا سا منظر یاد آیا اور قلم پھریری لے کر پھر چل پڑا۔ مگر اپنی رام کہانی تو نہیں سنانی تھی۔ اگرچہ نیاز صاحب کا اصرار یہی تھا کہ اسے باقاعدہ خودنوشت ہونا چاہیے۔ اس سے خیال آیا کہ مجھے یہ بھی تو بتانا چاہیے کہ اپنے نگر کی یاترا کے بعد میرے اندر تو کن من ہو ہی رہی تھی مگر باہر سے تقاضا نیاز صاحب کی طرف سے ہو رہا تھا کہ لکھو' لکھو' لکھو۔ اس تقاضے نے بھی چچی کا کام کیا۔ یوں بھی ہم زندگی میں کتنی مچھلیاں کھاتے رہتے ہیں۔ مگر ہر زخم' ہر کھرونچ دکھانے کے لیے تو نہیں ہوتی۔ زندگی کے بیان میں نجی زندگی کا بیان آٹے میں نمک کی نسبت سے ہونا چاہیے۔ یہ تو نہ ہو کہ اپنا سب اچھا برا گنتے چلے جا رہے ہیں اور ہر گفتنی ناگفتنی بے تکان کہتے چلے جا رہے ہیں۔ اس قصہ میں اطمینان کا پہلو یہ ہے کہ حافظہ خود بھی تو انتخاب پسند ہوتا ہے۔ کتنی فالتو باتوں کی تو وہ خود ہی چھانٹی کر دیتا ہے۔ سو جو یاد رہ گیا اور قلمبند ہوا وہ موتی۔ جو بسر گیا اور قلمبند نہ ہو پایا وہ کنکر۔ باقی رہے نام اللہ کا۔ لکھنے والے کا بھلا۔ پڑھنے والا کا بھلا۔ جسے یہ بیان بھا گیا اس کا بھلا۔ جسے نہ بھایا اس کا بھی بھلا۔

....

JUSTAJU KIYA HAI?

(Autobiography)

by

Intizar Hussain

غالب نے صحیح کہا ع کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے۔ مگر آدمی اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ کھوئے ہوؤں کی جستجو اس کا پرانا مشغلہ ہے۔ جو بیت رہی ہے وہ برحق۔ مگر جو دن بیت گئے وہ کیا تھے۔ وہ تہذیب جو بکھر گئی اور گذر گئی وہ کیا تھی۔

پریم چند فیلوشپ کے طفیل ہندوستان کی ایک پریم یاترا۔ پورب، پچھم، اُتر، دکھن، چاروں کنارے چھو لئے۔ ان کناروں کو چھوتے چھوتے اپنی گم بستی کو ڈھونڈ نکالا۔ مگر اس بستی میں وہ کونسی گلی تھی اور وہ کونسا گھر تھا جہاں اس خانہ خراب کی نال گڑی ہے۔ کھوئے ہوئے گھر کی تلاش۔ یہ اپنی جگہ پر ایک مہم ہے۔ آخر کو وہ گھر ڈھونڈ نکالا ع

جس محلہ میں تھا ہمارا گھر

وہ محلہ کیا تھا۔ وہ گھر کیسا تھا۔ اپنی جگہ پر ایک دنیا، ایک تہذیب۔ اسی بہانے ایک لمبی زقند اک لمبا سفر۔ بچپن اور لڑکپن کی دنیا۔ وہ کیا دنیا تھی، کیا اس کا رنگ تھا۔ مگر اچانک رنگ آسمان بدلتا ہے۔ لو یہ تو برصغیر کی تاریخ ہی بدل گئی۔ ایک نیا ملک وجود میں آ گیا۔ زمانہ کچھ اس رنگ سے بدلا کہ لوگ اپنی کشتیوں سے اکھڑ لئے۔ قافلے ایک ملک سے نکلے۔ اب ان کا رخ نئی سرزمین کی طرف ہے جو کل تک پرائی تھی اب نئی دنیا ہے۔ نئی زمین نیا آسمان۔ یہاں سے اک نیا سفر شروع ہوتا ہے۔ آگے حدِ ادب ہے۔ جو گذری اسے اس سرگذشت میں پڑھیے۔

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-81-8223-970-8